

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

فروری 2018

عمران ملک

معراج رسول



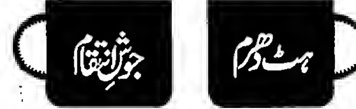
مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مُدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0323-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269









شراکت دار

جلد 47 • شمارہ 02 فروری 2018 • زرسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 70 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com









پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

مبارک ترین

"جنابِ شیان! آداب، بندگی، کورنش! تو آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے مجھ پر ہی نہیں۔۔۔ میری آنے والی نسلوں پر بھی احسان فرمایا۔۔۔ مگر میری آنے والی نسلیں! میر تقی تو نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ بیٹی۔۔۔۔ میں تو منقطع النسل ہوں۔ بہرحال آپ نے مجھ پر اور میرے باپ دادا پر بڑا احسان فرمایا۔۔۔۔"

"جون ایلیا! آخر بات کیا ہے۔ تم کچھ بہکے بہکے سے کیوں ہو؟"

"میں ہانتے ہیں میں کیوں ہوں؟ شیان! اس صورت میں میرا اور تمہارا نباہ ممکن نہیں ہے۔"

"کس صورت میں جون ایلیا؟ آخر ہوا کیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے کہ دوپہر سے سہ پہر ہوئی، پھر دھوپ سڑکوں پر چڑھ گئی اور اب شام کا اخیر ہے اور آپ اب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی شہر گردی اور سیر روز افزوں ہے۔ میں تم سے بار بار ایک بات کہتا چلا آیا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے زیادہ دیر تک اکیلا نہ چھوڑا کرو۔۔۔۔ مگر تم جو تمہارے شخص کی اذیت ہمارے بین کی ایک لگاتار اور شاعرانہ شروعات ہوتی جارہی ہے اور اسے جنگ کر اب میں کم ہے کہ آوارہ گردی کرنا ہو چاہوں۔ میں دوپہر سے لے کر ایک ساعت پہلے تک افلاطون اور ابن مسکویہ سے بات چیت کرتا اور آپ کی خبر گیری میں ہمہ تن رہا ہوں۔ آخر وہ دونوں بھی رخصت طلب کر کے "اللہ حافظ" کہہ کر چلے گئے۔ پھر آپ کے انتظار میں وقت کاٹنے کے لیے میں ابن فارض اور عرفی سے استفادہ کرنے میں لگ گیا۔ وقت کا ٹنا اور اپنے آپ کو اپنے آپ میں انتشار ہو۔ اس حالت میں کہ آپ اب آئے اور اب آئے۔ پر تم نہیں آئے، یعنی نہیں آنا چاہا۔"

"تم میری اس بات کا بہت برا مانتا کہ تم بہت ملنسار ہو گئے ہو یا ہوتے جا رہے ہو۔ یعنی تم انگریزی زبان میں 'سوشل'۔ پچھلے دنوں مجھے بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ تم ایک دن اپنے ایک ملنے والے کے بیٹے دوست کی شادی کی سالگرہ کی تقریب میں پائے گئے۔ کیا کہوں کہ کیسے کیسے لوگوں میں دکھائی دیے۔ ایک دن تم یعنی تم کسی قرابت دار کی لڑکی کی شادی میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظر آئے۔ ایک بات یاد ہے کہ تم ایک [illegible] کی شادی میں ایک "منتظم اعلیٰ" کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔"

"میرے دماغ میں جو چبھن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بہت "ملنسار"، "مرنجاں مرنج" اور مجلسی ہو گئے ہو۔ مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ اب تم اپنے دن کا ایک قابل ذکر حصہ ریستورانوں میں شاعروں کے ساتھ بیٹھ کر گزارتے ہو۔ شاید یہ بات بھی ان تک پہنچی کہ تم نے کسی زبان سے ایک نہایت فحش جملہ صادر ہوا تھا۔ وہ کچھ یہ تھا کہ عبیداللہ علیم نے اسد محمد خان پر آج ایک عجب فقرہ لگایا، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اسے مت سنا اور ہرگز نہیں۔ تو کیا اب میں سمجھا ہوں کہ تم بھی شاعروں کی صحبت بد کے اثر میں آکر میری چھ سو برس کی زبان کی ناموس بگاڑنے کی کوشش میں ہو۔ "فقرہ لگانا" کیا اردو کا کوئی محاورہ ہے؟ تمہیں اتنی بے ہودہ زبان بولنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"جون! تم ان دنوں بہت کھوئے ہوئے اور بجھے ہوئے رہتے ہو۔ تم اپنے احساسِ جمال اور اپنے دل کے شاعرانہ جذبوں تک سے بے سروکار ہو گئے ہو۔ اس لیے کہ تمہیں تمہارے اصل جلیش اور حقیقی قصے یعنی اپنے لوگوں، کروڑوں لوگوں کے عیش اور قصے سے بے واسطہ کر دیا گیا ہے۔۔۔۔ بے دل کر دیا گیا ہے یا یوں کہو کہ تم ایک قسم کی دل شکستگی، ناامیدی اور لاتعلقی میں مبتلا کر دیے گئے ہو اور دل کے دل اور جان کی جان سے یہ کہنے لگے ہو کہ تمہارا اور تم ایسے لوگوں کا کتنا بری طرح غارت کیا۔ اس وقت بھی تم بہت کھوئے اور بجھے ہوئے ہو۔ یعنی بہت۔"

"ہاں شیان! بہت اور بہت سے بھی کچھ زیادہ ہی۔۔۔۔ مگر اس وقت میری جھنجھلاہٹ کی وجہ میرا یہ احساس ہے کہ تم بہت "ملنساز" ہو گئے ہو اور کیا ہم دونوں یہ بات نہیں جانتے کہ ملنسار ہونے کا کیا مفہوم اور کیا مطلب ہے۔ ملنسار کے صحیح کیفیت اور مفہوم کے اظہار سے کئی مترادف ہیں مثلاً دوغلا، منافق اور مناق وغیرہ۔"

"ملنسار ظالم کا بھی نیازمند ہوتا ہے اور مظلوم سے بھی دعا سلام رکھتا ہے۔ وہ بچوں کا بھی جی بہلاتا ہے اور جھوٹوں کو بھی لطیفے سناتا ہے۔ وہ سترالد کے حامیوں سے بھی دردمندی کا رشتہ جوڑے رکھتا ہے اور اس شخص کی اس ہدایت کے ارکان میں سے ہر رکن کے حضور بھی آداب گزارتا ہے جس نے سترالد کو اسیری اور پھر شوکر ان کا قرابہ پلانے کی سزا دی تھی۔ وہ مقتول کے سوگواروں کو بھی "پرسہ" دیتا ہے اور اس کے "قاتل" کو بھی بیچ پر دونوں ہاتھ رکھ کے تم قد ہو کر کورنش بجا لاتا ہے۔ وہ چور سے بھی نباہتا ہے اور کوتوال کو بھی سراہتا ہے۔ شیان! ملنسار انسان، انسان کی سب سے زیادہ بودی، بھدی، بھونڈی اور بیہودہ قسم ہے۔ میں نے غلط کہا۔ ملنسار انسان بے اصل ہو سکتا ہے کہ اس کا سروکار سب سے رہتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں اگر تمہیں اس کے انسان ہونے پر اصرار ہے تو میں تمہیں اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک بدترین، بدگوش، بزدل اور بدنہاد انسان ہوتا ہے۔ وہ "وقت" کے ہر موسم سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔"

"ارے شیان! مجھے "وقت" کے لفظ پر یہ بات یاد آئی کہ یہ اس سال کے آخری دن ہیں اور ہم وہیں کے وہیں ہیں جہاں گزشتہ سال، گزشتہ سال ہی نہیں بلکہ گزشتہ تیس اکتیس سال پہلے تھے اور سچ پوچھو تو ہم اس سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔ ہماری طبع کی جولانی، جدت اور ہنگامہ سامانی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان کے قیام کا جشن جس اہتمام سے مناتے ہیں، اب نئے سال کے دوران پاکستان کے زوال کا "جشن" بھی پورے کروفر کے ساتھ منائیں۔ آخر تو ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم گزشتہ کئی سال سے بڑے سلیقے قرینے کے ساتھ "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے غلط کہا، سچ بات یہ ہے کہ جو "واپس" ہوتے چلے گئے ہیں وہ اس ملک کے حکمران، سیاست دان، صاحبانِ قوت اور افسر شاہی کے گندے، گھٹیا اور گھناؤنے دو پائے ہیں۔ ان سب کو نیا سال کیسر نامبارک ہو اور اس ملک کے اصل مالکوں کے حق میں یعنی عوام کے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔ ہاں شیان! ہمارے حق میں یہ سال مبارک ترین سال ثابت ہو۔"

☆☆☆

آپ کا خط

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

فروری 2018ء یعنی نئے سال کا دوسرا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ وقت کی تیز رفتاری اب انسان کو زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں دیتی اور اگر کوئی سوچنا چاہے بھی تو مسائل کا انبار دیکھ کر نظریں چرا لینے پر مجبور ہے مگر بااختیار لوگ جب ایسا کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ صبح سے رات گئے تک زندگی کے اہم امور چھوڑ کر لمبی لمبی قطاروں میں لگے قومی شناختی کارڈ کے اہم مرکز نادرا کے باہر خوار ہونے والے بے چارے عوام کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے وقت کے زیاں کی سب سے اہم اور اچھی جگہ یہی ہے...... جبکہ ان سے ایسے ایسے کاغذات کی فراہمی کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو شاید ان کے باپ داداؤں کے پاس بھی نہ ہوں۔ کیا ہو گیا ہے ہمارے اداروں کو، جن کے پاس جانچ پڑتال کا کوئی آسان طریقہ نہیں، دوسری جانب تعلیم کو عام کرنے کا نعرہ لگانے والی حکومت کو بھی اس بات کا خیال تک نہیں آتا کہ جب والدین کے شناختی کارڈ اور بچوں کے ”ب“ فارم نہیں بن پائیں گے تو کیا بچوں کا تعلیمی سلسلہ شروع کیا جا سکے گا۔ کیسا وقت آن پڑا ہے...... کہ اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح رہنا اور بار بار خود کو یہ یاد دلاتے رہنا کہ یہ میرا اپنا گھر ہے اور کوئی ماننے کو تیار نہ ہو تو کیسا لگے گا...... البتہ غیر ملکی لوگوں کے نہ صرف بہ آسانی شناختی کارڈ بن جاتے ہیں بلکہ پاسپورٹ تک میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ یہ کیسا نظام ہے ہمارا...... نظام تو اقتدار اعلیٰ کے زیرِ سرپرستی ترتیب دیا جاتا ہے اور اس طبقے کے پاس عوام کے لیے وقت ہی کہاں ہے، اگر وقت ہوتا تو کیا آج صحرائے تھر میں قحط سالی کے سبب موت کا رقص جاری ہوتا۔ جہاں نومولود بچے، مائیں...... غذائی قلت، وبائی امراض اور بدانتظامی کی وجہ سے سنگین حالات کا شکار ہیں تو جناب جہاں ان قابلِ فکر امور کی جانب سوچنے والا کوئی نہیں تو ایسے میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی دھمکیوں سے اہل تو بچے گی کیونکہ امداد کے بند ہو جانے سے مسائل میں تو اضافہ ہی ہوگا جس نے قومی نفسیات اور اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے جبکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ ٹرمپ کی طرف سے امداد اور سیکیورٹی معاونت روکنے کے فیصلے کے آگے پیچھے کئی پیچیدگیوں کا صحرا کھل گیا ہے۔ قرضے کا چسکا ہمارے بااختیار طبقے کے ہاتھوں قوم کو لے ڈوبا...... جبکہ دوسری جانب امریکیوں کی لغزشوں نے بھی عالمی امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ دیگر عالمی عوامل میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ٹرمپ انتظامیہ نے سارا ملبا ناحق پاکستان پر گرانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم پاکستان کی قومی امداد روکنے اور سیکیورٹی تعاون معطل کرنے کی کارروائیوں کے منفی اثرات پر خود امریکی میڈیا اور سیاسی و سفارتی حلقے لب کشائی پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ جب اتحاد میں فائدہ دونوں ممالک کا تھا تو کیا مخالفت میں نقصان برابر کا نہیں ہوگا...... ہونے کے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر ہمارے راہنماؤں کو کچھ فکر لاحق ہو جائے تو...... سوچ بچار کے در پر دستک دیتے ہوئے ہم تو چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں پیارے پیارے قارئین دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہمارے منتظر ہیں۔

✱ منشی محمد عزیز مئے، دہاڑی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”سسپنس سے یارانہ آج سے نہیں بلکہ بڑا پرانا ہے۔ کم و بیش تیس سال سے سسپنس کا شیدائی ہوں اور گزشتہ صدی میں میرے تبصرے وغیرہ بھی شائع ہوتے رہے ہیں بلکہ دیوتا کے سلور جوبلی نمبر میرا مفصل خط بھی غالباً 2002ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس ساری تمہید کا مقصد مطلب ہے پچیس سال پورے ہونے پر ایک صرف آپ کو یہ بتانا ہے کہ میں اور اولاد کو للہ سے بھی پرانا ہوں۔ (آپ کی اس سسپنس دوستی کے ہی تو ہم قدردان ہیں) بس فرق یہ پڑا کہ غم روزگار کے جھمیلوں نے خط لکھنے سے باز رکھا لیکن اس بار چونکہ ایک سال اور بیت گیا اور پھر...... گولڈن جوبلی سال بھی آہستہ آہستہ قریب سے قریب تر آ رہا ہے۔ خط لکھنے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو کہ صرف آپ کو بتا رہا ہوں کہ آج سے ٹھیک بیس سال پہلے 22 دسمبر 1997ء کو میری شادی ہوئی تھی اور اس موقع پر میرا دوسرا خط سسپنس میں شائع ہوا تھا اور آج بیس سال بعد جب یہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں تو انکل معراج رسول کی نداقتا کہی ہوئی بات یاد آ رہی ہے...... (ویسے آپس کی بات ہے...... وہ کیا بات تھی؟ جو آپ نے چھپائی۔) اب چلیے تازہ ترین شمارے کی جانب۔ 18 دسمبر کو جنوری کا سسپنس ملا جس پر ایک محترمہ افسردہ سی پریشان سی نظر آئیں، شاید یہ سسپنس کی قیمت بڑھ جانے کا اثر ہے۔ ذاکر صاحب سے ایک فرمائش ہے کہ کبھی بکھری بکھری سی زلفوں والی کوئی حسینہ کا دیدار بھی کروا دیں۔ (پھر آپ کا اعتراض بھرا خط آ جائے گا کہ ٹائٹل پر ایک عدد چڑیل کس خوشی میں چھاپ دی آپ نے)۔ آپ کے خط

میں تاب پر ہیں ایمانے زارا شاہ۔ اپنے اندازِ بیان سے خاصی نٹ کھٹ سی بلکہ چلبلی سی لگتی ہیں۔ ایمانے بہرحال تبصرہ بھرپور تھا، مبارک باد قبول فرمایئے۔ دیگر دوستوں میں اشفاق شاہین بڑے پرانے تبصرہ نگار دوست ہیں۔ ان کے علاوہ عبدالجبار رومی انصاری، بابر عباس کھاریاں، دوست محمد، زاہد احمد، محمد صفدر معاویہ اور محمد خواجہ نے بھی بھرپور انداز میں تبصرے لکھے تھے۔ ایک حیرت انگیز اور مزے دار بات یہ تھی کہ کیمپل تبصرہ نگار ایمانے زارا شاہ آپ کے خط کی محفل میں واحد خاتون تھیں دیگر کسی بھی کیمپل تبصرہ نگار کا خط شاملِ اشاعت نہ تھا۔ (تو اس میں مزے دار کونسی بات تھی؟) محفل شعر و سخن کے حوالے سے ایک بات ڈرتے ڈرتے...... کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اگر کوپن لازمی طور پر ہے تو پلیز اس طرح رکھیں کہ دوسری طرف کوئی اشتہار ہو نہ کہ محفل کا حصہ کیونکہ وہ حصہ کاٹتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ اس بار ملائکہ حریم، اشفاق شاہین، مرزا طاہر الدین بیگ، ریاض بٹ اور حنا خان کا انتخاب پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے حسبِ روایت گریبان کا مطالعہ کیا۔ فرید انتہائی نادان شخص تھا جو اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی سسرالی رشتے داروں کی چالبازی کو نہ سمجھ سکا اور پھر اپنی ماں سے اتنا ناروا سلوک! استغفر اللہ۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر صاحبہ ”درماندہ“ کے ساتھ براجمان تھیں۔ اف خدایا! ارلا ڈالا مہرن کی داستان نے تو...... کتنے بے درد اور سنگدل ہوتے ہیں یہ مرد، مجھے بہت غصہ آتا ہے ایسے درندوں پر۔ نعیم انتہائی گھٹیا ذہن کا مالک تھا جس کو بالآخر اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑا۔ یامین بھی اپنے کرتوتوں کی بنا پر جہنم واصل ہوا۔ میڈم کی بات صد فیصد درست ہے، تربیت ہی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ ساجد کا کردار بہت عظیم تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر چاندی کا چھلکن بھی ایک پُراثر تحریر تھی لیکن بھٹی صاحب نے کہانی کا اختتام بہت جلدی میں کر ڈالا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا تاریخی مضمون اک دور تھا، سیاست کی چالوں سے لبریز تھا۔ اس میں لکھا ایک فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ امورِ مملکت چلانے کے لیے صرف صلاحیتوں کی نہیں بلکہ سازشوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ نوروز گرگین حیرت انگیز قسم کا سازشی ذہن کا مالک شخص تھا جس نے حالات اور وقت کے مطابق کئی قلابازیاں کھائیں اور گناہ گاروں اور مجرموں کو بے گناہ قرار دلوا دیا اور کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سبب بنا۔ بیمار ذہن میں شرمین نے بہت جلدی مجرم کو پکڑ لیا ویلڈن۔ سچ کا آدمی میں ڈاکٹر شیر شاہ سید نے انسانی روپ میں چھپے ایک گدھ کے کالے کرتوت عیاں کر دیے۔ کتنے بے حس اور کم ظرف ہوتے ہیں رفیق جیسے لوگ۔ عکس میں سرمد کا کردار عجیب و غریب سا لگا لیکن اس کے گھریلو حالات کا اثر شاید اس صورت میں ہوا تھا کہ وہ دوسروں کو الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ عرصہ دراز بعد ٹوٹا سلسلہ جوڑنے لگا ہوں۔“ (اور جناب ہم ٹھہرے سب کا بھرم رکھنے والے...... اب کیسے دوبارہ سلسلہ جڑنے پر کیسا لگا؟)“

✱ محمد صفدر معاویہ خانیوال سے شریکِ محفل ہیں۔ ”آپ کو نیا سال مبارک۔ خدا کرے یہ سال ہمارے ملک کے لیے ایک بہترین سال ثابت ہو، آمین۔ سالِ نو کا پہلا شمارہ 18 دسمبر کو صدر بازار سے لیا گیا، خوب صورت سرورق ہے۔ ماڈل کے تو کیا ہی کہنے۔ ہم تو اس کے سحر میں کھو گئے۔ آنکھوں میں ہلکی نمی اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔ محترم جون ایلیا کا انشائیہ قانون پڑھا۔ بجا ہے کہ جب تک بڑے لوگ قانون کی پاسداری نہیں کریں گے اس وقت تک چھوٹے طبقے کے لوگ بھی قانون ہاتھ میں لیتے رہیں گے۔ قانون سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ آپ کا اداریہ پڑھا آپ کی دعا اللہ پاک قبول فرمائے۔ ملک میں امن و امان ہو۔ آپ نے شمارہ پر ریٹ بڑھائے میں نے اداریہ میں پڑھا۔ سرورق پر تو میں دلربا کے سحر میں کھو گیا تھا بعد میں دیکھا ادھر 70 لکھا ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں بقول عزیز میاں قوال، مال اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ ویسے میں جس سے ڈائجسٹ لیتا ہوں وہ ہمیشہ پہلے پشاوری قہوہ پلاتا ہے پھر ڈائجسٹ دیتا ہے اور قیمت بھی نہیں لینا چاہتا۔ (ارے یہ تو کمال ہے۔ پھر تو آپ کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے)۔ لیکن میں اسی وقت دے کر آتا ہوں ایسے دوست قسمت سے ملتے ہیں (بے شک...... اور اچھے دوستوں کی قدر ہمیشہ اچھے دوست بن کر ہی کرنا پڑتی ہے)۔ ایمانے زارا شاہ کو سال کے شروع میں صدارت ملی، مبارک ہو۔ بہت ہی بہترین تبصرہ لکھا، آپ نے۔ انجم فاروق ساحلی، مرزا طاہر الدین بیگ، اشفاق شاہین مختصر تبصروں کے ساتھ محفل میں موجود۔ بہت ہی خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں رومی بھائی، آپ کی بات بجا ہے کہ کوئی آگے تو آئے، لگتا ہے کہ اب خود ہمیں ہی آگے بڑھنا ہوگا۔ بابر عباس فضل عباس کھٹے میٹھے تبصرے کے ساتھ محفل کا لطف بڑھا رہے ہیں۔ دوست محمد تبصرہ بیسٹ رہا۔ زاہد بھائی اللہ پاک نعم البدل ہمیشہ پہلے والی چیز سے بڑھ کر دیتا ہے۔ اللہ پاک آپ کو اولادِ نرینہ سے نوازے (آمین)۔ ڈاکٹر عبدالقدیر ویلکم۔ ریاض بٹ اینڈ محمد خواجہ کے تبصرے بہت ہی عمدہ رہے۔ خاص طور پر خواجہ صاحب کا تبصرہ دل کو لگتا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی اک دور تھا پڑھی۔ مسلمانوں کو کبھی غیروں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا آپس میں چپقلش، حکومت کی حرص اور انا نے پہنچایا۔ جنگل کا شیر بھی شکار مل بانٹ کر کھاتا ہے۔ کیا ہوتا اگر مسلمان حکمران اتحاد سے ایک ایک حصے پر حکومت کرتے رہتے۔ شکر الحمد للہ کہ ہم ایک آزاد و خود مختار ملک میں پیدا ہوئے۔ تنویر ریاض کی جواب بھی اچھی رہی۔ بروڈی نے سوسن سے کیا خوب بدلہ لیا۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ سلیم انور کی مختصر تحریر بیمار ذہن بھی اچھی رہی۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسمان کا تیسرا حصہ بھی خوب رہا۔ پروفیسر ہنری کی موت کا دکھ ہوا۔ مندر میں کوئی

بڑا گیم کھیلا جارہا ہے اس لیے تو وہاں کسی کو جانے نہیں دیا جاتا۔ اگلی قسط مزید ہنگامہ خیز ہوگی۔ (ارے واہ آپ کو تو الہام ہوتا ہے) محمد یاسر اعوان کی بھنور بھی اچھی رہی۔ کبھی کبھی ایک لمحے کی ملاقات بھی تا زندگی یاد رہتی ہے۔ مرزا امجد بیگ اس دفعہ الوکھا قسم کا کیس لائے۔ فریدیوں تو سیدھا سادہ انسان تھا پر ماں کے لیے تو ایک بھیڑیا بن گیا مگر خدا دکھاتا ہے کہ والدین کی نافرمانی کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ دولت ہونے کے باوجود سکون نہیں ہوتا۔ جن کے والدین زندہ ہیں وہ اپنی جنت دنیا میں بنالیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید سچ کا آدمی لائے۔ یہ انسانیت کے قاتل جن کے نزدیک بس پیسا ہی سب کچھ ہے ان کو کسی کے مرنے کی کیا پروا۔ مظفر سلیم ہاشمی کی امید لو دعا چودھری کو بہت سے دکھ دیکھنے کے بعد آخر کار راحت کی زندگی میسر آگئی۔ محفل شعرو سخن بھی اچھی رہی۔ ثمر عباس کی مدد بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی چاندی کا چھکن بھی اچھی تحریر تھی۔ ارباب نے ان لوگوں کی مدد کی تو خدا نے اس کی بیوی کو تحفہ بھی دلوادیا۔ حسام بٹ کی وقت بھی جاری ہے۔ (جی جناب وقت کبھی کسی کے روکے سے رکتا بھی نہیں) سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ڈیلفینا کے بجائے بینا نکلی۔ کافی سرپرائز رہا۔ ماں جی کا مسئلہ بھی حل ہوگیا نادر شاہ کا کردار مجھے تھوڑا مشکوک لگ رہا ہے کہ یہ دھوکا دے گا۔ باقی مصنف سے گزارش ہے کہ وہ پچھلے واقعات دوبارہ نہ دہرائیں کیونکہ ایسے کہانی کا حسن ختم ہوتا ہے۔ محمد الیاس کی عکس بھی بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ سرمد کا کردار بے شک تھوڑا الگ تھا، پر اچھا تھا۔ کبھی کبھی اپنوں سے دوری انسان کو ایسا بنادیتی ہے۔ رضوانہ ساجد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک خوب صورت اور دلچسپ تحریر لائیں آپ اللہ کے نبی تھے۔ حضرت یوسف کا قصہ تو ہم نے کافی بار پڑھا پر حضرت موسیٰ کے بارے میں شروع کا کوئی خاص پتا نہیں ہے اس لیے یہ تحریر میرے علم میں اضافے کا باعث بنے گی۔ بے شک اللہ قادر ہے جو دشمن کے گھر میں اپنے کلیم اللہ کو پلوار رہا ہے۔ شاکر لطیف کی سنگی بھی عمدہ رہی۔ ایڈی نے بدلہ تو خوب لینا چاہا پر ڈیوڈ ان راہوں کو جانتا تھا اس لیے وہ بچ گیا پر ایڈی موت کے منہ میں چلا گیا۔ ناہید سلطانہ اختر درماندہ لے کر آئیں۔ آپ سے ایسی تحریر کی توقع نہ تھی۔ آپ ہمیشہ سنجیدہ موضوع پر ہی لکھتی ہیں ایسی تحریر لکھنا اور مردوں کے معاشرے کے ایک ناسور زدہ پہلو پر لکھنا دل گردے کا کام ہے۔ آپ نے دوسرا انجام دیا۔ آپ کی کہانی پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ بے شک مردوں کا معاشرہ عورتوں کو ایک کھلونا سمجھتا ہے پر اس حد تک گر جانا درندہ صفت لوگوں کا کام ہے۔ بہر حال سارے مرد اس حد تک نہیں گرتے کہ رشتے کے تقدس اور حرمت کو بھول جائیں پر آپ نے بہت ہی عمدہ تحریر لکھی جو انسانوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ کترنیں بھی خاصے کی چیز ہیں۔ (اتنی تفصیلی رائے کا بے حد شکریہ۔ آپ کے خیالات مصنفین کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب ہوتے ہیں)۔''

✠ ایمانے زارا شاہ کا خط اسلام آباد سے۔ ''نئے سال کا پہلا شمارہ ہاتھ آچکا ہے۔ خلاف معمول سسپنس خود بھی جلد دستیاب ہوگیا اور اس کا ٹائٹل بھی دل موہ لینے والا ہے۔ خاص کر کرنچی آئیز..... پرچے کی قیمت بڑھنے کے متعلق آپ کا اداریہ پڑھ کر ہمیں احساس ہوا پرنٹ میڈیا کس قدر مالی زبوں حالی کا شکار ہے اور اتنے معمولی سے اضافے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر ہم واقعی محبت کرتے ہیں..... یقیناً کرتے ہی ہیں اور کرتے رہیں گے۔ (بس آپ لوگوں کی اسی محبت نے پرنٹ میڈیا کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بہت شکریہ جناب) واؤ..... خطوط میں ٹاپ پوزیشن پر اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ (ہم ایسی خوشیاں وقتاً فوقتاً آپ کو دیتے رہتے ہیں)۔ تھینک یو سو مچ..... اسب کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ رمضان پاشا کی سالانہ لسٹ میں اپنا نام نہیں ملا، ذرا سا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ نومبر تک کی کارکردگی کا احوال تھا۔ ہم نے تو سال کے آخر میں چھکا لگایا ہے۔ وقت میں اپنا لگایا کیس بالکل ہی الٹ نکلا۔ ڈیلفینا کی کیسنگ سے بینا برآمد ہوگئی۔ ڈرامائی انداز میں قسط آگے بڑھی مگر دیکھیں جی ہم تو پھر تکے لگائیں گے اور جب تک ڈیلفینا اور علی کا ٹاکرا نہیں ہوجاتا ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے اور رہی بات ''بینا'' کی تو یہ بہت پراسرار کردار بن کر سامنے آئی ہے یہ کچھ تو رنگ دکھلائے گی یہ ضرور...... (بالکل درست کہا...... یہ عورت ہے جس کے کئی روپ ہوتے ہیں) بھنور میں سیر وزی ڈمپل کو تنی ہوشیاری سے اس کے محبوب نے مکھن سے بال کی طرح نکال لیا۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لیے ہوتی ہے۔ گریبان سادگی اور حماقت کی داستان تو تھی ہی ساتھ ہی ماں جیسی ہستی کا احترام نہ کرنے والے کا عبرتناک انجام بھی تھا۔ اس کا حال اس سے بھی برا ہونا چاہیے تھا۔ (خدا کرے کوئی اللہ کا بندہ اس سے راہ راست پر آجائے)۔ سچ کا آدمی ہولناک زلزلے میں امداد سے ایسے شاطر لوگوں نے اپنے ہی کنواں نما پیٹ بھرے تھے۔ بہت اچھا لکھا لیکن ڈاکٹر شیر شاہ سید سے ایک سخت اختلاف ہے جنہوں نے ایک مخصوص علاقے کے لوگوں کو جاہل ڈیکلئر کردیا حالانکہ جس علاقے کے پس منظر میں کہانی بنی گئی وہاں تعلیم کا شعور پیک پر ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔ ذہنی افلاس کا لفظ تب استعمال کیا جاتا جب تعلیم و شعور سے نابلد لوگ ہوتے۔ (آپ کی بات سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ذہنی افلاس یعنی شعور کی غربت اور یہ ڈگری سے نہیں دور ہوتی۔ اعلیٰ ظرفی اور وسعت نظری سے دور ہوتی ہے)۔ امید لو میں مظفر سلیم ہاشمی کے لکھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ کہانی کا اینڈ بھی ان ایکسپکٹڈ رہا اور ایک بار پھر ثابت ہوا صنف نازک تب سب سے زیادہ مضبوط بن جاتی ہے جب گھر کے مردوں کے بھی حوصلے جواب دے جاتے ہیں۔ مختصر کاوشوں میں چاندی کا چھکن، عکس اور بیمار ذہن

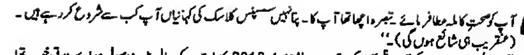


اچھی لگیں۔ سنگی میں سنگی بابا کچھ زیادہ ہی سنکا ہوا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا اگر ڈیوڈ انہی بھول بھلیوں میں کھو گیا تو۔ رنگ آسماں میں پروفیسر ہنری کی موت کے بعد کہانی نیا موڑ لے چکی ہے۔ مندر میں کون سے راز دفن ہیں جن سے مہارانی کو اتنا ڈر ہے۔ گوریوں کے بہروپ میں اریہ وزمان مجھے نہیں لگتا اپنے ارادے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ مجموعی طور پر قسط اچھی رہی۔ اب بڑھتے ہیں آخری رنگ کی طرف۔ درماندہ میں ناہید سلطانہ نے گدھوں اور درندوں کی درندگی کو قلم میں سمونے کی بہترین کوشش کی ہے۔ نامحرم رشتوں کی سفاکی تو عروج پر تھی ہی، سگے چچا۔ اتنی مذموم حرکت کی ہرگز توقع نہ تھی۔ (مان تب ہی ٹوٹتا ہے جب وہاں سے ٹوٹے جہاں سے اس کی توقع نہ ہو..... یہی اذیت انسان کو عبرت دیتی ہے)۔ بہر حال اچھا لکھا۔ چند ایک جزئیات کے علاوہ جن کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں، نمبر ایک پروین کی بہن بھی پروین کے شوہر کا شکار بنی جس سے پروین بھی باخبر تھی پھر نعیم کے ساتھ گناہ والی زندگی چہ معنی دارد۔ (اگر انسان اس پستی کا ادراک کرلے تو اتنی گھناؤنی اور گھٹیا حرکت کا مرتکب ہی نہ ہو)۔ یا تو لکھاری کو اس چیز کو مینشن کرنا چاہیے تھا کہ وہ بحالت مجبوری رو رہی تھی۔ (یہ بھی واضح بتایا ہے دیگر معاملات کو اگر یوں سمجھ لیں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں ہم ایسا سوچ سکتے ہیں)۔''

✠ محمد رفاقت کی واہ کینٹ سے آمد۔ ''جناب آپ کو اور آپ کے تمام ادارے کے افراد کو نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اس دفعہ کا رسالہ اپنی رنگینیاں لیے ہوئے حاضر خدمت ہے جسے پڑھ رہا ہوں۔ یہ رسالہ باقی رسالوں سے جلد مارکیٹ میں آجاتا ہے اور ہمیں وقت پر مل جاتا ہے اسی لیے میں اس کا فین ہوں۔ (مہربانی ہے جناب۔ آپ خوش ہم بھی خوش)۔ سسپنس خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ ہے اور اس کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ وہی لوگ تبصرے بھی کرتے ہیں جو ان کہانیوں کو باریک بینی سے پڑھتے ہیں۔ اس سے رسالے کی مقبولیت کا پتا چلتا ہے اور نئے لوگ بھی رسالے کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ (یہی ہماری محنت کا ثمر ہے)۔ اس دفعہ کی کہانیاں جن میں اک دور تھا، جواب، بیمار ذہن، بھنور، گریبان، سچ کا آدمی، امید لو، مدد، چاندی کا چھکن، عکس، سنگی..... کہانیاں بہت خوب تھیں اور سلسلے وار کہانیاں بھی اچھی جا رہی ہیں۔ خط کتابت میں بھی ایمانے زارا شاہ، فاروق انجم، مرزا طاہر الدین بیگ، اشفاق شاہین، عبدالجبار رومی بھائی، رمضان پاشا، بابر عباس، دوست محمد، اویس احمد خان، رانا بشیر احمد، زاہد احمد، محمد صفدر اور محمد خواجہ صاحب کے بھی خط خوب تھے اور اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے اور جن دوستوں نے میرے خط کو پسند کیا میں دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

✠ مرزا طاہر الدین بیگ میر پور خاص سے شامل محفل ہیں۔ ''دلی دعا ہے کہ آنے والا سال ملک پاکستان کے لیے امن، چین اور سکون کا سال ثابت ہو۔ آمین۔ مختصر تبصرہ تھا اور وہ بھی آپ نے شائع کردیا۔ بہت بہت شکریہ دعا ہے کہ خدا سسپنس والوں کو سدا شاد و آباد رکھے۔ (اللہ تعالیٰ ہمارے قارئین کو بھی شاد رکھے...آمین) عرض یہ ہے کہ شکاریات کے اوپر بھی کچھ نہ کچھ ہوجائے تو بہت عمدہ رہے گا۔ ایمانے زارا صاحبہ دوست محمد صاحب اور زاہد احمد صاحب اپنے اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ بہت ہی نمایاں نظر آئے، خدا نظر بد سے بچائے۔ آمین۔ تاریخی کہانی اک دور تھا بہت خوب رہی۔ تاریخی کہانیوں کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے اور اپنا ہی رنگ۔ مدثر عباس نے سنگی شاکر صاحب بھنور اعوان صاحب نے اچھی کہانیوں کا انتخاب کیا اور خوب کیا۔ مرزا صاحب کی گریبان پڑھ کر مرزا صاحب کو داد دینی چاہیے کہ کیسے کیسے کیس اور کس طرح کے لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔''

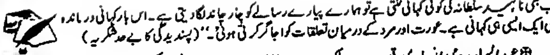
✠ بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس کھاریاں سے تبصرہ کررہے ہیں۔ ''سرجی سسپنس کا نیا شمارہ اپنی تمام تر خوب صورت حشر سامانیوں کے ساتھ رینگتا ہوا اٹھارہ دسمبر کو کسی بوڑھی محبوبہ کی طرح ملا۔ محبوبہ بھی وہ جس کی عمر 70 سے 80 سال کے قریب ہے۔ سرورق کی دل نواز حسینہ آنکھوں میں نمی لیے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگائے فل میک اپ کیے شاید ساجن کا انتظار کررہی ہے۔ سرورق کے ایک طرف جگ مگ کرتا ہوا 70 کا ہندسہ ہمارا منہ چڑا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کہہ رہا تھا کرلو جو کرنا ہے ارے او بھیا سسپنس بھی ہم نے بھلا کیا کرنا ہے کرنا تو تم نے ہی ہے جو چاہے کرلو۔ بے شک اپنی قیمت سو روپے کرلو ہم تو تمہارے دیوانے ہیں (سسپنس سے محبت میں ثابت قدمی دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ شکریہ)۔ بے شک آپ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کی قیمت سو روپے بھی کردیں تو ہم نے لینا ہی لینا ہے سرجی اس میں کوئی شک والی بات نہیں۔ میں محفل کا سینئر ترین قاری ہوں۔ میں نے سسپنس اور جاسوسی اس وقت لینا شروع کیا تھا جب ان کی قیمت ڈیڑھ روپیہ تھی اور آج 2018ء میں اس کی قیمت 70 روپے ہے۔ سرجی! قیمت تو آپ نے بڑھادی اب کچھ ریلیف قارئین کو بھی دیں۔ آپ سسپنس اور جاسوسی کے صفحات بے شک زیادہ نہ کریں کم از کم خطوط کی محفل اور چینی نکتہ چینی کے صرف دو صفحات بڑھادیں، مہربانی ہوگی۔ محفل میں داخل ہوا تو سب سے پہلے 500 واٹ کا انرجی سیور لے کر اپنا خط ڈھونڈا۔ بڑی تلاش بسیار کے بعد ساتویں نمبر پر اپنے خط کو موجود پایا۔ اس بار کرسی صدارت کی حق دار ایمانے زارا آف آزاد کشمیر ٹھہریں۔ سرورق کی لڑکی کو ٹھنڈ اس لیے نہیں لگ رہی کیونکہ اس نے گرمیوں کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اشفاق شاہین صاحب جون ایلیا مرحوم کے انشائیے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے دماغ چاہیے، آپ بادام کھایا کریں۔ رمضان پاشا صاحب اللہ تعالیٰ



آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تبصرہ اچھا تھا آپ کا۔ پتا نہیں سسپنس کلاسک کی کہانیاں آپ کب سے شروع کر رہے ہیں۔ (عنقریب ہی شائع ہوں گی)۔''

⁎ ادریس احمد خان کی آمد ناظم آباد کراچی سے۔ ''جنوری 2018ء کا ماہنامہ بلکہ سال نامہ موصول ہوا۔ سرورق خوب تھا ذاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ چنیدہ چنیدہ کہانیوں نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ ہماری طرف سے سب ہی دوستوں کو نئے سال کی بہت بہت مبارکباد۔ عرض ہے وطن عزیز کو اللہ تعالیٰ ساری دنیا کی خوشیوں سے نوازے اور عشروں سے جاری بے چینی، انتشار، دہشت گردی اور مسائل کے انبار سے سرخروئی عطا فرمائے اور پاکستان کے دشمنوں کا منہ کالا ہو۔ 2018ء امن و امان کا سال ہو مسلمانانِ عالم کو اللہ ہر ظلمتوں کے سائے سے بچائے۔ نیا سال رحمتوں کے دروازے کھول دے آمین ثم آمین۔ انشائیہ بھی حسب حال تھا۔ اندرونی صفحات پر اداریے سے مستفید ہوئے۔ ناموں کی فہرست میں ایمانے زارا شاہ نظر آرہی تھیں۔ پرانے دوست زیادہ محفل میں حاضر تھے اور اپنے اپنے خیالات سے نواز رہے تھے۔ تاریخی کہانی اک دور تھا ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ سے روشناس کرا رہے تھے بہت اچھے انداز میں لکھتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو اس دور میں محسوس کرتا ہے۔ تنویر ریاض کی جواب اثر پذیری لیے ہوئے تھی۔ بیمار ذہن میں سارجنٹ نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے مجرم کو بے نقاب کر دیا۔ اے آر راجپوت کی کہانی بہت کامیابی سے جاری ہے۔ رنگ آسماں میں سارے رنگ شامل ہیں۔ امید ہے اختتام بھی اچھے انداز میں ہوگا۔ بھنور بھی اچھی لگی۔ سچ کا آدمی اور امید تو بھی متاثر کن کہانیاں تھیں۔ اشعار نے بھی کافی محظوظ کیا۔ ثمر عباس کی مدد بھی بہتر کہانی تھی۔ چاندی کا چکن بھی اثر انگیز تھی جس میں ارباب نے جذبات سے کام نہ لیتے ہوئے انسانیت پر زیادہ زور دیا۔ اس کے بعد وقت نے معروف کر دیا۔ عکس میں بھی دلچسپی رہی۔ حضرت موسیٰؑ کے حالات و واقعات بھی دلوں میں روشنی بڑھانے والی تحریر ہے۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں بہت خوب صورت تھیں۔''

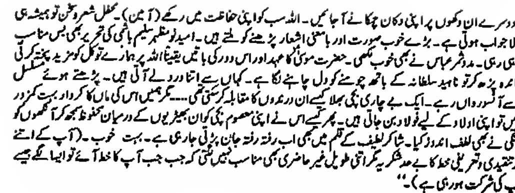
⁎ ریاض بٹ، حسن ابدال سے۔ ''2018ء کا پہلا شمارہ (جنوری) بیس تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ نئے سال کی مبارکباد دیتی محسوس ہوئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ زندگی کا پیغام دے رہی ہے...... جون ایلیا اس بار قانون کے متعلق لکھ رہے ہیں...... قانون سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے لیکن بات وہی ہے جو جون ایلیا صاحب کہہ رہے ہیں کہ جب تک قانون کے محافظ اور اس کو بنانے والے اس کا احترام نہیں کریں گے، قانون کی یہ بے توقیری جاری رہے گی۔ اس کے بعد پہنچے اپنے خطوط کی محفل میں۔ اس بار ایمانے زارا شاہ نے کرسیِ صدارت حاصل کر لی۔ ویل ڈن۔ اچھے لفظوں کی مالا بُن کر یہ تبصرہ لکھا گیا جس کے لیے تبصرہ نگار مبارکباد اور داد کی مستحق ہیں۔ مرزا طاہر الدین بیگ صاحب، بہت مختصر تبصرہ ہے۔ ذرا کھل کر لکھیں۔ اشفاق شاہین بھائی آپ نے بھی حسب معمول خوب لکھا۔ عبدالجبار رومی انصاری ملکہ ترنم نور جہاں کے شہر سے تشریف لائے ہیں۔ آپ کا تبصرہ اور شعر پسند آیا۔ اسی طرح محفل کی شان بڑھاتے رہیے گا کیونکہ یہ پرچہ اس بات کا حقدار ہے۔ رمضان پاشا بھائی، خدائے بزرگ و برتر آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین اور آپ دوبارہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ بابر عباس، فضل عباس آپ نے جن لکھاریوں کے نام لیے ہیں، وہ لکھنے میں یکتا تھے۔ ایسے ایسے شاہکار سلسلے اور کہانیاں انہوں نے لکھی تھیں کہ ہم آج بھی ان کی کہانیاں پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں بے تحاشا یاد آتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی اک دور تھا نے ہمیں ماضی کے جھروکوں میں لے جا کر بہت لطف دیا۔ یہ کہانی بھی بھرپور تھی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ تنویر ریاض کی جواب بھی لاجواب تحریر ہے۔ بیمار ذہن سلیم انور کی ایک ذہانت سے پُر تحریر ہے۔ وقت کے ہیر پھیر کی وجہ سے آخر اصل مجرم پکڑا گیا۔ سارجنٹ ولسن نے نائٹ کلرک کو دبوچ ہی لیا۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسماں کا تیسرا رنگ بھی اچھا لگا۔ کہانی میں کافی تیزی آگئی ہے۔ اب دیکھتے ہیں...... کالی دیوی کے مندر میں کیا ہوتا ہے۔ محمد یاسر اعوان نے اس بار کمال کی کہانی لکھی ہے۔ بھنور ایک انوکھے ماحول کی کہانی ہے...... آخر تک سسپنس برقرار رہا۔ حقیقت کے قریب کہانی نے بڑا مزہ دیا۔ قدردان نے بھی اپنا کمال دکھایا اور آخر میں اداسیوں کو سمیٹ لیا۔ اب باری آئی ہے، مرزا امجد بیگ کی کہانی گریبان کی۔ اس بار کہانی منفرد اور انوکھی ہے۔ فرید کا کردار بلکہ ایسے لوگ دنیا میں مل جاتے ہیں جو اپنی حماقتوں کی وجہ سے عیار لوگوں کا تر نوالہ ثابت ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ تو بیگ صاحب نے اس کو بچا دیا تھا لیکن دوسری بار وہ مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکا کیونکہ اس نے اپنی ماں جیسی عظیم ہستی کے ساتھ کئی بار ناروا بلکہ وحشیانہ سلوک کیا تھا...... آخر میں لکھا شعر بھی حسب حال ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید بھی اس بار حسب معمول بڑی دل گداز پُراثر تحریر سچ کا آدمی لے کر آئے...... یہ بالکل حقیقی کرداروں پر مبنی تحریر ہے...... بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔ رفیق بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا فین ہوں کیونکہ وہ ہمیں ایسی تحریریں پڑھنے کو دیتے ہیں۔ امید تو مظہر سلیم ہاشمی کی پل پل رنگ بدلتی ایک اچھی تحریر ہے...... دعا کا کردار بھی خوب ہے جس نے خود زخم کھا کر دوسروں کے لیے مرہم کا کام کیا۔ انجام بھی اچھا ہے۔ چاندی کا چکن ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے کہنہ مشق قلم کا شاہکار ہے...... جس نے آنکھوں کو غم کے آنسو بھی دیے اور آخر میں خوشی کے آنسو بھی...... ایسی تحریریں سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں...... آخری صفحات پر



جب بھی ناہید سلطانہ کی کوئی کہانی لگتی ہے تو ہمارے پیارے رسالے کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس بار کہانی درماندہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان تعلقات کو اجاگر کرتی ہوئی۔'' (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

⁎ عبدالجبار رومی انصاری، قصور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''خوب صورت دوشیزہ کی آنکھیں نم ہیں اور ہونٹوں پہ مسکان ہے۔ دوپٹا بے دھیانی میں بس سر پر ہی رکھا ہوا ہے۔ خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات لیے حسینہ یوں ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے کہ بس میں نے سمجھ لیا ہے زمانے کو مجھے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ ہاں جون ایلیا کو ضرور سمجھنے کی کوشش کرو۔ یقیناً وہ آپ کے بھلے کے لیے ہی اتنی قیمتی باتیں بتلاتے ہیں اور قانون کو بھی تم لوگوں نے زندہ رکھنا ہے ورنہ حکمران تو اپنے مفاد کے لیے اس میں تبدیلی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ باقی ملکی حالات کے نشیب و فراز تو سامنے ہی ہیں ہاں کچھ امید ہو چلی ہے کہ آئندہ سال میں تبدیلی ضرور آئے گی۔ (جی ضرور...... 2017ء کی جگہ 2018ء ہو جائے گا اور بس) لیکن اس کے لیے بھی پاکستان کی بھولی بھالی عوام کو ووٹوں کے معاملے میں ذرا مختلف ہونا پڑے گا۔ ایمانے زارا شاہ نے عمدہ تبصرے میں بہترین تبصرہ کیا۔ رمضان پاشا کے خط نے واقعی بہت لطف دیا بہت عمدہ۔ بابر عباس، فضل عباس کی قلقاریاں بھی زبردست رہیں اور جناب ساتھ میں انصاری آج سے نہیں شروع سے ہی لگا ہوا ہے، کمال ہے آپ کی اب نظر پڑی۔ دوست محمد، زاہد احمد، محمد صفدر معاویہ اور محمد خواجہ کے بھرپور تبصرے ایک دم زبردست رہے۔ باقی ریاض بٹ، رانا بشیر احمد ایاز اور یس احمد خان اور محمد رفاقت کے تبصرے بھی بے مثال رہے۔ فرعون نے جس بچے کے ڈر سے بچوں کا قتل عام کروایا وہی بچہ اللہ کی حکمت سے اس کے محل میں پروان چڑھنے لگا۔ اس پیارے بچے نے ہی فرعون کی جھوٹی خدائی کو شیر خواری میں ہی عاجز کر دیا۔ بہترین اور سبق آموز قصہ جو روح میں ایمان کی تازگی بھر دے۔ سائمن صرف جیک کی لاش اٹھانے میں ہی مجرم بن گیا اور سیروزی کو اس کے دوست نے بچا لیا۔ محمد یاسر اعوان کی تحریر دلچسپ رہی۔ تاریخی کہانی اک دور تھا زبردست رہی کیسا دور ہوگا جب شورشوں کو کچلنے کے لیے بادشاہ فیروز شاہ دہلی سے دیپالپور ملتان اور سندھ میں ٹھٹھہ تک جا پہنچا تھا۔ ہاتھیوں گھوڑوں پر اور پیدل اتنے لمبے لمبے سفر اور پھر مہینے سالوں گزر جاتے ایسی بادشاہیوں میں بھی سازشیں بھی بہت ہوا کرتی تھیں اور جیسے عروج ملتا ویسے زوال بھی آ جاتا۔ درماندہ میں میرن کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ نازک اندام لڑکی ڈرانے دھمکانے سے زیادتی کا شکار ہوتی رہی۔ وہ مردوں کے معاشرے میں مایوس تو تھی ہی لیکن زندگی سے ہمت نہیں ہاری۔ اخبار میں بیان دے کر سب کو بے نقاب کیا۔ وہ درماندہ تو کی گئی تھی لیکن وہ حق پر تھی اور پھر جن لوگوں نے زیادتی کی تھی وہ بھی عبرت انگیز مکافاتِ عمل کا شکار ہوئے۔ وقت میں علی کی توجہ دیسی حسینہ کے بجائے دیسی حسینہ بینا نے ہی چونکا دیا اور پھر سارا وقت بینا کی رفاقت میں اور عظیم برو سے صلاح مشورے میں گزر گیا لیکن دو موٹر سائیکل سواروں نے گاڑی میں لگتا ہے ماں جی کو نشانے پر رکھ لیا ہے۔ رنگ آسماں میں ہنری کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ جان سے گیا۔ رینا کو جانے کیسے اس سازش اور قتل کرنے کی بھنک پڑ گئی۔ یہ اب کالی کے مندر میں جا کر ہی عقدہ کھلے گا۔ زمان اور اریبہ کی بارش میں ہم رکابی خوب رہی۔ عمدہ کہانی۔ محفل شعر و سخن سے عالیہ خان، ناہید یوسف اور جاوید اختر رانا کے شعر عمدہ رہے۔ (خوب صورت تبصرے کا بے حد شکریہ)۔''

⁎ شاہانہ سلطان کی تشریف آوری جامع کلاتھ کراچی سے۔ ''میں اگرچہ سسپنس سے دوستی ایک لمبے عرصے سے نبھا رہی ہوں گرچند ایک بار خط لکھ سکی۔ وجہ وہی ہے زندگی کی بے پناہ مصروفیات لیکن ان مصروفیات کے باوجود ہم نے سسپنس سے رابطہ برقرار رکھا ہوا ہے۔ (جناب بہت شکریہ سسپنس دوستی کا)۔ سب سے پہلے تو خطوط کی محفل پر نظر ڈالتی ہوں۔ اب تو بہت سنجیدگی چھائی رہتی ہے محفل پر حالانکہ پہلے بہت زیادہ شور شرابا رہتا تھا۔ کسی کے طنز نے کسی کا دل چھلنی کر دیا تو کسی کے مذاق نے کسی کے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دی۔ زندگی بھی تو اسی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے۔ (بالکل بجا فرمایا آپ نے...... جو لوگ اس دھوپ چھاؤں کو سمجھ لیتے ہیں وہی کامیاب زندگی گزارتے ہیں)۔ اک دور تھا ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پڑھی۔ ویسے تو آپ کی ہر تحریر میں بڑی گہرائی ہوتی ہے اور بالخصوص تاریخی ادوار کا احاطہ بہت مضبوط حوالوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس بار بھی محمد تغلق اور فیروز شاہ کی بادشاہت اور اسی طرح کے دیگر معاملات کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ تنویر ریاض کی مغربی کہانیوں کا مزہ بھی الگ لطف دیتا ہے جیسے اس بار جواب نے لاجواب کر دیا۔ سلیم انور اگرچہ بہت چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور اس بار بھی بیمار ذہن مختصر کہانی لے کر آئے۔ انتہائی اختصار سے کہانی مکمل کر دی۔ ویلڈن جناب۔ رنگ آسماں اے آر راجپوت کی بہترین کاوش ہے جو اب رفتہ رفتہ اپنے رنگ بکھیرتی جا رہی ہے۔ پہلے تو لگا کوئی تاریخی کہانی ہوگی مگر اب اس کے دیگر پہلو بھی سامنے آتے جا رہے ہیں۔ بہت دلچسپ لگنے لگی ہے۔ گریبان مرزا امجد بیگ کا ایک اور کامیاب مقدمہ اور اس کی جیت کی روداد۔ ایک بات بتائیے ہر بار کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے، کبھی شکست سے بھی دوچار ہوئے کہ نہیں۔ کبھی کچھ ایسا بھی تو کیس لکھ بھیجیے (ارے جناب یہ بتائیے کہ کبھی آپ امتحان میں فیل ہوئیں...... تو کیا ڈھول لے کر لوگوں کو بتایا کہ میں فیل ہو گئی...... بھلا کوئی اپنی کمزوری بھی کسی پر آشکار کر سکتا ہے...... تو پھر وکیل صاحب کیسے کوئی ہارا ہوا مقدمہ ہم سے شیئر کر سکتے ہیں...... سمجھا کریں نا)۔ سچ کا آدمی ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک اور دل دکھانے والی تحریر لے کر حاضر ہوئے۔ سچ ہے کسی کا دکھ کسی کا کاروبار بن جائے تو یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ جانے ہم خود اس کی لپیٹ میں آ جائیں اور



دوسرے ان دکھوں پر اپنی دکان چمکانے آ جائیں۔ اللہ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے (آمین)۔ محفل شعر و سخن تو ہمیشہ ہی لاجواب ہوتی ہے۔ بڑے خوب صورت اور بامعنی اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ امید و منظر سلیم ہاشمی کی تحریر بھی بس مناسب ہی رہی۔ مدثر عباس نے بھی خوب لکھی۔ حضرت موسیٰ کا عہد اور اس دور کی باتیں یقیناً اللہ پر ہمارے توکل کو مزید پختہ کرتی ہیں۔ درماندہ پڑھ کر تو ناہید سلطانہ کے ہاتھ چومنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ کہاں سے اتنا درد لے آتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے مسلسل آنکھوں سے آنسو رواں رہے۔ ایک بے چاری بچی بھلا کیسے ان درندوں کا مقابلہ کرسکتی تھی.... مگر ہمیں اس کی ماں کا کردار بہت کمزور لگا..... مائیں تو اپنی اولاد کے لیے فولاد بن جاتی ہیں۔ پھر کیسے اس نے اپنی معصوم بچی کو ان بھیڑیوں کے درمیان محفوظ سمجھ کر آنکھوں کو بند کرلیا۔ سنگی نے بھی لطف اندوز کیا۔ شاکر لطیف کے قلم میں بھی اب رفتہ رفتہ جان پڑتی جا رہی ہے۔ بہت خوب۔ (آپ کے اتنے تفصیلی اور تنقیدی و تعریفی خط کا بے حد شکریہ مگر اتنی طویل غیر حاضری بھی مناسب نہیں تھی کہ جب جب آپ کا خط آئے تو ایسا لگے جیسے پہلی بار آپ کی شرکت ہورہی ہے)۔‘‘

٭ ناہید یوسف اسلام آباد سے شریک محفل ہیں۔ ’’اس دفعہ تو جناب ذاکر صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ بھئی انہوں نے ہمیں کہاں دیکھ لیا جو اتنا پرفیکٹ ٹائٹل بنا ڈالا۔ شکر ہے ہمارے میاں صاحب کی نظر نہیں پڑی، ورنہ پوچھتے کہ تم نے اپنی تصویر ٹائٹل کے لیے کیوں دی۔ خیر ایسا تو ہوتا ہے۔ بعض دفعہ خیالی پرواز انسان کو حقیقت تک پہنچا دیتی ہے۔ یعنی خیال حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔ چلیں اب چلتے ہیں رسالے کی طرف۔ اتنے دنوں تک محفل میں غیر حاضری پر معذرت خواہ ہیں۔ گھر کے جھمیلوں میں فرصت ہی نہ ملی کہ محفل میں حاضری دیتے۔ اس ماہ کا سسپنس بہترین کہانیوں سے مزین تھا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ اس سے آگے بڑھے اور فہرست پر نگاہ دوڑائی۔ پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی اک دور تھا پڑھی۔ زبردست تحریر تھی۔ ساجد صاحب نے تاریخ سے آگاہی فراہم کی۔ پھر ناہید سلطانہ کی درماندہ میں مہرن کے ساتھ پیش آنے والے واقعات نے دل دہلا دیا۔ مہرن ہمیں بے قصور لگی۔ قصوروار معاشرے کے وہ لوگ تھے جنہیں نہ رشتوں کا پاس تھا نہ ہی کسی اور چیز کا۔ ایسے لوگ عورت کو بس کھلونا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عزت بے عزتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مگر جب ان کی پکڑ ہوتی ہے تو پھر انہیں احساس ہوتا ہے مگر تب تک وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا سلسلہ ہم شوق سے پڑھ رہے ہیں جو ایمان کی تازگی کا سبب ہے۔ پھر آئے ہم حسام بٹ کی وقت کی طرف۔ کہانی میں لفاظی زیادہ ہے۔ اگر جملوں کی طوالت اور غیر ضروری باتوں کے اظہار کو کم کر دیا جائے تو امید ہے کہ کہانی کا ٹیمپو تیز ہو جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر، چاندی کا چکن پُراثر تحریر تھی۔ بھٹی صاحب نے کہانی جلدی میں ختم کر دی۔ کہانی بہت عمدہ تھی اور مزید صفحات بڑھائے جاسکتے تھے خیر یہ تو رائٹر کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کہانی کا اینڈ کیسے کرتا ہے۔ بیمار ذہن بھی بہتر کہانی تھی۔ رنگ آسماں خوب جارہی ہے۔ ہنری کو سانپ نے ڈس لیا اور ادھر رینا اپنے باپ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ کہانی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے ویلڈن اے آر راجپوت صاحب۔ کہانی کا ٹیمپو سلومت کیجیے گا پلیز۔ ہم کہانی اسی وجہ سے شوق سے پڑھتے ہیں کہ کہانی میں ٹیمپو تیز ہے۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لیے ہوتی ہے۔ گریبان میں ماں جیسی ہستی کا احترام نہ کرنے والے کا قدرت کے ہاتھوں عبرتناک انجام ہوا۔ انتہائی سبق آموز کہانی تھی۔ اس کا حال اس سے بھی بدتر ہوتا تو کم تھا۔ والدین کی عزت ہم پر فرض ہے۔ جو لوگ والدین کے ساتھ بہتر سلوک نہیں کرتے وہ دین و دنیا دونوں میں ناکام ہوں گے۔ یہ حقیقت تمام لوگوں کو سمجھنی چاہیے۔ جن لوگوں کے والدین حیات ہیں انہیں ان کے ساتھ بہتر سلوک رکھنا چاہیے اور ان کی خدمت کر کے جنت کمانی چاہیے۔ اللہ پاک ہم سب کو نیک ہدایت دے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی سچ کا آدمی زبردست کہانی تھی، ایسے لوگوں کی جن کی لالچ و ہوس ہی ختم نہیں ہوتی۔ ایسے ہولناک زلزلے میں بھی لوگ خدمت کرنے کے بجائے اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے ہوئے تھے۔ امید و منظر سلیم ہاشمی کی اچھی کہانی تھی۔ عکس بس ٹھیک لگی۔ مجموعی طور پر سسپنس شاندار تھا۔ نئے سال کا مزہ دوبالا کر گیا۔ خاص کر محفل شعر و سخن زبردست رہی۔ ہماری طرف سے تمام لوگوں کو نیا سال مبارک۔ دعا ہے یہ سال تمام عالم اسلام کے لیے خوشیوں کا گہوارہ ثابت ہو۔‘‘ (سسپنس کے لیے وقت نکالنے کا بے حد شکریہ)۔

٭ گلشن اقبال کراچی سے کرن عمران کی شرکت۔ ’’تمام اہلِ محفل اور سسپنس کے قارئین و اسٹاف کو ہماری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں ہم پر اپنا خاص کرم فرمائے (آمین)۔ ناہید سلطانہ کی کہانی درماندہ اس بار سب سے پہلے پڑھی۔ بہت سے سوالات نے سر اٹھایا اور بہت ساری کڑوی حقیقت جان کر دل کو بہت دکھ بھی ہوا۔ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ ایک معمولی سا ان پڑھ جاہل اور کمزور سا انسان اتنا طاقتور کیسے ہوگیا کہ بار بار عورتوں کی عصمت کا دشمن بن کر فتح پالیتا ہے۔ یہ پہلو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ مہرن کا کمزور کردار اور اس ظالم دنیا کی سنگدلی نے خون کے آنسو رلا دیا۔ کس کس طرح اسے ذہنی اذیت دی گئی۔ دنیا میں اب خون کے رشتوں پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مہرن کے سگے چچا نے بھی جو گناہ کیا اس سے بڑھ کر انسان اور کیا سوچ سکتا ہے۔ وقت حسام بٹ کے ہاتھوں میں اس بار محض ایک کھلونا سا محسوس ہوا۔ کہانی ایک ہی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہے۔ حسام بٹ صاحب پلیز کہانی میں کچھ ہلچل لائیں۔ اس طرح اگر ٹھہری رہی تو کہیں ٹھہر ہی نہ جائے۔ اس میں بھاشن زیادہ ہوتے ہیں اور واقعات بہت کم۔ پلیز اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جبکہ رنگ آسماں نے اب رنگ جما لیا ہے۔ دیکھیے آگے چل کر کیا رخ اختیار کرتی ہے کہانی۔ اک دور تھا ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی نے بھی مزہ دوبالا کر دیا۔ سسپنس کی یہی تو خوبی ہے کہ اس میں ہر طرح کا فلیور مل جاتا ہے۔ (ظاہر ہے پاکستانی عوام چٹ پٹے کھانوں کی دیوانی ہے تو تھوڑا مرچ مسالا تو ڈالنا پڑتا ہے نا بھئی)۔ محمد یاسر اعوان کی کہانی بھنور نے بھی ٹائم پاس ہونے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ ایک ہی نشست میں ہلکی انتہائی تیز رفتاری سے کہانی مکمل کی تو احساس ہوا ’’ہیں..... ابھی تو شروع کی تھی ابھی ختم۔‘‘ (اوہ..... ویری گڈ) شاکر لطیف کی کہانی سنگی بھی اچھی لگی۔ محمد الیاس کی تحریر عکس بس گزارے لائق تھی۔ چاندی کا چکن نے ایک دوسرے کی محبت کے احساس کو اجاگر کیا۔ تنویر ریاض کی کہانی جواب اور سلیم انور کی تحریر بیمار ذہن نے بھی لطف اندوز کیا اور جناب سچ کا آدمی نے تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اگلی بار کوشش کریں گے کہ مکمل رسالہ پڑھ کر تبصرہ لکھا جائے۔ (ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تبصرہ ہو یا بات چیت، مکمل ہی اچھی رہتی ہے۔ ہم انتظار کریں گے)۔‘‘

٭ طلعت مسعود کا نامہ دبئی سے۔ ’’نئے سال کے پہلے شمارے کے ساتھ ہم بھی نئی امیدوں کے ساتھ سسپنس کی محفل میں حاضر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایک بار یہ کوشش تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ ٹائٹل والی خاتون ٹاپ لڑکی پر نئے سال کی آمد کے باوجود شاید ابھی دسمبر کے اثرات ہیں اس لیے ملکۂ جذبات بننے کی کوشش کر رہی ہے اور اسی وجہ سے متاثر نہ کر سکی اور ہم نے انشائیہ میں جاکر جون ایلیا مرحوم کا قانون کی بے بسی پر نوحہ پڑھا جو آج بھی اتنا ہی حسب حال ہے جتنا پہلے تھا۔ اداریہ میں ملکی حالات کے بارے میں پڑھ کر دعا ہے کہ اللہ پاک اس نئے سال کو امن و سلامتی کا پیغام بنائے۔ آمین۔ خطوط کی محفل کی سرداری... ایلانے زارا شاہ کے حصے میں آئی۔ ایک مہینے کی صدارت مبارک ہو۔ خوب صورت لفظوں سے بھرپور اور جامع تبصرہ پہلی پوزیشن کا حق دار تھا۔ بابر عباس پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتے نظر آئے۔ اس کے علاوہ دوست محمد، ریاض بٹ، زاہد احمد، رمضان پاشا، محمد خواجہ کے خطوط بھی محفل کا نامہ رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے وقت کی طرف بڑھے۔ پچھلی دو تین قسطوں سے کہانی ٹھہری سی گئی تھی، اب تیزی آتی نظر آرہی ہے۔ لگتا ہے اب علی کو امریکا جانے سے پہلے کچھ ہنگاموں سے گزرنا پڑے گا۔ اگلی قسط میں مزید حالات کا پتا چلے گا۔ رنگ آسمان کے تیسرے حصے میں کہانی کافی آگے بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ رینا جتنی تیزی سے شوکی کی طرف بڑھی ہے، اس پر حیرانی بھی ہوئی کہ بہت تیز رفتار محبت رہی۔ آخری صفحات پر سینئر رائٹر ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی درماندہ، مقدس رشتوں کی پامالی کی داستان۔ بے شک ایسے کئی گھناؤنے اور نفسیاتی مریض معاشرے میں موجود ہیں جو ان مقدس رشتوں کے نام پر دھبا ہیں لیکن ایک دو پوائنٹس پر جیسے مہرن کے ساتھ چچا کی بدسلوکی کے بعد مہرن کے والدین کو اس شخص کو بدستور گھر میں رکھ کر پھر شادی کروا کر رخصت کرنا عجیب لگا حالانکہ ایسے شخص کو تو اسی وقت سزا ملنی چاہیے۔ گو کہ آخر میں یہ سب کردار اپنے انجام کو پہنچے جس کے وہ حقدار تھے۔ ایک تلخ تحریر اور ایسے لوگ معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہیں۔ ان کا سدباب اسی وقت ممکن ہے جب لوگوں کو ہر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ’’سچ کا آدمی‘‘ میں اکتوبر کے زلزلے کے پس منظر میں ڈاکٹر شیر شاہ سید ان بے حس لوگوں کا ذکر کرتے نظر آئے جن کا مطمح نظر صرف دولت ہوتی ہے۔ وہ انسانی المیوں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ’’عکس‘‘ اچھی لگی کبھی کبھی چھوٹی باتیں زندگی کا انداز بدل دیتی ہیں۔ ’’سنگی‘‘ بہت اچھی لگی۔ انا اور کینہ انسان کو اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا اختتام غیر متوقع اور چونکا دینے والا تھا۔ ’’امید نو‘‘ میں دس سے ایک تک گنتی میں، دس میں جہاں ناامیدی ہی تھی وہ ایک تک آتے ہی نئی امید میں بدل گئی۔ نئے سال پر نئی امیدیں جگاتی تحریر اچھی لگی لیکن یہ امید بھی اسی وقت نظر آتی ہے جب مشکل حالات میں اپنے راستے خود کھولے جائیں جیسا کہ دعا نے کیا۔ چاندی کا چکن، دوسرے کی بھلائی سوچنے والے کو صلہ مل ہی جاتا ہے چاہے جس صورت میں بھی ملے۔ ’’بھنور‘‘ اچھی رہی جبکہ ’’جواب‘‘ زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ طوالت کہانی کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ کم ہوتی تو شاید بہتر ہوتی۔ انبیائے کرام کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر دوبارہ واقعات تازہ ہوئے۔ بیگ صاحب کی کہانی ’’گریبان‘‘ کا سارا نچوڑ آخر میں دیے گئے شعر میں پنہاں ہے کہ مکافات عمل یہی ہے اور والدین کے ساتھ برا سلوک رکھنے والے کا انجام دنیا ہی میں اسے مل گیا۔ تاریخی کہانی ’’اک دور تھا‘‘ سلطنت دلی کے دور ابتری، امراء کی سازشوں اور خاندان تغلق کے زوال کی داستان۔ ویسے ایک بات سمجھ نہیں آتی یہ سارے بادشاہ پہلے تو اچھے ہوتے ہیں لیکن اقتدار ملتے ہی سب ایک جیسے ہی نکلتے ہیں (بالکل درست کہا..... یہ تخت شاہی ہوتا ہی ایسا ہے کہ بیٹھتے ہی طاقت کا نشہ ہو جاتا ہے) اور ان کہانیوں سے آج کے دور کی بھی بہت مماثلت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ’’سسپنس کلاسک‘‘ کا بھی شدت سے انتظار ہے۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

ریحانہ ناز اشرف، کراچی۔ خالدہ شمیم، ملتان۔ لائبہ منیر، کوئٹہ۔ اقبال احمد، کراچی۔ نازیہ رحیم، سکھر۔ فرحانہ نعیم، سرگودھا۔ شاہین اختر، منڈی والا یار۔

ہٹ دھرم

عاصی اختر

اللہ اس کائنات کا نظام ایک اصول کے تحت چلا رہا ہے۔ انہی میں ایک نکتہ ہے خاندان کا بنانا اور اس کا ایک سربراہ ہونا۔ اب چاہے خاندانی ہوں یا مملکتی امور... اس سربراہ کی عقل و شعور اور طاقت کے محتاج ہوتے ہیں مگر جہاں اس اصول کے منافی عمل ہوتا ہے اس کا نتیجہ بھی منافقت بھرا نکلتا ہے جیسے کہ تاتاری قوم کی بادشاہت کا یہ رخ... جس میں عورتوں کی ہٹ دھرمی نے اس طاقتور قوم کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ تاریخ نے یوں تو ہر عہد میں خواتین کے کردار کو اجاگر کیا ہے مگر اس قوم میں سازشوں نے عروج کو ایسا زوال دیا کہ تاتاری عہد محض ایک خواب بن کر رہ گیا۔ جن کے قدموں کی دھمک سے زمین لرزتی تھی اور دنیا دہشت زدہ تھی اسی قوم کی عورتوں کی ضد نے اس دہشت کو مٹی میں ملادیا۔ وحشی منگول دنیا میں تو اپنا آپ منواگئے مگر اپنی عورتوں سے ہار گئے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



"ان کے پہیوں سے "لنگ لنگ" کی آواز آتی ہے۔ ان کے گھوڑے "سیاؤ سیاؤ" کہہ کے ہنہناتے ہیں۔ جن کی لگامیں تھامے، تیر کمان سنبھالے، سوار چلے آتے ہیں۔
جانے والے نوجوانوں کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ گویا انہیں روکنے کے لیے۔"
عہد تانگ کے ایک چینی شاعر نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور چلّا اٹھا۔
ان کی عورتیں بھی بے پروا اور جاندار تھیں۔ وہ چکن کے کاڑھے ہوئے ریشم کے ملبوسات پہنتیں اور ان کی بے شمار اولاد ہوتی۔ شادی شدہ عورتیں اپنے لیے زیادہ خوب صورت گاڑیاں بنواتیں۔ جب کسی پڑاؤ پر یہ خیمے نصب کرتے تو پہلی بیوی کا خیمہ امیر کے مغرب میں نصب کیا جاتا جبکہ باقیوں کے خیمے تھوڑے فاصلے پر مشرق کی طرف لگائے جاتے۔ جس علاقے میں یہ رہتے اس کی زمین بالکل ہموار ہوتی۔ اس لیے وہ گاڑیوں اور ٹھیلوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتے۔ یہ لوگ بہت آہستہ آہستہ سفر کرتے۔ بیل یا بچھڑے کی سی رفتار کے ساتھ۔
عورتیں بھی گھوڑوں پر مردوں کی طرح پیر پھیلا کر بیٹھتیں اور بیٹھتے وقت اپنے لبادے پر گہرے نیلے رنگ کے کمربند اور سینے پر ایک رومال باندھ لیتی تھیں۔ بیوی کو خریدنا پڑتا اور اگر کوئی لڑکی بکنے سے رہ جائے تو وہ تمام عمر کنواری رہ کر گزار دیتی۔ ان کے قبائل کی عورتوں کے خاوند اگر مارے جاتے تو وہ دوبارہ شادی نہیں کرتی تھیں کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ جس عورت نے اس دنیا میں ایک مرد کی خدمت کی، اگر وہ دوسری شادی نہیں کرے گی تو مرنے کے بعد بھی وہ اسی کی ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی رواج تھا کہ بیٹا اپنی سگی ماں کے علاوہ اپنے باپ کی دوسری ساری بیواؤں سے شادی کرسکتا تھا۔
عورتیں گاڑیاں اور چھکڑے ہنکاتیں۔ جانوروں پر بوجھ لادتیں، گایوں کا دودھ دوہتیں، مکھن بناتیں۔ چمڑے کو جوتا سازی، جرابوں اور دیگر کاموں کے لیے تیار کرتیں۔ چمڑے کے ریشوں کے دھاگے بنانا بھی انہی کا کام تھا۔ دوسرے کپڑوں اور خیموں کے لیے اونی کپڑے بناتیں مگر اپنے کپڑے کبھی نہیں دھوتیں کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ کپڑے دھونے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ جب دوران مسافرت طوفان آتا تو تمام اجنبیوں کو خیمے سے نکال باہر کرتیں اور کالا سمور اوڑھ لیتیں۔

اور ان کے مرد خانہ بدوشوں کی طرح الگ الگ رہتے۔ ان کی جسمانی ساخت کو اگر دیکھا جائے تو ان کے اوپر کے دھڑ لانبے ہوتے جن پر وہ سردی سے بچنے کے لیے تیل ملتے اور ان کے چھوٹے پیر گھوڑوں پر سوار ہونے کی وجہ سے خمیدہ ہوجاتے۔ ان کے حواس جانوروں کی طرح تیز ہوتے۔ رات کو ان کی آنکھیں تاریکی میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھیں۔ ہر سوار کے پیچھے ایک نیزہ یا ایک لمبی سی خمیدہ تلوار تنگ لٹک رہی ہوتی۔ اس کی بائیں جانب یا کلہاڑی ہوتی یا جانوروں کے سینگوں سے مضبوط کی ہوئی کمان اور بائیں جانب ترکش ہوتا۔ موقع ملتے ہی وہ تیزی سے ترکش سے تیر نکالتا اور چلا دیتا کہ اس کے باپ دادا بھی شکاری تھے۔
وہ بھی شکار کرنے کے سارے طور طریقے جانتا تھا۔ اسے کھال اور گوشت کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ شکار کیے جانوروں کی آنتیں تک کھا جاتا اور خون پی لیتا تھا۔ ایسا وہ اپنی فطرت کے مطابق کرتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ کچا گوشت کھانے سے اس کے جسم میں اتنی توانائی آجاتی ہے جس سے وہ سخت سردی برداشت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس کا گھر اس کا خیمہ تھا۔ شہد کی مکھیوں کی طرح جانوروں سے اتاری اون کو پہلے تیل میں اچھی طرح بھگویا جاتا یا اس پر گھوڑی کے دودھ کی تہیں جمائی جاتیں تاکہ سردیوں کی روک ہوسکے۔ چھت کے درمیان دھواں نکالنے کے لیے ایک سوراخ رکھا جاتا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے خیمے کے اندر کا حصہ کالا ہوجاتا۔
تاتاریوں کا اپنا کوئی شہر نہیں تھا۔ وہ اپنے مستقبل سے بھی آگاہ نہیں تھے لیکن ہر سردار کو اپنی چراگاہوں کا علم ضرور ہوتا اور اسے معلوم ہوتا کہ اپنے مویشیوں کو سردیوں اور گرمیوں میں کہاں کہاں چرانا ہے۔ گرمیوں میں وہ جنوب کے گرم میدانوں میں آجاتے۔ ان چراگاہوں میں جاڑوں میں پانی نہیں ہوتا اور زمین پر برف جم جاتی تھی۔ ان کے خیمے جن میں وہ سوتے تھے، سفید اون کے بنے ہوتے۔ یہ خیمے چھکڑوں اور گاڑیوں پر نصب کیے جاتے تھے۔ ان گاڑیوں اور چھکڑوں کے دونوں پہیوں کا درمیانی فاصلہ بیس فٹ کا ہوتا اور بائیس بیل ایک گاڑی کو کھینچ کر لے جاتے۔ گھر کا ساز و سامان اور خزانہ یہ لوگ اونچی گاڑیوں پر لے جاتے تھے، جنہیں اونٹ کھینچتے۔ اس طرح یہ لوگ ندیاں پار کر جاتے تھے۔
میدانی علاقوں میں جب یہ خیمے زمین پر نصب کرتے

تو ان کا رخ ہمیشہ جنوب کی طرف ہوتا تھا۔ جب خیمہ نصب کیا جاتا تو مالک کا بستر دروازے کے مقابل لگایا جاتا تھا۔ مالک کے سرہانے اون کی ایک پتلی لٹکائی جاتی تھی جسے مالک کا بھائی کہا جاتا تھا۔ جب یہ لوگ شراب پینے کے لیے اکٹھے ہوتے تو پہلے کچھ شراب یا دودھ اس پتلی پر چھڑکتے پھر ایک نوکر خیمے کے باہر جا کر ایک پیالے سے تین بار زمین پر جنوب کی طرف اس شراب یا دودھ کے چھینٹے پھینکتا۔ یہ ان کی طرف سے آگ کو نذر ہوتی تھی۔ اس کے مشرق کی طرف چھینٹے اڑائے جاتے جو ہوا کو نذر ہوتے پھر شمال کی طرف اسی طرح مردوں کو نذر چڑھائی جاتی تھی، تب وہ شراب کا پیالہ آقا اور اس کی بیوی کو دیتا جو بستر پر بیٹھے اس کے منتظر ہوتے۔
اگر مالک کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں تو اس کے ساتھ وہ بیوی بیٹھتی جس کے ساتھ اس نے گزشتہ رات گزاری ہوتی اور دوسری بیویاں اس کے خیمے میں آکر شراب پیتیں۔ اس دن مالک کو جو تحفے ملتے وہ اس بیوی کے صندوقوں میں رکھے جاتے۔ بڑی دعوتوں میں مہمان تالیاں بجاتے اور ناچتے۔ مرد مالک کے آگے اور عورتیں گھر کی مالکہ کے سامنے ناچتی اور تالیاں بجاتی تھیں۔
مرد تیر کمان اور زین بناتے۔ خیمے اور گاڑیاں بناتے۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے اور گھوڑیوں کا دودھ دوہتے تھے۔ جاڑوں میں یہ لوگ چمڑے کے دو لبادے پہنتے تھے۔ ایک میں بالوں کا رخ اندر ہوتا۔ دوسرے لباس میں بالوں کا رخ باہر کو ہوتا تھا۔ ان کے پاجامے بھی چمڑے کے ہوتے تھے۔ اکثر وہ اپنے کپڑوں میں ریشم کی جھالر لگاتے جو ہلکی نرم اور گرم ہوتی۔ پہاڑی بھیڑوں کے سینگوں سے وہ شراب پینے کے لیے گہری گہری پیالیاں بناتے تھے۔ یہ تاتاری بڑے ہی مشاق شکاری تھے۔ جب کوئی بیمار ہوتا تو اس کے خیمے پر نشان لگا دیا جاتا کہ کوئی اندر نہ جائے۔ اس کے اپنے نوکر کے سوا کوئی اس وقت اس کے خیمے میں نہیں جاتا۔ جب بڑے امیر بیمار ہوتے تو کچھ کچھ فاصلے پر چوکیدار کھڑے کر دیے جاتے تاکہ کوئی قریب نہ آنے پائے۔ ان کو اس بات کا ڈر ہوتا کہ اجنبیوں کے ساتھ کہیں گندی روحیں یا بری ہوائیں خیمے کے اندر نہ چلی جائیں۔ وہ اپنے جادوگروں یا نجومیوں کو پجاری سمجھتے تھے۔
ان کا یہ بھی یقین تھا کہ چار دیواری میں ترقی یافتہ قوموں کی طرح رہنے سے آدمی نرم اور کمزور ہوجاتا ہے، صرف غلامی کے کام کا رہ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خانہ بدوشی میں انسان مضبوط رہتا ہے۔ اس میں قوتِ برداشت زیادہ ہوتی ہے اور وہ خود حکومت کرنے کے قابل رہتا ہے۔ اس زمانے میں خانہ بدوشوں کے قبائل کے سب سے طاقتور قبیلے کو ترک کہتے تھے۔ چینی شاعر لی تائی پو نے اس لو وار دکا نام سرحدی رکھا اور لکھا ہے کہ ساری عمر یہ سرحد کا رہنے والا کتاب کھول کے نہیں دیکھتا لیکن اسے شکار کھیلنا آتا تھا۔ جب کمان کھینچتا تو نشانہ خطا نہیں کرتا۔ جب وہ میدان میں گھوڑا دوڑاتا... تو سیٹی بجا کر اپنے شہباز کو بلاتا۔ وہ اڑتا ہوا اس کے سیدھے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ ریگستان اس کی شجاعت اور بہادری کا گواہ تھا۔
ترکوں کا سردار جسے وہ خاقان کہتے اپنا خیمہ مشرق میں نکلتے سورج کے رخ پر نصب کرتا۔ اس کے خیمے کے آگے جو جھنڈا نصب ہوتا، اس پر بھیڑیے کے سر کا نشان نصب ہوتا جو کہ سونے سے بنا ہوتا اور اس کے نگہبان بھیڑیے کہلاتے۔ خاقان ایک چھوٹا موٹا بادشاہ بھی ہوتا۔ وہ اپنے قبیلے کے ہر شخص کو زمین کا ایک حصہ بانٹ دیتا تھا۔ اس کی طاقت کا نشان ایک تیر ہوتا جس کی نوک سونے کی ہوتی جس پر اس کی مہر کندہ ہوتی۔ ترکوں نے جب خشک ہوتے ہوئے دشت سے ہجرت شروع کی تو ان کے وحشی قبیلے جدھر سینگ سمائے گھس گئے۔ ہر ایک نے اپنے لیے الگ الگ منزل تلاش کی۔ ستاروں کی راہنمائی میں انہوں نے گوبی کا ریگ زار پار کیا اور جنوب میں ایک پہاڑی سلسلے کی طرف بڑھے۔ صرف کمزور قبیلوں نے مشرقی راستے سے چین کی طرف رخ کیا۔ وحشی اور سخت کوش کافر ترک قبیلے جنوب کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ وہ برفانی پہاڑوں کی حد سے نکل کر سمرقند کی طویل وادی میں جا نکلے اور آہستہ آہستہ ایشیا کے پار شمال کو جانے والی چراگاہوں تک جا پہنچے۔ دشت کے دروازے پر پہنچ کر انہیں پانچ شہروں کے تمدن سے واسطہ پڑا اور یہ ان پانچ شہروں میں آ کر آباد ہوگئے۔ یہاں انہوں نے کاشتکاری شروع کی اور قدیم حروف تہجی میں اپنی زبان لکھنی شروع کی پھر وہ آریاؤں کی باقیات کے ساتھ خلط ملط ہوگئے۔ آہستہ آہستہ اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے بٹے ہوئے خاندان ایک جگہ یکجا ہونے لگے۔ ان میں سے جنگجو برسر اقتدار آگئے جو اپنے آپ کو ترکان کہلانے لگے۔ چراگاہوں کے جنگجو سردار ایک دوسرے سے دور دور رہتے۔ مسلح ساتھیوں کے سہارے وہ اپنے گلوں کی حفاظت کرتے۔ جو ان میں سے زیادہ دولت مند اور

طاقتور ہوجاتے، وہ دشت کے امیر کبیر بن جاتے اور ”نویان“ کا لقب اختیار کرتے۔

اب معاشرے کی وحدت ایک پورے قبیلے کی شکل میں ڈھل چکی تھی اور ایک خاندان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ امیر خاندان گھوڑوں کے بڑے بڑے گلوں کے سہارے بہت سے مسلح شہ سواروں کو ملازم رکھ سکتے اور خیمہ گاہ میں نیچے درجے کے کام کاج کے لیے غلام رکھنے لگے تھے۔ کمزور خاندانوں کو نکال باہر کیا جاتا تاکہ وہ امیروں کے علاقے میں افراتفری اور بغاوت نہ بپا کرسکیں۔

شمالی چراگاہوں میں لوگ الگ الگ ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ جھیل بیکال کے جنوب مشرق میں دریائے اونان اور کیرولان کے درمیان کی چراگاہوں میں مقامی جنگی سرداروں میں کسی نہ کسی کی ملازمت میں رہتے، ان کو سرحدی جرنل منتشر رکھتے پھر انہوں نے اپنے قریب کے جنگجو قبیلے کو تنخواہوں پر رکھنا شروع کردیا جن کے ذریعے وہ.... شہزادوں پر لگاتار حملہ کراتے رہتے۔ یہ لوگ اس قدر کمزور تھے کہ محض غلے کپڑے اور لوہے کے ہتھیاروں کے عوض ان کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ایسے ہی ایک کمزور خاندان میں جب ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کی مٹھی میں خون کا ایک لوتھڑا تھا۔ یہ چنگیز خاں تھا، اس وقت اس کی قوم ایک ہزار خاندانوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھری ہوئی تھی۔ اس کا اپنا قبیلہ جو ”کیات“ کہلاتا تھا، اس کے خاندان کو برادری سے خارج کیا جاچکا تھا۔ جب وہ اتنا بڑا ہوگیا کہ خود شکار کرسکے تو اس کی والدہ نے اسے سمجھایا۔

”ہماری پرچھائیوں کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمارا ساتھ دے سکے۔ کوئی ہمارا دوست نہیں، گھوڑے کی دم کے سوا ہمارے پاس کوڑا تک نہیں.....!“

جب وہ پیدا ہوا تو اس کے باپ نے اس کا نام ”تموجین“ رکھا۔ بعد کے کئی سالوں تک وہ تموجین رہا پھر لوگوں نے اسے چنگیز خاں کہنا شروع کردیا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے باپ کو دشمنوں نے زہر دے کر مار ڈالا۔ جب بڑا ہوا تو اتفاق سے اس کے آس پاس کی تمدنی طاقتیں کمزور ہوچکی تھیں۔ اس نے اپنے جبر اور وحشت سے ان کو لرزہ براندام کردیا۔ وہ ایک معمولی سا وحشی تھا جو چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی اپنے آبائی دشت سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کی خداداد صلاحیت اور بے انتہا قوتِ ارادی نے اسے پوری دنیا پر قابض کردیا۔

اس کی قوتِ ارادی کا مقصد محض ایک تھا۔ ہر طرح کی مخالفت کا سامنا اور اس کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرنا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اسے اندھی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھنا ہوگا۔ اسے خود ہی اپنی تیمارداری اور علاج کرنا ہوگا کہ دشت میں ڈاکٹر اور طبیبوں کا گزر نہیں ہوتا۔

چنگیز خاں کی والدہ کسی اور قبیلے کی تھی اور جنگ میں قید ہوکر آئی تھی۔ اس کے باپ لیسوکائی کو کسی نے زہر دے دیا تھا۔ جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کی والدہ نے بچوں کو کسی نہ کسی طرح پال کر زندہ رکھا۔ چنگیز خاں جب بڑا ہوا تو اس کی شادی بورتائی سے کروی گئی جو اپنے جہیز میں چنگیز خاں کے لیے ایک سمور کا کوٹ لائی جو چنگیز خاں کو دیا گیا۔ بورتائی کو تاتار حملہ کرکے پکڑ کر لے گئے، جب دوبارہ اسے چنگیز خاں نے حاصل کیا تو وہ اپنے ساتھ ایک ناجائز بیٹا بھی لے کر آئی جسے چنگیز خاں نے اپنا سب سے بڑا بیٹا بنا کر پالا۔ چنگیز خاں نے دشت میں شکار کو اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شکار کرنے کی ایک ٹولی بنا رکھی تھی۔ انہوں نے اخوت اور ہمیشہ مل کر رہنے کے لیے کیرولان کے چشمے کا پانی پیا اور ایک دوسرے کی رگ سے خون پی کر باہمی اخوت کے وعدے کیے۔ ایک جنگ میں چنگیز خاں کو بھی زخم آ گیا تھا اور اس کی گردن پر خون کی پپڑی سی جم گئی تھی، اس کے ساتھیوں نے اس پپڑی سے خون پی کر چنگیز خاں کے ساتھ یکجہتی کی قسم اٹھائی تھی۔

چنگیز خاں کے چار بیٹے ہوئے جن میں سب سے بڑا جوچی تھا، جسے بورتائی دوسرے قبیلے سے لائی تھی، باقی بیٹوں میں چغتائی، اوغدائی اور تولوئی تھے۔ وہ جنگ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کے بعد بورتائی اور اپنے بیٹوں کے علاوہ کسی پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ چنگیز خاں کے ساتھی انتہائی بہادر، قوی اور مضبوط اعضا کے مالک تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی تعریف میں اکثر گیت گایا کرتا تھا کہ:

”وہ شکاری کتے ہیں اور انسانوں کا گوشت ان کی خوراک ہے۔

چنگیز انہیں لوہے کی لگاموں سے تھامے ہے۔

ان کے سر تانبے کی طرح سخت ہیں۔ ان کے دانت چٹانوں کو کاٹ سکتے ہیں۔ ان کے دل فولاد کے ہیں۔

شبنم ان کی شراب ہے اور جدھر وہ سوار ہوکر نکلتے ہیں ہوائیں ان کی رفتار کو اور بھی تیز کردیتی ہیں.....!“

☆☆☆

توراکینہ اسی چنگیز خاں کی بہو اور اس کے تیسرے بیٹے اوغدائی کی بیوی تھی۔ چنگیز خاں کے فوجی غولوں کی صورت میں حملے کرتے اور آنکھ جھپکنے میں دشمن کی فوجوں کو تہس نہس کرکے فتوحات سمیٹتے، آگے نکل جاتے تھے۔ اب وہ نہ صرف خونخوار جانوروں کی طرح دہشت ہی نہیں پھیلاتے تھے بلکہ انہوں نے اپنی حکمتِ عملی سے خوارزم شاہی ترکوں کی عسکری طاقت کو بھی ختم کردیا تھا۔ سلجوق ترکوں، قپچاق اور روسی جنگجوؤں کو شکست دے دی تھی۔ اب ان کے سارے غول ایک قومی فوج میں منظم ہوچکے تھے۔ کن کی لڑائیوں اور مغربی حملوں کے مقابلے میں یہ دستے راتوں کو نمودار ہوتے اور کھڑی کمانوں سے آہنی نوک کے تیر برساتے۔ خوارزم شاہ کے ساتھ جنگ میں انہوں نے جی کھول کر دہشت گردی کی۔ وہ فصیل بند شہروں کی پوری آبادی کو باہر نکالتے۔ ان میں کاریگروں کو جو ان کے کام آسکتے، احتیاط سے چن کر الگ کرلیتے پھر باقی ماندہ بے بس انسانوں کے ہجوم میں گھس کر اپنی تلواروں اور کلہاڑیوں سے اس طرح قتل عام کرتے، جیسے کسان پکی ہوئی فصل کاٹتے ہیں۔ آہ و بکا کرتی عورتوں کو ان کے بال پکڑ کر بے دردی سے آگے جھکا دیتے تاکہ آسانی سے ان کی ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگا کر اسے توڑا جاسکے۔ جو مرد ذرا سی مزاحمت کرتے ان کے سر توڑ ڈالتے۔ 1227ء میں جب چنگیز خاں کا انتقال ہوا اور اسے قبر میں ڈال کر کچی مٹی کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے دبا دیا گیا۔ ان کے رواج کے مطابق اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تولوئی اب اس کا وارث تھا۔ تولوئی کی بیوی سیورقوقطنی بیگی بڑی بہادر اور ذہین عورت تھی۔ وہ ترک نسل کے کرائت قبیلے سے تھی۔ دشت کی دوسری عورتوں کے مقابلے میں وہ غیر معمولی قوتِ برداشت کی مالک تھی۔ وہ بے حد حسین، ذکی المزاج اور خطرے میں اپنی حفاظت کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ بیرونی قوتوں کے مسلسل دھاوں کی وجہ سے تولوئی کا بیشتر وقت گھوڑے کی زین پر گزرتا اور وہ اس کی ہم رکاب رہتی تھی۔ سیورقوقطنی جانتی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ ہی دنیا میں عزت اور نیک مقام پاتے ہیں۔ اس لیے اس نے اپنے بیٹے قبلائی کو بڑی جرأت سے قدم اٹھا کر لکھنا پڑھنا سکھایا۔

اس کے مقابلے میں اوغدائی خوش طبع اور بلانوش تھا۔ جب چنگیز خاں کا تاج و تخت تولوئی کو نہ مل سکا تو اس کی بیوی کو یہ ناگوار گزرا کیونکہ تخت تولوئی کا حق تھا توراکینہ، اوغدائی کی پہلی بیوی تھی۔ وہ بڑی وحشی عورت تھی جو گلا پھاڑ پھاڑ کر باتیں کرتی تھی۔ وہ بھاری بھرکم، رعب داب والی عورت تھی۔ اوغدائی کی بیوی بننے سے پہلے وہ ایک مرکیت سردار کی بیوی تھی جسے لڑائی کرکے اوغدائی نے اپنے لیے حاصل کرلیا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں میں سونے کے موٹے موٹے کڑے ہوتے تھے جن کی وجہ سے اس کے بازو اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ وہ ہمیشہ سرداروں والی ٹوپی پہنتی اور اپنی وضع قطع مردانہ رکھتی۔ اپنے سر پر خوب صورت پروں کی کلغی رکھا کرتی تھی۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ وہ صرف اوغدائی کو ہی حسین نظر آتی تھی۔ اوغدائی اس کی ہر ضد پوری کرتا مگر اس کی ضدوں کی انتہا نہ ہوتی تھی۔

چنگیز خاں کو مرے ہوئے چالیس روز گزر گئے، اس کی موت پر بلائی گئی قرولتائی (مجلس مشاورت) میں اگلے خاقان کو منتخب کرنے کی تیاریاں ناکام ہوتی نظر آئیں کیونکہ نئے خاقان کے چناؤ میں بے شمار دشواریاں اور سازشیں حائل تھیں۔ ادھر توراکینہ اپنے سازشی ذہن کے ساتھ قرولتائی کے ارکان میں پھوٹ ڈال کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ اپنی سازشوں میں مصروف تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اوغدائی کو نیا خاقان چن لیا جائے حالانکہ اس ناچاقی اور اس افراتفری کا ادراک چنگیز خاں کو پہلے سے تھا۔ اس لیے اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے چاروں بیٹوں کو اپنی زندگی میں نئی سلطنت کی ہر ہر چیز تقسیم کردی تھی جو بورتائی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے ذہن میں خانہ بدوشوں کا سا دولت کا تصور تھا۔ اس نے ہر وہ چیز جو اسے پسند آئی، چاروں میں بانٹ دی۔ خدمت کے لیے آدمی، آدمیوں کے لیے خوراک، ان میں بانٹے گئے جانور اور ان کے لیے زرخیز زمینیں۔ فصیل بند شہر، شہروں کی صنعتیں اور شہروں کا سارا مال و متاع سب کچھ حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کے پاس اپنی زیر قبضہ سلطنتوں کے نقشے نہیں تھے۔ اس لیے اس بوڑھے.... نے ایک ایک لڑکے کے حصے میں کچھ قبیلے دے دیے۔ ان کے ساتھ دریاؤں کی وسیع وادیاں، کوہستانوں کے سلسلے جو دشت سے باہر پھیلے ہوئے تھے، اس نے اپنے زیر نگیں ہر شے کو بانٹ دیا تھا لیکن اپنی فوج تولوئی کے سپرد کردی کیونکہ فوج کی ساری ہمدردیاں تولوئی کے ساتھ تھیں۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ اس قدر فتوحات حاصل کرنے کے بعد اب اس کا خاندان مرتبے میں تمام دوسرے خانہ بدوش خاندانوں

سے زیادہ بلند تھا۔ اس کا یہ خاندان آلتین الوک یا خاندان زریں کہلانے لگا تھا جس میں اس کے بیٹے، پوتے، عزیز واقارب اور ان کی بیویوں کی اولادیں شامل تھیں۔ یہ سب تقسیم کرنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''خاندان زریں کا سرتاج وہ شخص ہوگا جو زریں خاں کے خاکی نمدے کی مسند پر بیٹھے گا۔ وہ خان بن کر بیٹھے گا اور سب پر حکومت کرے گا۔ وہ خود دشت میں رہے گا لیکن سارے بنی نوع انسان پر اس کی حکومت ہوگی۔''

چنگیز خاں کی یہی وصیت تو راکینہ کے ذہن میں فتور مچائے ہوئے تھی کہ سارے بنی نوع انسان پر چنگیز خاں کے بعد اس کا شوہر اوغدائی حکمران بن کر بیٹھے۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے سازشیں بننا شروع کردی تھیں۔ جب چالیس روز اسی تذبذب میں گزر گئے تو ایک بار پھر قرولتائی (مجلس مشاورت) کے منعقد ہونے کے مباحث گونجنے لگے اور چنگیز خاں کے پرانے مشیر۔ یلیے لیو چت سائی نے تولوئی سے کہا۔

''کل آٹھویں چاند کی بائیسویں تاریخ ہے اور یہ تاریخ نئے خاقان کو نامزد کرنے کے لیے بڑا مبارک دن ہے......!''

تولوئی نے اس کی بات سن کر خاموشی سے سر ہلا یا۔

کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''کوئی خاقان بننے کو تیار نہیں، ایک دن اور انتظار کر لینے دو......!''

''کل کے بعد پھر کوئی دن مبارک نہ ہوگا۔'' بوڑھے مشیر نے جواب دیا۔

دوسرے دن صبح کو قرولتائی کا پھر اجلاس شروع ہوا اور یلیے لیو چت سائی نے چغتائی کو ڈھونڈ نکالا جو پریشانی کے عالم میں پھر رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کے کان میں کہا۔

''شہزادے! اب تم ہی اولاد اکبر ہو لیکن تم بھی خاقان کی رعایا ہو۔ اگر تم سب سے پہلے منتخب ہونے والے خاقان کے آگے سر نہ جھکاؤ گے تو پھر اور کون سر جھکائے گا۔''

یہ ایک قانونی مسئلہ تھا جو قبائل کے اپنے قوانین کا حصہ تھا اور اسی کے ذریعے کسی دوسرے کو قائل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ اسے لے کر اوغدائی کے پاس پہنچا تو اس کا سارا تذبذب اور پریشانی جاتی رہی۔

قرولتائی کے قریب جا کر چغتائی اونچی آواز میں بولا۔

''یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ والد نے خود یہ حکم صادر کیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد اوغدائی تخت نشین ہوگا......!''

شامیانے میں جہاں قرولتائی ہو رہی تھی اور بحث و مباحثہ زوروں پر تھا، چغتائی کی بات سن کر سب خاموش ہوگئے اور وہ لوگ جو تولوئی اور فوج کے حق میں تھے اور دوسرے لوگ جو چغتائی اور قبائلی قانون کے حق میں تھے، سب ٹکٹکی باندھے چنگیز خاں کے بیٹوں کو دیکھنے لگے۔ انہیں حیرت میں دیکھتا چھوڑ کر چغتائی نے اوغدائی کا سیدھا بازو پکڑا۔ اسی وقت تولوئی بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے یہ کہتے ہوئے اوغدائی کا بایاں بازو پکڑا۔

''چل رے بیل......!''

اوغدائی جو ریچھ کی طرح وزنی اور بھاری جثے کا مالک تھا، وہ اٹھنا نہ چاہتا تھا کہ اس کا ایک چچا مجمعے سے نکل کر آیا اور اس کی کمر پکڑ کر اسے اٹھایا اور تینوں اسے لے کر زریں خاں کے بھورے چمڑے کی مسند پر لے گئے۔ اسے زبردستی مسند پر بٹھایا۔ چغتائی نے اپنی ٹوپی اتاری۔ اپنی پیٹی ڈھیلی کر کے کاندھے پر ڈال لی اور تین بار اوغدائی کے آگے دوزانو ہوا۔ اس نے اپنی کرخت آواز میں تینوں بار پکارا۔

''اوغدائی! اب تم خاقان ہو......!''

یہ سن کر قصبات اور قبیلوں کے سرداروں نے بھی اپنی اپنی ٹوپیاں اور پیٹیاں اتار دیں اور نئے خاقان کے سامنے سر جھکا دیا۔ تولوئی نے جلدی سے شراب کا ایک جام بھرا اور اسے اپنے بھائی کی خدمت میں پیش کیا جو نیا خاقان منتخب ہو چکا تھا۔ اب وہ آلتین الوک، خاندان زریں، دشت کے امیر سرداروں اور.... قبیلوں، آنجہانی خاقان چنگیز خاں کی ذاتی فوج وسمور کے خیموں میں رہنے والی ساری مخلوق کا آقا بن چکا تھا۔

اوغدائی نے بے تکلفی سے شراب پینی شروع کی۔ تولوئی نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر پھر اپنے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اے میرے خاقان! سب تیرے آگے گردن جھکا رہے ہیں اور اپنے گلے اور گردنوں میں تیری غلامی کا طوق پہنے ہوئے ہیں......!''

قرولتائی ختم ہوئی تو سیکڑوں کی تعداد میں جو لوگ وہاں کھڑے تھے، انہوں نے اوغدائی کے خاقان ہونے کا نعرہ لگایا۔ ایک دربان باہر گیا اور ایک جام سے چاروں طرف شراب چھلکائی۔ جب اوغدائی جاودائی آسمان کے سامنے دوزانو ہونے کے لیے خیمے سے باہر نکلا تو ہزاروں لوگ جو باہر کھڑے تھے، انہوں نے اوغدائی کے حق میں نعرے لگائے۔ ان میں چنگیز خاں کے مشیر یلیے لیو چت سائی اور رروادار محمد یلواج بھی شامل تھے۔ پڑاؤ نے اوغدائی

کی اطاعت کی قسمیں کھائیں۔

یلیے لیو چت سائی کی عقل مندی سے چنگیز خاں کے خاندان میں پھوٹ پڑتے پڑتے رہ گئی اور خاقان کا انتخاب ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے جھگڑے کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ تخت کی حفاظت کے لیے تینوں بھائی یک جان رہیں گے۔

اوغدائی کے خاقان بننے کی خبر توراکینہ نے بھی سن لی تھی۔ وہ مارے غرور کے اور بھی پھول گئی تھی کیونکہ اب وہ چنگیز خاں کی سلطنت کی بغیر کسی اور کی شراکت کے ملکہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

تین ہی تو عورتیں تھیں چنگیز خاں کے خاندان میں جو اپنے اپنے وقتوں میں پورے خاندان کے مردوں پر حاوی رہیں۔ ان میں اوغدائی کی بیوی توراکینہ، دوسری تولوئی کی بیوی سیورقوتغتی اور تیسری عورت اوغدائی کے بیٹے تویوق کی بیوی اوغول غائمش شامل تھی۔ جب تک چنگیز خاں زندہ رہا اس وقت تک اس کی بیوی بورتائی اپنے خاندان کے سیاہ و سفید کی مالک رہی۔ اس کی ہر بات مانی گئی کیونکہ اس وقت سلطنت کی باگ ڈور سفاک چنگیز خاں کے ہاتھ میں تھی۔

صرف ایک بار معمولی سا اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب چنگیز خاں نے اپنے بیٹوں سے مستقبل کی بات کی۔

''اپنے خون کے عزیزوں کو تباہ کرنا، گھر کے چولہے کی آگ بجھانا ہے۔ میں تم میں سے ہر ایک کو ایک قوم کا بادشاہ بناتا ہوں لیکن تم میں سے ایک ہے جو سب پر حکومت کرے گا اور تم سب اس کی اس طرح اطاعت کرنا جیسے تم میری اطاعت کرتے ہو......!''

جب اس کے تین بیٹوں نے یہ محسوس کیا کہ چنگیز خاں کا زیادہ رجحان جوچی کی طرف ہے جو ان کا بڑا بھائی اور چنگیز خاں جسے اپنا بڑا بیٹا سمجھتا تھا، ان کو لوگوں نے وہ سب بتایا تھا، جب ان کی والدہ بورتائی کو ایک جھڑپ کے دوران مخالف قبیلہ پکڑ کر لے گیا تھا اور جب چنگیز خاں نے اسے دوبارہ حاصل کیا تو وہ ماں بننے والی تھی اور اس نے راستے میں جوچی کو جنم دیا تھا۔ چنگیز خاں کے پاس واپس آکر اس نے کبھی اس بات کو نہیں دہرایا اور جوچی کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے بیٹوں میں کوئی فرق نہ سمجھا۔ جب جائداد اور سلطنتیں دینے کا وقت آیا تو باقی بیٹوں نے دیکھا کہ جوچی کے ساتھ ان کا باپ ان سے بڑھ کر سلوک کر رہا ہے۔ انہوں نے سنا کہ جوچی ''اولوس'' کا مختار ہوگا تو انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا خون مرکیت ہے۔ وہ ہماری برابری کس طرح کرسکتا ہے۔''

چنگیز خاں نے خاموشی سے اس بات کو سنا تو ایک بوڑھے... نے جو چغتائی کا مشیر تھا، ان کو جواب دیا۔

''ابھی تم تینوں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور ہر ''اولوس'' خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ جب دشمن تمہاری ماں کو پکڑ کر لے گئے۔ اس کے بعد سے اب تک تمہاری ماں محنت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ یہ سلطنت پیدا ہوئی۔ اس نے تم سب کو یہ سمجھ کر پرورش کی کہ تم بڑے ہو کر آدمی بنو گے۔ وہ سورج کی طرح روشن اور گہرے سمندر کی طرح مضبوط تھی۔ تم ایسی خاتون کے متعلق ایسے الفاظ کیسے نکال سکتے ہو......!''

جوچی کو بھی اپنی حیثیت کے بارے میں علم تھا اس لیے جب چنگیز خاں نے اسے مغرب کے دشت کے بعید ترین علاقوں کی حکومت سپرد کی تو وہ...... چنگیز خاں کے پاس زیادہ نہ ٹھہرا جو اس کا باپ نہ تھا۔ وہ شاہی لشکر سے نکل کر دشت کو چل دیا۔ ویسے بھی خانہ بدوشوں میں یہ بات بری نہ جانی جاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی آوارہ ہوجاتی تو وہ ان کے نزدیک کوئی ایسی شرمناک بات نہیں ہوتی تھی کیونکہ دشت میں رہنے والے عشق و محبت میں تجربہ کار عورت کو بزدل لڑکی پر ترجیح دیتے تھے۔ خانہ بدوش عورت جب شادی کر لیتی تھی تب بھی اسے بھٹکے ہوئے مردوں اور خاص طور پر چالاک شامانوں (جادوگروں) سے ہوشیار رہنا پڑتا تھا جو اس پر محبت کا جادو کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی دشمن قبیلہ اسے پکڑ کر لے جاتا اور وہ کسی اور کی ملکیت بن جاتی اور نئے شوہر کے بچوں کی ماں بنتی تھی یہاں تک کہ اس کا پہلا شوہر اسے دشمن کی قید سے چھڑا لے یا کوئی اور حملہ آور اسے پکڑ کر کہیں اور لے جائے۔ ان کے ہاں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہ ہوتی، جب تک کوئی انہیں شادی کے لیے خرید کر نہ لے جائے یا بھگا نہ لے جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے لمبے لمبے بالوں کی چوٹی گوندھ سکتی تھیں۔ ماتھے پر سے بال مونڈ سکتیں، پھولوں کا گلدستہ پہن سکتی تھیں اور اگر شوہر امیر ہو تو سونے کا گہنا پہن سکتی تھیں۔ یہ شوہر ان کے اپنے رشتے داروں سے نہیں ہوتا تھا۔ دشت کا قانون تھا کہ شادی قبیلے سے باہر کرنی چاہیے۔ اس لیے دلہنیں اپنے اور دور نزدیک قبیلے چھوڑ کے اجنبیوں کے قبیلے میں بچوں کی ماں بنتی اور بچوں کو پالتی تھیں۔

ہمیشہ سے خانہ بدوش خیمہ گاہوں میں مردوں کے

ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے حسین لڑکیوں کو مردوں سے اپنی حفاظت آپ کرنی پڑتی تھی یا پھر مردوں سے شادی کرنا پڑتی تھی۔ اس عہد کی عورتوں کو گلوں کی حفاظت کے لیے اپنے مردوں کی طرح دن بھر میں ستر ستر میل سواری کرنا پڑتی۔ وہ تیروں سے بھیڑیوں کا شکار کھیلتیں اور میدان جنگ میں مردوں کے ہمراہ شامل ہوتیں۔ وہ جانوروں کی آنتوں کو سکھا کر تانت بناتیں۔ نمک ڈال کر چمڑوں کو سکھاتیں۔ دودھ کو چمڑے کے تھیلوں میں ہلا ہلا کر جما دیتیں۔ گوبر جمع کر کے اُپلے بناتیں اور انہیں سکھاتی تھیں۔ سفر کے دوران سوکھا ہوا گوشت زین کے نیچے رکھ دیتیں تاکہ گھوڑے کی پیٹھ کی گرمی سے اور ہچکولوں سے نرم ہوجائے۔ کھانا کھانے کے لیے سوکھے دودھ کے ٹکڑے پانی کی تھیلی میں ڈال دیے جاتے اور گھوڑے کی رفتار سے یہ پانی میں گھل جاتے۔ یہ ایسے موقعوں پر کیے جاتے جب سواروں کو نیچے اتر کر کھانا پکانے کی مہلت نہ ہو۔ ان خانہ بدوشوں کا یہ رواج تھا کہ جب میاں مرجاتا تو پہلی بیوی پر اس قدر ذمے داری آن پڑتی کہ اسے ماتم کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ اب وہ گھر کی مالک بن جاتی اور گھر کے کاروبار کی ذمے داریوں کو بھی اسے سنبھالنا پڑتا تھا۔ اگر شوہر کا کوئی جوان بیٹا ہو تو وہ فرائض سنبھال لیتا تھا۔ دشت کے رہنے والوں کا کہنا ہے کہ:

"باپ کا مرجانا اتنا برا نہیں، جتنا ماں کا مرجانا......!"

تورا کینہ کا تعلق ایسے ہی قبیلے سے تھا۔ انتہائی اکھڑ اور منتقم مزاج کی مالک، موٹے اور بھدے سے نین نقش، ہر وقت غصے میں رہنا اور ہر بات کا انتہائی چڑچڑے پن سے جواب دینا اس کی عادت میں شامل تھا۔ اوغدائی کے پاس آنے سے پہلے چونکہ وہ ایک مرکیت سردار کی بیوی تھی اس لیے اس میں حاکمانہ عادات وصفات انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ اوغدائی کے پاس آنے سے اس میں خود اعتمادی اور قوت مزید بڑھ گئی تھی۔ اب اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اپنے جسم کو اندھی طاقتوں سے اکیلی بچا سکتی تھی۔ جب سے اسے یقین ہوگیا تھا کہ قرولتائی نے شوہر کو خاقان بنا دیا ہے تو اس کے مزاج کی تندی اور تیزی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا کیونکہ اوغدائی اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اگر اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجاتی تو وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگتی۔ اس لیے خاندان بھر کے دوسرے لوگ اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سیورقوقلتی بیگی بڑی بہادر اور ذہین عورت تھی۔ وہ ترک النسل کے کرائت قبیلے سے تھی۔ جب تک چنگیز خاں نے قبیلوں کو نہیں توڑا تھا، کرائت میدانوں کے خانہ بدوش تھے اور جنگل والے چرواہوں سے برتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا گزر بسر گھوڑوں کے گلوں پر ہوتا۔ اس لیے دشت کے رہنے والوں میں بہت امیر سمجھے جاتے تھے۔

سیورقوقلتی میں اسی لیے دشت کی عورتوں کی سی غیر معمولی قوتِ برداشت تھی۔ وہ بے حد حسین اور ذکی الحس تھی۔ وہ خطرے کے سامنے اپنی حفاظت کرنے کا ہنر جانتی تھی کیونکہ وہ کرائت قبیلے کے وانگ خاں کی بھتیجی تھی جو نستوری عیسائی تھا اور مرنے کے بعد ایشیا کے پریسٹر جان کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ ایک.... مقابلے میں زخم کھا کر مارا گیا تھا۔ سیورقوقلتی عیسائی پادریوں کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی جو آکر اس کے قبیلے میں ٹھہرتے تھے۔ وہ آوارہ گرد شامانوں سے بہت ڈرتی تھی جو اس کے اپنے اجداد کے سایوں کی طرح آکے دھمکاتے اور بھیک مانگتے تھے۔ وہ اس قدر قناعت پسند تھی کہ جتنی چیزیں اس کی ملکیت تھیں، انہی پر اکتفا کیے ہوئے تھی۔ اس کے پاس اتنا سامان تھا جو آسانی سے باربردار جانوروں پر ادھر سے ادھر منتقل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے اپنے کڑھائی کیے ہوئے کپڑے، لوہے کے برتن، تراشے ہوئے ہاتھی دانت کا زیور اور شاید چاندی کا ایک آدھ آئینہ۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سموروں کی دباغت کی تھی اور آنتوں سے تانت اکھیڑی تھی۔ وہ تولوئی کی پہلی بیوی تھی۔ اس لیے اسی کی اولاد خانہ بدوشوں کے قانون کے مطابق وارث تھی۔ جنگوں کے مسلسل ہونے کی وجہ سے تولوئی کا بیشتر وقت گھوڑے کی زین پر گزرتا تھا اور توقلتی اس کے ہم رکاب رہتی تھی۔ اسے جنگوں میں حصہ لینے والے مردوں کے بعد پیچھے خاندان زریں کے ساتھ رہنا پسند نہ تھا۔

جب ختا کی جنگ سے مالِ غنیمت ملا تو اس کا خیمہ اس کے مالِ غنیمت سے بھر گیا تھا۔ ریشم کے پردے، موتی کی جھالر، چاندی کے عود دانوں میں عود، سیورقوقلتی اس سے قطعی طور پر مطمئن نہ ہوئی تھی کہ خاندان زریں کی اس نئی سلطنت میں اس کی اولاد کو وہ فراغت اور اطمینان نصیب ہو جو خود اسے میسر نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ بھی ہو اس کے بیٹے ایسے مضبوط ہوجائیں کہ دوسروں کے مقابلے میں زندہ رہ سکیں۔ اس نے جب اپنے بیٹوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا چاہا تو اکثر بوڑھوں نے اس کو طعنہ دیا تھا کہ:

"بچھڑے پر دونوں پاؤں ایک طرف کر کے بیٹھ

جاؤ تو سواری نہیں آتی، خالی پڑھ لینے سے آدمی فاضل نہیں بن جاتا......!"

تب اس نے تنک کر جواب دیا۔

"اچھا...... بے وقوفوں سے بات چیت کرنا ایسا ہی ہے جیسے گائے کے سینگوں پر اناج بونا......!"

اس کا گھر اب بہت بڑا ہوگیا تھا کیونکہ تولوئی کی پہلی بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس اب سپاہی بھی تھے جو جانوروں کے گلوں کی حفاظت کرتے، نوکرانیاں تھیں۔ پیغام لے جانے والے قاصد تھے اور معمولی کام کاج کرنے کے لیے جنگوں میں پکڑے ہوئے غلام بھی تھے۔

ان میں سے اس نے دو عالموں کو اپنے لیے چنا۔ ایک "الغیور" تھا جو کاروانوں کے شہر کا اور پڑھا لکھا تھا۔ اس کے پاس اپنے قبیلے کی مہر بھی تھی۔ اس کا نام تاتا تنگا تھا۔ پہلی مرتبہ چنگیز خاں کو لکھی ہوئی تحریر سے سابقہ پڑا۔ اس نے دیکھا کہ تاتا تنگا کاغذ پر ایسے نشانات بنا سکتا ہے جن سے...ان کی گفتگو کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ وہ اس کے گھرانے کے کم سن لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھائے اور دوسرا چینی کا روشن دماغ فلسفی لیے لیو چت سائی تھا۔

سیورقوقلتی کو جو چیز کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، وہ یہ تھی کہ تولوئی اپنے باپ کے مرنے کے بعد خاقان کے لیے نامزد کیوں نہ ہوا تھا۔ اس نے تولوئی کو یاد دلایا کہ ان لوگوں.... کا پرانا دستور چلا آرہا ہے کہ باپ اپنے بڑے لڑکوں میں دولت اور جانوروں کے گلے اور اپنے ساتھیوں کو تقسیم کردیتا ہے۔ جو کچھ بچ جاتا ہے وہ سب سے چھوٹے بیٹے کی ملکیت ہوتا ہے جو "اچی گین" کہلاتا ہے۔ باپ کے گھر کی حفاظت اسی کا فرض ہوتا ہے اور وہ الاؤ کی آگ روشن رکھتا ہے۔

"یہ ہم سب جانتے ہیں کہ چنگیز خاں اپنی سلطنت کا راج تیرے سپرد کرنا چاہتا تھا اور یہ بہتر ہوگا کہ گھر کے شاہی لشکر اور فوج کی نگہداشت تمہارے سپرد ہو، اس سے تمہیں زیادہ اطمینان نصیب ہوگا کیونکہ تمہاری فوج میں ہزارہا جنگجو سپاہ ہوگی جس کی بنا پر تمہاری اولاد دوسرے شہزادوں سے زیادہ طاقتور ہوگی۔"

تولوئی کو علم تھا کہ اس کی بیوی نے جو الفاظ کہے ہیں وہ اس کے دل کی تمنا ہیں، اس نے بڑی توجہ سے انہیں سنا بھی مگر ان کی طرف دھیان نہ دیا۔ اوغدائی جو اس کے خاوند کا بڑا بھائی تھا، اس کو وہ بھی پسند کرتی تھی مگر قرولتائی کا فیصلہ اسے بے حد ناگوار گزرا تھا لیکن تولوئی نے اس فیصلے کے خلاف اپنے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا تھا۔ تب توقلتی نے خاموشی سے یہ عہد کیا کہ وہ اس دیوار کو گرائے گی ضرور۔ تولوئی نے بھی اسے خاموش رہنے کے لیے اصرار کیا تھا۔

خاندان کی تیسری عورت اوغدائی اور تورا کینہ کے بیٹے تویوق کی بیوی اوغل غامش تھی جو اپنی ساس کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ تو باتیں کرتی تھی اور نہ ہی اس کی طرح وحشی تھی البتہ وہ اپنی ساس کے فیصلوں کے خلاف جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں عورتیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں۔ اوغل غامش میں ایک کی ضرور تھی کہ وہ سیورقوقلتی کی طرح ہوشیار نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ تورا کینہ کی طرح اپنے معاملات کو حل نہ ہوتے دیکھ کر شور وغل کرنے والی تھی اور نہ ہی توقلتی کی طرح خاموش رہ کر انتظار کرنے والی تھی۔ وہ کم گو تھی لیکن اپنے مطلب کی پوری تھی۔ تویوق ویسے ہی بیمار رہتا تھا۔ گزرتی زندگی میں اسے قدم قدم پر اپنی ساس کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی، اس لیے وہ ساس کی ہاں میں ہاں ملا کر وقت گزار رہی تھی۔

☆☆☆

اوغدائی کے خاقان بنتے ہی تورا کینہ کھل کر کھیلنے لگی۔ ویسے تو اس نے پہلے سے اوغدائی کی دوسری بیویوں پر رعب رکھا ہوا تھا اور وہ اس کے دباؤ میں رہتی تھیں کیونکہ اوغدائی اسے دوسری بیویوں کے مقابلے اس لیے بھی پسند کرتا تھا کہ اس کو وراثت میں ملی ہوئی دوسری بیویوں میں سے تورا کینہ زیادہ معاملہ فہم اور ذہین لگتی تھی۔ اگرچہ وہ تند مزاج تھی مگر وہ جنگ میں اوغدائی کے ساتھ ہوتی اور جب اوغدائی نے خاقان بن کر دربار لگانا شروع کیے تو یہ اس کے ساتھ دربار میں بیٹھتی اور اوغدائی کے فیصلوں میں اپنی رائے پیش کرتی تھی اسی وجہ سے اوغدائی کی دوسری بیویاں اس سے خوفزدہ رہتی تھیں ماسوائے موق کے۔

موق، اوغدائی کو ملنے والی وراثتی بیویوں میں سے ایک تھی۔ وہ بھی تورا کینہ کی طرح تیز مزاج کی تھی اور بات بات پر جھگڑا کرنے کی ماہر تھی جبکہ وہ تورا کینہ کا سامنا اس لیے نہیں کرتی تھی کہ کسی بھی معاملے میں اوغدائی کا جھکاؤ تورا کینہ کی طرف رہے گا۔ تورا کینہ کے کیے گئے فیصلوں کو اوغدائی کبھی رد نہیں کرتا تھا۔ اس لیے درباری بھی تورا کینہ سے ڈرتے تھے۔

اوغدائی نے خاقان بن کر خاندان زریں کے مسند پر بیٹھ کر پہلا حکم یہ صادر کیا کہ تین روز تک چنگیز خاں کا ماتم کیا جائے۔ اس نے پابندی لگائی کہ تین روز تک ہر شخص کے

سامنے ابلتا ہوا گرم گھوڑے کا گوشت، چھلا ہوا بکرے کا گوشت اور ابلا ہوا گائے کا گوشت رکھ دیا جائے اور گھوڑیوں کے دودھ کے علاوہ شراب کے بڑے بڑے مٹکے رکھ دیے جائیں۔ اوغدائی جانتا تھا کہ چنگیز خاں کی زندگی میں اس کے ساتھ بیس نوجوان اور نازک لڑکیاں ہر وقت رہتی تھیں جو ناچ گا کر اسے خوش کرتی رہتی تھیں لیکن مرنے کے بعد وہ اپنی قبر کے خیمے میں پرانے سمور کے تمدے پر جنوب کی چراگاہوں کی طرف رخ کیے اکیلا پڑا تھا اور لڑکیاں اس کے ساتھ نہ تھیں۔ اوغدائی کی یہ سوچ اس کو بے حد تکلیف دے رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی روح کو خوش کرنے کے لیے چالیس نوعمر کنواری لڑکیاں چنیں۔ یہ اعلیٰ خاندانوں کے سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ اس نے انہیں بہترین چینی کپڑے اور بیش قیمت جگمگاتے ہوئے زیور پہنائے۔ پھر وہ انہیں برخان کالدون لے گیا جہاں عظیم الشان صنوبر کے درخت کے نیچے چنگیز خاں نشست کی حالت میں مدفون تھا اور اس کے ساتھ اس کے جنگی گھوڑے کی ہڈیاں دفن تھیں۔ چالیس اعلیٰ نسل کے ابلق گھوڑے اس درخت کے پاس منگوائے گئے۔ بیگی نے قربانی کی رسم ادا کی۔ خوب صورت لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور گھوڑے مار دیے گئے تاکہ یہ سب دوسری دنیا میں چنگیز خاں کی خدمت انجام دے سکیں۔

پھر اوغدائی نے چنگیز خاں کی زندگی کی آخری یلغاروں کے مالِ غنیمت کے وہ چھکڑے لٹا دیے جو پڑاؤ کے پاس بلندی پر عرصہ دراز سے کھڑے تھے اور ان کی چوکیداری پر کوئی مامور نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں یہ لوگ چوری کے نام سے ناآشنا تھے۔ ان چھکڑوں میں چاندی کی سلاخیں، موتیوں کے صندوق، منقش ہاتھی دانت، صنوبر، جیڈ کی چمکتی ہوئی پتلیاں، ہلکے سونے کے پترے، ریشم کے تھان اور جواہرات کے ذخیرے شامل تھے۔

اوغدائی ایک بااصول اور خوش فطرت کا مالک تھا۔ وہ جاہل ہونے کے باوجود اپنے دونوں بھائیوں کے سوا کسی اور پر اعتماد نہ کرتا تھا۔ اسے صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ اس کے والد کی روح اس کے گرد کیوں پھڑپھڑاتی ہے۔ اسی لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ گرم گرم گوشت کھانے اور شکر ملے ہوئے کھانے یا بے تحاشا شراب پینے کا شوق تھا۔ جب سے بیل والے سال اس کی تاج پوشی کی پہلی رسم ادا ہوئی تھی، اس کی چہیتی اور لاڈلی بیوی تورا کینہ نے سب سے پہلی تجویز اس کے سامنے یہ رکھی کہ خاقان کو اور زیادہ شان و شوکت سے زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس نے ایک روز بڑے دلار سے اپنی بانہیں اوغدائی کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں بھی دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح شان و شوکت سے زندگی بسر کرنا ہوگی۔"

"اس بات سے تمہارا مطلب؟" اوغدائی نے حیرانی سے سوال کیا۔

"دیکھو نا پیارے۔ دنیا کے بادشاہ شاندار محلوں میں رہتے ہیں، جن میں پچی کاری کا فرش ہوتا ہے۔ ان کی خواب گاہیں خوشبوؤں میں بسی ہوتی ہیں۔" ابھی تورا کینہ بتا رہی تھی کہ اوغدائی بول اٹھا۔

"تمہیں اس کی خواہش کیونکر ہوئی؟"

"میں تمہارے ساتھ ہی تو رہی ہوں، جنگوں میں۔ جنگوں کے بعد میں نے بادشاہوں کے محل بھی دیکھے ہیں جن میں وہ بڑے مزے کی زندگی گزارتے ہیں اور ایک ہم ہیں آج تک چرواہوں کی طرح خیموں میں پڑے زندگی گزار رہے ہیں۔" تورا کینہ کے لہجے میں پیار اور چاپلوسی کی جھلک نمایاں تھی۔

"ہمارے بھی تو اب خیمے بڑے بڑے ہوگئے ہیں اور ان میں خوب صورت رنگ برنگے پردے لٹکنے لگے ہیں۔" اوغدائی نے جواب دیا۔

"نہیں میرے خاقان! اوغدائی اب بہت بڑا خاقان ہوچکا ہے۔ اب اسے اپنے آباؤ اجداد کی طرح ان خیموں میں نہیں رہنا چاہیے۔ اب تو زریں شہنشاہ کے غلام بھی ہم سے اچھے گھروں میں رہتے ہیں۔" تورا کینہ نے تھوڑی ناراضگی سے اسے احساس دلایا مگر اوغدائی نے بڑے تحمل سے اسے جواب دیا۔

"دیکھو میری جان! ہمارے بڑوں نے ہمیشہ ہمیں تلقین کی ہے کہ ہم خانہ بدوش قوم ہیں اور کسی ایک جگہ ہمیشہ سے ہمیں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ شہریوں یا تاجروں کی طرح مکان بنانے سے میرے باپ کی روح ناراض ہوجائے گی۔ اس لیے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے والد کی روح ناراض ہو۔ ہم کبھی بھی چار دیواروں والے مکان کے اندر نہیں رہ سکتے۔ بہتر ہے کہ تم بھی ایسی فرمائشیں کرنا چھوڑ دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم ہمیشہ چرواہوں کی طرح ان گندے مندے خیموں میں ہی زندگی گزارتے ہوئے

مرجائیں گے۔ ہمیں کبھی اچھی اور خوب صورت زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملے گا مگر میں...... میں ایک بڑے خاقان کی بیوی ہوتے ہوئے ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔" تورا کینہ نے فوراً دوسرا حربہ استعمال کیا۔

"اس کا بھی حل میرے پاس موجود ہے۔ وقت آنے پر وہ بھی حل کروا دوں گا۔"

"جو بھی ہو۔ بہرحال اتنا میں بتائے دیتی ہوں کہ اب میں جب بھی یورت سے نکلوں گی تو میں اپنے سر پر چینی عہدے داروں کی سواری ایسا چتر لگاؤں گی اور پالکی میں سوار ہوکر نکلوں گی۔ اس کے علاوہ میری پالکی کے آگے غلاموں کا ایک جم غفیر ہوگا جو اپنی مخصوص وردیوں میں ملبوس ہوگا اور آج سے میں تمہارے دربار میں تمہارے ساتھ بھی نہیں بیٹھوں گی بلکہ اپنا الگ سے دربار لگاؤں گی۔" تورا کینہ نے آخر اپنے دل کی خواہش کا برملا اظہار کر ہی ڈالا۔

اوغدائی جانتا تھا کہ تورا کینہ بہت ہٹ دھرم ہے۔ وہ جس بات کا ایک دفعہ ارادہ کرلے، اسے ہر قیمت پر پورا کرتی ہے۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہو رہا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کیا کہ اپنے بڑے شامیانے کے ستونوں پر سونے کے پترے جڑوا دیے۔ اس نے چراگاہ میں پکی اینٹوں کی ایک لمبی سی بل کھاتی دیوار بنوا دی کہ اس میں شکار کھیلتے ہوئے وہ شکار کو اس میں ہنکا دیتا اور آسانی سے شکار کرلیتا۔

تورا کینہ نے اپنی ضد پوری کرلی تھی۔ وہ جب کسی کام کے لیے اپنی یورت سے نکلتی تو اس کے سر پر چینی عہدے داروں کی سواری کا چتر لگا ہوتا۔ سب سے پہلے وہ اپنی سوتنوں کی یورتوں میں جاتی تاکہ ان پر رعب قائم کرسکے۔ اس کی سوتنیں اس کو دیکھ کر جل بھن جاتیں مگر کچھ کہتی نہ تھیں۔ ان میں سے زیادہ جلاپا موق کو ہوتا تھا جو اسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگتی تھی۔ اس بات کو تورا کینہ بھی جانتی تھی۔ تبھی وہ تیار ہوکر ان کی یورتوں میں ایک بار ضرور جاتی پھر وہ اپنی پالکی میں اسی شان سے سوار ہوکر نکلتی جیسے خود خاقان اوغدائی کی سواری نکلتی تھی۔ اس کے آگے کالے غلاموں کی بھیڑ ہوتی جو اس کی پالکی کے آگے آگے بھاگتے۔ انہوں نے سرخ لباس پہنا ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک چالاک نستوری پادری ہوتا جو جادو کے ٹوٹکے لکھتا جاتا۔

تورا کینہ نے اپنی ضد پوری کرتے ہوئے نہ صرف خاقان کے اصل طریق کار حکومت کی نقل کی بلکہ اس نے اپنے نام کے ساتھ ایک مزید اس کی عزت بڑھانے والا لفظ خاتون بھی لگا لیا تھا۔ اب وہ صرف تورا کینہ نہیں تھی۔ اس کی جگہ تورا کینہ خاتون بن چکی تھی۔ وہ شہنشاہیت کی عظیم خاتون کہلانے لگی تھی۔ جیسے اوغدائی اپنے ساتھ ایک پادری اور ایک کنیز رکھتا تھا، تورا کینہ خاتون بھی اپنے ساتھ ایک پادری اور ایک خاتون رکھنے لگی تھی۔ اب کبھی کبھی یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ تورا کینہ خاتون کا دربار بھی الگ لگے گا۔ اب اس نے اتنے اختیارات حاصل کرلیے تھے کہ وہ اس کی حقدار بھی معلوم ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

لیے لیو چت سائی ختا کے ایک شاہی خانوادے سے تھا۔ دراز قد جو معمول سے زیادہ لمبا تھا۔ اس کی مونچھ اور ڈاڑھی دراز تھی۔ چینی اسے لمبی مونچھوں والا کہتے تھے۔ اس کے خاندان نے کن خاندان کی بڑی وفاداری سے خدمت کی تھی۔ لیے لیو چت سائی اپنے بچپن سے ہی پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ ریاضی کے علم میں ماہر اور جنتری سازی میں ہر وقت نئے نئے تجربات کرنا اس کے مشغلے میں شامل تھا۔ جغرافیے کے نکات کو حل کرنے میں وہ خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ چینی علم ہیئت میں دلچسپی رکھنے کے سبب اپنے لیے ستاروں کا ایک نیا حساب تیار کرچکا تھا۔ خالص فلسفۂ زندگی کو اپنا کر اپنی طبیعت اور اپنی زبان پر قابو رکھنا اس نے سیکھ لیا تھا۔ وہ ابھی بیس سال کا تھا جب اسے ین کنگ، کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔

اس وقت اس کی عمر بمشکل اٹھائیس سال کی تھی جب چنگیز خاں نے اس کے شہر کو فتح کیا تو وہ اس کے اندازِ گفتگو اور ذہانت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ گرفتاری کے وقت جب چنگیز خاں نے سوال کیا کہ اہلِ کن اور اہل ختا آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، اس لیے ایک طرح سے میں نے تم لوگوں کا انتقام لے لیا ہے۔

تو لیے لیو چت سائی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"میرا باپ اور میں ہمیشہ کن خاندان کی خدمات انجام دیتے رہے تو پھر ہم ان کے دشمن کیسے ہوئے۔" چنگیز خاں کو اس کا جواب بہت پسند آیا۔ چنانچہ اس نے نوجوان وزیر کو اپنا ملازم رکھ لیا اور یہ سوچ لیا کہ اگر اہل ختا، اہل کن کے وفادار ہوسکتے ہیں تو اس پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وہ... ان کی مدد کرتا رہے گا۔ اسے چنگیز خاں کے ساتھ دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ سکندرِ اعظم کو ارسطو جیسا مشیر مل گیا ہے۔ شروع شروع میں چنگیز خاں لیو چت سائی سے صرف نجوم کی فال نکالنے تک کا مشورہ لیتا لیکن اس .... نے اپنی فہم و فراست کو اس

خوش اسلوبی سے استعمال کیا کہ وہ چنگیز خاں کے تمام معاملات میں دخل دینے لگا۔ وہ بھی اس پر بے حد اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس طرح لیے لیو چت سائی قتل و غارت کی آندھیوں، معاملہ فہمی کے مسائل اور نظم و نسق کے معاملات میں لمبی مونچھوں والا چینی چنگیز خاں کے نہ صرف ساتھ چلتا رہا بلکہ اس غارت گری و تباہی سے کسی نہ کسی طرح چنگیز خاں کے معاملات کو سدھارتا رہا پھر وہ اس پر اندھا دھند اعتماد کرنے لگے۔

جب چنگیز خاں مرا تو یہ لیے لیو چت سائی تھا جس نے خاقان کی نامزدگی کے بگڑتے ہوئے مسئلے کو اپنی معاملہ فہم قوت سے حل کیا اور خانہ بدوشوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ اوغدائی کی اولاد کے سوا کسی کو تخت پر نہ بٹھائیں گے۔ ان خانہ بدوشوں کی یہ قسم اس قوم کے لیے جو لکھی ہوئی دستاویزات کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی، بالکل پابند کر دینے والی قسم تھی۔ نہ صرف ان کے لیے بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی۔

ان کی اس قسم نے پڑاؤ میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ قبائلی خاقان کے چناؤ کے بعد اطمینان سے جی بھر کر شراب پینے بیٹھ گئے۔

خاقان کے چناؤ کا سارا معاملہ لیے لیو چت سائی کی کوششوں سے حل ہوا تھا۔ اگر تولوئی اور چغتائی میں سے کسی ایک کو خاقان بنایا جاتا تو یہ زیادہ عرصہ ایک دوسرے کی اطاعت نہ کر پاتے لیکن دونوں اوغدائی سے محبت کرتے تھے اور یہ یقینی بات تھی کہ دونوں اس کی حکومت کی مدد کریں گے اور تخت کی حفاظت کے لیے تینوں بھائی یک جان رہیں گے۔ اوغدائی کے خاقان بننے سے تورا کینہ مارے غرور کے پھول گئی کیونکہ اب وہ ملکہ بن گئی تھی۔

تورا کینہ کو بھی اس بات کا ادراک تھا کہ اگر لیے لیو چت سائی اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی فراست سے اسے نہ سلجھاتا تو یہ کبھی حل نہ ہو پاتا۔ اس لیے اس کے ذہن میں اس کی عزت دو چند ہو گئی تھی۔ لیے لیو چت سائی پھر نئے خاقان کا بھی اسی طرح سے مشیر رہا جیسے وہ چنگیز خاں کا تھا۔ لیے لیو چت سائی نے اوغدائی کو اس بات پر قائل کیا کہ فتح اور چیز ہے، کسی ملک کو اپنا باج گزار بنا لینا اور بات ہے مگر نظم و نسق دوسرا معاملہ ہے۔ اس نے بتایا کہ نظم و نسق اور امور سلطنت چلانے کے لیے چاندی کی ضرورت ہے۔ اس لیے سالانہ لگان لگایا جائے۔ گوداموں میں اناج جمع کیا جائے۔ رسل و رسائل کا سلسلہ کھلا رہے۔ عدالتیں انصاف کرتی رہیں تو عوام میں خوش حالی آئے گی۔ اس نے کہا کہ:

''برتن بنانے کے لیے کمہار کی ضرورت ہوتی ہے اور حساب کتاب رکھنے کے لیے پڑھے لکھے منشیوں کی ضرورت ہوتی ہے......!''

اوغدائی نے یہ سن کر کہا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر تم ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟''

لیے لیو چت سائی نے جواب دیا۔ ''زیادہ پڑھے لکھے ختائی جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں، قید میں ہیں یا غلام بنا لیے گئے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک برلیغ (فرمان) صادر کیا جائے کہ یہ قیدی اور غلام آزاد کیے جاتے ہیں اور انہیں حکومت کے عہدوں پر مامور کیا جاتا ہے!''

اس نے اوغدائی کو اس پر بھی رضامند کر لیا کہ مفتوحہ علاقوں کے عام چوراہوں پر اب بھی لاشیں اور ڈھانچے بڑے جانوروں اور پرندوں کی خوراک بننے کے علاوہ پڑے سڑ گل رہے ہیں۔ وہاں ایسے افراد مقرر کیے جائیں جو انہیں ٹھکانے لگا کر ماحول کو صاف ستھرا بنائیں لیکن یہ افسر فوجی نہ ہوں۔ شہریوں کو قتل کی سزا ملنے سے پہلے انہیں عدالت میں جانے کا حق بھی دیا جانا چاہیے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ عوام پر باقاعدہ ٹیکس اور لگان وصول ہونے سے لوٹ کھسوٹ کے مقابلے میں زیادہ آمدن ہو سکتی ہے۔

اوغدائی نے لیے لیو چت سائی کی تمام باتوں کو مان لیا بلکہ اس کے کہنے پر سخت کوش چنکائی کو معتمد سلطنت بنا کر یہ حکم جاری کر دیا کہ جب تک کسی برلیغ (فرمان) پر چنکائی کی مہر ثبت نہ ہو، اسے اصل نہ سمجھا جائے۔ یہ سب کرنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ ختا کے تمام قیدیوں کو رہا کر کے اس کے دربار میں حاضر کیا جائے۔

قیدیوں کو رہا کرنے کے بعد انہیں اوغدائی کے دربار میں حاضر کیا گیا تو ان میں سے زیادہ پڑھے لکھوں کو اس نے اپنے خاندان کے بچوں کو پڑھانے یا امور سلطنت میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات کر دیا۔ جس وقت یہ فیصلہ کیا جا رہا تھا... تورا کینہ خاتون بھی دربار میں بیٹھی اوغدائی کو مشوروں سے نواز رہی تھی اور مختلف قیدیوں کی تعیناتی کے بارے میں احکامات دے رہی تھی۔ اسی کے کہنے پر اس نے محمد یلواج کو اپنا وزیر اور لیے لیو چت سائی کو شمالی چین کا گورنر بنایا۔ لیے لیو چت سائی کو اب اس قدر اختیارات حاصل ہو چکے تھے کہ وہ اوغدائی کی پالیسیوں پر تنقید اور انہیں تبدیل کر سکتا تھا۔

قیدی قطار میں دربار میں کھڑے تھے کہ معا

تورا کینہ نے ایک نوجوان قیدی اور سیاہ چشم ایرانی لڑکی فاطمہ تاجک کو ان سے الگ کرتے ہوئے اوغدائی سے کہا۔

''یہ دونوں میری ملکیت میں دے دیے جائیں!''

خاقان اوغدائی نے ان دونوں کو باقیوں سے علیحدہ کر لیا۔ یہ دونوں قیدی چین کی مشرقی مہم سے یرغمال بنائے گئے تھے۔ اوغدائی نے ان کے متعلق پتا کیا تو اسے بتایا گیا کہ نوجوان عبدالرحمان ہے جو نوجوانی ہی میں اپنی قدرتی ذہانت اور تعلیمی استعداد کی وجہ سے ختا کی سلطنت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکا ہے جبکہ فاطمہ تاجک نے طوس سے لے کر منگولیا تک اپنے علم اور دانائی کی دھاک بٹھائی ہوئی تھی۔

عبدالرحمان لانبے قد اور چوڑے چکلے سینے کے ساتھ مضبوط جسم کا مالک تھا، جس کی نیلی آنکھوں میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تورا کینہ نے اسے دیکھتے ہی فوراً اسے اپنی ملکیت میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا جبکہ فاطمہ بھی خوب صورتی اور نازک اندامی کی وجہ سے تورا کینہ کے من کو بھا چکی تھی۔ عبدالرحمان اور فاطمہ کو تورا کینہ نے اپنی ملکیت میں لیتے ہی عبدالرحمان کو ملکی معاملات میں مشیر رکھ لیا جبکہ فاطمہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ یورت میں ہوتی تو فاطمہ اس کے پاس ہوتی اور اگر وہ پالکی میں بیٹھ کر کہیں جاتی تو نستوری پادری کے ساتھ فاطمہ تاجک اس کے ہمراہ ہوتی۔

خاقان بننے کے بعد اوغدائی کا زیادہ وقت اپنی یورت میں شراب پینے اور نوجوان خوب صورت لڑکیوں کے رقص دیکھنے اور ان کے ساتھ عیاشیوں میں گزرنے لگا تھا۔ اوغدائی کی فطرت کا وحشی پن اب شراب کے نشے میں ڈوب کر تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن ایک مرحلے پر ایک قبیلے نے نافرمانی کی۔ انہیں اوغدائی نے ایسی سزا دی کہ وہ کبھی اسے بھلا نہ پائے۔

اوئرات قبیلے نے جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتا تھا اور یہ ان پہلے قبیلوں میں سے تھا جو.. ان کی برتری قبول کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ خبر سنی کہ خاقان ان کی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتا ہے یا انہیں کسی دوسرے قبیلے میں بیاہنا چاہتا ہے۔ یہ تجویز انہیں پسند نہیں آئی مگر وہ احتجاج کرنے سے بھی ڈرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے چپکے سے اپنی لڑکیوں کی منگنیاں اور شادیاں اپنے ہی قبیلے میں کر دیں۔

جب اوغدائی کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اوئرات قبیلے کی ساری کنواری لڑکیاں جن کی عمر سات سال سے اوپر تھی اور وہ ساری لڑکیاں جن کی شادیاں اسی

سال کے اندر ہوئی ہوں، ان سب کو حاضر کیا جائے۔ تقریباً چار ہزار لڑکیاں خوب صورت اور بھڑک دار کپڑے پہنے شاہی فوج کے میدان میں پہنچائی گئیں۔ ان کے خاندان اور والدین پیچھے پریشان کھڑے تھے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ خاقان ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ معاً خاقان نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ لڑکیوں کو دو قطاروں میں کھڑا کیا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان سے ہو کر گزر سکے۔ ایسا ہی کیا گیا تب خاقان ان کے درمیان سے گزرا۔ اسے جو لڑکیاں اچھی اور خوب صورت لگیں، اس نے انہیں اپنے لیے چن لیا۔ اس کے بعد کچھ لڑکیاں اس نے اپنے چہیتے افسروں کو دے دیں۔ ان کو بانٹنے کے بعد بھی جو خوب صورت لڑکیاں باقی بچیں انہیں قحبہ خانوں کے مالکوں کے حوالے کر دیا۔ باقیوں کو محافظ دستوں اور تماشائیوں میں جو جس کو پسند آئے کی بنیاد پر بانٹ دیا۔ ان کے باپ، بھائی اور شوہر دیکھتے رہ گئے اور سپاہی دوڑ دوڑ کر لڑکیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ کسی کی مجال نہ ہوئی کہ کچھ کر سکے۔ اس طرح اوئرات قبیلے کو نہ صرف رسوائی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ انہیں ایسا عبرتناک سبق مل گیا جسے وہ تمام عمر نہ بھلا پائے۔

اوغدائی کو خاقان بنتے ہی تورا کینہ نے زریں خاندان کے اس رواج سے آگاہی دی جس پر چل کر وہ اپنے عیش و آرام میں مزید اضافہ کر سکتا تھا۔ ایک روز فاطمہ نے جو تورا کینہ کی رازدار اور قریبی سہیلی بن چکی تھی، اس نے تورا کینہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''خاتون اعظم! اگر اجازت ہو تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ضرور۔ میری جان۔'' تورا کینہ نے پیار سے جواب دیا۔

''مجھے اس بات کا بڑے دنوں سے احساس ہو رہا ہے کہ عبدالرحمان کو پسند کرنے کا احساس آپ کی نظروں میں پیدا ہونے لگا ہے۔ کیا میں غلطی پر تو نہیں۔ میں کتنے دنوں سے پوچھ لینا چاہتی تھی مگر آپ کی زودرنجی کی وجہ سے میں کچھ خوفزدہ تھی۔'' فاطمہ نے آہستہ آہستہ کہا اور پھر جواب کی منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ تورا کینہ گومگو کے عالم میں چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''فاطمہ! تمہاری اسی ذہانت کی وجہ سے میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ تم نے بہت درست اندازہ لگایا ہے۔ یہ چینا مسلمان نوجوان بھی مجھے اسی طرح پسند آ گیا جیسے تم میری نظروں کو بھائی ہو۔ وہ میری سوچوں سے بڑھ کر حسین اور ذہین نوجوان ہے مگر یہ بات۔'' تورا کینہ ایک لمحے کو چپ ہوئی تو فاطمہ نے فوراً بات اچک لی۔

''خاتون اعظم! محبت کے معاملے نازک اور پوشیدہ ضرور ہوتے ہیں مگر آنکھیں اس کی جادوگری کو نہیں چھپا پاتیں۔ کیا اس بات کا عبدالرحمان کو بھی علم ہے؟'' فاطمہ نے کھلتے ہوئے پوچھا۔

''فاطمہ! میں نہیں جانتی عبدالرحمان کو اس بات کا علم ہے بھی یا نہیں۔ مگر وہ... ذہین شخص ہے۔ یقیناً میری نوازشات سے اسے سمجھ جانا چاہیے۔'' تورا کینہ نے ایک دانا عورت کی طرح جواب دیا۔

''خاتون اعظم! جیسے عورتیں اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں، ایسے ہی کچھ مرد بھی ایسے معاملات میں پہل کرنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں یا وہ اس کا اظہار عورت کی زبانی سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ خاقان اعظم کی طرح بے خوف اور نڈر نہیں ہوتے۔ ایک بات اور ...... کیا خاقان اعظم کو اس بات کا علم ہے؟'' فاطمہ نے ذہانت سے پوچھا۔

''شاید نہیں۔'' تورا کینہ نے جواب دیا۔

''خاقان اس معاملے میں شکی مزاج ہیں۔ اگر انہیں علم ہو گیا تو بہت ممکن ہے کہ ان کے دل میں آپ کی محبت کا جلتا چراغ بجھ جائے یا ٹمٹمانے لگے۔ اس سے بہتر ہے کہ انہیں اس کا علم ہونے سے پہلے انہیں ان کی پسند کے کسی معاملے میں اس طرح الجھا دیا جائے کہ اس کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جائے۔'' فاطمہ نے مشورہ دیا۔

''وہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے؟'' تورا کینہ نے تجسس سے پوچھا۔

''عورت کے معاملے میں ہمیشہ سے آپ کے خاندان کے مرد بے حد دلچسپی لیتے رہے ہیں۔'' فاطمہ نے بات شروع کی۔

''یہ تو ہے۔ اوغدائی کو بھی اپنی وراثت میں کئی بیویاں ملی ہیں مگر اس کی طمع ختم نہیں ہو پائی۔ مجھ سے پہلے اوغدائی کی ایک بیوی پہلے بھی تھی مگر اس سے اس کی اولاد نہیں ہوئی تھی پھر جب میرے پہلے مرکیت شوہر ''ڈیئر اوسن'' سے چھین کر اس کے حوالے کیا گیا اور بڑے خان کے مرنے کے بعد وراثتی بیویاں بھی اسے ملیں۔ تب بھی وہ عورتوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔ شراب اور نت نئی خوب صورت لڑکیاں اس کی کمزوری رہی ہیں ......'' تورا کینہ اسے بتا رہی تھی کہ فاطمہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بالکل درست خاتون اعظم! یہی بات میں آپ

سے کہنے والی تھی۔ کہیں سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ زریں شہنشاہوں یعنی کن خاندان کا ایک رواج یہ بھی تھا کہ ہر سال کن سرزمین سے حسین ترین لڑکیاں تلاش کی جاتی تھیں۔ ان میں سے جو زیادہ خوش اندام، خوش گلو اور خوشبو دہن ہوتی تھیں، وہ دربار کو بھیجی جاتی تھیں اور ان میں سے پچاس لڑکیاں جو سب سے زیادہ دلفریب ہوتی تھیں، شہنشاہ کی خدمت کے لیے منتخب کی جاتی تھیں... جو شہنشاہ کی خدمت بجالاتی تھیں۔ ساقی گری کرتیں، اس کے بدن کی مالش کرتیں اور اس کی مسہری کے قریب سوتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ ان میں سے ان لڑکیوں کو چنتا جن کے ساتھ وہ ہم بستری کرنا چاہتا تھا۔ میرا آپ کو یہ مشورہ ہے کہ آپ خاقان اعظم کے سامنے کسی نہ کسی طرح اس رواج کا ذکر کریں اور اسے اس رواج کا دھیان دلا کر اسے اپنانے پر مجبور کریں۔ اس طرح ان کا دھیان آپ کی طرف سے ہٹا رہے گا۔''

''اوہ ...... فاطمہ تو کس قدر ذہین ہے۔ اوغدائی شراب اور لڑکیوں میں لگا رہے تو اسے ملکی معاملات تو کیا خود اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا۔ مجھے یقیناً اسے اس رواج سے متعلق یاد دلانا ہوگا۔ تم بہت اچھی ہو۔'' یہ کہہ کر تورا کینہ نے فاطمہ کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کا منہ چوم لیا۔

پھر جلد ہی تورا کینہ نے ایسا موقع تلاش کر لیا جب اس نے اوغدائی سے کہا۔

''خاقان اعظم! کیا آپ کو زریں خاندان کے اس رواج کا علم ہے؟''

''کونسا رواج جانِ خاقان۔'' اوغدائی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''ایک وقت میں آپ کے خاندان کا یہ رواج رہا تھا۔'' پھر ہولے ہولے تورا کینہ نے سب اوغدائی کے گوش گزار کر دیا تو اوغدائی خوشی سے اچھل پڑا اور بولا۔

''یہ رواج یقیناً بڑا اچھا اور شاہانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے شہنشاہ کی عظمت اور اسے اپنی رعایا پر رعب ڈالنے کا موقع بھی میسر آتا ہے۔ تم میرا کس قدر خیال کرتی ہو۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر مجھے ایسا کرنے سے پہلے لیو چت سائی اور اپنے دوسرے مشیروں سے مشورہ کرنا ہوگا۔''

''اوں ہوں۔ کیا اب خاقان اعظم اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بھی مشیروں اور وزیروں سے مشورہ لیتا پھرے گا۔'' تورا کینہ نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے کہا تو اوغدائی کو احساس ہوا کہ اس نے کس قدر غلط بات کہہ دی ہے۔

''ہاں۔ یہ تو ہے۔ اپنی خواہشات اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کا مجھے حق حاصل ہے اور اس کے لیے مجھے صرف اپنے دل سے مشورہ کرنا ہوگا۔ تمہیں خاتون اعظم کہلوانے کا حق حاصل ہے۔''

''تو پھر کل ہی اس پر عمل کروانا شروع کر دیں۔'' تورا کینہ نے دوبارہ اپنی بات پر زور دیا کیونکہ اسے علم تھا کہ اوغدائی کی یہ عادت ہے کہ وہ بہت جلد اپنے فیصلوں کو تبدیل کر لیتا ہے اور وہ وہی کرتا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔

پھر ہوا بھی یہی، اس نے اگلی صبح اپنے اس رواج کا ذکر لیو چت سائی سے کیا تو اس لمبی مونچھوں والے چینی نے فوراً اس پر اعتراض کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قوم کو چینی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں کیونکہ وہ زیادہ نازک اندام اور قبائلی عورتوں سے زیادہ شائستہ ہوتی ہیں۔ اسے ڈر ہوا کہ اگر یہ رواج دوبارہ شروع ہو گیا تو ہر سال ختا کی عورتوں اور خوب صورت نوجوان لڑکیوں کو زبردستی پکڑ کر خاقان کے سامنے پیش کیا جانے لگے گا۔ اس کا اعتراض سن کر اوغدائی کے ماتھے پر غصے کی تیوریاں چڑھ آئیں۔ اس نے غصے میں کہا۔

''ہمارے بڑوں نے کہا تھا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی مسرت نہیں کہ مفتوح لوگ تمہارے قدموں کے پاس پڑے ہوں۔ تم ان کے گھوڑوں کی لگام تھام کر لے جاؤ اور ان کی عورتوں کے بین، آہ و بکا تمہارے کانوں میں گونجیں، خاص طور پر ان کی حسین ترین عورتیں تمہارے عیش و آرام کا سامان بنیں پھر میں اس نعمت سے محروم کیوں رہوں۔''

لیو چت سائی نے بڑے آرام سے کہا۔

''کیا آپ کے پاس اٹھائیس لڑکیاں پہلے سے موجود نہیں؟ کیا یہ تعداد آپ کے لیے کافی نہیں اور زیادہ آگے اپنی خواہشات کو بڑھائیں گے تو آپ کی صحت کے لیے برا ہوگا اور تکلیف اٹھائیں گے۔''

کچھ سوچتے ہوئے اوغدائی نے اس کی بات مان تو لی مگر تورا کینہ کا کہا ہوا اسے بار بار بے چین کیے جا رہا تھا۔ اس نے اس پر آہستہ آہستہ عمل کرنا شروع کر دیا اور اپنے مرنے سے پہلے اس کے حرم کی تعداد بڑھ کر ساٹھ ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کوئی رات خالی نہ گزارتا تھا۔ اس سے اس کی طاقت میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ اس میں چراگاہوں کی گزری ہوئی قبائلی زندگی کی کئی نسلوں کی طاقت جمع تھی اور ابھی تک وہ کسی طرح کی جسمانی کمزوری کو محسوس نہ کرتا تھا۔

بہرحال فاطمہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر

توراکینہ نے اپنے آپ کو محفوظ ضرور کرلیا تھا۔ اب خاقان اعظم اوغدائی کی تمام تر توجہ توراکینہ اور اس کے کاموں سے ہٹ گئی تھی۔ یہی توراکینہ چاہتی تھی۔ اب وہ دربار میں بڑے کروفر کے ساتھ بیٹھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی حکمت عملی سے اوغدائی کی دوسری بیویوں پر اپنا رعب جمالیا تھا۔ دربار میں اس کا اثر رسوخ زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ بلا جھجک دربار میں باقاعدہ خاقان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی رائے دیتی۔ درباری بھی اس سے خوف کھانے لگے تھے۔ اس نے درباریوں میں اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اتحاد کو قائم کیا تاکہ کوئی بغاوت نہ کرسکے کیونکہ اوغدائی توراکینہ کی تجاویز سے کسی طور پر بھی انحراف نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

فاطمہ تاجک نے اپنی ذہانت سے توراکینہ کے حواس کو مکمل طور پر اپنے قابو میں لے لیا تھا۔ اب توراکینہ کوئی کام بھی اس کے مشورے کے بغیر انجام نہیں دے سکتی تھی، جس طرح خاقان اعظم اوغدائی لیے لیو چت سائی کے مشورے کے بغیر نہیں کرسکتا تھا۔ خاقان کے چھوٹے بھائی تولوئی کا بھی اس کے لیے مشورہ تھا کہ خاقان چنے جانے کے بعد باقی کام اسے اپنی سلطنت کے مرکز میں بیٹھ کر کرنے چاہئیں۔ فتوحات اور جنگیں لڑنا سپہ سالاروں اور خود اس کا کام ہے مگر اوغدائی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے تخت پر بیٹھنا اگرچہ بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اس کے بجائے زین پر بیٹھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ پہلی قرولتائی کا اجلاس ختم ہونے سے پہلے اس قوم نے متمدن قوموں پر چڑھائی کی تجاویز مکمل کرلی تھیں۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ختا کے دور دراز کے گوشے میں زریں شہنشاہ اب بھی اپنے قلعے میں رہتا ہے۔ اس کے آگے جنوبی چین میں قدیم چین کی حکومت ابھی تک قائم ہے۔ اس کی طرف ابھی تک کسی کا دھیان نہیں گیا۔

اسی طرح مغرب میں روسی اور اس دور دراز بر اعظم یورپ کے رہنے والے عیسائی ہیں جو ایسے جنگجو اور وحشی ہیں کہ وہ ان کے نام کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اس لیے فوج کے سپہ سالاروں کی یہ تجویز تھی کہ ان علاقوں پر فوج کشی کر کے انہیں بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا جائے۔ وہ ختا کے بچے کھچے قلعوں کو بھی فتح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ختا کا یہی ایک گوشہ تھا جو باقی رہ گیا تھا۔ تاکن یا زریں شہنشاہ جسے ین کنگ اور شمالی علاقے سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ہونان کے زرخیز صوبے میں چوڑے دریائے زرد کے جنوب میں جابسا تھا۔ یہاں قدرتی رکاوٹیں کن خاندان کے لوگوں کی قلعہ بندی کرتی تھیں۔ اس کے شمال میں دریائے زرد، جنوب میں نیلے پہاڑوں کا سلسلہ اور تانگ کوان کے پہاڑی سلسلے کے علاوہ دریائے یانگ لتی تھا۔ کن اب بھی بے شمار دولت اور بے حد مضبوط شہروں کے مالک تھے۔ یہی باتیں ان کی افواج کو کھٹک رہی تھیں۔

اوغدائی اس سے پہلے ان شہروں پر حملہ کر چکا تھا اور وہ انہیں فتح کر لینے کے قریب تھا جب چنگیز خاں نے اسے واپس بلالیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس حکمت عملی کے تحت ان علاقوں کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے تولوئی نے پوچھا کہ میں جب ان علاقوں میں پہنچ جاؤں تو کن پر کیونکر حملہ آور ہوسکوں گا؟

اوغدائی نے جواب دیا۔

''وہ شہروں کے پلے ہوئے لوگ ہیں، تھکن برداشت نہیں کرسکتے۔ انہیں خوب پریشان کرو تاکہ تم ان پر آسانی سے غالب آجاؤ۔''

تولوئی نے خاقان کی یہ بات یاد رکھی اور اسی حکمت عملی کے تحت انہیں اس قدر ہراساں کیا کہ کسی نے مزاحمت نہیں کی کیونکہ انہیں علم نہ تھا کہ ان کی افواج ایسے حربے استعمال کریں گی۔ انہوں نے مقابلہ کرنے سے گریز کیا تو یہ لوگ آہستہ آہستہ انہیں زیر کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ دیوار چین کے راستے وہ شمالی چراگاہوں کو زیر کرتا ہوا جب واپس لوٹا تو شہنشاہ زریں نے صلح کی درخواست بھجوائی۔ اس بارے میں تولوئی نے اوغدائی سے پوچھا۔ اس نے حسب دستور غیر معمولی تحفے طلب کیے۔ ایک فاضل جو کنفیوشس کی اولاد میں سے تھا۔ بہت سی لڑکیاں جو کاڑھنا جانتی تھیں۔ مرد نوکر جو بازوں سے شکار کھیل سکتے تھے۔ شہنشاہ زریں نے یہ تمام تحائف اوغدائی کو بھجوا دیے۔ اس مہم میں لیے لیو چت سائی اوغدائی کے ساتھ نہ تھا۔ دیوار عظیم عبور کرنے کے بعد اوغدائی کو ایک مہلک بیماری نے آدبوچا۔ اس وقت کوئی اور طبیب بھی نہ مل سکا تھا۔ اوغدائی نے اپنے تمام (جادوگروں) یعنی ایسے شامان (ساحر) طلب کیے جو بیماری کو آسیبوں کے ذریعے نکال باہر کرتے ہیں۔

شامانوں (جادوگروں) نے اوغدائی کے خیمے پر مہریں لگادیں اور بیٹھ کر ڈھول بجانے لگے۔ ایک چشمے سے پانی بھرا اور ...... نازک نازک پودوں سے یورت میں جھاڑو دی تاکہ زمین پاک ہوجائے۔ انہوں نے پانی میں شراب اور بکری کا دودھ انڈیلا اور اپلوں کی آگ پر لکڑی کی ہانڈی میں اسے جوش دیا۔ اس مرکب سے اوغدائی کے جسم کے بیمار اعضا کو دھویا تاکہ ان آسیبوں کو دھو کر ہٹادیں جو خاقان کے گوشت سے چمٹ گئے تھے۔

تولوئی خاموشی سے پریشان کھڑا سب دیکھ رہا تھا پھر اچانک وہ آگے بڑھا، اس نے ان سے ہانڈی لے لی۔ اسے بھی شامانوں کی ساحری پر اعتقاد تھا۔ اس نے ہانڈی جادوئی آسمان کی طرف اٹھائی اور یہ کہہ کر مرکب پی لیا۔

''تو جانتا ہے کہ اس سے زیادہ خون میری گردن پر ہے۔ میں نے اس سے زیادہ انسانوں کا خون بہایا ہے اور لاکھوں کو غلام بنایا ہے۔ اگر تو اسے اٹھالینا چاہتا ہے کہ یہ حسین ہے تو یہ مجھ سے بھی زیادہ بدشکل ہے۔ اس کو زندہ رہنے دے اور اس کی جگہ میری جان لے لے!''

یہ عجیب بات تھی کہ تولوئی کی اس دعا کے بعد اوغدائی صحت یاب ہونے لگا۔ انہوں نے پھر سے واپسی کا سفر شروع کردیا۔ وہ دریائے اولون کے سرچشمے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ تولوئی بیمار ہوگیا اور چند دنوں کے اندر مرگیا۔ شامانوں کو فخر تھا کہ ان کی ساحری سچی نکلی۔ ان کے مطابق تولوئی نے اوغدائی کی بیماری پی لی تھی۔

اوغدائی اب بے تحاشا شراب پی کر تولوئی کے مرنے کا غم غلط کرنے لگا تھا۔ اس نے ختا کی نئی نئی شرابوں کا ذائقہ چکھا جن میں لونگیں اور شکر ملی ہوئی تھی۔ جب وہ یہ تیکھی اور تیز شراب پیتا تو گرمی اس کے سر کو چڑھ جاتی اور اسے یوں لگتا جیسے وہ خود بخود ناچ رہا ہو۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں کی آواز آنے لگتی اور اس کے کان خود اپنی آواز سنتے۔ وہ جب بالکل مدہوش ہوتا تو اس کے قبیلے کا جد امجد اسے لگتا کہ ایک نیلے بھیڑیے کے روپ میں اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ ایسے میں اوغدائی اپنے اندر ایک عجیب سی طاقت اور قوت محسوس کرتا۔ اسے ناچنے والی لڑکیوں کی آوازیں یوں سنائی دیتیں جیسے چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

چغتائی بھی اپنی مہم سے شاہی فوج کے ساتھ آملا تھا۔ اسے تولوئی کی موت کا علم ہوا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اوغدائی اس کا غم غلط کرنے کے نام پر بے تحاشا شراب پینے لگا ہے۔ چنانچہ اس نے اوغدائی کو سختی سے منع کیا کہ دن بھر شراب کے صرف چھ سے زیادہ جام نہ پیا کرے۔ خاقان کو اپنے بڑے بھائی کے غصے کا علم تھا۔ اس لیے وہ اس سے سرتابی نہ کرسکتا تھا۔ چغتائی نے ایک افسر کو اس خدمت پر مامور کیا کہ جب اوغدائی کھانا کھائے یا شراب پیے تو وہ اس

کے قریب رہے اور اسے مجوجام سے زیادہ شراب نہ پینے دے۔ اوغدائی اس پر عمل کرتا رہا لیکن اس نے بڑے بڑے جام بنوا لیے تاکہ ان میں وہ دگنی شراب پی سکے۔

اوغدائی کے یوں ہر وقت مدہوش رہنے سے تورا کینہ کو اس قدر ڈھیل مل گئی تھی کہ وہ امورِ سلطنت میں من مانی کرنے لگی تھی۔ اس نے درباریوں میں اپنی پسند اور ناپسند کی تبدیلیاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایسے میں ایک روز فاطمہ نے تورا کینہ کو خوش گوار موڈ میں دیکھ کر کہا۔

”خاتون اعظم! میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی نظریں اس چاند سے ہٹ گئی ہیں جسے عبدالرحمان کہا جاتا ہے۔“

”تم نے درست اندازہ لگایا ہے میری پیاری۔ امورِ سلطنت میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو چکے ہیں کہ ان کو سلجھاتے سلجھاتے میں اپنے دل کی دھڑکنوں کا بھی اندازہ نہیں کر پاتی۔“

”خاقانِ اعظم تو اپنے حال میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ انہیں خود اپنے آپ کا پتا نہیں!“ فاطمہ نے دوبارہ کہا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کہنا کیا چاہتی ہو تم؟“ تورا کینہ نے جلدی سے پوچھا۔

”دل کے ایوانوں میں ہلکی سی آہٹ پر بھی خوف اور ڈر کے قدموں کی آواز تھرا اٹھتی ہے۔ شک کی چمگادڑیں پھڑ پھڑانے لگتی ہیں لیکن اب خاتون اعظم کو تو ایسا کوئی ڈر خوف نہیں رہا... پھر محبت کی کھڑکیاں اور دروازے کیوں بند کر دیے گئے تھے؟

”عبدالرحمان کے دل میں بھی میں نے یہ چنگاری سلگا دی ہے۔ اب وہ آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ اجازت طلب کرتا ہے۔ دیدارِ خاتون اعظم کے لیے۔“ فاطمہ نے اشاروں اور کنائیوں کی زبان میں مدعا بیان کیا۔

”فاطمہ! ایسے الفاظ کہاں کہاں سے ڈھونڈ لاتی ہو۔ یقیناً مجھے عبدالرحمان سے ملنا چاہیے۔ میں تو اسے بھول ہی گئی تھی۔“ تورا کینہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر؟“ فاطمہ نے دوبارہ پوچھا۔

”آج ہی سورج ڈھلنے کے بعد اوغدائی خاقان جب شام کے کھانے سے فارغ ہو کر شراب میں اپنا غم غلط کرنے بیٹھے۔ تم آجانا، پھر بتاؤں گی۔“ تورا کینہ نے جواب دیا۔

یہ اسی شام کا ذکر تھا۔ جب اوغدائی کھانے کے بعد شراب پینے میں محو تھا کہ فاطمہ اس کی یورت میں پہنچی تو اس نے اشاروں سے تورا کینہ کو کچھ کہا۔ تورا کینہ نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی تو اس کے تھوڑی دیر بعد تورا کینہ بھی یورت سے باہر نکلی اور پیچھے چراگاہ میں پہنچ گئی جہاں فاطمہ پہلے سے موجود تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی وہاں موجود تھا اور یہ مرد عبدالرحمان تھا۔

اونچا لمبا قد، مضبوط اعضا، گورا رنگ اور نیلی آنکھوں والا عبدالرحمان۔ تورا کینہ کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر وہ تعظیم کے لیے فوراً جھکا۔ تورا کینہ نے اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”دل میں بسنے والے ان حدود و قیود سے ماورا ہوتے ہیں!“

”شکریہ ملکہ اعظم۔“ عبدالرحمان نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا ہے۔ تمہیں علم ہے!“ تورا کینہ کی زبان میں پہلی بار لڑکھڑاہٹ آن بسی تھی۔

”میں جانتا ہوں ملکہ معظم۔ انسان جس قدر مرضی چاہے اپنے آپ کو بندشوں اور پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑے رکھے، وہ اپنے جذبات کی لگامیں بڑی مضبوطی سے تھامے رہے مگر اس کی آنکھیں سچ بول دیتی ہیں۔ میں وہ سب اسی روز جان گیا تھا، جب آپ نے پہلی بار اتنے قیدیوں میں سے میرا انتخاب کیا تھا۔“ عبدالرحمان نے تلے انداز میں جواب دیا۔

”میں نہیں جانتی یہ سب میرے شایانِ شان بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں نے جب تمہیں دیکھا تو اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی لیکن اس کے برملا اظہار میں میرا رتبہ حائل تھا۔ اس لیے میں اتنی دیر تک اپنی محبت اور اپنی پسند کا کھل کر اظہار نہ کر سکی۔ یہ تو اس فاطمہ کا کیا دھرا ہے۔“ یہ کہہ کر ہنستے ہوئے اس نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں سے بچ کر دور جانے کو تھی۔

”اری فاطمہ! تو کہاں چلی؟“ تورا کینہ نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے فاطمہ کو آواز دی۔

”مجھے مہذب اور غیر مہذب دونوں سے ڈر لگتا ہے۔“ فاطمہ نے طنز کیا تو عبدالرحمان بھی ہنس پڑا۔

”فاطمہ! تم واقعی ذہین ہو۔ آج تک میں نے تمہارے بارے میں صرف سنا تھا۔ آج پہلی بار تمہارا سامنا ہوا تو میں نے تمہیں اس سے بڑھ کر پایا۔ جتنا تمہارے بارے میں سنا تھا۔“ عبدالرحمان نے فاطمہ کی چوٹ کا جواب دیا۔

”تم نے درست کہا فاطمہ۔ ہم وحشیانہ کشمکش کے

دھندلکے میں رہنے والے خانہ بدوشوں کو پیار اور محبت سے کیا لین دین۔ تیروں سے بھیڑیوں کا شکار کرنے والیاں اور میدانِ جنگ میں اپنے مردوں کے ساتھ شریک ہونے والیاں، پیار کیا جانیں۔“ تورا کینہ نے تقریباً افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

”خاتون اعظم! میں نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ میرا مقصد ہرگز آپ کا دل دکھانا نہ تھا۔ اگر آپ کو میرے کہے سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میں تو چاہتی تھی، آپ دونوں پہلی بار یوں تنہائی میں ملے ہیں۔ اپنے دل کی باتیں کر لیں اس لیے آپ کو تخلیہ دینا چاہتی تھی۔“ فاطمہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور ان سے دور ہٹ گئی۔

”ملکہ معظم! آپ سے ملنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس جرم کی پاداش میں میرے جسم کی بوٹیاں بھی جانور کھانے سے کترانے لگیں۔“ عبدالرحمان نے اپنے خوف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”عبدالرحمان! ہم خانہ بدوش عورتیں اپنی ضد کی بہت پکی ہوتی ہیں اور اپنی پسند تو ریچھ کے منہ سے بھی چھین لیتی ہیں پھر تمہیں کس بات کا خوف ہے۔ تم شہنشاہیت کی عظیم خاتون کی پسند ہو۔ تورا کینہ خاتون کی چاہت ہو۔ تمہاری طرف میلی آنکھ اٹھنے سے پہلے نکال دی جائے گی۔ تم بے فکر رہو۔“ تورا کینہ نے بڑے جوش اور غرور سے جواب دیا۔ ”تم بلاجھجک جس وقت چاہو مجھ سے مل سکتے ہو۔ اب میری تنہائیاں تمہارے دم سے آباد ہو چکی ہیں۔“

عبدالرحمان بھی تورا کینہ خاتون کی شہ پر اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے لگا تھا۔ اب اسے کسی بات کا خوف اور ڈر نہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھے لیے لیا. چت سائی، جو تیس سال سے مشیر رہا تھا اور جس کی عزت ہر کوئی کرتا تھا، اس کے معاملات اور اس کی دی ہوئی تجاویز پر بھی برملا تنقید کرنے لگا تھا۔ اب خانہ بدوشوں کے حلقے میں محبوب ملکہ تورا کینہ کا عروج بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اوغدائی بڑے صبر و تحمل سے اس کی بات سنتا اور ہر بات کو پورا کرتا تھا۔ اب تورا کینہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی متمدن ملکوں کی شہزادیوں اور ملکاؤں کی طرح شان و شوکت سے زندگی بسر کرے۔

☆☆☆

بڑے دنوں سے تورا کینہ اپنے شوہر اوغدائی کے رویّے میں عجیب سی بے چینی اور اضطراب دیکھ رہی تھی۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی نہ تھی کہ تولوئی کی اچانک موت کا صدمہ اس نے اپنے ذہن پر بے حد لیا تھا اور اب ہر وقت اس کا غم غلط کرنے کے نام پر شراب پیتا رہتا تھا۔ اگرچہ چغتائی نے اس پر پابندیاں بھی عائد کر رکھی تھیں لیکن وہ پھر بھی دن بدن شراب کی مقدار بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو عنانِ حکومت تورا کینہ کے ہاتھوں میں تھی مگر کچھ دنوں سے اوغدائی کے رویّے میں بے حد تبدیلی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس بارے میں فاطمہ نے بھی ایک دو بار اشارتاً اس کی توجہ دلائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تولوئی کی موت نے سیورقوقطنی کو ایک بادشاہ بیوی کی حیثیت سے بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اس نے بیوہ ہونے کے باوجود ماتم میں کوئی خاص آفت نہ اٹھائی تھی۔ اس کے برعکس اس نے اپنے آپ کو زیادہ حسین بنانے کے لیے چین سے آئے ہوئے میک اپ کے رنگ و روغن سے اپنا آپ سجانے، سنوارنے اور بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تولوئی کی لاش کے قریب بھی جب وہ بیٹھی تو اس کا چہرہ سنگِ عقیق کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا اور بال کنگھی کر کے چمکائے ہوئے تھے۔ وہ شروع سے ہی نرم آواز میں بات کرتی تھی۔

اوغدائی اور تولوئی کے ہر فیصلے کی تائید کرتی بلکہ اوغدائی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی تھی۔ اوغدائی بھی سیورقوقطنی کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔

تورا کینہ باوجود اتنی چالاک ہونے کے سیورقوقطنی کے اس رویے کو نظر انداز کرتی رہی۔ جب فاطمہ نے اس کی حرکات و سکنات کے بارے میں ملکہ اعظم کو بتایا، تب اس نے بڑے غور سے اس کے رویے کو جانچا تو اسے وہ ہر معاملے میں مشکوک نظر آئی۔ تولوئی کی وفات پر جب شامان اور پجاری ماتم پرسی کے لیے اس کے پاس آئے تو اس نے خاموشی کے ساتھ انہیں تحفے دیے۔ تورا کینہ نے اندازہ لگایا کہ سیورقوقطنی کو اس طرح ماتم پر بیٹھا دیکھ کر اوغدائی کا دل دکھ رہا ہے۔ وہ بار بار اس کے گرد بھونرے کی طرح چکر لگاتا۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرتا۔ جب کتنی دیر تک وہ اسی حالت میں رہنے لگی تو اوغدائی سے برداشت نہ ہو پایا۔ وہ اس کے قریب آکر جھکا اور بولا۔

”جو تمہارا جی چاہتا ہے مانگو۔ میں انکار نہ کروں گا۔“

سیورقوقطنی نے اپنی خوب صورت آنکھیں اٹھائیں اور بڑے دلار سے بولی۔

”خاقان اعظم! مجھے آپ کی محبت اور ہمدردی پر فخر ہے۔“

”نہیں سیورتوقطقی پھر بھی تم جو چاہو مانگ سکتی ہو۔“ اوغدائی نے دوبارہ کہا۔ تورا کینہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموش چھائی رہی۔ بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

”جو کچھ بھی مانگوں، آپ مجھے دے دیں گے؟“

”ہاں بالکل۔“ اوغدائی نے جواب دیا۔

”تو مجھے اپنا خدمت گار دے دیں۔ میں اسے اپنی خدمت کے لیے رکھنا چاہتی ہوں۔“

تورا کینہ اس کی خواہش سن کر ایک لمحے کو ہنس دی۔ وہ جانتی تھی کہ اوغدائی کا یہ خدمت گار بڑے کام کا آدمی تھا اور خاقان اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”کچھ اور مانگو سیورتوقطقی! تم جانتی ہو، مجھے یہ خدمت گار کس قدر عزیز ہے۔ میں اسے تورا کینہ کو دینا پسند نہیں کرتا۔ تمہیں کس طرح دے دوں۔ اس کے بدلے میں کچھ اور مانگ لو۔“

اوغدائی کا یہ جواب سن کر سیورتوقطقی بے اختیار ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ وہ روتی جاتی تھی اور ہچکیاں لیے جاتی تھی۔ اوغدائی سے اس کا رونا برداشت نہ ہوسکا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔ تب سیورتوقطقی روتے ہوئے بولی۔

”میں تولوئی سے محبت اور عشق کرتی تھی اور آپ کا بھی بے پناہ احترام کرتی ہوں۔ آج مجھے دکھ ہورہا ہے کہ میرے تولوئی نے کس کی خاطر خود کو قربان کیا۔ کس کے لیے اس نے اپنی جان دی!“

اس کی بات سن کر اوغدائی کو خود پر بڑا افسوس ہوا۔ وہ دوزانو ہوکر اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے دکھ زدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں سیورتوقطقی! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی خودغرض ہوں۔ مجھے تمہارے رنج اور اپنے رویے پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ تم جو چاہتی ہو، وہی ہوگا۔ آج کے بعد یہ خدمت گار تمہاری خدمت پر مامور ہوگا۔ مجھے معاف کردینا۔“

”خاقانِ اعظم! تم کتنے عظیم اور پیارے ہو!“ سیورتوقطقی نے کہا۔

تورا کینہ نے دونوں کی باتیں سنیں اور اپنی یورت میں آکر بڑے غصے سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ اس نے فوراً خدمت گار کے ہاتھ فاطمہ کو بلوانے کا کہا۔ تھوڑی دیر میں فاطمہ بھی یورت میں آگئی تھی۔ وہ آتے ہی معاملہ بھانپ گئی تھی۔

”ملکہ معظم! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں مگر وہ سیورتوقطقی اور خاقان اعظم۔“ غصے سے اس کی زبان سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔

”میں جانتی ہوں ملکہ اعظم۔ بڑے عرصے سے جانتی ہوں۔ اس وقت سے جب تولوئی ابھی زندہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بیوی سیورتوقطقی اس کے لیے بنتی سنورتی ہے۔ اس کو دکھانے اور رجھانے کو یہ سب کرتی ہے لیکن نہیں خاتون اعظم! میں نے آپ کی ہمراہی میں آتے ہی اس کی نظروں کے پیغام پڑھ لیے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں کئی بار آپ کو بتایا بھی مگر آپ نے شاید اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔“

”عورت جب ہر وقت بننے سنورنے پر دھیان دینے لگے تو اس کے دل میں کہیں ادھر ادھر کسی کونے کھدرے میں چور چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ جو وقت آنے پر خودبخود ظاہر ہوجاتا ہے!“

”آج کا واقعہ آپ کے لیے نیا ہوسکتا ہے مگر اس کنیز کے لیے نہیں۔ میں آپ کا نمک کھاتی ہوں تو آپ کے مفادات کا تحفظ بھی میرے ذمے ہے۔ میں ایسے کئی واقعات کی گواہ ہوں مگر آپ کو بتانے سے اس لیے گریز کرتی تھی کہ شاید اس کا آپ کو یقین آئے یا نہ آئے۔“

”ہوں! تورا کینہ نے کچھ سوچتے ہوئے لفظ ”ہوں“ کو طول دیتے ہوئے کہا۔

پھر اس رات تورا کینہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ اوغدائی کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہارا عبدالرحمان آج کل بڑا اونچا اڑ رہا ہے۔ درباریوں کو اس سے بڑی شکایتیں ہیں!“

”اور وہ جو سیورتوقطقی اڑانیں بھر رہی ہے۔ اس کی طرف درباریوں کی نظریں نہیں جاتیں؟“ تورا کینہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”مطلب؟“ خاقان اعظم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اب اس کا مطلب بھی مجھے سمجھانا ہوگا۔ مانا کہ نت نئی عورتوں میں دلچسپی لینا تمہاری خاندانی فطرت ہے مگر ایسا بھی کیا، دنیا کو فتح کرنے والا اور ایک جہاں پر حکومت کرنے والا خاقان گھاس کے تنکے کی طرح کمزور ہوگیا ہے کہ عورت کی ایک پھونک سے ہی اڑ جاتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں، سیورتوقطقی اور پھونک کا آپس میں

کیا تعلق ہے؟ کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتی ہو کہ سیورتوقطقی نے شامانوں سے سحر سیکھ لیا ہے اور وہ دوسروں پر پھونکیں مار کر انہیں سحر میں گرفتار کرنے لگی ہے!“ خاقان اعظم نے وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا۔

”مردوں کو لبھانا بھی ایک سحر ہی ہوتا ہے خاقان اعظم اور سیورتوقطقی تو یہ ہنر شروع سے ہی جانتی ہے۔ اتنے بچوں کی ماں ہونے کے باوجود جب کوئی عورت اپنے جسم اور اپنی خوب صورتی کو قائم رکھنے کی تگ ودو کرتی ہے تو اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟“ تورا کینہ نے غصے سے کہا۔

”کیا سیورتوقطقی نے کوئی ایسی حرکت کی ہے۔ تمہارا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟“ اوغدائی نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

”ہاں ہاں۔ میرا اشارہ تم دونوں خاقان اعظم اوغدائی اور تولوئی کی بیوہ سیورتوقطقی کے اس کھیل کی جانب ہے جو سارے خاندان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کھیلا جارہا ہے۔ میں نہ جانتی تھی سیورتوقطقی اتنا بن سنور کر کیوں رہتی ہے۔ کس کی خاطر وہ اس قدر اپنے آپ کو سنوارتی ہے۔ مجھے تو پتا ہی آج لگا۔ آج میری آنکھیں کھلی ہیں۔ وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ میرے حق پر ڈاکا ڈال رہی ہے۔ وہ خاقان اعظم کی بیوی بننے کے لیے پرتول رہی ہے۔“ تورا کینہ نے تیز لفظوں میں اپنا مدعا بالآخر بیان کر ہی ڈالا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ الزام ہے ہم دونوں پر!“ اوغدائی بھی غصے میں بول اٹھا۔

”کیا ان آنکھوں نے جھوٹ دیکھا کہ سیورتوقطقی تمہارے سینے پر سر رکھے ہوئے بڑے پیار سے گفتگو کررہی تھی۔ تمہاری اور سیورتوقطقی کی محبت کے کئی ایسے چور لمحوں کی گواہیاں میرے پاس موجود ہیں۔“ تورا کینہ گلا پھاڑ کر بولی۔

”تمہاری یہ باتیں میری سمجھ سے بالا ہیں۔ میں نہیں جانتا تم ہم دونوں پر یہ الزام لگا کر اپنا کونسا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہو۔“ اوغدائی نے غصے سے جواب دیا۔

”ہاں ہاں چور چوری کرتا ہوا بھی پکڑا جائے تو کب مانتا ہے۔ بہانے ڈھونڈتا ہے اور سچ کو بھی جھوٹ بنانے پر تلا ہوتا ہے۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر مجھے حملہ آور سے کہہ کر یورت سے اٹھوا دو۔ مجھے کسی دوسرے کے حوالے کردو۔ جیسے ہم خانہ بدوشوں کی عورتیں بھٹکتی ہیں۔ جیسے تمہاری والدہ کو اٹھالیا گیا تھا۔ جیسے مجھے تم نے چھین لیا تھا۔ یہ سب ہوتا آیا ہے۔ اب بھی تم کرواسکتے ہو۔ میرے بعد خوب عیش و

ماضی

آغا نے یک لخت ماضی کے مرغزاروں سے سر نکال کر فیر کیا۔ ”یادش بخیر کبھی ایک ہی رہی۔ اپنا تو عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں آتا، اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں لیکن جو اپنے ماضی کو یاد ہی نہیں کرنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔ کیا سمجھے؟“

مدتیں گزریں ٹھیک سے یاد نہیں بحث کن دل آزار مراحل سے گزرتی ہوئی اس تجریدی نکتے پر آپہنچی کہ ماضی ہی اٹل حقیقت ہے۔ اس لیے کہ ایک نہ ایک دن یہ اژدہا حال اور مستقبل دونوں کو نگل جائے گا۔ دیکھا جائے تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ، ہر آن اور ہر پل ماضی کی جیت ہورہی ہے۔ آنے والا کل آج میں اور آج گزرے ہوئے کل میں بدل جاتا ہے۔ اس پر پہلے درویش نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ایشیا کا حال اس شخص جیسا ہے جس نے:

گئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی

مشرق نے کبھی پل کے روپ سروپ سے پیار کرنا نہیں سیکھا۔ جینا ہے تو پھسلتے سرسراتے لمحے کو دانتوں سے پکڑو۔ گزرتے لمحے کو بے جھجک چھاتی سے لگاؤ کہ اس کی نس نس میں ماضی کا نیم گرم خون دوڑ رہا ہے۔ اسی کی جیتی جیتی کوکھ سے مستقبل جنم لے گا اور اپنی چھل بل دکھا کر آخر اسی کی طرف لوٹے گا۔

یہاں چگی ڈاڑھی والے درویش نے اچانک بریک لگایا۔ ”آپ کے ننھے منے لمحے کے نجیب الطرفین ہونے میں کیا کلام ہے لیکن بیتی ہوئی گھڑیوں کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹوتھ پیسٹ کو واپس ٹیوب میں گھسانا! الا کہ یہ دنیا غلط کدہ سہی لیکن کیا اچھا ہو کہ ہم ماضی کے دھندلے خاکوں میں چیختے چنگھاڑتے رنگ بھرنے کے بجائے حال کو روشن کرنا سیکھیں۔“

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس)

زریان سلطان کا مطالعہ

عشرت کرلینا۔ اس خوب صورت بلا سیورقوقطنی کے ساتھ۔''
تورا کینہ اپنی عادت کے مطابق دہاڑ رہی تھی۔
''تم حد سے تجاوز کررہی ہو۔ میں اس کے لیے قسم دینے کو تیار ہوں کہ ہم دونوں کے بیچ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔'' خاقان اعظم نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔
''اگر یہ جھوٹ ہے تو میں تب مانوں گی جب میری دو شرائط پر عملدرآمد ہوگا۔ یوں جان لو یہ تمہاری اور اس بیوہ کی آزمائش ہے۔'' تورا کینہ نے خاقانِ اعظم کو امتحان میں ڈال دیا۔
''کہو۔'' اوغدائی خاقان نے پوچھا۔
''تم اس سے یا خاندان کے شہزادوں سے پوچھے بغیر سولدو قبیلے کے دو ہزار سوار اپنے بیٹے کے حوالے کردو۔ دوسرا اگر وہ اس پر رضامند ہوجاتی ہے تو قبائلی دستور کے مطابق اپنے بڑے بیٹے قویوق کی سیورقوقطنی کے ساتھ شادی کرادو کیونکہ کسی کے مرنے کے بعد اس کا بھائی یا بھتیجا اس کی بیوی سے شادی کرسکتا ہے۔ سیورقوقطنی کی دوبارہ شادی کرادو۔ اس طرح میں سمجھوں گی میرے راستے کا کانٹا ختم ہوگیا ہے اور خاقان اعظم مجھ سے بے انتہا پیار کرتا ہے۔''
تورا کینہ نے اپنی شرائط خاقان اعظم کے سامنے رکھیں تو اوغدائی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
''تمہاری دونوں شرائط میں سے ایک کا تعلق میرے ساتھ جبکہ دوسری کا تعلق سیورقوقطنی کے ساتھ ہے۔ میں اپنی شرط تو پوری کردوں گا مگر اس سے متعلق شرط کا جواب اسی سے پوچھ کر بتایا جاسکتا ہے!''
خاقان نے تولوئی کی بیوہ کو آزمانے کی خاطر اس سے یا خاندان زریں کے شہزادوں سے مشورہ کیے بغیر سولدو قبیلے کے دو ہزار سوار اپنے ایک بیٹے کی تحویل میں دینے کے احکام جاری کردیے۔ جب اس کا علم فوج کو ہوا تو اس پر تولوئی کی فوج کے زیر کمان ہزاری اور دو ہزاری سوار سیورقوقطنی کی یورت میں اس کے بیٹوں اور خاندان کے دوسرے شہزادوں کے سامنے جمع ہوئے اور کہنے لگے۔
''یہ دو ہزار سولدو سوار چنگیز خاں کے فرمان کے مطابق ہماری فوج کے حصے میں آئے تھے۔ اب اوغدائی نے انہیں اپنے بیٹے کے حوالے کردیا ہے۔ یہ کون برداشت کرسکتا ہے۔ ہم چنگیز خاں کی بریغ کے الفاظ کی کیونکر نافرمانی کرسکتے ہیں۔ ہم اس کی شکایت خاقان کے روبرو بھی کریں گے!''
سیورقوقطنی نے ان کی باتیں سن کر آہستگی سے انہیں کہا۔
''تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن سوچو تو سہی کیا ہمیں کچھ کم مال و دولت ملی ہے۔ ہمارے ساتھ کس بات کی کمی کی گئی ہے اور پھر فوج اور ہم سب خاقان ہی کے تو ہیں۔ ہم سب اس کے چاکر ہیں اور وہ جانتا ہے کہ کون سا حکم مناسب ہے۔ ہم اس کی مرضی کے آگے سر جھکا دیں گے!''
یہ سن کر سردار خاموش کھڑے رہے۔ اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ جب اس بات کا علم تورا کینہ کو ہوا تو وہ جل بھن گئی۔ اسے لگا کہ سیورقوقطنی نے اپنی دانائی اور ذہانت سے ایک بار پھر اسے شکست دے دی ہے۔ اب اس کا مطالبہ تھا کہ جیسے تیسے اس کی دوسری شرط پر عملدرآمد کرایا جائے۔ سیورقوقطنی کا سرداروں کو یہ جواب خاقان اعظم کے دل میں اس کی عزت مزید بڑھا چکا تھا۔ اس نے شہزادوں کے سامنے کہا کہ:
''بھلا عورتوں میں کوئی اس کا مقابلہ بھی کرسکتی ہے؟''
اوغدائی نے تورا کینہ کی دوسری شرط کے بارے میں سوچا تو اسے اس میں بہتری نظر آئی۔ قویوق ہمیشہ افسردہ اور تنہا رہتا تھا۔ بیماری اور آسیب اسے ستاتے رہتے تھے۔ اس نے سوچا اگر سیورقوقطنی اس سے شادی پر رضامند... ہوجاتی ہے تو یہ قویوق کے لیے ایک نعمت بن جائے گی اس طرح اس کا اور تولوئی کا گھر ایک ہوجائے گا۔
اس نے سیورقوقطنی سے اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے قاصد بھیجا۔ سیورقوقطنی نے خاقان کا پیغام سن کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ:
''خاقان کا کہا سر آنکھوں پر اور شکریہ کہ اسے میرا اس قدر خیال ہے مگر میں دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اب تو میری یہی تمنا ہے کہ میں اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کروں اور انہیں آداب و تمیز سکھاؤں۔ انہیں ایک دوسرے سے نفرت نہ کرنے دوں۔ ایک دوسرے سے بیگانہ نہ رہنے دوں تاکہ ان کی وفاداری سے سب کو فائدہ پہنچے!''
اوغدائی ایک ماں کی اس آرزو سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے طے کیا کہ تولوئی کا سارا ورثہ اسے ملنا چاہیے۔ اس نے سیورقوقطنی کا گھر... ان کا الاؤ جو اصلی قبیلوں کا مرکز تھا اور پرانی کارآزمودہ فوج کا زیادہ تر حصہ اس باحیا، باعفت اور عاقل خاتون کو دینے کا حکم دیا جو سیورقوقطنی نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ تورا کینہ اپنی شکست پر بس کھولتی رہ گئی۔

☆☆☆

سیورقوقطنی سے ذہنی طور پر شکست کے بعد تورا کینہ

اندر ہی اندر تلملانے لگی تھی حالانکہ فاطمہ اور عبدالرحمان نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا مگر پھر بھی وہ اس کی ذہانت، دور اندیشی اور فراست سے بری طرح شکست خوردہ ہوچکی تھی۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلانے کا طنزیہ انداز تورا کینہ کے لیے ایک طعنے کی حیثیت رکھتا تھا کہ تم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت تو کیا انہیں پڑھنا لکھنا تک نہیں سکھایا۔ ایک میں ہوں جس نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سب کچھ تیاگ دیا ہے۔
اپنی اس سوچ کا ذکر تورا کینہ نے فاطمہ سے کیا تو اس نے عبدالرحمان سے مل کر اس کی سوچوں کا رخ ہی تبدیل کردیا۔ ختا کی جنگ کے بعد اوغدائی خاصا تھک چکا تھا۔ اوپر سے تورا کینہ کی ایک ہی ضد تھی کہ اوغدائی اپنے لیے ایک محل تعمیر کروائے جس میں وہ آرام و سکون سے عیش و عشرت کی زندگی گزار سکے۔ اوغدائی خود بھی ختا کے آرام دہ مکانوں میں کچھ عرصہ گزار آیا تھا اور ان کے صحن اور باغوں کے حوض اسے بہت پسند آئے تھے۔ پھر سے خیموں کی زندگی اسے بھلی نہ معلوم ہورہی تھی۔ یہ بات اس کے ذہن میں ختا کی جنگ کے دوران ہی سما چکی تھی۔ اوپر سے وہ تورا کینہ کی ضد کا کسی طرح مقابلہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے جنگ سے فارغ ہوکر وہ ختا کے علاقے سے اپنے ساتھ ایسے کاریگر لے آیا تھا جو اپنے فن کے ماہر تھے۔ اس نے اپنے شہری قیام کے لیے جھیل بیکال کے جنوب میں جہاں سے ایک دریا پھوٹ نکلتا تھا، چراگاہوں کے لیے زمین منتخب کی اور یہاں پر مٹی سے ایک دیوار بنوا دی جو شہر پناہ کی نشانی بھی تھی اور جس میں گھوڑے بھی اکٹھا کیے جاسکتے تھے۔ اس مقام کو قراقورم کہتے تھے جس کے معنی کالی دیواریں رکھا گیا۔ اس کا دوسرا نام ''اردو بالیغ'' تھا جس کا مطلب خیموں والا شہر تھا۔ اس کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ قراقورم جہاں اس کی اپنی یورت تھی، ٹھوس بنیادوں اور اونچے میناروں والا ایک محل تعمیر کیا جائے۔ یہ محل ایک تیر کی اڑان کے برابر وسیع ہو اور اس میں شہریار جیسے مجسمے اور تصویریں نصب کی جائیں۔ اس کے ایک حصے میں اس کا دربار اور تخت گاہ بنائی جائے۔
بڑی تیزی کے ساتھ یہ کام مکمل ہوا تو اگلا فرمان یہ جاری ہوا کہ اس کے نزدیک اس کا بھائی، بیٹے اور دوسرے شہزادگان اپنے اپنے محل بنائیں۔ سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ سب کے محل مکمل ہوگئے تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس نئے بسے ہوئے شہر کو دیکھنے کے لیے آنے لگی۔ خاقان اعظم اور ملکہ معظم اب اپنے اس نئے محل میں رہنے لگے تھے۔ تب خاقان نے حکم دیا کہ ''بڑے استاد...!'' شراب نوشی کے کمرے میں ضیافت کے لیے ایسے فوارے بنائے جائیں جن کی شکلیں ہاتھی، شیروں اور گھوڑوں ایسی ہوں۔ ان جانوروں کے جسموں میں شراب یا گھوڑی کا دودھ بھر دیا جائے تاکہ ان کے آگے پڑے ہوئے چاندی کے برتنوں میں شراب یا گھوڑی کا دودھ گرا کرے۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ روزانہ پانچ سو چھکڑے جن میں سے ایک چھکڑے کو چھ چھ بیل کھینچتے ہوں، ان میں شراب، غلہ اور گوشت بھرا ہو۔ اس کے محل پر گودام سے ہر روز یہ سامان لے کر آیا کریں۔
قراقورم میں اپنے صحرائی دارالسلطنت سے دن بھر کی مسافت پر اوغدائی نے ضیافت کے لیے ایک بڑے شامیانے جتنا ہال بنوایا۔ جب ضیافت کرنی منظور ہوتی تو وہاں چلا جاتا اور بہار کے ایک دو مہینے وہ اپنے محل میں قیام کرتا۔ اس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ محل کے سارے ملازمین ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنیں۔ مہینا بھر وہ محل کی مسرتوں میں گزارتا۔ وہ خزانے کے دروازے کھول دیتا اور امیر و گدا سب اس کی فیاضی سے مالا مال ہوتے، شکار کے لیے اس نے الگ حصہ بنوایا۔
تورا کینہ کی یہ ضد بھی پوری ہوچکی تھی۔ وہ اب خیموں سے نکل کر محلوں میں رہنے لگے تھے۔ سیورقوقطنی بھی اپنے بچوں کو لے کر نئے محل میں آچکی تھی۔ اب ان کی زندگی میں شہروں کی رنگینیاں جھلملانے لگی تھیں۔
چراگاہوں میں اوغدائی کے محلوں کی تکمیل سے بہت پہلے سوبودائی کے حملوں کی وجہ سے ختا کے شہر خاک کا ڈھیر بن چکے تھے۔ تعمیرات سے فارغ ہوکر ایک بار پھر اوغدائی نے ختا کا مکمل طور پر حل نکالنے کے لیے سوبودائی کو ختا کے شہروں اور قلعوں پر حملے کے لیے کہہ دیا۔ پہلے حملوں میں تو ختا شکست کھا چکے تھے مگر اس بار ان کی خدمت کے لیے انجینئر موجود تھے۔ ان کے پاس اب آگ کی ایسی منجنیقیں تھیں جو ''ہو پاؤ'' کہلاتی تھیں۔ یہ منجنیقیں بارود کی وجہ سے قیامت ڈھاتی تھیں۔ وہ اپنی جنگی حکمتِ عملی اور توانائی کے باوجود ''ہو پاؤ'' سے اس وقت تک ڈرتے رہے جب تک انہوں نے خود ان مشینوں کو استعمال کرنا نہ سیکھ لیا۔ اہلِ ختا نے ان کے پے درپے حملوں کا بڑی جرأت سے مقابلہ کیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ سوبودائی نے اپنی جنگی حکمتِ عملی کو تبدیل کرکے اپنی فوج کو آرام دینے کے لیے

اہلِ ختا کی فصیلوں کو حد نظر دور تک ہٹالیا۔ بعدازاں کچھ دنوں کے وقفے کے بعد دوبارہ حملہ کرکے شہنشاہ زریں کو شکست سے دوچار کیا پھر اس کے بچے کھچے شہروں کو زیر کرنا شروع کردیا۔

لیے لیو چت سائی چونکہ ختائی تھا اس لیے اس کی ساری ہمدردیاں اہلِ ختا کے ساتھ تھیں۔ وہ اس وقت شمالی چین کا گورنر بنا ہوا تھا۔ اس نے حتی الوسع بہت سے کارآمد شاہکاروں کو ان کی دست برد سے بچالیا لیکن جب اس نے نان کنگ کے سقوط کی خبر سنی تو وہ سیدھا اوغدائی کے پاس پہنچا اور اس سے کئی لاکھ باقی ماندہ افراد جو نان کنگ میں موجود تھے، ان کی جاں بخشی کے لیے کہا۔

اوغدائی نے ایسا کرنے سے انکار کردیا تو اس نے دلیل دی کہ ختا کی زمین میں اب اس کے باشندوں کے سوا باقی کیا بچا ہے جو غلہ اور چاول اگاتے ہیں۔ ریشم کے کیڑوں اور شہتوت کے درختوں سے ریشم حاصل کرتے ہیں۔ اوغدائی نے پھر انکار کیا مگر لیے لیو چت سائی اس سے باقاعدہ بحث پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اسے پھر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تو سوچیے کہ ختا میں آپ نے جو خزانہ حاصل کیا ہے، سارا سونا چاندی، بیش قیمت اشیا، تلواروں اور تیر کی نوکوں کی بے مثال افراط یہ صرف چند ہنرمندوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ اس پشت کے آدمیوں کا خاتمہ کردیں گے تو آپ کے لیے اور خزانے کا سامان کیسے بنے گا؟''

یہ بات اوغدائی کی سمجھ میں آگئی۔ اس لیے اس نے سوبودائی کو حکم بھیج دیا کہ شہری آبادی کی جاں بخشی کردی جائے۔ اوغدائی جانتا تھا کہ لیے لیو چت سائی کا کوئی وعدہ اب تک جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔

لیکن قراقورم کے بہت سے امراء کا اس بات سے اطمینان نہ ہوا حالانکہ لیے لیو چت سائی نے اوغدائی سے وعدہ کیا تھا کہ ایسا وقت بہت جلد آجائے گا کہ وہ ختا کی مال گزاری سے ہر سال دس لاکھ اونس چاندی وصول کرسکے گا۔

قراقورم کے ... امراء کو عبدالرحمان اور تورا کینہ کی حمایت حاصل تھی۔ اس روز جب تورا کینہ ضیافت ہال دیکھنے کے لیے گئی تو اس نے فاطمہ کے ذریعے عبدالرحمان کو ملنے کے لیے بلوا بھیجا تھا۔ فاطمہ اور عبدالرحمان دونوں ضیافت ہال میں پہنچ چکے تھے۔ جب تورا کینہ وہاں پہنچی تو فاطمہ نے دوڑ کر تورا کینہ کو گلے لگالیا اور گلہ کرتے ہوئے بولی۔

''ملکہ اعظم کو نئی اور شاندار رہائش گاہیں بنوانے پر بہت بہت مبارک ہو۔ اب زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ اس قوم کے پاس شہروں کی طرح خوب صورت اور شاندار مکانات موجود ہیں اور اس کے شہنشاہ کے پاس عظیم الشان محلات۔''

''یہ سب تمہارے مشوروں کی وجہ سے ہوا یا پھر میری ہٹ دھرمی نے خاقان کو یہ محلات بنوانے پر مجبور کردیا۔ دگرنہ بڑوں کی طرح ساری عمر ان یورتوں میں گزار دیتا۔'' تورا کینہ نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ اس سے ذرا ہٹ کر عبدالرحمان کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ تورا کینہ اس سے ہٹی تو وفورِ جذبات سے دوڑتے ہوئے عبدالرحمان کے گلے جا لگی۔ اس نے بالکل اسی طرح جیسے سیورقوقتنی نے اوغدائی کے سینے پر سر ٹکایا تھا، اپنا سر عبدالرحمان کی چھاتی پر ٹکا دیا اور محبت سے بولی۔

''ہم نے کبھی بھی یہ نہیں چاہا تھا کہ تم ہماری ملکیت میں رہتے ہوئے بھی اتنی اتنی دیر تک ہم سے دور رہو۔''

''خاتون اعظم! محبت جب تک دوریوں کا مزہ نہ چکھ لے، اتنی دیر تک اس میں استقامت نہیں آتی پھر آپ لوگ تو تعمیرات کے جھنجٹ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس قدر خوب صورت اور عظیم الشان محلات کی تعمیر پر اس خاکسار کی مبارک باد بھی وصول کیجیے گا۔'' عبدالرحمان نے تورا کینہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔ یہ سب آپ ہی لوگوں کے مشوروں سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔''

''ان تعمیرات پر اٹھنے والے اخراجات اور خاقان اعظم کی فراخ دلی و شاہ خرچیوں سے خزانہ تو خالی ہونے کے قریب ہوچکا ہوگا۔'' عبدالرحمان بولا۔

''ہاں اس کا احساس مجھے بھی ہے۔'' تورا کینہ نے اس کی چھاتی سے اپنا سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اگر محاصل سے اتنی آمدنی ہوسکتی ہے جس کا اندازہ لیے لیو چت سائی نے لگا کر خاقان اعظم کو بتایا ہے تو یہ محاصل دگنے کیوں نہ کردیے جائیں تاکہ دگنی آمدنی ہو۔ میں نے یہ شکایت اور تجویز خاقان اعظم سے بھی کی ہے کہ محصول کم لگایا گیا ہے۔'' عبدالرحمان نے دل کی بات تورا کینہ سے کرکے اسے نئی راہ دکھائی۔

''ان کی بات سو فیصد درست ہے۔ اس طرح خزانہ ایک بار پھر بھر جائے گا مگر اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ وہ بوڑھا مشیر لیے لیو چت سائی ہے جو چینی تمدن کے تحفظ اور بقا

کی لڑائی بڑا چھپ چھپاتے لڑ رہا ہے۔'' فاطمہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''میں بھی بڑی دیر سے یہ محسوس کررہی ہوں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خاقان اعظم کو اس پر بے حد اعتماد ہے۔ وہ اس کی کسی بات اور کسی مشورے کو پس پشت نہیں ڈالتا۔''

''خاقان اعظم کی لگام عظیم خاتون تورا کینہ خاتون کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس لگام سے کب اور کیا کام لینا ہے۔'' عبدالرحمان نے مسکراتے ہوئے اتنا کہہ کر تورا کینہ کے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا۔

یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ قراقورم کے بہت سے امراء نے پہلی بار خاتون سے شکایت کی کہ ختا میں محصول کم لگایا گیا ہے۔ تورا کینہ نے یہی بات اس انداز سے خاقان کو سمجھائی کہ ایک موقع پر اس نے حکم دیا کہ لیے لیو چت سائی کو قید کرلیا جائے مگر چند دنوں کے بعد اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو اسے دوبارہ رہا کرکے اپنا وزیر بنالیا۔ لیے لیو چت سائی نے اس پر احتجاج بھی کیا تو خاقان نے قاصد کے ہاتھ جواب بھیجا۔

''دن بھر میں میری زبان سے بھولے میں ہزاروں باتیں نکل جاتی ہیں، میں کس کس کا الزام اپنے سر لوں مگر حقیقت یہ ہے کہ تم بے گناہ ہو، اس لیے تمہیں اپنے عہدے پر بحال کیا جاتا ہے!''

☆☆☆

موسم بہار 1235ء کا ذکر ہے جو اس قوم کی جنتری کے لحاظ سے بکری کا سال تھا۔ اوغدائی نے دوسری قرولتائی طلب کی تاکہ قراقورم کے محل کی تیاری اور آبادی کی تقریب میں ضیافت کی جائے۔ تقریب میں ضیافت کی پہلی رنگین شام تھی۔ اس کے پہلو میں بائیں جانب ملکہ اعظم تورا کینہ بڑی شان و شوکت سے براجمان تھی۔ شراب نوشی کے طویل ایوان میں اس کے ہزاروں عزیز اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ چمکتے ہوئے گھوڑوں، ہاتھیوں اور شیروں کے منہ سے شراب اور گھوڑیوں کے دودھ سے چاندی کے پیالوں کو بھرا جارہا تھا۔ سارے مہمان نیلے رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ نیلا رنگ جو آسمان کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ جب اوغدائی نے پینے کے لیے جام اٹھایا تو پہلے اس نے لیے لیو چت سائی کا جام صحت تجویز کیا اور ساتھ ہی کہنے لگا۔

''دیکھو تو سہی یہاں میرے پاس بیٹھے بیٹھے یہ شخص دور دور سے میرے لیے سونے اور جواہرات کے خزانے کھینچ منگاتا ہے، آج تک کسی شہریار کو ایسا وزیر کہیں ملا ہے! اس لیے میں لیے لیو چت سائی کو ختا کا حاکم اعلیٰ مقرر کرتا ہوں۔'' اس اعلان کے ساتھ ہی مغنیوں کی صف کی صف نے راگ چھیڑا۔

چغتائی، اوغدائی کا بڑا بھائی جواب بڑھاپے کی طرف مائل تھا، وہ اس قرولتائی سے مطمئن تھا کیونکہ چنگیز خاں کے یاسا کے احکام اور سورث اعلیٰ کے عہد ناموں کی تکمیل ہورہی تھی۔ خاندان زریں کے سارے افراد اقوال دانش سننے کے لیے جمع تھے۔ گزشتہ چند سالوں کی فتوحات میں ختا کا نام و نشان مٹایا جاچکا تھا اور ایران میں ان سلطنت کی سرحد بحیرہ خزر کے آگے تک پہنچ چکی تھی۔ کوریا نے بغاوت کی تھی لیکن کن کے نابود کیے جانے کے بعد کوریا کی بغاوت آسانی سے ختم کی جاسکتی تھی۔

ان کے اپنے وطن میں سالہا سال کے امن اور فراغت کی وجہ سے فوج کی طاقت بہت مضبوط ہوگئی تھی۔ نئے مال و دولت سے خیمے گوداموں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے گلوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ یہ الگ بات کہ چغتائی کو قراقورم میں اوغدائی کی تعمیرات پسند نہ آئی تھیں۔ وہ خود خیموں میں رہنے کا قائل تھا لیکن وہ یہ بات سوچ کر خاموش تھا کہ خانہ بدوشوں کا آئین یہی تھا کہ شہروں کی دولت صحراؤں میں کھینچ لائی جائے۔ کتنے دنوں سے درباریوں کے ساتھ اوغدائی مشورے کررہا تھا کہ اب نئی مہم کا وقت آگیا ہے اور یہ بہت بڑے پیمانے پر ہوگی۔ وہ اب مغرب کی طرف بہت بڑے پیمانے پر یلغار کا سوچ رہے تھے۔ شامانوں اور لاماؤں نے بھی اوغدائی کی اس تجویز کو درست قرار دیا تھا۔

تورا کینہ نے بھی اس تجویز کو اپنی منظورِ نظر کنیز فاطمہ سے مشورہ کرنے کے بعد منظور کرلیا تھا مگر اس تجویز میں یہ ردوبدل کیا کہ اس مہم کی نگرانی اوغدائی کے بجائے کوئی اور کرے گا اور اوغدائی خود اس کے ساتھ قراقورم ہی میں قیام کرے گا۔ اوغدائی کی خواہش تھی کہ وہ اس مہم کی نگرانی خود کرے لیکن ہر ایک کے اصرار پر اسے رکنا پڑا کیونکہ کن کی یلغار میں خاقان کی جان جاتے جاتے بچی تھی اور اب وہ دوبارہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس یلغار میں جانے میں رکاوٹ ہر کسی کے اپنے اپنے مفادات تھے۔

سیورقوقتنی اگرچہ اس مہم میں اپنی رائے خاقان کے ساتھ ہم آہنگ رکھتی تھی مگر اپنے چھوٹے بیٹے قبلائی خاں کو مہم میں نہ جانے دینا چاہتی تھی۔ اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ خاندان کے الاؤ کو روشن رکھنے کے لیے اور نوجوان طالب

علموں کے ساتھ تعلیم پانا اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ لیو چت سائی کا وہ وعدہ تھا جو اس نے سیورقو قطنی سے کیا تھا کہ اس کے بیٹے قبلائی خاں کے لیے زیادہ بہتر استاد مقرر کرے گا۔ لیے لیو چت سائی بڑا دانش مند اور زیرک وزیر تھا۔ اسے اس نئی مہم میں فوج کے چناؤ پر بھی اعتراض تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ترکوں کو، جو ابھی اچھی طرح متمدن نہیں ہونے پائے اس کے ملک میں نہ گھسنے پائیں۔

بڑے رودکد کے بعد 1236ء کے موسم گرما میں ان کی نئی فوج آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ فوج کے ہراول دستے کے قاصد آگے تھے جو فوجی ضروریات کی نہ صرف چیزیں فوج کے لیے مہیا کرتے بلکہ راہ کی رکاوٹیں بھی دور کرتے تھے۔ ان کے پیچھے بیل گاڑیاں چرچراتی چلی آرہی تھیں۔ ان کے پہیوں سے لنگ لنگ کی آواز آتی۔ ان کے گھوڑے سیاؤ سیاؤ کہہ کر ہنہناتے۔ جن کی... لگامیں تھامے تیر کمانیں سنبھالے سوار چلے آتے۔ بیل گاڑیوں پر منجنیقیں اور آتش بار گولا بارود تھا۔ یہ گندھک اور دوسرے آتش گیر مادے ان پر اسرار اور نئے آتشیں اسلحے کے ساتھ ساتھ چلے جارہے تھے۔

فوج کا ہر دستہ دس دس کی اکائیوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ دس دس سپاہی سالہا سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ ان دس سواروں کا جمعدار ''اونگ خان'' کہلاتا تھا جس کے ذمے ان کی حفاظت اور بہبود کی ذمے داری ہوتی تھی۔ اس طرح انتہائی منظم طریقے سے فوج کے دوسرے حصوں کو ترتیب دیا گیا تھا۔ چنگیز خاں کا سب سے بڑے بیٹا جوجی خاں ایک عرصے سے جلاوطنی کے عالم میں زندگی بسر کررہا تھا۔ اس مہم میں اوغدائی نے دانائی سے کام لیتے ہوئے اس کے بڑے بیٹے باتو خان کو بھی اس مہم میں شامل کرکے اسے مغرب کی جنگل والی قوموں کا خان بنادیا تھا اور اسے اس نئی مہم کا برائے نام سپہ سالار مقرر کیا تھا۔

سوبودائی نے دسمبر 1237ء میں شمال مغرب کے بڑے روسی شہروں پر حملہ کیا۔ فروری کے مہینے تک روسی بارہ قلعہ بند شہر تباہ کردیے گئے۔ دسمبر اور مارچ کے ختم ہونے تک روس کے آزاد باشندوں کا خاتمہ ہوگیا۔

1238ء کی گرمیوں تک وہ چراگاہوں کے راستے جنوب کی طرف روانہ ہوا اور کریمیا میں تگ و تاز شروع کردی۔ کچھ دستوں نے کوہ قفقاز کی بلندیوں تک گھس کر شمالی ایران کی مغل فوج سے رابطہ قائم کرلیا۔ ان ساری مہمات میں فوج جب فتوحات پر فتوحات کرتے آگے بڑھ رہی تھی، ان سے چار ہزار میل کی مسافت پر خاقان اعظم اوغدائی اپنی چہیتی ملکہ تورا کینہ کے ساتھ نیلی جھیل کے کنارے موسم گرما گزارنے کے لیے محل میں بڑے آرام کے دن گزار رہا تھا۔ وہ محل کے ساتھ لگے ہوئے زرنگار خیمے میں شراب پی رہا تھا۔ کبھی کبھی کثرت شراب نوشی کے بعد وہ خاموش اور مدہوش ہوکر لیٹ جاتا۔ اسے اب کوئی فکر دامن گیر نہ تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے میانہ روی کی حکمت عملی پر قائم تھا کیونکہ اب اس کا زیادہ تر بار دوسروں نے اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔

ان ہی دنوں جب اوغدائی اور اس کی محبوب ملکہ اپنے نئے تعمیر شدہ محلوں میں رہ رہے تھے، ایک بار پھر ایک دوسرے کے ساتھ چپقلش شروع ہوئی۔ جب باتوں باتوں میں تورا کینہ نے اوغدائی سے کہا کہ آخر اپنے دربار کو اور زیادہ امیر بننے سے کون روکے ہوئے ہے۔ اگر تم اس کے بارے میں فیصلہ کرنے سے ہچکچارہے ہو تو میں فیصلہ کیے دیتی ہوں۔ لیے لیو چت سائی اب بوڑھا ہوچکا ہے۔ اب وہ مدبرانہ طریقے سے فیصلے کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ چاہتا تو اپنے دربار کو زیادہ امیر کرسکتا ہے۔ مگر وہ نہیں کررہا جبکہ اس کے مقابلے میں عبدالرحمان نوجوان اور بہتر فیصلے کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر لگان کی فراہمی کا انتظام اس کے سپرد کیا جائے تو وہ چین کے مفتوحہ علاقوں سے بیس لاکھ تولے چاندی لگان وصول کرسکتا ہے مگر یہ بوڑھا چینی اس کی مخالفت کررہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ لگان کی فراہمی کی ذمے داری عبدالرحمان کے سپرد کردی جائے۔

اس روز عبدالرحمان اور لیے لیو چت سائی ایک دوسرے کے ساتھ اس بات پر الگ سے بحث کررہے تھے۔

''آخر حرج ہی کیا ہے۔ اگر ان پر لگان کی رقم بڑھادی جائے؟'' عبدالرحمان نے لیے لیو چت سائی سے سوال کیا۔

''تمہیں نہیں پتا اس کا کتنا بڑا نقصان ہوگا۔'' لیو چت سائی نے جواب دیا۔

''ہم جس سلطنت کا کھاتے ہیں، ہمیں اس کی فلاح کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔''

''ایسا کرنے سے چینی عوام پر بے تحاشا بوجھ بڑھ جائے گا۔ وہاں ترقی کی رفتار رک جائے گی۔'' لیو چت سائی نے کہا۔

''ادھر چاہے خزانہ خالی ہوجائے۔ تمہیں پتا ہے کہ اس وقت سلطنت پر اقتصادی لحاظ سے کتنا بوجھ ہے۔''

عبدالرحمان نے دلیل دی۔

''جانتا ہوں۔ یہ سب خاقان کو دیے تم جیسے حواریوں کے غلط مشورے ہیں جن کی وجہ سے سلطنت مصائب کا شکار ہوتی جارہی ہے۔'' لیو چت سائی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم عمر کے اس حصے میں جا کر اول فول بکنے لگے ہو۔ تم خاقان پر الزام لگا رہے ہو۔'' عبدالرحمان نے پینترا بدلا۔

''نوجوان! میں جانتا ہوں، تمہاری جذباتی عمر ہے اور مجھے یہ بھی علم ہے تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے۔''

لیو چت سائی آخر پھٹ پڑا۔ ممکن تھا کہ بات اور آگے بڑھ جاتی کہ لیو چت سائی خود ہی دوسری طرف نکل گیا۔ عبدالرحمان نے ساری باتیں تورا کینہ کے گوش گزار کردیں۔ اس وقت فاطمہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے باتیں سن کر فوراً تجویز دی۔

''کیوں نہ یہ ساری ذمے داری اسے سونپ دی جائے۔ یہ بہتر انداز میں لگان فراہم کرسکتا ہے۔''

''ہاں یہ بہتر ہوگا۔ میں آج بلکہ ابھی خاقان اعظم سے بات کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ غصے میں پیر پٹختی ہوئی محل میں چلی گئی۔ عبدالرحمان اور فاطمہ واپس چلے گئے تھے۔ ایک بار پھر تورا کینہ نے لیو چت سائی کی باتیں خاقان کو بتاتے ہوئے اس کو عہدے سے ہٹانے کی ضد شروع کردی۔

''میں پوچھتا ہوں اس بوڑھے چینی سے۔'' خاقان اعظم نے غصے میں کہا اور اگلے روز لیے لیو چت سائی کو دربار میں بلوالیا اور بے صبری سے پوچھا۔ ''کیا تم ہماری مخالفت کررہے ہو؟ کیا تم ان لوگوں کے لیے رو رہے ہو۔ جنہوں نے تمہارے لیے کبھی کچھ نہیں کیا!''

لیو چت سائی نے جواب دیا۔

''میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اس لمحے سے لوگوں کے لیے آفت اور مصیبت کا آغاز ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ سنہری خیمہ گاہ میں اوغدائی اپنے گدے پر بے حال پڑا تھا۔ تورا کینہ چت سائی کے خیمے میں یہ پوچھنے آئی کہ خاقان اوغدائی تو بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اب حکومت کا نظم و نسق کیسے چلے گا۔

''تیس سال تک میں نے نظم و نسق بہتری کے اصول پر چلایا ہے۔ جو بہتری اور بھلائی کی بات تھی وہ میں نے کی اور اگر کسی نے غلطی کی تو میں نے اسے سزا دی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ خاقان نے ہر معاملے میں مجھ پر اعتماد کیا مگر اب میں دیکھ رہا ہوں کہ معاملات میرے ہاتھوں سے بھی نکل رہے ہیں۔'' لیو چت سائی نے دکھی ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب تو وہ بیمار ہے۔ نظم و نسق چلانے کے لیے نئے قانون کی ضرورت ہے۔'' تورا کینہ نے تجویز دی۔

''خاقان کے فرمان کے بغیر کسی قانون میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔'' لیے لیو چت سائی نے جواب دیا۔

''آپ کو اس بات کا علم ہے کہ قراقورم کے امراء میں اور درباریوں میں کیسی کیسی سرگوشیاں سر اٹھارہی ہیں۔ اگر آپ نے نظم و نسق چلانے کے لیے نئے قوانین نہ بنائے تو بے چینی میں مزید اضافہ بھی ہوسکتا ہے.....'' اس نے کہا۔

''مجھے اس کی فکر نہیں۔ میں اسی قانون کا پابند ہوں جس کا ذکر یاسا میں کیا گیا ہے۔'' لیو چت سائی نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ قانون تو نہ بدلا جاسکا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ عبدالرحمان کو لگان وصولنے کے لیے چین کا انتظام دے دیا گیا۔ جب دشت پر موسم سرما چھایا تو اوغدائی کو کسی قدر افاقہ ہوا۔ اب بھی وہ خیمہ گاہ چھوڑ کر زیادہ آرام دہ محل میں منتقل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیو چت سائی نے اسے باہر نہ جانے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ اس کے خلاف پھر سوار ہوکر شکار کھیلنے نکل گیا لیکن تھوڑی دیر بعد ایک واقعے نے اس کو دہلا کر رکھ دیا اور وہ واپس اپنے خیمے میں آگیا۔

☆☆☆

11 دسمبر 1241ء کی رات اوغدائی اپنے خیمے کے گدے پر بیٹھا پھر سے شراب نوشی کرنے میں مصروف تھا اس کے ساتھ دو لوگ اور بھی تھے۔ جن میں ایک سیورقوقطنی کی بہن اور دوسرا اس کا بھتیجا تھا۔ یہ دونوں ختا سے بطور مہمان آئے تھے۔ اوغدائی نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کے ساتھ گرم سرد شراب کے جام خالی کرنے لگا اور پھر اسی رات وہ سوتے میں مرگیا۔

صبح کو دوسری عورتوں نے اوغدائی کو مردہ پایا۔ ماتم شروع ہوا تو ان دونوں پر بھی الزام لگایا جانے لگا جو اس کے ساتھ شراب پی رہے تھے۔ بعض نے کہا کہ سیورقوقطنی کی بہن نے خاقان کو زہر دے دیا ہے۔

جلائر خانوادے کے ایک طاقتور سردار ایلچی دائی لویان نے یہ خبر سنی تو اس نے درشت لہجے میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا خرافات ہے۔ خاقان ہمیشہ ضرورت سے زیادہ پیتا رہا ہے۔ خاقان کو بدنام کرنے سے فائدہ۔ اس

نے کسی اور کے ہاتھ سے زہر کیوں پیا۔ بس اس کا وقت آچکا تھا وہ مرگیا۔ کسی کو ایسی بیہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں!''

سب نے اس کی بات کو مان لیا۔ دستور کے مطابق یہ حکم نافذ کیا گیا کہ ڈاک کے راستے بند کردیے جائیں۔ کسی تاجر یا اجنبی کو قراقورم کے دروازوں کے اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ان کی قوم کا کوئی شخص نیی جھیل کے خیمہ گاہ کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ بجز ان قاصدوں کے جنہوں نے یہ خبر خاندان زریں کے قریبی رشتے داروں تک پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔ سراؤں پر مسافروں کو روک لیا گیا۔ تیز گام رہواروں پر قاصد دوڑائے جارہے تھے۔ ایک نے تلاش کرکے تویوق کو ڈھونڈ نکالا جو کوبی کے علاقے میں آوارہ گھوم رہا تھا۔ افواج جو کہ یورپ کی مہم پر برسرپیکار تھی اس کی طرف بھی پیغام بھجوا دیا گیا کہ وہ اوغدائی کے وطن کو واپس چلے جائیں جہاں عزیزوں کی قرولتائی منعقد ہونے والی ہے۔

اوغدائی کی موت سے گویا سب کو آزادی مل گئی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اور اندیشہ تورا کینہ کو تھا کیونکہ اب چنگیز خاں کے خاندان میں سب سے زیادہ بزرگ چغتائی تھا جو بہت بوڑھا ہوچکا تھا اور کثرت شراب نوشی سے اس کی صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ دوسرا ابھی کوئی اس خاندان میں ایسا نہ تھا جو سلطنت کے بار کو اٹھا سکے۔ کچھ کو ویسے ہی خاقان بننے سے دلچسپی نہ تھی۔

جب اوغدائی نے دم توڑ دیا تو خاتون اعظم تورا کینہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ فوراً لیے لیو چت سائی سے مشورہ کرنے چلی گئی۔ ''اب خاقان باقی نہیں رہا۔ تاج و تخت کا کاروبار کیسے چلے گا؟''

لیو چت سائی نے جواب دیا۔ ''خاقان نے مرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ تحریر کیا ہے۔ ہم اس کی تعمیل کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ ہم اجنبیوں کے ہاتھ حکومت کی باگ ڈور نہیں دے سکتے!''

تورا کینہ کو کسی اور جواب کی توقع تھی لیکن اس ختائی کی آہنی طبیعت ایسی تھی کہ وہ اس عورت کا لوہا ماننے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ یوں تورا کینہ انتہائی غصے کے عالم میں واپس ہوئی اور اپنے دوسرے مشیروں سے رائے طلب کی۔ جنہوں نے اس کی یاد دہانی کرائی کہ ان کے دستور کے مطابق مردہ سردار کی پہلی بیوی اس وقت تک رعایا اور اس کی املاک کی نگہبان ہوتی ہے جب تک اس کا جانشین نامزد نہیں ہوجاتا۔ اس لیے اب وہ خود اوغدائی گھرانے کی سرتاج ہے اور عنان حکومت اس کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ہوگی۔ یہی تورا کینہ چاہتی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سربراہ سلطنت بنانے کا اعلان کرتا، ایک اور واقعہ رونما ہوگیا۔ اوغدائی خاقان کو چنگیز خاں کے مرنے کے بعد جو بیویاں وراثت میں ملی تھیں، ان میں سے ایک موتی بھی تھی۔ تورا کینہ ادھر جوڑ توڑ میں مصروف تھی جب اس نے اپنے سربراہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اس نے اندر ہی اندر چغتائی کے بیٹوں کو اپنا ہم نوا بنالیا تھا۔ اس نے اعلان کیا چونکہ وہ اوغدائی کی بیواؤں میں سب سے بڑی ہے، اس لیے حکومت کرنے کا حق اس کا ہے۔ ادھر لیو چت سائی کا اپنا استدلال تھا... سلطنت مردہ خاقان کا حق تھی جو اسی کا حق تھا، اس پر کسی دوسرے کو کیسے اختیار حاصل ہوسکتا ہے۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اب یہ قوم محض ایک ایسا قبیلہ نہیں ہے جن کی ساری املاک محض چند گلوں اور بوڑھوں پر مشتمل ہو۔ لہٰذا تمام بڑوں اور بہادروں نے آپس میں مشورہ کیا ہے۔ ان کے مطابق بوڑھے چغتائی سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ تخت و تاج کو قبول کرلے!''

اب تورا کینہ کو دوہرے محاذ پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف موتی نے عنان حکومت کو چغتائی کے بیٹوں کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کردیا تھا اور دوسری طرف لیو چت سائی کا فیصلہ تھا۔ جس کا احترام آج تک چنگیز خاں کا خاندان کرتا چلا آیا تھا۔ اس کی بے صبری کی عادت اور لالچ و ہٹ دھرمی اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ فوراً چغتائی کے پاس پہنچی اور اسے سارے حالات کے بارے میں احساس دلایا کہ معاملہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ تب بوڑھے چغتائی نے بڑے تحمل اور اطمینان سے جواب دیا۔

''میں اب اپنے بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے اس دعوے سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی خود میں ہمت پا رہا ہوں کہ تخت و تاج کا بوجھ اٹھا سکوں۔ ویسے بھی قبائلی دستور کے مطابق تمہارا دعویٰ درست ہے۔ جب تک قرولتائی کسی اور خاقان کا انتخاب نہیں کرلیتی۔ اس وقت تک تم حکومت کے کاموں کو چلا اور نمٹا سکتی ہو۔ رہی بات موتی کی اور میرے بیٹوں کی، تو میں اپنے بیٹوں کو تو سمجھا سکتا ہوں کہ وہ اس کی حمایت نہ کریں مگر اس سرپھری عورت کو لگام نہیں دے سکتا۔''

''اس سرپھری عورت سے تو میں خود نمٹ لوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ سانپ کا سر کس طرح کچلا جاتا ہے۔'' یہ

کہتے ہوئے وہ چغتائی کے پاس سے واپس آ گئی۔ واپس آکر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ایک فرمان کے تحت عبدالرحمان کو اپنی سلطنت کا وزیر اعظم مقرر کردیا اور لیو چت سائی کے ساتھ دوسرے عہدے دار اس کے ماتحت کردیے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے فرمان پر دستخط کردیے۔ ایرانی وزیر عبدالرحمان نے خزانوں کے منہ کھول دیے اور خاندان زریں کے عزیزوں کو تحائف سے مالا مال کردیا۔

اس نے خاقان اوغدائی کے کئی افسروں کو گرفتار کرلیا کئی وزرا تبدیل کرکے اپنے اعتماد کے وزیروں کو لگادیا۔ اس کام میں اسے تقریباً ایک سال لگ گیا۔ اس دوران سوق بھی اپنے ہاتھ پیر مارتی رہی لیکن تورا کینہ نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اس کو پتا چلا کہ خفیہ طور پر اوغدائی کا مہتمم اعظم چنکائی اور نائب مہتمم اعلیٰ محمد یلواج موق کی مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں بھی گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور وہ تورا کینہ ہی کے بیٹے قدآن کے پاس چین چلے گئے۔ وہاں مسعود بیگ ترکستان کی طرف سے مہتمم اعظم تھا پھر ادھر سے وہ روس میں...... پناہ میں چلے گئے۔ تورا کینہ نے بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اس نے کرگیزوں کو حکم دیا کہ ان کو گرفتار کرکے اس کے دربار میں پیش کیا جائے۔

تورا کینہ کے ان ہنگامی احکامات نے موق کو اکیلا کردیا تھا۔ موق کو پتا تھا کہ تورا کینہ کس قدر منتقم مزاج ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کا مرتے دم تک پیچھا کرتی ہے۔ چنکائی اور یلواج کو گرفتار کرتے ہوئے چغتائی خاں کارا نے انہیں قید خانے میں ڈال دیا۔ 1242ء تک تورا کینہ نے اپنی سیاسی طاقت دوبارہ حاصل کرلی اور خاتون اعظم کہلانے لگی۔

لیے لیو چت سائی کو اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اس کی جگہ عبدالرحمان کو وزارت عظمیٰ دے دی گئی ہے۔ اس نے بڑے غصے سے کہا۔

''ان احکامات کی تعمیل نہیں کی جاسکتی۔ کیا بیوہ ملکہ یہ چاہتی ہے کہ تیس سال کی خدمات کے عوض مجھے سزائے موت ملے۔'' بوڑھا...... لیے لیو چت سائی اپنی دھن کا پکا تھا تو اس کے مقابلے میں تورا کینہ بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔ اسے لیو چت سائی کے مقام اور اہمیت کا بھی علم تھا۔ اس لیے وہ لیو چت سائی کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ جہاں وہ اس سلطنت کے بانیوں میں سے تھا، وہاں اس نے سلطنت کے لیے ایسا آئین وضع کیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت متمول ہوگئے تھے لیکن محکوم قومیں بھی نیست و نابود ہونے سے بچ گئی تھیں۔ لیو چت سائی کی وجہ سے شہروں اور دشت کے درمیان رابطے کا سلسلہ قائم ہوا تھا۔ اس لیے تورا کینہ اس کی تعریف اور عزت کرتی تھی مگر وہ دل کے ہاتھوں اور اپنے لالچ کے ہاتھوں بھی مجبور تھی۔

لیو چت سائی کے شدید احتجاج کے باوجود عبدالرحمان نے محصول اور لگان میں دگنے اضافے کی تجویز وضع کیں۔ اسی دوران قانون ساز چغتائی کا بھی انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے تورا کینہ کی اپنی طاقت مزید طاقتور اور زیادہ مستحکم ہوگئی۔ مایوسی کے عالم میں چت سائی نظم ونسق سے کنارہ کش ہوگیا۔ یہ ان کی تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ ایک عورت کا ہاتھ اس سلطنت کی دنیائے کاروبار کو چلا رہا تھا اور یہ عورت تورا کینہ تھی جواب اپنی عمر کے ساٹھ سالوں پر پہنچ چکی تھی اور وہ اوغدائی کے سوا ہر کسی کو بدشکل نظر آتی تھی۔ اس میں دشت میں پیدا اور جوان ہونے والی عورتوں کی طرح کڑا پن تھا۔ ہٹ دھرمی تھی اور وہ بڑھاپے میں بھی بڑی ہمت و حوصلہ رکھتی تھی۔ اسے انتظام کی بڑی مہارت تھی۔ وہ فتوحات کے ایام سے پہلے ہی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ مورخ اس بات پر متفق تھے۔

''تورا کینہ بڑی دانشمند اور اپنی ضد کے مطابق حکومت کرتی تھی۔ عورت ہونے کے باوجود اس میں اوغدائی کے مقابلے میں اپنے آپ کو ضرورت کے لحاظ سے ڈھال لینے کا ملکہ زیادہ تھا۔ اسے بڑی شان وشوکت کے ساتھ پالکی میں سوار ہوکر نکلنا زیادہ پسند تھا۔ وہ چاہتی تو آسانی سے اپنے خیمے میں گوبر کی آگ کے الاؤ کے پاس بھی سوسکتی تھی لیکن اسے قراقورم کے محل میں آرام کرنا پسند تھا۔ جہاں انگیٹھیاں تھیں اور شاندار پچی کاری کے فرش پر موٹی موٹی توشکیں اور لحاف تھے۔ اسے ایک طرح سے یقین تھا کہ طاقت اور قوت اس کا پیدائشی حق ہے کیونکہ وہ اوغدائی خاندان کی سردار تھی' وہ بیوہ ملکہ نہ تھی۔ خاندان زریں کی سرتاج تھی۔ اس بات کو چغتائی نے بھی مانا تھا۔''

تورا کینہ کی جلد پر اب موسموں کی سختیوں نے جھریاں ڈال دی تھیں اور اس کی جلد کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے بھی زیادہ شاہانہ مزاج اور آرام پسند بن گئی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے لیے اطمینان اور طاقت کی خواہاں تھی۔ اس کے لیے وہ ہر قربانی کو جائز سمجھتی تھی۔ تورا کینہ مشکلوں اور رکاوٹوں سے کبھی نہیں ڈرتی تھی۔ دوسرے اپنی قوم کی طرح اس کا دل کافر تھا۔ اسے یقین تھا دولت وہ آسانی سے حاصل کرسکتی ہے۔ اگر وہ سادے سے چینی کاغذ

پر مہر ثبت کردے جو اس کے وزیر عبدالرحمان کی تحویل میں تھی تو اجنبی ملکوں کے سوداگر بھی نمودار ہوکے اس کے قدموں پر بڑی تعظیم اور نیاز مندی سے سونے چاندی کا ڈھیر لگادیتے اور یہ صرف کاغذ کے ایک پرزے کی وجہ سے ممکن ہوتا۔ اس کے دولت کے حصول کی کوئی حد وانتہا نہ تھی جو عبدالرحمان کے حسن انتظام سے حاصل ہوسکتی تھی اور جو اس ہوشیار بھیدی کنیز فاطمہ کے مشورے سے حاصل کی جاتی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک فاطمہ ہی ایسی ہے جو اس ملکہ اعظم کے بھیدوں سے آگاہ تھی۔ اس لیے اب وہ لیے...... لیو چت سائی سے بھی مشورہ لینے کی زحمت نہ اٹھاتی تھی جو قراقورم کے اپنے مکان میں قید ہوکر رہ گیا تھا۔ چت سائی کو اب بھی یہ اعتراض تھا کہ اوغدائی خاندان اس قدر سہولت سے اتنی دولت سمیٹ رہا ہے۔ وہ افسوس کر رہا تھا۔

''مشیران تخت کی نیت ٹھیک نہیں۔ دربار پر حرص کا غلبہ ہے۔ عہدوں کا نیلام ہورہا ہے۔ ایماندار لوگ قید میں پڑے سڑ رہے ہیں جن کا واحد جرم یہ ہے کہ انہوں نے خلاف قانون لوٹ مار کی مخالفت کی ہے!''

لیے لیو چت سائی کے لیے یہ بات کسی صدمے سے کم نہ تھی کہ اس نے تیس سال تک چنگیز خاں، اوغدائی اور تورا کینہ کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ آخر میں اسے کیا صلہ ملا۔ اس سے سب کچھ چھین کر اسے قید تنہائی کا شکار بنادیا گیا۔ اسی صدمے سے وہ عفریت (اژدہے) والے سال کے پانچویں مہینے میں مرگیا۔

جب لیے لیو چت سائی کا انتقال ہوگیا تو عبدالرحمان کے ساتھیوں نے تورا کینہ سے اشارتاً کہا کہ جو شخص اتنے عرصے تک خاقانوں کا خاص عہدے دار رہا، اس کے پاس بڑی دولت جمع ہوگی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی یہ دولت خانوادۂ اوغدائی میں منتقل ہوجانی چاہیے۔

تورا کینہ ہچکچائی۔ وہ صرف چنگیز خاں کی روح سے ڈرتی تھی اور اس ختائی لیے لیو چت سائی کی دل سے عزت بھی کرتی تھی لیکن لوگوں کے اکسانے پر اس نے اپنی چہیتی فاطمہ سے مشورہ مانگا۔

''تم جانتی ہو کہ لیے لیو چت سائی کے مرنے کے بعد لوگوں میں کیا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔''

''اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اس نے اتنے سال خاقانوں کے ساتھ گزارے ہیں۔ یقیناً اس نے بے شمار دولت بھی جمع کررکھی ہوگی۔ اگر اب وہ آپ کے خزانوں میں جمع ہوجائے تو کیا حرج ہے!'' فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

اب تورا کینہ کے دل میں بھی تجسس جاگ اٹھا۔ اس نے حکم دیا کہ لیے لیو چت سائی کے گھر کی تلاشی لی جائے اور اس کی ساری دولت کو ضبط کرلیا جائے۔

عبدالرحمان نے چند لوگوں کو لیے لیو چت سائی کے گھر تلاشی کے لیے بھجوادیا مگر اس کے گھر سے وہ خزانہ یا دولت تو نہ ملی جن کی انہیں تلاش تھی۔ البتہ تھوڑے سکے اور ایک درجن کے قریب بانسریاں ضرور ملیں جن سے چت سائی اپنا دل بہلاتا تھا۔ پرانے مسودوں اور کتابوں کی الماریاں تھیں۔ کئی ایسی جلدیں تھیں جو اس ختائی نے اپنے ہاتھوں سے لکھی تھیں۔ پرانے سکوں اور دھاتوں کا ذخیرہ تھا جن پر پتھر اور سنگ مرمر کے نقوش تھے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو تلاشی لینے والوں کے ہاتھ آتا۔

تورا کینہ جہاں بے حد ضدی تھی، وہاں وہ دوسری عورتوں کے معاملے میں بھی بہت شکی مزاج تھی۔ وہ حسد کی حد تک ان عورتوں سے بدظن تھی جو کسی بھی معاملے میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتیں۔ خاص طور پر سیورقوقطنی بیگی کو تو وہ اپنا رقیب خاص سمجھتی تھی جو خود بھی چنگیز خاں کے ایک بیٹے کی بیوہ اور ایک بڑے خاندان کے سردار کی بیٹی تھی۔ قوقطنی نت نئے فیشن کرتی اور جاذب نظر خوب صورت کپڑے پہنتی۔ اس نے اپنی حیا کی وجہ سے قویوق کی دوسری بیوی بننے سے انکار کردیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے سوا اور کسی بات کی طرف نہ دھیان دیتی اور نہ ہی پروا کرتی۔ وہ اس بات کو بھی سمجھتی تھی کہ اس کے بیٹے بھی خاندان زریں کا ایک حصہ ہیں۔ جیسے اوغدائی خانوادے کے لڑکے۔ تورا کینہ نے اپنے سب سے بڑے بیٹے قویوق کو جنگ میں ناموری حاصل کرنے کے لیے مغرب کی فوج کے ساتھ سوبودائی کی کمانداری میں اس لیے بھیجا تھا کہ اس وقت تک کوئی...... شہزادہ اہل دشت میں عزت حاصل نہ کرسکتا تھا، جب تک وہ میدان جنگ میں فوج کی قیادت نہ کرے۔ تورا کینہ اپنے حسد کو چھپاتی تھی اور سوائے کان دھرکے سننے والی فاطمہ کے کسی اور پر اپنے دل کا بھید ظاہر نہ کرتی تھی۔ بیوہ ملکہ شہزادوں اور بڑے سرداروں سے کہتی تھی کہ وہ اس کے بیٹے قویوق کو جو اوغدائی کی اولاد اکبر ہے، ...... تخت کا مالک منتخب کریں۔ اس راہ کی ایک رکاوٹ تھی کہ خاقان کے لیے اوغدائی نے اپنے ایک پوتے

شیرا مون کو اپنا وارث مقرر کیا تھا جبکہ تورا کینہ کا کہنا تھا کہ جب بیٹا زندہ ہے تو پوتا کیسے وارث بن سکتا ہے۔

☆☆☆

قرولتائی کا وقت آیا تو باتو نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ تورا کینہ نے حکم دیا کہ خاندان زریں کی دوسری قرولتائی نیلی جھیل کے کنارے باتو کے بغیر منعقد کی جائے۔

1245ء میں چند ہفتوں کے لیے نیلی جھیل کا پڑاؤ دنیا کا دارالحکومت بن گیا۔ یہاں دو لاکھ سمور کے خیمے سرائے اردو (شاہی) کے اطراف میں نصب کیے گئے تھے لیکن لوگوں کا رش اس قدر زیادہ تھا کہ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر گھوڑوں سے اترنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ مہمانوں کی کثرت سے جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ تمام مہمان نئے خاقان کے لیے تحائف لائے تھے۔ بیس تاجدار قویوق کے آگے اطاعت کے لیے آئے تھے۔ اوغدائی، تولوئی اور چغتائی کے خانوادوں کے تمام اراکین اپنے دور دراز علاقوں سے قویوق کی قرولتائی کی ضیافت اور ناچ گانے میں حصہ لینے آئے تھے۔

ضیافت کے دوران تین بڑے خانوادوں کی اولاد کے دل میں ایک طرح کا خوف اور ڈر تھا۔ باتو اپنے عزیز کی قرولتائی میں نہیں آیا تھا اور انہیں چنگیز خاں کا قول یاد تھا۔

”وہ جو دور رہ جائے گا اور نہیں آئے گا، وہ اس پتھر کی طرح ہوگا جو گہرے پانی میں گر جائے گا۔ اس تیر کی طرح جو لمبی لمبی گھاس میں جا گرے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا!“

وہ سب قویوق سے بھی ڈرتے تھے۔ اب جبکہ وہ خاقان بن چکا تھا، وہ کسی کو بلا اجازت اصطبل کے اس پار اپنے تک نہ آنے دیتا اور خود بات کرنے سے پہلے کسی کو بات کرنے نہ دیتا۔ اس کا مزاج بھی اپنے دادا کی طرح سخت اور شاہانہ تھا۔ کچھ بوڑھے .... یہ سمجھتے تھے کہ چنگیز خاں کی روح عالی شان پرچم سے نکل کر قویوق کے بیمار جسم میں حلول کر گئی ہے۔ دونوں کی طبیعت میں وہی بے رحم سختی تھی۔

قویوق کی صحت فطری طور پر ضعیف تھی۔ وہ اکثر علیل رہتا تھا۔ اس کے باوجود شام سے صبح تک وہ شراب کے ساغروں اور خوب صورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہتا اور داد عیش دیتا تھا۔ اس لیے اس کی بیماری بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن اسے پروا نہ تھی۔ دن کو اسے مالیخولیا کے دورے پڑتے اور وہ کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ فیاضی میں وہ سب سے بازی لے گیا تھا اور اس کی تمنا تھی کہ اس معاملے میں اسے اپنے والد سے زیادہ شہرت حاصل ہو۔

نیا خاقان امراض سے پریشان، اپنے ارادے کی پختگی سے سرگرم، اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ اور راتوں کو شراب و شباب میں ڈوبا رہتا تھا۔ اس نے خاقان بنتے ہی پرانے دیانت دار وزیروں کو پھر سے طلب کیا۔ اس کے اس اقدام نے درباریوں کے حوصلوں کو بلند کیا تو شکوے شکایت کے دفاتر کھل گئے۔ لوگوں نے سب سے پہلے مالی شعبدہ باز عبدالرحمان کے متعلق اس کے کان بھرے۔

”اس کے تعلقات ملکہ اعظم سے ہیں اور وہ مالی بے ضابطگی میں سرفہرست ہے۔“ کسی نے کہا۔

”وہ انتہائی چالاک اور شعبدہ باز ہے۔ اس نے مکاری سے ملکہ کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔“ دوسرے نے بتایا۔ چنانچہ اس نے فوراً عبدالرحمان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کی سفارش ملکہ اعظم تورا کینہ کرتی اور اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالتی، اس نے عبدالرحمان کو قتل کروا دیا۔ عیسائی، الغیوری وزیروں کا چناؤ کر کے انہیں مختلف عہدوں پر لگا دیا۔

تورا کینہ کو یہ توقع ہی نہ تھی کہ قویوق ایسا قدم اٹھائے گا۔ خاص طور پر جب اسے عبدالرحمان کے قتل کی خبر ملی تو وہ قویوق سے بے حد ناراض ہوئی مگر قویوق نے اس کی ناراضگی کا ذرہ بھر خیال نہ کیا۔ عبدالرحمان کے قتل کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ اسی کرداروں نے اس سے شکایت کی کہ ایرانی کنیز فاطمہ کا اس کی والدہ تورا کینہ پر بہت اثر ہے۔ انہوں نے سب جو دیکھا سنا تھا، اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ مزید زور دے کر کہنے لگے۔

اگر اسی طرح وہ عظیم خاتون پر اثر انداز رہی تو بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب اس عظیم الشان سلطنت پر اسی کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ انہوں نے قویوق کو یہ بھی یقین دلایا کہ یہ کنیز تم پر اور تمہارے بھائیوں پر بھی جادو کرے گی کیونکہ اس نے جادو ہی کے ذریعے تمہاری والدہ کو قابو کیا ہوا ہے۔

قویوق نے حکم دیا کہ فاطمہ کو اسی وقت اس کی والدہ کے خیمے سے گرفتار کر کے اور زبردستی پکڑ کر لایا جائے اور پھر اسے برہنہ کر کے کوڑے لگائے جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ سپاہی تورا کینہ کے خیمے میں گئے تو فاطمہ اور تورا کینہ کسی بات پر بے تحاشا قہقہے لگا رہی تھیں۔

انہوں نے آگے بڑھ کر فوراً فاطمہ کو دبوچ لیا اور

اسے زبردستی ساتھ لے جانے لگے۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ تورا کینہ چلا اٹھی۔

”خاقان کا حکم ہے جسے پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔“ سپاہیوں نے جواباً کہا۔

”یہ میرا حکم ہے کہ اسے فوراً چھوڑ دیا جائے۔ میں خود قویوق سے بات کرتی ہوں۔“ تورا کینہ نے غصے سے کہا مگر وہ اسے زبردستی ساتھ لے گئے تھے۔

اسے لے جا کر اس پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ اس نے جادوگری کا اقرار کر لیا۔ منگول جادو شکنوں نے پہلے یہ اطمینان کر لیا کہ اس کے جسم میں جو بد روح یا چڑیل ہے۔ وہ اس کے مرنے کے بعد نکل کر اوروں کو نقصان تو نہیں پہنچائے گی۔ انہوں نے اس کے سر کے تمام بال کاٹ کر اس کے جسم پر تشدد کر کے...... اسے ڈوبنے کے لیے ندی میں دھکیل دیا۔ اس پر تورا کینہ کو بے حد غصہ آیا مگر قویوق نے اس کے غصے کی قطعاً پروا نہ کی۔

اس طرح کمزور سے قویوق نے اپنے تیز اور فوری فیصلوں سے اس خانہ بدوش سلطنت کے معاملات کا رخ پھیر دیا۔ وہ اپنی والدہ تورا کینہ کی طرح زین پر بیٹھے بیٹھے حکومت کرنے کے حق میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دشمنوں کے خلاف جنگ کے سلسلوں کو برقرار رکھے۔ وہ ساری دنیا پر اپنی قوم کی برتری مسلط کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان علاقوں میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں ابھی تک ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نہ پہنچی ہو۔

تورا کینہ کو اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی ذلت آمیز شکست ہوئی تھی۔ وہ جو اپنی ضد کی پکی اور ہٹ دھرمی میں شہرت رکھتی تھی، یوں اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں بری طرح ذلیل ہو کر رہ گئی تھی مگر پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ جانتی تھی جیسے اوغدائی اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی کسی ضد کو نہیں ٹالتا تھا۔ اسی طرح اس کا بیٹا اور... شہنشاہیت کا نیا خاقان قویوق اپنی بیوی اوغل غائمش کی بات نہیں ٹالتا۔ چنانچہ اب اس نے کمال چالاکی سے اوغل غائمش کی قربت حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے دور اقتدار میں اس نے اوغل غائمش کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اب جبکہ قویوق خاقان اعظم بن چکا تھا پھر بھی تورا کینہ اپنے آپ کو اس شخصی سلطنت میں اولین خاتون تصور کرتی تھی۔ قویوق خاندانی معاملات میں بڑی نرمی سے کام لیتا تھا۔ مگر پھر بھی اسے باتو خاں پر غصہ تھا جس نے اس کو منتخب کرنے والی قرولتائی میں حصہ نہ لیا تھا۔ وہ اسے اس کی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے تیاری بھی کر لی اور دھوکے سے باتو خاں کو بلا کر گرفتار کرنا چاہا مگر سیورقوقطنی کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا۔ اس نے باتو خاں کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کی باتوں میں نہ آئے۔

قویوق بیمار ہونے کے باوجود باتو خاں سے لڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ دوسری طرف سے باتو خاں بھی اپنی سپاہ لے کر آ رہا تھا کہ دریائے ایمیل کے کنارے تک پہنچا تھا کہ بیماری نے اسے موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ قویوق مر چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار تورا کینہ ہچکچائی اور قویوق کی بیوی سے مشورہ کرنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ایک بار پھر سے وہی عمل دہرایا گیا۔ تورا کینہ کی ضدی اور ہٹ دھرمی نے ایک بار پھر اپنا کام دکھایا۔ دونوں عورتوں نے صلاح مشورے کے بعد باتو خاں کو یہ پیغام بھجوایا کہ خاقان قویوق کی بیوہ اوغل غائمش حکومت کرے گی۔ باتو خاں کو آ کر انہیں مشورہ دینا چاہیے۔

سیورقوقطنی جوان دونوں سے زیادہ دانش مند تھی، اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اس نے منگو خاں سے کہا چونکہ باتو کی عمر پختہ ہے، وہ چنگیز خاں کے تمام پوتوں کا آغا ہے اور قرولتائی میں کوئی بھی اس کی رائے سے اختلاف نہ کرے گا۔ دوسرے لوگ اس وقت باتو کے پاس نہیں، وہ بیمار ہے۔ تو اس کے پاس مزاج پرسی کے لیے جا۔

اس طرح ... ان میں سیاست کا ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ باتو نے گوبی میں عورتوں کے پڑاؤ میں پیغام بھیجا کہ منگو اور قبلائی خاں میرے پڑاؤ میں ہیں۔ دوسرے پوتوں کو بھی یہیں آنا چاہیے اور یہیں قرولتائی منعقد ہونی چاہیے۔

تورا کینہ اور اوغل غائمش نے جواب دیا کہ دستور کے مطابق قرولتائی صرف ان کے وطن ہی میں منعقد کی جا سکتی ہے۔ کیرولان کے ساحل کے کنارے یا کہیں اور نہیں۔ انہوں نے اپنے حقوق کے ثبوت کے لیے قبائلی قوانین پیش کیے۔ جوڑ توڑ کر کے اپنا موقف منوانے کی کوشش بھی کی مگر ناکام ہو گئیں۔

تورا کینہ اور اوغل غائمش دونوں جانتی تھیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے۔ ان میں سے ایک بیوہ تمام قبائل کی ملکہ تھی دوسری بیوہ سرتاج ہے پھر انہی قبیلوں نے ناقابل شکن قسم کھائی تھی کہ جب تک اوغدائی کے خاندان میں گوشت کا ایک لوتھڑا بھی باقی رہے گا، وہ اس کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ اس پر سیورقوقطنی نے برملا جواب دیا۔

”کیا ہمارے مورث اعلیٰ نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر

اوغدائی کے جانشین نالائق نکلیں تو تخت کے لیے کسی اور کو تلاش کرو!“

تورا کینہ جانتی تھی کہ تاخیر خطرناک ہے اگر وطن میں خاقان کا انتخاب ہوتو… روایت کی بنا پر ہوگا۔ وہ چاہتی تھی کہ انتخاب جلد اور یہاں وسط ایشیا کے مسلح پڑاؤ میں ہو۔

بوڑھی تورا کینہ غصے اور حسد سے تلملا رہی تھی۔ اوغل غامش جو سیورقوقطنی سے کم ہوشیار تھی، شامانوں کی پیش گوئیاں سن رہی تھی مگر منگو کی والدہ نے کمال ہوشیاری سے اپنے خانوادے کی سپاہ اور ختا کے مشیروں کو جمع کیا اور گوبی کے ریگستان سے گزر کر پہاڑ کا درّہ پار کیا۔ چغتائی کے دو بیٹے بھی ساتھ تھے۔ اس نے فیصلہ کہلا بھیجا کہ قرولتائی باتو کے پڑاؤ میں شاہینوں کی جھیل کنارے منعقد ہوگی۔

اس کشمکش میں سیورقوقطنی اپنی حریف تورا کینہ اور توہم پرست اوغل غامش کے مقابلے میں جیت گئی۔ تورا کینہ نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور باتو کے خیمے میں اوغدائی کے گھرانے کی نمائندگی کے لیے قاصد بھیجے اور کہلا بھیجا۔ ”باتو شہزادوں کا آقا ہے اور اس کے حکم کی تعمیل ان پر واجب ہے۔ کوئی اس کا مشورہ ماننے سے دریغ نہ کرے گا!“

دونوں بیوائیں اپنے ساتھ تویوق کی لاش لے کر قراقورم روانہ ہوگئیں۔ تورا کینہ نے آخری بار بڑی ہوشیاری اور چالاکی کی بات کی تھی۔ اسے شک ہوگیا تھا کہ معلوم نہیں قرولتائی کیا فیصلہ کرے۔ اب باتو خاں کی بات مان لینے میں ہی اس کی بھلائی ہے۔ باتو خاں نے خاقان بنتے ہوئے یاد دلایا کہ اوغدائی خاندان ہی نے سب سے پہلے بڑے خاں کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بعد تورا کینہ خاتون نے اس کا حکم نہیں مانا اور ہمارے سروں پر تویوق کو لا بٹھایا۔ پھر اس نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے منگو خاں کو خاقان بنانے کی تجویز دی۔

منگو خاں نے خاقان بنتے ہی سب سے پہلے خاندان کی روایت توڑنے اور سازشیں کرنے کے جرم میں حکم دیا کہ تویوق کی بیوی کے ہاتھ چمڑے کے تھیلے میں سی دیے جائیں اور سپہ سالار منگو سار کو حکم دیا کہ تم انصاف کرو۔

بوڑھے جنرل نے اوغل غامش کو برہنہ کر کے اس پر جادوگری کا الزام لگایا تو اوغل غامش غصے سے چلا اٹھی۔

”تم میرے جسم پر کیسے نظر ڈال سکتے ہو۔ جسے سوائے ایک شہنشاہ کے کسی اور کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔“

منگو سار نے سمور کے کپڑوں میں اس کی ہڈی پسلی کچل کر اسے پانی میں ڈوبنے کے لیے پھنکوا دیا۔ جو شامان……. شیرامون کی ماں کے نوکر تھے، ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ منگو نے کچھ عرصے بعد فرانس کے شاہ لوئی کے سفیر سے اوغل غامش کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بدذات عورت جو کتیا سے بدتر تھی۔ صلح اور جنگ کے مسائل کو کیا خاک سمجھ سکتی تھی۔ وہ اس عظیم دنیا کو امن اور چین سے کیسے بخش سکتی تھی۔“

کسی نے باتو کو بتایا کہ یہ کام تو وہ بوڑھی چڑیل تورا کینہ بھی کرتی ہے جو ابھی تک خود کو شہنشاہیت کی عظیم خاتون کہتی ہے۔ وہ بھی اپنی موافقت یا مخالفت کے معاملوں میں بہت انتہا پسند ہے۔ اس نے منگول مرکز میں پانچ سالوں سے بدنظمی و انتشار پھیلا رکھا ہے۔ اس کا بھی کوئی حل سوچنا ہوگا۔

ادھر تورا کینہ اب انتہائی شکست خوردہ ہو کر اپنی یورت میں پڑی رہتی تھی۔ اس کے چہرے کی جھریوں نے اس کی ہیت کذائی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ باتو خاں نے بڑی ہوشیاری سے منگو کو نیا خاقان بنوا دیا تھا۔ تورا کینہ اپنے منظورِ نظر عبدالرحمان اور اپنی سہیلی فاطمہ کے قتل کو نہیں بھولی تھی۔ اوپر سے سیورقوقطنی اسے ہر مقام پر شکست دیے جا رہی تھی۔ اس کے احکامات کو ہوا میں اڑایا جا رہا تھا۔ اس نے عبدالرحمان کے ذریعے محبت کی دولت شہر سے صحرا میں لانے کی کوشش تو کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اب اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ کسی وقت بھی اس کا انجام اوغل غامش، فاطمہ اور عبدالرحمان جیسا ہوسکتا ہے۔ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کے محلات میں وقت نے دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اسی انجانے خوف اور غم سے جب منگو خاقان بننے کی خوشی منا رہا تھا، ایک رات تورا کینہ ایسی سوئی کہ دوبارہ نہ اٹھ سکی۔

ماخذات:

تاریخ چنگیزی۔ اخوندمیر (ترجمہ)۔ تاتاری خوانین کی تاریخ۔ ابو الغازی بہادر خان۔ تاریخ رشیدی۔ رشید الدین (ترجمہ)۔ تاتاری تاریخ۔ نکولس سالکن (ترجمہ)۔ تاریخ جامع ہند۔ محمد حبیب، خلیق احمد نظامی۔ تاتاریوں کی یلغار۔ ہیرلیم (ترجمہ)۔ تاریخ ایران۔ راشد الدین ہمدانی (ترجمہ)

جوشِ انتقام

تنویر ریاض

کچھ لوگوں کے مزاج کی تندی کہتی ہے کہ مانگنے سے کچھ نہ ملے تو چھین لو… اور بہتے پانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جہاں رستہ ملے بہہ جائے۔ ضرورت اسی کو کہتے ہیں جسے ہر حال میں پورا کرنا ہو اسے ہر حالت میں پورا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی اسی فارمولے پر عمل کیا اور اپنے لیے وہ ساری زنجیریں توڑ ڈالیں جو اس کی ضرورت کے رستے میں رکاوٹ تھیں… کیونکہ جب چیز مانگے نہ ملے تو چھین لینی چاہیے۔ یہ اس کا اصول تھا!

بھروسے اور اعتبار کے دھوکے میں فتین کی واردات کی دلچسپ روداد

ڈیوڈ انگولا، پارکنگ لاٹ میں کھڑی این ڈیوبیٹ کی کار پر جھکا ہوا تھا۔ سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور پارکنگ لاٹ تقریباً خالی پڑی ہوئی تھی۔ این اسے دیکھ کر بالکل بھی حیران نہیں ہوئی۔ شاید وہ اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ اسے اس کے آنے کی توقع تھی اور وہ ہمیشہ گھر جانے سے پہلے اپنے کاغذات سمیٹتے ہوئے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھا کرتی تھی۔

چند لمحے اندرونی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس

نے معمول کے مطابق گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ ڈیوڈ کیا چاہتا ہے۔ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے وہ پوری طرح ہوشیار تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں موجود چاقو پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ان آلات کا استعمال کرنے میں ماہر تھی۔

''میں جھگڑا کرنے نہیں آیا۔'' ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں خالی ہاتھ اسے دکھا دیے۔

پہلے کبھی ڈیوڈ اس کا دوست ہوا کرتا تھا یا اس سے دوستوں جیسی قربت تھی لیکن اس بات کو بھی کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ اس سے دس فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔

''تمہاری غیر موجودگی میں کیمپ ویسٹ کون دیکھ رہا ہے؟''

''کیل۔'' اس نے کہا۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا۔ پورا نام بتاؤ۔''

''کیل فشگری۔'' وہ بولا۔ ''سنہرے بالوں والی..... چھ فٹ لمبی۔''

''وہی جو مارشل آرٹ سیکھنے جاپان گئی تھی؟''

ڈیوڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے وہ کبھی اچھی نہیں لگی لیکن تمہاری رائے مختلف ہو سکتی ہے۔''

این اسے باتوں میں لگا کر وقت حاصل کرنا چاہ رہی تھی تاکہ اسے صورت حال کا اندازہ ہو جائے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈیوڈ یہاں کیوں آیا ہے۔ اس کی آمد کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''وہ میرے برابر نہیں ہو سکتی۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''وہ تمہارا انتخاب کیوں نہیں ہو سکتی!'' این بولی۔ ''جہاں تک میں جانتی ہوں، تم اس پر حکم چلاتے تھے۔''

گزشتہ آٹھ برس سے ڈیوڈ انگولا، کیمپ ویسٹ کا سربراہ تھا جہاں جاسوسی کی تربیت دی جاتی تھی کہ کس طرح سخت حالات اور تفتیش میں زندہ رہنا ہے۔ این اس کے بالمقابل پہاڑیوں میں واقع کیمپ ایسٹ میں تھی۔ وہاں کی تربیت اتنی سخت تھی کہ ہر دوسرے سال کم از کم ایک طالب علم زندہ نہ بچ پاتا اور جب اس کیمپ میں ایک سینیٹر کی بیٹی مر گئی تو این کو فارغ کر دیا گیا۔

''میں اسے سمجھایا کرتا تھا، جب تک حسابات میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔''

''اور اسی وجہ سے تمہیں فارغ کر دیا گیا۔''

''اسے ہم جبری چھٹی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ابھی اس کی تحقیقات ہو رہی ہیں۔'' اس نے بظاہر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کی لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کافی پریشان ہے۔ این کو یاد تھا کہ لباس کے معاملے میں اس کا ذوق کتنا نفیس تھا۔ وہ زیادہ تر سلک کی ٹی شرٹ اور ڈیزائنر جینز میں نظر آتا تھا لیکن آج اس نے گولف شرٹ اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ نارتھ کیرولینا کے آدھے مرد اسی طرح کا لباس پہنتے تھے، گویا اس میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

این نے اگلا سوال کیا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''میں کبھی یہاں نہ آتا اور نہ ہی تم پر نظریں لگاتا لیکن تمہارے سیاہ بال مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

این نے کندھے اچکا دیے۔ اس کے بالوں میں کوئی قابل ذکر خصوصیت نہیں تھی۔ ناک چھوٹی اور پتلی تھی اور پلکیں بنی ہوئی تھیں تاہم اب بھی وہ کافی پُرکشش نظر آتی تھی۔

''تم نے مجھے دیکھ لیا۔ اب آگے کہو۔''

''دراصل میں اپنے آدمی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''میں نے سوچا کہ پہلے تم سے ملنا بہتر ہوگا۔''

این کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ ڈیوڈ اپنے سابق نائب ہولٹ ہیلسی سے ملنے آیا ہے۔ ڈیوڈ نے ہولٹ کو این پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا تھا جب اسے کچھ لوگوں کی جانب سے قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ کم از کم ہولٹ نے یہی بتایا تھا جسے اس نے ایک کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیا تھا۔

''ٹھیک ہے جاؤ، اس سے مل لو۔'' این نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تک اسے جم بند کر دینا چاہیے۔ شاید وہ گھر جانے کے لیے نکل پڑا ہو۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے پاس اس کے گھر کا پتا ہوگا۔''

اس کی نظریں ڈیوڈ پر جمی ہوئی تھیں، گو کہ اس کے ہاتھ خالی تھے لیکن اس جیسے ماہر شخص کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ترقی پانے سے پہلے وہ دونوں ہی انسٹرکٹر رہ چکے تھے۔ ڈیوڈ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو۔ کیتھی سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔''

''یہ بات پرانی ہو چکی۔'' این سختی سے بولی۔ ''پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔''

''ہولٹ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ہولٹ نے کیمپ ویسٹ کیوں چھوڑا۔ کیا این کو اس کی وجہ معلوم ہے؟

این کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی کبھی

اس نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے ڈیوڈ؟''

''میں اس وقت فارغ ہوں حالانکہ دس سال میں کبھی چھٹی نہیں کی اور ہمیشہ کیمپ میں رہا لیکن جب تک وہ یہ معلوم نہیں کر لیتے کہ غبن کس نے کیا، میں کام پر نہیں جا سکتا۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں ہولٹ سے ملنے آ گیا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہوگا۔'' این بولی۔ ''اس کا فیصلہ کب ہوگا؟''

''بہت جلد، اس وقت آزادانہ آڈٹ ہو رہا ہے۔ میں ثابت کر دوں گا کہ بے گناہ ہوں۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے بجٹ بنانے میں ہمیشہ مشکل پیش آئی۔ زیادہ تر کام ہولٹ ہی کیا کرتا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ نگرانی کرنے والے مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں بڑی نفاست سے غبن کر سکتا ہوں۔''

''ان کا کام ہی شک کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے اپنی کار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہولٹ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''تقریباً چھ میل جنوب کی جانب۔ بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا کمپلیکس ہے جس میں سب ٹاؤن ہومز ہیں۔ اس کے گھر کا نمبر آٹھ ہے۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی این۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔

این اسے دیکھتی رہی، جب تک اس کی کار نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس نے پرس سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''این۔'' ہولٹ نے کہا۔ ''میں.....''

''ڈیوڈ انگولا یہاں آیا ہوا ہے۔'' این نے کہا۔ ''جب میں اسکول سے باہر آئی تو وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔''

ہولٹ لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''کیوں؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اسے کیمپ چھوڑنے کے لیے کہا گیا ہے جب تک آڈٹ نہیں ہو جاتا۔ غبن کا معاملہ ہے۔ وہ تم سے ملنے آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ہولٹ نے کہا۔ اس کے لہجے سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پریشان یا پُرجوش ہے۔

این سوچ رہی تھی کہ کیا ڈیوڈ کی غیر متوقع آمد نے ہولٹ کو پریشان کر دیا ہے یا پھر اسے یہ جان کر خوشی ہوئی ہوگی کہ اس کا سابق باس شہر میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کی آمد کی وجہ جانتا ہو۔

این کا مکان ایک ایسی سڑک پر واقع تھا جو آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ اس نے اس دو منزلہ سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے مکان کا انتخاب کرنے سے پہلے کئی جگہیں دیکھیں لیکن اسے یہی پسند آیا گو کہ یہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر تھا لیکن مرحوم شوہر کے انشورنس سے ملنے والی رقم اتنی تھی کہ وہ بآسانی اس کی ڈاؤن پیمنٹ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ لان سروس کا عملہ اس کی غیر موجودگی میں کام کر کے جا چکا ہے۔ کئی پودے خشک ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے طور پر لان میں کام کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ سب بے حد گھریلو اور اکتا دینے والا لگا۔ ویسے بھی یہ کام اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔

جلد یا بدیر اردگرد کا علاقہ ڈیولپ ہونا تھا لیکن فی الوقت جنگل نے اس جگہ کو گھیرا ہوا تھا۔ چھوٹا سا علاقہ بہت پرسکون اور خوشگوار تھا اور کوئی بھی مکین اپنے بیرونی لان سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ البتہ جہاں سڑک ختم ہوتی تھی وہاں دو نوعمر لڑکے اپنے ڈرائیو وے میں کھیلتے نظر آتے۔

اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی، تبھی اسے اپنے عقب میں کوئی نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ کوئی اپنی کار سے اتر کر گیراج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کی عورت تھی جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ این اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ہیلو کیتھی۔'' این نے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر حیرانی ہو رہی ہے۔''

''انجن بند کر کے گاڑی سے باہر آ جاؤ۔ ہم اندر چل کر بات کریں گے۔''

ڈیش بورڈ کے خانے میں گن رکھی ہوئی تھی لیکن اس کو نکالنے سے پہلے ہی کیتھی اسے گولی مار دیتی۔ بہرحال اس کی جیب میں چاقو موجود تھا۔

''جلدی کرو۔'' کیتھی بے صبری ہو رہی تھی۔ این نے کیتھی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گاڑی کا انجن بند کیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

''ہم کافی عرصے بعد مل رہے ہیں۔'' این نے کہا۔

''اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔'' کیتھی نے بےزاری سے کہا اور اپنا ہُڈ اتار دیا۔

این نے اس کی سرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتیں تو یہاں کیوں آئی ہو۔ کیوں گھات لگائے بیٹھی ہوئی تھیں؟''

''مجھے تم سے بات کرنے کی ضرورت پیش آ گئی

ہے۔ گھات اس لیے لگائی کہ کہیں تم کوئی سوال کرنے سے پہلے ہی گولی نہ مار دو۔ میں نے سب باتوں پر پہلے ہی غور کرلیا تھا۔''

''یہ سوچتے ہوئے کہ تم نے مجھے بس سے نیچے پھینک دیا تھا؟''

جب سینیٹر ایبرسن کی بیٹی پہاڑی پر چڑھنے کے ٹیسٹ کے دوران مرگئی تو کیتھی نے سارا الزام این کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ این اس کی حکمت عملی سمجھ گئی تھی حالانکہ کیتھی نے ہی سینیٹر کی بیٹی کو پہاڑی پر چڑھنے کے لیے کہا تھا جبکہ اس نے بتایا بھی تھا کہ وہ بیمار ہے۔ این جانتی تھی کہ الزام اس کے سر آئے گا کیونکہ وہ کیمپ ایسٹ کی انچارج تھی۔

''اندر چلو۔'' کیتھی نے کہا۔

این نے عقبی دروازے کا تالا کھولا اور الارم کوڈ لگا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کچن تک آئی۔

کیتھی اس کے پیچھے تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا حال ہی میں تمہاری ڈیوڈ انگولا سے ملاقات ہوئی ہے؟''

این کو اسی سوال کی توقع تھی۔ وہ چلتے ہوئے لیونگ روم تک آئی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اسے دیکھ کر مجھے اتنی ہی حیرانی ہوئی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے لیکن میں زیادہ خوش ہوئی۔ کیا وہ اب بھی فارم ویسٹ کا نگراں ہے؟''

''وہ نگراں تھا۔'' کیتھی بولی۔ ''ہم دونوں تحقیقات مکمل ہونے تک معطل ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں آیا ہوگا کیونکہ تم اس کی پسندیدہ شخصیت ہو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ گریگ ہولٹ بھی یہاں ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی ڈیوڈ کا آدمی تھا۔''

''یقیناً یہ ایک جذباتی ڈرامائی انداز ہے۔'' این نے کہا جو درست نہیں تھا۔ ہولٹ اپنے علاوہ کسی کا نہیں تھا۔ کم از کم این یہی سمجھتی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ تم دونوں یہاں کس طرح اپنی نئی زندگی گزار رہے ہو۔'' کیتھی نے کہا۔ ''میں نے کبھی دو لوگوں کو ایک ہی شہر میں اس طرح ساتھ رہتے نہیں دیکھا۔''

''یہاں رہنے کی وجہ یہ ہے کہ میری موجودگی خفیہ رہے۔'' این نے کہا۔

''تم تک پہنچنے میں کچھ وقت تو لگا۔'' کیتھی بولی۔ ''لیکن میں نے پتا لگا لیا۔''

''اس کے لیے تم نے کیا ہتھکنڈا آزمایا؟ جبر و تشدد یا کچھ اور گھٹیا حرکت؟'' آخری لفظ کا اضافہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ کیتھی نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ عجیب انداز میں مسکرا دی۔

ضرور کہیں کوئی لیک ہے جسے بند کرنا لازمی ہے۔ اسے اس وقت ہی احتیاط کرنی چاہیے تھی جب پہلی بار اس کے ماضی سے تعلق رکھنے والا پہلی بار اس کے گھر آیا اور اسے مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے یہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا کہ وہ کوئی پرانا دشمن تھا لیکن اب وہ سمجھ گئی کہ کیتھی کے پردے میں کون بول رہا تھا۔ بظاہر وہ ایک کمزور شخص ہے لیکن اس کی ریکارڈ تک رسائی ہے۔

''گیری پارمر جو ٹیکنیکل سپورٹ میں ہوتا ہے۔'' این نے اپنے اندازے کی بنیاد پر کہا تو کیتھی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون ہے۔'' کیتھی اب کاؤچ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گن آگے کرتے ہوئے کہا۔ ''کپڑے اتار دو۔''

این کو غصہ آ گیا گو کہ اس نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے سوچا۔ 'میرے ہی گھر میں کوئی مجھے کپڑے اتارنے کے لیے کیسے کہہ سکتا ہے۔'

لیکن وہ اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی پتلون کی زپ کھول دی۔

''انگولا نے رقم کہاں چھپائی ہے؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کیا بات کر رہی ہو۔'' این نے کہا۔ ''میں اس معاملے سے بالکل بے خبر ہوں۔''

سارے کپڑے اتارنے کے بعد وہ ایک دائرے کی شکل میں گھومی تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ اس کے زیریں لباس میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ''تم کس رقم کی بات کر رہی ہو؟''

کیتھی کی نظریں این پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بائیں ہاتھ سے اس کے کپڑوں کو ٹٹول رہی تھی جب اس نے جیکٹ کاؤچ پر پھینکی تو اسے چاقو کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''اکاؤنٹنگ کے شعبے سے کسی نے اس غبن کی نشاندہی کی تھی۔'' کیتھی نے کہا۔ ''اس کے بعد تحقیقات شروع ہو گئیں جیسے جانور کی لاش پر مکھیاں بیٹھتی ہیں۔''

کیتھی نے این کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اس کی پتلون اور بلاؤز اس کی طرف پھینک دیا۔ جب این کپڑے پہن چکی تو کیتھی بھی کاؤچ پر بیٹھ گئی لیکن وہ اب بھی بہت چوکس تھی۔

''دونوں کیمپوں کا آڈٹ ہو گیا؟'' این بلاؤز کے بٹن لگاتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ ہمارے اکاؤنٹس منجمد کر دیے گئے ہیں۔ ہر کوئی باتیں بنا رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں پانچ لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی خورد برد ہوئی ہے۔''

این یہ سن کر حیران رہ گئی۔ اس تربیتی کیمپ کے اخراجات بہت زیادہ تھے اور اتنی بڑی رقم کے نکل جانے سے مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ رقم بجٹ سے غائب ہوئی یا خفیہ فنڈ سے؟''

''فنڈ سے۔'' کیتھی نے جواب دیا۔ ''دونوں کیمپ اس فنڈ میں وہ پیسا جمع کراتے ہیں جو مجرموں یا ایسے لوگوں سے ضبط کیا جاتا ہے جو دشمن تصور کیے جاتے ہیں۔ اس فنڈ کا علم صرف اعلیٰ افسران یا نگرانوں کو ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکنیکل ٹیم کے کچھ لوگوں کو بھی اس فنڈ کے بارے میں معلومات ہیں جو اعداد و شمار جمع کرنے کا کام کرتے ہیں۔''

کیتھی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اوپر والے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں ڈیوڈ پر شبہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے بھی اس میں ملوث کر رہے ہیں جس کا مجھے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر میں اس الزام سے بری ہو گئی تب بھی اس خسارے کی وجہ سے اگلے برس تربیت پانے والوں کی تعداد آدھی رہ جائے گی جس کے نتیجے میں کم از کم دو انسٹرکٹرز کو فارغ کرنا ہوگا۔''

یہ کوئی انوکھی صورت حال نہیں تھی۔ این کی مدت ملازمت کے دوران بھی دو مرتبہ پیسوں کا بحران ہو چکا تھا۔ ''دونوں کیمپوں کے انضمام سے کافی رقم بچائی جا سکتی ہے۔'' این نے کہا کیونکہ وہ یہ افواہ پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکی تھی لیکن اب یہ کیتھی پر براہ راست حملہ تھا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بہت جونیئر تھی اور اگر دونوں کیمپ ایک ہو جاتے تو اس کی چھٹی ہو جاتی۔

''فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' کیتھی نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''جب تک اس رقم کا پتا نہیں چل جاتا، میں اور ڈیوڈ معطل رہیں گے، مجھے یقین ہے کہ ڈیوڈ، گریگ سے ملنے ضرور آئے گا۔ وہ دونوں چوروں کی طرح ایک ہیں۔''

''میں یہاں تین سال سے ہوں جبکہ ہولٹ کو بھی دو سال ہو گئے ہیں۔'' این نے کہا۔ ''یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اس کا ذمے دار ہو سکتا ہے۔''

اس نے دل میں سوچا۔ 'لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔'

''اگر تمہیں ڈیوڈ مل گیا تو کیا کرو گی؟''

کیتھی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور بولی۔ ''میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔ کیا تم سچ کہہ رہی ہو کہ تم نے اسے نہیں دیکھا؟''

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔''

''گریگ کا نیا نام کیا ہے؟''

''ہولٹ ہیلسی۔ وہ یہاں ٹیبل ہال کوچ ہے۔'' این نے یہ بات چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے یقین تھا کہ کیتھی کسی کو نہیں بتائے گی۔

''اندھیرا ہوتے ہی ہم کوچ ہیلسی سے ایک مختصر ملاقات کرنے جائیں گے۔'' کیتھی نے کہا اور دوبارہ کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

این کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ اپنی نئی شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے اسکول کو بہترین بنانے میں زبردست قابلیت کا مظاہرہ کیا تھا گو کہ بعض اوقات اسے غیر روایتی طریقے اختیار کرنے پڑے۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ یہ سب کچھ کھو دے گی۔

وہ ممکنہ منظرنامے کا نقشہ کھینچ رہی تھی اور مختلف امکانات کے بارے میں سوچ رہی تھی جن میں سب سے زیادہ اہم گیری پارمر سے غیر اعلانیہ ملاقات کرنا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے ملنا چاہ رہی تھی۔

اندھیرا ہونے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت باقی رہ گیا تھا اور اسے یہ وقت کیتھی کے ساتھ گزارنا تھا۔ ''کیا تم تاش کھیلنا پسند کرو گی؟'' این نے پوچھا۔

اس کے جواب میں کیتھی نے ایک ایسی فحش بات کہی کہ غصے سے این کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''شٹ اپ۔''

کیتھی دم بخود اسے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد این کچھ نہیں بولی لیکن وہ بے کار نہیں بیٹھی رہی۔ اس کے پاس منصوبہ بنانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس کے لیونگ روم میں ہتھیار موجود تھے، اگر وہ ان تک پہنچ سکتی۔

''یہ تمہاری فیملی ہے؟'' کیتھی نے کہا تو این اپنے خیالوں سے واپس آ گئی۔ کیتھی اپنی گن سے میز پر رکھی ہوئی تصویروں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''ہاں۔'' این نے جواب دیا۔

''یہ تمہاری ممّا اور یہ ڈیڈی ہیں؟''

''ظاہر ہے کسی اور کے تو نہیں ہو سکتے۔''

''انہوں نے اس شخص کو کہاں سے تلاش کر لیا جو تمہارا شوہر لگ رہا ہے۔ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی ہے؟''

کیتھی اس تصویر کی بات کررہی تھی جس میں این اور اس کا شوہر جنگل کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا بازو این کے کندھے پر تھا اور دونوں مسکرارہے تھے۔

''وہ ایکٹر تھا۔''

''اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''وہ اسکیٹنگ کررہا تھا کہ اونچائی سے پھسل پڑا۔''

''اور یہ لڑکی کون ہے؟''

این کے دفتر میں ایک نوجوان لڑکی کی اسٹوڈیو پورٹریٹ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کیمرے سے اس کی تصویر اتارنی اور فریم کرواکر گھر میں رکھ لی۔ اس لڑکی نے نرس کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک تختی تھی۔ اسے سال کی بہترین نرس کا اعزاز ملا تھا۔

''یہ میری بہن ثریا ہے۔'' این نے جواب دیا۔ ''سان ڈیگو میں رہتی ہے۔''

کیتھی نے این کو یقین نہ کرنے والے انداز میں دیکھا اور بولی۔ ''میں اپنے کام سے پہچانی جاتی ہوں اور مجھے جعلی فیملی بنانے کی ضرورت نہیں اور کوئی مجھے کم تر نہیں سمجھتا۔ تم یہاں سویلین کی حیثیت سے کس طرح رہ رہی ہو؟''

''میں کسی سے کم نہیں ہوں۔'' این نے کہا۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو سویلین نہیں سمجھا گو کہ انسٹرکٹر لڑائی میں حصہ نہیں لیتے لیکن وہ اب بھی اپنے آپ کو فائٹر اور فوجی حکمت عملی کا ماہر سمجھتی تھی۔ اس نے اسکول پر اپنی توجہ مرکوز کی ہوئی تھی۔ وہ کیتھی کو اسکول میں ہونے والی بتدریج بہتری اور کھیل کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاسکتی تھی۔

کیتھی بظاہر خوش نظر آرہی تھی کہ سابقہ باس اس کے رحم وکرم پر ہے۔ این کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیتھی ہمیشہ سے اوپر آنے کی خواہش مند تھی اور اس نے کبھی اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی اور سینیٹر کی بیٹی کی موت پر اسے یہ موقع مل گیا۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ کیتھی نے لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔ ''تم فون سن سکتی ہو لیکن مدد کے لیے کسی کو نہ بلانا۔ ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

این نے سر ہلایا اور آہستہ سے کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ صرف دو قدم کے فاصلے پر ایک خفیہ جگہ گن رکھی ہوئی تھی اور وہ بہ آسانی اس تک پہنچ سکتی تھی لیکن کیتھی اس کے بالکل سامنے کھڑی نگرانی کررہی تھی۔ اس نے پرس سے فون نکالا۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ فون کرنے والا کون ہے۔

''کیا ہم آج رات مل رہے ہیں؟'' ہولٹ نے محتاط انداز میں کہا۔

این اس کال کا شام سے ہی انتظار کررہی تھی لیکن صورت حال کے پیش نظر بولی۔ ''معاف کرنا۔ ہمیں آج کی ملاقات منسوخ کرنا ہوگی۔ غیر متوقع طور پر ایک مہمان آگیا ہے۔ ہم کافی عرصے بعد ملے ہیں۔ اس لیے میں آج کی شام اس کے ساتھ گزاروں گی۔''

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد ہولٹ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہارے ساتھ ڈنر نہ کرنے کا افسوس رہے گا۔''

''کیا ہولٹ کا فون ہے؟'' کیتھی نے آہستہ سے کہا تو این نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''اسے کہو کہ آجائے۔'' کیتھی نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

''تم یہاں کیوں نہیں آجاتے۔'' این نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے گھر پر ہی بہت اچھی چیزیں بنائی ہیں۔ میں تمہیں اپنی دوست سے بھی ملواؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے کیتھی سے کہا۔ ''وہ آرہا ہے۔''

''کیا تم اکثر اس کے ساتھ ڈنر کرتی ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا حالانکہ وہ ہولٹ کے ساتھ کم از کم ہفتے میں تین مرتبہ ڈنر کیا کرتی تھی۔

''کیا تمہارے اس کے ساتھ جسمانی تعلقات بھی ہیں؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

این کو یاد آگیا۔ اسے کسی انسٹرکٹر نے بتایا تھا کہ جن دنوں کیتھی اور ہولٹ پلاننگ سیکشن میں کام کررہے تھے تو کیتھی نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔

دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھی نے اثبات میں سر ہلایا تو این نے دروازہ کھول دیا۔

ہولٹ نے بائیں ہاتھ میں سامان کا تھیلا پکڑا ہوا تھا جبکہ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا، گویا وہ مسلح ہوکر آیا تھا۔

''تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ یہاں کون آیا ہوا ہے۔'' این نے ایک طرف ہوکر اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیتھی برنٹن یاد ہے؟''

ہولٹ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ ''میں تم سے ملنے کی

توقع نہیں کررہا تھا کیتھی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں دیکھے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

کیتھی نے گن اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں۔ کیا تم مجھے روک سکتے ہو؟''

''میں روکوں گا۔'' عقب سے ڈیوڈ کی آواز آئی۔ کیتھی تیزی سے گھومی لیکن ڈیوڈ اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ این نے عقب سے چھلانگ لگائی اور دونوں بازو کیتھی کی گردن میں ڈال دیے۔ اس نے ایک بازو استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا اور دوسرے ہاتھ سے گن کو مضبوطی سے پکڑلیا لیکن ہولٹ نے اس ہاتھ پر اپنی گن کا دستہ مارا تو کیتھی کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ این نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی اور گولی چلے بغیر ہی کھیل ختم ہوگیا۔

ایک دفعہ این کی انگلی ٹوٹ گئی تھی۔ اس لیے وہ جانتی تھی کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کیتھی نہیں چلائی جو کہ بہت ہی متاثر کن بات تھی۔

''تم غیر مسلح ہوچکی ہو اور ہمارے کنٹرول میں ہو۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''اگر یہ صورت حال ٹریننگ کے دوران پیش آتی تو تم اپنے آپ سے کیا کہتیں؟''

کیتھی کچھ نہیں بولی لیکن اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔

''کیا تم قتل کرنے کے لیے میرا پیچھا کررہی تھیں؟'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''کیا تم یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہی ہو کہ رقم میں نے چرائی ہے؟''

''ہاں، تم نے ہی چرائی ہے۔'' کیتھی نے پورے یقین سے کہا۔

ڈیوڈ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں نے کبھی ایک سینٹ بھی نہیں لیا۔''

''اور میں نے بھی نہیں۔'' کیتھی نے کہا پھر اچانک ہی وہ پیچھے ہٹی۔ اپنے گھٹنے اوپر اٹھائے اور آگے بڑھ کر ڈیوڈ کے سینے پر لات ماردی۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔

تبھی این اپنے بائیں پاؤں پر گھومی اور دائیں پاؤں سے کیتھی کی کنپٹی پر لات ماری۔ اس کا سر پیچھے کی جانب جھول گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بل کھاکر گر پڑی۔ اس وقت تک ڈیوڈ بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوچکا تھا اور اپنی سانس پر قابو کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے کیتھی پر گن تان لی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی اسے یقین ہوگیا کہ وہ بے ہوش ہوچکی ہے۔

''ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔'' ہولٹ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''کیا واقعی؟'' ڈیوڈ نے کچھ الجھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ غبن بھی اسی نے کیا ہے۔''

''اور وہ یقین سے یہ کہہ رہی ہے کہ رقم تم نے ہی چرائی ہے۔'' این بولی۔

ڈیوڈ کچھ پریشان اور ناراض دکھائی دینے لگا۔ ''کیا تم دونوں کو میرے خائن ہونے کا یقین ہے؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔'' ہولٹ بولا۔ ''تم دونوں میں سے کسی ایک پر الزام آئے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ کیتھی ہی ہوگی۔''

این نے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنا شروع کردیں جو گروسری کے تھیلے سے گرگئی تھیں۔ ان میں ایک چاقو بھی تھا۔ اسے دیکھ کر این مسکرادی۔ وہ جیکٹ کی جیب میں سے اپنا چاقو بھی نکال چکی تھی۔

''اب تم اس کے ساتھ کیا سلوک کروگے ڈیوڈ؟''

''ہم کیمپ ایسٹ کو فون کرکے کہہ سکتے ہیں کہ وہ

نہلے پہ دہلا

ایک کاسمیٹکل اسٹور کے سامنے ہوٹل کے باہر دو اجنبی چائے پی رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا۔

''وہ جو سامنے اسٹور ہے، میں وہاں سے ایک پینٹ کا ڈبا چوری کرکے لاؤں گا اور دکان والے کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' دوسرے نے کہا۔

''یہ نہیں ہوسکتا بہت بارونق اسٹور ہے۔'' پہلے نے کہا۔ ''اگر میں چرالایا تو پانچ سو روپے کی شرط لگی؟'' دوسرے نے کہا۔ ''ہاں لگی شرط۔'' پہلا والا اسٹور میں گیا اور پینٹ کا ڈبا لے آیا اور دوسرے سے شرط جیتنے کے بعد 5 سو روپے مانگے۔ دوسرے نے کہا۔

''میں تمہیں چوری کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں کیونکہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔'' پہلے نے کہا۔

''تم مجھے گرفتار نہیں کرسکتے کیونکہ میں اسٹور کا مالک ہوں۔''

(مرسلہ: رعنا رضوی)

آ کر اسے لے جائیں یا پھر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں تا کہ اس سے کچھ سوال پوچھے جاسکیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے جانے دیں یا مار ڈالیں۔"

"اب ہم اس سسٹم کا حصہ نہیں رہے۔" این نے اپنے اور ہولٹ کے بارے میں کہا۔ "اس لیے ہمیں کسی تحقیقات میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم اسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے؟" ہولٹ نے کہا۔

"اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا لیکن اس نے کچھ عزت بنائی ہے اور این کے جانے کے بعد بہت اچھے طریقے سے کام کیا ہے۔"

ہولٹ نے کیتھی پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ تم کیتھی کو خود کیمپ ایسٹ لے جاسکتے ہو۔"

ڈیوڈ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"بہت سے لوگ پہلے سے جانتے ہیں کہ این کہاں ہے۔" ہولٹ نے کہا۔ "انہی میں سے کسی نے کیتھی کو بھی بتا دیا ہوگا۔ اگر تم نے یہاں سے فون کیا تو کم از کم دس لوگوں کو اور معلوم ہو جائے گا۔ این! کیا کیتھی نے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں کیسے تلاش کیا؟"

"گیری پارمر نے۔ کیتھی کو یہ بھی معلوم تھا کہ تم بھی یہیں ہو لہٰذا اس نے سوچا کہ ڈیوڈ بھی شاید آ جائے۔"

"کتیا کی اولاد۔" ڈیوڈ نے غصے سے کہا۔ "میں واپس جا کر گیری سے ضرور ملوں گا۔"

"اگر تم نہیں گئے تو میں ضرور جاؤں گی۔" این بولی۔

"میں وہ سب دوبارہ نہیں کرنا چاہتی۔ لگتا ہے کہ گیری سے بھید لینا بہت آسان ہے۔"

"تمہاری اس بات سے کیا مطلب لیا جائے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"تم شروع سے ہی جانتے تھے کہ میں کہاں ہوں۔ تم نے ہی ہولٹ کو یہاں بھیجا۔"

"اس لیے کہ تمہیں قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔"

"میں نہیں مانتی کہ اس کے یہاں آنے کی صرف یہی ایک وجہ تھی۔"

ڈیوڈ نے ہولٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اسے کچھ نہیں بتایا؟"

"ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی۔" ہولٹ نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"ہم ماضی کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرتے۔" این بولی۔

"این! شاید تمہیں یہ جاننے میں دلچسپی ہو کہ یہاں آنے سے پہلے یہ گریگ بیئر تھا۔ اس پر ایک ڈاکٹر کو غائب کرنے اور ممکنہ طور پر قتل کرنے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔"

"پھر؟" این نے پوچھا۔

"مجھے کہیں سے معلوم ہوگیا کہ گریگ کو گرفتار کیا جانے والا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ ہم پولیس کو کیمپ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا میں گریگ کو ان سے ملوانے شہر لے گیا۔"

"وہ مجھے مقامی پولیس اسٹیشن لے گئے لیکن رسمی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا۔"

"بہر حال اس کی گرفتاری کا خطرہ موجود تھا۔ لہٰذا میری سفارش پر اوپر والوں نے اسے روپوش ہونے کی اجازت دے دی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ یہ خفیہ ٹریننگ پروگرام کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ اس کا پس منظر دیکھتے ہوئے ہم نے اس کا حلیہ بدل کر یہاں بھیج دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اسے نہیں پہچان سکیں کیونکہ اس سے پہلے کبھی تم دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے اسے نہیں پہچانا۔"

"اوپر والوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نے تم دونوں کی شناخت بدل دی تھی۔"

"سوائے گیری کے۔"

ڈیوڈ نے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کیتھی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ہم میں سے کوئی ایک تمہارے ساتھ جاسکتا ہے۔" این بولی۔ "شاید تمہیں مدد کی ضرورت پیش آئے۔"

"نہیں شکریہ۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "مجھے کچھ سوچنا ہے۔ کسی نے نقب زنی کا ارتکاب کیا ہے وہ میں نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ کیتھی بھی نہیں ہوسکتی لیکن شاید ہم دونوں ہی اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

ہولٹ اور این نے ایک دوسرے کو دیکھا اور فوراً ہی نظریں ہٹالیں۔ شاید وہ کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے۔

"تمہاری کار کہاں ہے؟" این نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

"ہم اسی کی کار میں یہاں آئے ہیں۔" ہولٹ نے کہا۔

"بہت اچھے۔ اب ہمیں اس کی کار بھی تلاش کرنی ہے۔"

ہولٹ نے جھک کر کیتھی کی تلاشی لی۔ اسے دو چابیوں کے گچھے ملے۔ ایک اس کی ذاتی چابیاں تھیں اور دوسری کرائے کی کار کی۔

"اس کا کیبن کیمپ سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔" این نے کہا۔ "اگر اس نے وہ جگہ اب تک نہیں چھوڑی۔"

"یہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہے گی۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "اگر راستے میں پولیس نے روک لیا تو مجھے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں اس کا انتظام کر دیتی ہوں۔" این نے کہا اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دو انجکشن تھے۔

"یہ تم نے کیوں رکھے ہوئے ہیں؟" ڈیوڈ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

"کیمپ ایسٹ میں ایک زیر تربیت شخص کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو میں نے ڈسپنسری سے منگوائے تھے جو بچ گئے۔ تو میں نے یہ سوچ کر اپنے پاس رکھ لیے کہ شاید بھی کام آجائیں۔"

ڈیوڈ نے شیشی کو غور سے دیکھا۔ ابھی ان کی میعاد باقی تھی۔ اس نے ایک انجکشن سرنج میں ڈالا اور کیتھی کو لگا دیا پھر اس نے این سے پوچھا۔ "کیا تمہارے گیراج میں جگہ ہے؟"

"ہاں۔ کچن کے دروازے کے ساتھ ہی اس کا بٹن لگا ہوا ہے۔ تم اپنی گاڑی اندر لے جاسکتے ہو۔"

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد این نے گیراج کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس نے ہولٹ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اس نے کیتھی کو کندھوں کے بل کھڑا کیا۔ این نے اس کے کندھے پکڑے اور اسے لے کر گیراج کی طرف چل دیے۔ اس نے کار کی ڈکی کھولی اور بولا۔ "میں چار گھنٹے بعد اسے دوسرا انجکشن لگا دوں گا۔"

این اور ہولٹ نے بمشکل تمام کیتھی کو ڈکی میں ڈالا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ ڈیوڈ نے ڈکی بند کر کے کار اسٹارٹ کی اور گیراج سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد این نے ہولٹ سے کہا۔ "یہاں آنے سے پہلے تم گریگ تھے۔ تمہاری کوئی فیملی بھی ہوگی؟"

"ہاں، ممی، ڈیڈی اور بھائی۔ میرے باپ کو معدے کا کینسر تھا۔ ایک رات اسے شدید تکلیف ہوئی۔ بھائی شہر سے باہر تھا۔ میری ماں اسے رات کے تین بجے ایمرجنسی کلینک لے کر گئی کیونکہ وہ اسپتال کی نسبت کافی نزدیک تھا۔ میں بھی ان سے ملنے کے لیے ہوٹل سے روانہ ہوگیا۔ ڈاکٹر نے غلط دوا دے دی اور ڈیڈی کا انتقال ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بیماری میں کوئی نہیں بچتا لیکن وہ مزید کچھ عرصہ زندہ رہ سکتے تھے۔ ماں کو بھی یقین تھا کہ وہ انہیں واپس گھر لے آئے گی۔"

"پھر تم نے اس ڈاکٹر کو پکڑا؟"

"میں نے تین ہفتے انتظار کیا پھر ایک دن، رات کو اس کے گھر چلا گیا۔ اسے بستر سے باہر نکالا اور پھر وہ غائب ہوگیا۔"

"کیا واقعی پولیس کے پاس تمہارے خلاف کچھ ثبوت تھے؟"

"اس رات میں نے اس سے کچھ باتیں کی تھیں جن کی وجہ سے پولیس مجھ پر شک کر رہی تھی۔ جب انہوں نے میرا پس منظر معلوم کیا تو ان کا شک اور بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ ایک پڑوسی نے اس کے ڈرائیو وے سے ایک کار نکلتی دیکھی جو میری کرائے کی کار جیسی تھی۔"

"اس سے کوئی حتمی نتیجہ تو نہیں نکالا جاسکتا۔"

"نہیں لیکن مجھ سے تفتیش کے لیے اتنا ہی کافی تھا اور ڈیوڈ یہ نہیں چاہتا تھا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا اور ڈیوڈ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھا۔"

وہ دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔ این نے الماری کھول کر مشروب کی بوتل نکالی اور ایک گلاس میں انڈیل کر اسے دیا پھر اپنے لیے بھی ایک گلاس بنایا۔ کچھ دیر دونوں خاموشی سے ڈرنک کرتے رہے پھر این بولی۔ "کینسر کا علاج تو بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

ہولٹ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی طویل عرصے تک بیمار رہے۔ ایک بار اسپتال جانے پر جو خرچہ ہوتا تھا، اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ انشورنس سے ملنے والی رقم اس مہنگے علاج کے لیے ناکافی تھی۔ میری ماں اور بھائی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ قرضہ بڑھتا جا رہا تھا جو وہ ساری عمر نہیں اتار سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میری آمدنی اتنی زیادہ نہیں۔ اس لیے وہ مجھ سے کسی مدد کی توقع نہیں کر رہے تھے اور یہ چیز مجھے اندر سے جلا رہی تھی۔"

"اس لیے تم نے وہ رقم فنڈ سے خورد برد کی؟"

"ہاں۔ یہ نقب زنی میں نے ہی کیا تھا۔"

اس اعتراف کے بعد شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تاہم این نے مزید تفصیل جاننے کے لیے پوچھا۔ "تم نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا اور کسی کا دھیان تمہاری طرف نہیں گیا۔ یہ بتاؤ کہ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟"

''میں جانتا تھا کہ ڈیوڈ حساب کتاب میں بہت کمزور ہے۔ ہمیشہ بجٹ بناتے ہوئے اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے اور اسے میری مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ میری ایک ذہین اکاؤنٹنٹ سے واقفیت تھی۔ وہ کالج کے زمانے میں میرا روم میٹ ہوا کرتا تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت کو غلط کاموں میں استعمال کرنا شروع کر دیا اور کئی لوگ اس سے حساب کتاب میں ہیرا پھیری کروانے لگے۔ جب یہ بات میرے علم میں آئی تو میں نے اس سے رابطہ کیا اور وہ بخوشی میری مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کسی بھی سسٹم کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

''کیا وہ اب بھی یہیں موجود ہے؟ وہ اس سے بھی تحقیقات کر سکتے ہیں۔''

''غلط کاموں کی وجہ سے اس کی بدنامی ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ ایک سال پہلے غائب ہو گیا۔''

این نے بے یقینی کے انداز میں ہولٹ کو دیکھا اور بولی۔ ''کیا واقعی؟''

''ہاں۔'' ہولٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کے غائب ہونے کے بعد میں پُرسکون ہو گیا۔ اب کوئی مجھ پر ذرہ برابر بھی شک نہیں کر سکتا تھا لیکن جب ڈیوڈ آج یہاں آیا تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر شبہ کرے لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ کیتھی کو قابو کرنے میں میرا ساتھ دیا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈیوڈ کو تم پر شبہ ہے؟'' این نے پوچھا۔

''نہیں۔ ورنہ وہ مجھے وہاں سے نہ نکالتا۔''

''تمہارے گھر والے نہیں جانتے کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ کیا وہ حادثاتی طور پر اس کا اظہار نہیں کر سکتے؟''

''میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نے کسی کاروبار میں سرمایہ لگایا تھا۔ یہ رقم وہیں سے نکالی ہے۔ یہ جان کر وہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی۔''

''تم نے اپنے باپ کے علاج پر جو رقم خرچ کی، اس پر بھی سوالات ہو سکتے ہیں۔ کیا اوپر والے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تمہارے پاس یہ رقم کہاں سے آئی؟''

''اگر اسپتال کے بل کی ادائیگی یکمشت ہوتی تو شبہ ہو سکتا تھا لیکن میں نے ڈھائی سال میں تھوڑی تھوڑی کر کے یہ رقم ادا کی اور اس کا کچھ حصہ فیملی اکاؤنٹ سے دیا گیا اس لیے شبے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ویسے بھی میں کیپ ویسٹ میں دو سال سے کم رہا۔ میرا گزارہ کوچ کی تنخواہ سے ہو رہا ہے۔''

''اور اب رقم بھی خورد برد نہیں ہو رہی۔''

''آج کل سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی یہ حماقت نہیں کرے گا۔''

''لیکن شاید وہ کوئی قربانی کا بکرا تلاش کر کے خوش ہوں گے۔''

''تم کیا سوچ رہی ہو این؟''

''میں سوچ رہی ہوں کہ ہم کیتھی کی کار میں پنسلوانیا تک جائیں اور ڈیوڈ سے آگے نکل جائیں۔''

''پھر کیا ہوگا؟'' ہولٹ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''پھر ہم کیتھی کے گھر میں وہ رقم رکھ دیں گے۔ سونے یا بانڈ کی شکل میں جن کا پتا نہیں لگایا جا سکتا۔''

''لیکن میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ ہی اتنی زیادہ رقم ہے جس سے انہیں یقین ہو سکے کہ کیتھی نے ہی چوری کی ہے۔''

''میرے پاس کچھ محفوظ فنڈز ہیں۔'' این نے کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ہولٹ آگے کی طرف جھکا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم میری خاطر یہ سب کرو گی؟''

''ہاں۔'' وہ پُرعزم انداز میں بولی۔ ''ضرور کروں گی۔''

''کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوگا؟''

''بالکل نہیں۔''

ہولٹ اظہارِ ممنونیت کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ این اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اگر انہیں کیتھی کے گھر سے رقم مل گئی تو ڈیوڈ بری ہو جائے گا اور کیتھی ان کے ہاتھ نہ آئی تو روپوش ہو جائے گی۔ اس طرح وہ سمجھ جائیں گے کہ کیتھی نے غبن کیا تھا۔ مجھے اس کا گھر معلوم ہے اور میرے پاس اس کی چابیاں بھی ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ہولٹ نے کہا۔

این نے ایک خفیہ جگہ سے اپنے فنڈ کی آدھی رقم نکالی اور دو منٹ سے کم وقت میں... واپس آ گئی۔ انہیں کیتھی کی کار تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

شمال کی طرف لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے انہوں نے موسم بہار کی تعطیلات کے لیے کچھ پروگرام بنائے جن میں گیری پارمر کو بھی سبق سکھانا شامل تھا کیونکہ وہی اس سارے فساد کی جڑ تھا۔

میراث

زویا اعجاز

زمین کے ٹکڑوں پر حق جتانے والے محبت بھرے دلوں کو روند کر شاید تاج محل تو کھڑا کر لیتے ہیں مگر ان میں شادمانی کو تمام عمر ڈھونڈتے ہی رہتے۔ یہی حال ظالمانہ کارروائیوں کے عادی ان لوگوں کا ہے جو کشمیر جنت نظیر وادی کے حسن کے متوالے تو ہیں مگر قدر دان اور رکھوالے نہیں...

غاصبانہ کاوشوں اور بے حسی کا ایک چھوٹا سا منظر...... ماہِ فروری کے لیے

خصوصی تحریر

گل خان اپنی سماعت پر شرمسار تھا۔

وہ ایک سناٹے کی کیفیت میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد پھیلا.... شور اس کی ہستی میں مزید انتشار پیدا کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بگولوں کی زد میں آنے لگا۔ الفاظ کے کنکر سماعتیں لہولہان کر رہے تھے۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھے اور چلا کر بولا۔

''بس کر دو...... خدا کا واسطہ...... بس کر دو یہ سب...... خاموش ہو جاؤ۔''



گل تڑپتا رہا' چلاتا رہا لیکن اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا بھی کون؟ وہ اب ہانپتا ہوا گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا تھا۔ سالخوردہ گھٹنوں نے اس اضطراری اور' بے پروا' حرکت پر کئی احتجاجی صدائیں بلند کیں لیکن گل کو کسی بھی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔

☆☆☆

''اتنی دیر کہاں لگا دی خان؟ ہم کب سے انتظار کر رہے تھے۔'' گل خان کے گھر میں داخل ہوتے ہی روشن خانم نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کہیں نہیں! یہیں تھا بس۔'' اس نے شکستگی سے کہا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا...؟'' روشن کو تشویش نے گھیر لیا۔

''ٹھیک ہوں۔ کیوں جھک جھک کر رہی ہو؟'' وہ... چڑچڑے انداز میں بولا تو روشن نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ وہ اپنے مجازی خدا کے مزاج سے اپنے ہاتھ کی لکیروں ہی کی طرح واقف تھی۔ گل خان بہت تحمل مزاج اور دھیمی فطرت کا مالک تھا۔ بڑی سے بڑی بات بھی خندہ پیشانی سے سہہ لیا کرتا تھا۔ زندگی ان کے لیے کبھی بھی آسان نہیں رہی تھی ۔ وہ پیدائشی بدنصیب تھے شاید۔ مصائب و مشکلات کو ان سے اتنی محبت تھی کہ وہ انہیں کبھی اکیلا چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتے۔

گل خان اسم بامسمّیٰ بالکل نہیں تھا۔ اس کے سینے میں چٹانوں کی سی سختی اور افق سے بھی زیادہ کشادگی تھی۔ وہ اکثر اہل و عیال کو ایک بات سمجھایا کرتا تھا کہ رب کریم کسی بشر کو اس کی استطاعت سے زیادہ آزمائش میں مبتلا نہیں کرتا اس ذاتِ اقدس نے اپنی الہامی کتاب میں فرمایا ہے کہ 'ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔' تو یہ امر ایک حقیقت ہے کہ ہر پریشانی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی حل بھی لایا کرتی ہے۔ اس کائنات میں کوئی بھی در ایسا نہیں جو ہمیشہ مقفل رہنے کے لیے بنا ہو۔

''آج ایسا کیا ہو گیا خان کے ساتھ؟ اتنا افسردہ تو وہ کبھی نہیں ہوا۔'' روشن کے ذہن میں ایک بار پھر وفاشعار بیوی کا عکس لہرایا۔

''آج صبح رفیق آیا تھا۔ کرایہ بڑھانے کی بات کر رہا تھا۔'' اس نے شوہر سے کہا۔

''اچھا! ٹھیک ہے۔'' وہ مختصراً جواب دے کر صحن میں موجود نلکے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ ایک اور خلافِ معمول بات تھی۔ رفیق کی آمد کا ذکر سن کر وہ ہمیشہ تاسف سے سر جھٹک کر کم و بیش ایک ہی فقرہ دہرایا کرتا تھا۔

''خدائی خوار کو اتنی بار سمجھایا ہے کہ گھر میں پردہ دار بیبیاں رہتی ہیں۔ بے نتھے بیل کی طرح منہ اٹھا کر نہ چلے آیا کرو۔ نہ جانے کب سمجھے گا؟''

روشن مضطرب نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے اس خاموشی کی وجہ جاننے اور قفل توڑنے کا ایک اور جواز تلاش کرنے لگی۔ گل آستینیں چڑھائے وضو میں مگن تھا۔ روشن کی عقابی نظروں نے ایک اور تبدیلی بھی فوری طور پر محسوس کر لی۔

گل ہمیشہ انہماک اور زیرِ لب آیات کا ورد کرتے ہوئے وضو کے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا لیکن ابھی وہ سر کا مسح کرنا بھول گیا تھا۔ اس کے ہونٹ بھی ساکت تھے۔ روشن کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جب پاؤں دھونے کا آغاز کیا تو یہاں بھی دایاں پاؤں صرف دو دفعہ دھو کر بائیں کی جانب بڑھ گیا۔ یہ واضح غلطیاں روشن کے لیے اب ناقابلِ برداشت تھیں۔ وہ تیزی سے اس کی جانب لپکی اور نرمی سے کندھا ہلا کر بولی۔

''خان!! ہوش میں آؤ۔ کیا ہو گیا ہے؟''

''ہوش میں ہی تو ہوں۔ تم عورتیں تو بس ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔'' وہ جھنجلایا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں ورنہ وضو میں اس قدر غلطیاں کیسے ہو سکتی ہیں؟'' وہ حقیقتاً بہت حیران تھی۔ گل خان تو حافظِ قرآن اور دین کی بہترین سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ایسی حماقتیں کیونکر کر سکتا تھا؟

اس کی حیرت اس وقت مزید دوچند ہو گئی جب وہ اس کی بات ان سنی کیے برآمدے کے ایک کونے میں جائے نماز لیے بڑھ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات بہت بے تاثر اور مشینی تھیں۔ روشن بھی پیچھے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر اس کا بغور مشاہدہ کرنے لگی۔

نتیجہ اب بھی وہی تھا۔

روشن کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا مجازی خدا کسی ایسی افتاد کا شکار ہو گیا ہے جو اس کا وجود اپنے آسیب میں بری طرح جکڑ چکی ہے۔ کم علم اور سیدھی سادی سی وہ عورت اتنی بات تو جانتی ہی تھی کہ وہ بے حد دباؤ کا شکار ہے اور اگر اسے مزید کریدنے یا دباؤ

ڈالنے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس تصور سے وہ لرز کر رہ گئی۔ عمر کے اس آخری حصے میں اپنے سر کے تاج سے محرومی کا خیال ہی اس کے لیے بہت ہولناک تھا۔

''الٰہی! اپنا کرم فرمانا۔'' وہ تاروں بھرے آسمان کی جانب دیکھ کر گڑگڑائی۔

تھوڑی ہی دیر بعد گل بھی صحن میں بچھی چارپائی پر آ کر لیٹا اور خالی نظروں سے آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟ کھانا لے کر آؤں کیا؟''

''نہیں! میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے پژمردگی سے جواب دیا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی دونوں کے درمیان حائل رہی اور پھر گل نے کہا۔ ''سہیل کے ایصالِ ثواب کے لیے کل قرآن خوانی کا بندوبست کر لینا۔''

''میں نے پچھلی جمعرات محلے کے بچوں میں چاول بانٹے تھے۔ مسجد میں بھی بھیجے تھے۔''

''کل صبح پھر بھیج دینا۔ ورنہ بہت خرابی ہو جائے گی۔'' وہ مصر تھا۔

''الٰہی خیر! ماجرا کیا ہے؟'' روشن دہل گئی۔

''وہ بہت دکھی ہے...... بہت ملول ہے۔'' گل کی نگاہیں ہنوز آسمان پر تھیں۔ ''میں نے دیکھا تھا اسے۔''

''کہاں دیکھ لیا؟ کہیں خواب میں تو نہیں آیا وہ؟'' روشن کی آواز بھرا گئی۔

''خواب میں نہیں..... حقیقت میں ...... وہ اُدھر تھا۔'' اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر جنوبی سمت اشارہ کیا تو روشن کا دل ہول کر رہ گیا۔

''وہ وہاں کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ ہوش میں آئیں خدارا!''

''وہیں تھا وہ۔'' گل نے برہمی سے کہا۔ ''وہ سب وہیں تھے..... سہیل' ناصر' علی' قاسم' عاطف...... اور وہ بھی تو تھا جسے ہم لمبے قد کی وجہ سے بہت چھیڑتے تھے..... کیا بھلا سا نام تھا..... ہاں! حذیفہ..... سب ملے تھے آج...... بہت پریشان ہیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے ہانپنے لگا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر روشن کا دل خون ہو رہا تھا۔ ''وہ سب اس دنیا میں نہیں رہے..... کیسے مل گئے آپ کو؟'' وہ رونے لگی۔

''مہ وش کہاں ہے؟'' گل خان نے موضوع بدلا۔

''سو گئی ہے..... اس کا پرچہ ہے کل۔''

''اسے کہنا کل صبح مجھ سے ملے بغیر نہ جائے۔''

''وہ آپ ہی کے ساتھ تو جاتی ہے۔ بھول گئے ہیں کیا؟'' روشن نے تشویش سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر حرارت محسوس کرنی چاہی لیکن پیشانی بالکل ٹھنڈی تھی۔

''ہاں! میں بھول گیا تھا۔ میں صبح رستے میں ہی اس سے بات کر لوں گا۔ تم اس سے کہنا مجھے مل کر جائے۔'' وہ ایک بار پھر بے خیالی میں بولا۔ روشن بے بسی کے عالم میں رونے لگی لیکن گل بے نیازی سے آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا تلاشتا رہا۔

☆☆☆

اگلی صبح بھی یہی صورتِ حال ہنوز برقرار تھی۔

گل خان کی حالت میں زیادہ بہتری نہیں تھی۔ بدحواسی قدرے کم تو تھی تاہم خاموشی اور اداسی اب بھی ویسے ہی قائم تھی۔ اس نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ چائے بھی آدھا کپ پی کر ہی چھوڑ دی تھی حالانکہ چائے پراٹھا وہ بہت رغبت سے کھایا کرتا تھا۔

مہ وش بھی باپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت حیران تھی۔ وہ سترہ سال کی تھی اور آج کل میٹرک کے پرچے دے رہی تھی۔ سرخ و سپید رنگت' جاذبِ نظر نقوش اور متناسب سراپا کی حامل مہ وش گل خان کی اکلوتی زندہ اولاد تھی۔ باحیا' تابعدار' شریف النفس اور معصوم فطرت وہ لڑکی ہر کسی کا دل موہ لیا کرتی۔ گل خان اسے لیے خاموشی سے گھر سے چلا آیا۔ وہ ہمیشہ اپنی سائیکل ساتھ لیے اسے چھوڑنے آتا تھا۔ دونوں باپ بیٹی پندرہ منٹ کے اس سفر میں خوب باتیں کیا کرتے۔ اسے امتحانی سینٹر میں چھوڑ کے وہ آگے بڑھ جاتا۔ گل خان ایک ترکھان تھا۔ صحت اس عمر میں بھی قابلِ رشک تھی۔

''تمہارے کتنے پرچے باقی رہ گئے ہیں؟'' اس نے کچھ دور آنے کے بعد پوچھا۔

''صرف تین پرچے اور باقی ہیں ابا!'' مہ وش اپنے مخصوص دھیمے اور شائستہ انداز میں بولی۔

''میں تمہاری شادی کر دینا چاہتا ہوں پری!'' اس نے پیار سے کہا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''جیسے آپ کی مرضی ابا! میرا ہر فیصلہ آپ ہی کی خوشی سے مشروط ہے۔'' وہ سر جھکا کر کہنے لگی۔

''جیتی رہو! خوش رہو! میں شادی بیاہ کے معاملات میں بھی شریعت کے احکام پر چلنے کا قائل ہوں۔ شریعت یہی کہتی ہے کہ اولاد سے اس کی مرضی

دریافت کرلی جائے۔ کیا تمہارے ذہن میں شریکِ حیات کا کوئی خاکہ موجود ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بلاجھجک بتا دینا۔"

"نہیں ابا جان! آپ کی اور امی کی پسند ہی میرے لیے حرفِ آخر ہوگی۔" اس کی رضامندی جان کر گل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مہ وش کو سینٹر چھوڑ کر وہ 'ملک ووڈ ورکس' چلا آیا۔ اس دکان کا مالک ملک مقصود تھا۔ پچاس کے پیٹے میں موجود ملک گل خان کو اس کی پیشہ ورانہ ایمانداری کی بدولت بہت پسند کرتا تھا۔

"نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے نا... خان صاحب؟ بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہو۔" ملک کی عقابی نظروں سے بھی اس کی کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"ٹھیک ہوں ملک جی! بس بڑھاپا جوآن پہنچا ہے۔ اس لیے پہلے سی توانائی کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟"

"ایسی باتیں نہ کرو پیارے! ابھی تم نے زندگی میں بہت سی خوشیاں دیکھنی ہیں۔" ملک مقصود نے خلوص سے کہا۔

"ملک جی! چھوٹا منہ اور بڑی بات..... کیا میں ایک بات پوچھنے کی گستاخی کرسکتا ہوں؟"

"ایک نہیں..... ایک ہزار باتیں پوچھو۔" مقصود اس کی ایمانداری، فرض شناسی اور شریف النفسی کا دلی طور پر قائل تھا۔

"کچھ عرصہ قبل آپ نے ایک بات کہی تھی..... ملکانی جی کی خواہش بیان کی تھی۔ کیا آپ کی وہ پیشکش اب بھی برقرار ہے؟" اس نے جھجک کر کہا۔

"بالکل برقرار ہے۔ اس سے بڑھ کر خوش نصیبی ہمارے لیے اور کیا ہوگی بھلا؟" مقصود نے جوش سے جواب دیا۔ فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"آپ نے ملکانی جی کو ہمارے ماضی کے بارے میں تو بتا دیا تھا نا...؟"

"ہاں! اسے کوئی اعتراض نہیں۔ ہم نے بلال کو بھی ساری سچائی سے آگاہ کر دیا تھا اور الحمدللہ! میرے بیٹے نے بھی مجھے مایوس نہیں کیا۔"

"جیتا رہے..... خوش رہے..... ہمیشہ اپنے والدین کی آنکھوں کا نور اور دلوں کی ٹھنڈک بن کر سلامت رہے۔" گل خان ہمیشہ یونہی دعاؤں کے انمول خزانے لٹایا کرتا تھا۔

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم نے میرے بیٹے کو اپنی فرزندی میں قبول کرلیا ہے؟" مقصود نے خوشدلی سے استفسار کیا۔

"شرمندہ نہ کیجیے ملک جی! آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ اس غریب اور بدحال بوڑھے کو اپنایت اور خلوص دے کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا رہے ہیں۔" اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ارے تمہیں کیا خبر کہ میں تمہاری انسان دوستی اور عاجزی کا.... کتنا قدردان ہوں۔"

"میں جلد از جلد بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں ملک جی! اسی ماہ اگر......"

"بے فکر رہو۔ میں آج ہی ملکانی اور بیٹے سے بات کرلوں گا۔ اسی ماہ کی اٹھائیس کو یہ فرض بھی نبھا دیں گے۔"

"بہت شکریہ ملک جی!"

"اب تم گھر جانا چاہتے ہو یا یہیں رکو گے؟"

"نہیں جناب! گستاخی معاف۔ کل جو کام رہ گیا تھا وہ نمٹا آؤں پھر گھر چلا جاؤں گا۔" اس کا یہ جواب مقصود کے لیے متوقع تھا۔ گزشتہ روز ایک گھر میں دیوار گیر منقش الماریاں بنانے کا کام ملا تھا۔ گل خان اسے ہی مکمل کرنے کا کہہ رہا تھا۔

وہ کئی سالوں سے اس کے پاس ملازمت کر رہا تھا اور اپنی شخصی خوبیوں کی بدولت اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ اپنے گھر میں منعقد ہونے والی ایک محفلِ میلاد میں مقصود نے اسے اہلِ خانہ سمیت مدعو کیا تھا۔ مہ وش اور روشن کی سادگی، شائستگی اور اخلاقیات عذرا کو اس قدر بھائیں کہ شوہر کے سامنے اکلوتے بیٹے کے لیے مہ وش سے شادی کا عندیہ دے دیا۔ مقصود نے چند روز کی سوچ بچار کے بعد ہامی بھر لی تاہم گل قدرے متامل تھا۔ وہ ملازم اور مالک کے رشتے سے خائف تھا۔

"میں جدی پشتی مالک نہیں ہوں پیارے ٹھوکریں کھا کر ہی اس مقام تک پہنچا ہوں۔ اس لیے انسان اور رشتوں کی قدر کرتا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ مجھے حقیقتاً تم سے رشتے داری قائم کرنے میں فخر ہوگا۔" مقصود نے اس کے خدشات اور ماضی کی بابت مختصراً جان کر کھلے دل سے کہا۔

گل اس وقت تو خاموش ہوگیا تھا لیکن آج دو ماہ بعد وہ اس رشتے کو قبول کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔

"کچھ تو ایسا ہوا ہے جو اسے اپ سیٹ کیے ہوئے ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر اداسی اور وحشت پہلے تو کبھی نہ تھی، گل کی روانگی کے بعد اس نے الجھ کر سوچا۔ روشن اور مہ وش کے بعد ملک مقصود نے بھی اس کی وہ تبدیلی بھانپ تو لی تھی لیکن اس تبدیلی کا ماخذ کیا تھا؟ یہ ہنوز ایک اسرار تھا۔

☆☆☆

روشن شوہر کے اس اچانک فیصلے سے بہت حیران تھی اور اس کی کوئی توجیہہ تلاش کرنے سے قاصر بھی۔

"یہ سب اچانک کیوں؟ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے اور آپ ہی تو کہتے تھے کہ اسے پڑھا لکھا کر قابل افسر بنانا ہے۔"

"میں زندگی کے ایک ایسے مقام پر آ چکا ہوں جہاں انسان اپنی ہی کہی گئی باتوں اور فیصلوں میں واضح نقص اور جھول دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہ وقت تبھی آتا ہے جب عمر کی نقدی اپنے اختتام تک پہنچنے والی ہو۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"موت ایک حقیقت ہے۔ تمہارے یا میرے کہنے سے کبھی ٹل تو نہیں جائے گی نا...؟ تم میرے بغیر باہر کہیں نکل سکتیں۔ اس دنیا میں موجود بھیڑیوں سے کیسے نمٹو گی بھلا؟" روشن اس کے انداز و الفاظ دیکھ کر گنگ ہوگئی۔

"ٹھیک ہے خان جی! جیسے آپ کی مرضی۔"

"اس ماہ کی اٹھائیس کو ملک صاحب اپنی امانت لے جائیں گے۔ انہوں نے زیادہ تیاری کرنے سے بھی سختی سے منع کیا ہے۔" گل خان نے یاددہانی کروائی۔

"اللہ انہیں دو جہان کا سکون اور ہر خوشی نصیب فرمائے۔" روشن نے تہِ دل سے کہا۔ اس کے پاس تیاری کے لیے اب صرف پندرہ روز ہی باقی تھے۔ اس نے اپنی جمع پونجی اور استطاعت کے مطابق بیٹی کے لیے سامان اکٹھا کیا اور جیسے کی دوپہر نہایت سادگی سے نکاح پڑھوا دیا گیا۔

گل خان نے شادی کے تمام انتظامات خوش اسلوبی سے نبھائے تھے لیکن اس کی خاموشی ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی گئی تھی۔ وہ کچھ ہی روز میں صدیوں کا بوڑھا لگنے لگا تھا۔ مہ وش کی رخصتی کے بعد گھر کے در و دیوار سے مزید وحشت ٹپکتی محسوس ہونے لگی۔

"ایسا کب تک چلے گا خان؟ اگر دل پر کوئی بوجھ ہے تو مجھ سے کہہ سن کر ہلکا کر لو یا نادانستگی میں کوئی غلطی کوتاہی ہوگئی ہے تو معافی دے دو..... مگر اس طرح خاموش تو مت رہو۔" اگلی صبح بے تاثر انداز میں ناشتا کرتے گل کو دیکھ کر روشن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم ایک بہترین شریکِ حیات ہو روشن! مجھے تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ میں تمہارا بے حد مقروض ہوں۔ نہ جانے جیتے جی یہ قرض اتار پاؤں گا کہ نہیں۔" اس کا انداز اب بھی کھویا کھویا سا تھا۔

"اس رات ایسا کیا ہوا تھا؟ گل خان کو کہاں چھوڑ آئے تھے اس رات؟"

"گل خان تمہارے سامنے ہی موجود ہے۔ اب اسی کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا تمہیں۔" اس کے دوٹوک رویے پر روشن خاموش ہوگئی۔

"ہم یہ گھر تبدیل نہ کرلیں؟ دو افراد کی ضروریات سے بہت بڑا ہے یہ۔ رفیق بھی آئے روز کرایہ بڑھانے کی بات کرتا رہتا ہے۔" وہ شوہر کا دھیان بٹانے کے لیے ایک اور تجویز دینے لگی۔

"میں نے پندرہ روز قبل ہی اسے گھر خالی کرنے کا بتا دیا تھا۔ سامان کے حوالے سے بھی ایک گاہک سے بات ہوگئی ہے۔ یکم کو مکان خالی کر کے ضروری کپڑے لتے سمیٹ لینا۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" وہ ششدر تھی۔

"واپس...... اپنے دیس..... اپنی مٹی میں۔" وہ اطمینان سے کہتا ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا۔

☆☆☆

گل خان کے اس فیصلے سے مہ وش بھی بہت حیران تھی۔

"ابا جان! ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟"

"غلط سوال کر رہی ہو پری! تمہیں تو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ یہ سب اتنی تاخیر سے کیوں کر رہا ہوں؟ یہ سب تو مجھے پہلے کرلینا چاہیے تھا۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔ "اور یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اللہ کے فضل سے تمہارے سر پر ایک مضبوط سائبان فراہم کر دیا ہے۔ عورت باپ کے نام سے کہیں زیادہ شوہر کے نام سے معتبر سمجھی جاتی ہے۔ پروردگار تمہیں اپنے گھر میں سدا سکھی رکھے اور اولاد کا سکون بھی نصیب فرمائے۔" اس نے بیٹی کو بھرپور تسلی دی۔

مقصود نے بھی اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن گل خان کے فیصلے ہمیشہ اٹل ہوتے تھے۔ دو روز بعد وہ سلطان پور روانہ ہوگیا۔ خوشبوؤں، مہکتی فضاؤں اور دلکش نظاروں نے اس کا والہانہ استقبال کیا تھا۔

☆☆☆

والدین کی اس ہجرت کے بعد مہ وش قدرتی طور پر بہت افسردہ رہی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شوہر کی صورت میں سر پر سائبان تو موجود ہے لیکن پشت پر کوئی بھی سہارا باقی نہیں رہا۔

وہ کم عمری کے باوجود بہت سمجھدار، حساس اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔ اس کا وجدان آگاہی دے چکا تھا کہ باپ کے اس عمل کے پسِ پردہ کوئی بہت گہری چوٹ پوشیدہ ہے۔ گل خان نے اپنے بوڑھے اور ناتواں وجود پر کوئی ایسا زخم کھایا ہے جس کی کسک نے اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا ہے۔ اسی تبدیلی کی وجہ ڈھونڈتی، الجھتی، تڑپتی مہ وش اگلے دو سال میں خود بھی ماں کے رتبے پر فائز ہو گئی۔ گل خان سے خط کتابت ہوتی رہتی تھی تاہم اس میں بھی کوئی باقاعدگی یا تعطل نہیں تھا۔ نواسے کی پیدائش پر وہ روشن کے ساتھ کچھ روز کے لیے ان سے ملنے بھی آیا تھا۔ اس کی خاموشی مزید گہری ہو چکی تھی۔

کچھ عرصے بعد اسے روشن کی وفات کی خبر ملی۔ بدقسمتی تو یہ تھی کہ اسے کسی بھی سفر کی ممانعت تھی۔ گل نے بھی اسے نہایت حوصلہ اور تسلی دیتے ہوئے اس مشکل وقت میں صبر کی تلقین کی تھی۔ ابھی یہی زخم مندمل نہیں ہو پایا تھا کہ چھ ماہ بعد ملنے والے ایک اور خط سے والد کی ناسازیٔ طبع کا علم ہونے سے وہ مزید تڑپ کر رہ گئی۔ مقصود بھی اس موقع پر بہت آزردہ تھا۔ اس نے ہنگامی بنیادوں پر بلال اور مہ وش کو سلطان پور بھیجنے کے انتظامات کر دیے مگر دعائیں، آرزوئیں اور التجائیں اس وقت بالکل بے اثر ثابت ہوئیں اور پہاڑوں کا وہ جیالا سپوت اپنے وجود کے زخم دنیا سے چھپائے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ مہ وش کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ بلال کی بے لوث محبت اس کی ہمراہی نہ ہوتی تو شاید اس کی ہستی بھی پارہ پارہ ہو کر بکھر جاتی۔

تدفین کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایک روز وہ اس کچے کمرے میں بچھی چارپائیوں پر والدین کا لمس اور خوشبو تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسوؤں کی باڑ پر بند باندھنا بہت دشوار ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد بلال بوجھل وجود لیے اندر آیا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”سارا گاؤں ہی گل چاچا کی وفات پر بہت افسردہ ہے۔ کئی عورتیں تم سے ملنے کے لیے مصر تھیں لیکن تمہاری طبیعت کے پیشِ نظر میں نے انہیں ٹال دیا ہے۔“

”میں کل صبح سب سے مل لوں گی۔ یہاں سے جانے سے قبل میں اپنے والدین کی سبھی یادیں سمیٹ کر لے جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کچے مکان کو دیکھا جو کسی بھی قسم کی سہولیات سے عاری تھا۔ ایک مختصر کمرے میں دو چارپائیوں کے علاوہ دیوار پر لگی کھونٹی پر کپڑوں کے دو جوڑے لٹکے تھے۔ صحن میں بچھی چٹائیاں ایک طاق پر رکھے سیپارے اور چند کتابیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہاں آنے کے بعد وہ درس و تدریس میں ہی مشغول رہا تھا۔ دکھی اور بوجھل دل سے اردگرد کے مناظر دیکھتی وہ بیرونی جانب کسی کی آواز سے چونکی تھی۔ بلال بھی صحن کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے پر ایک بوڑھا شخص موجود تھا۔

”میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے بیٹا! ایک امانت کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں۔“ اس بوڑھے آدمی نے اپنی جیب میں موجود ایک لفافہ نکال کر بلال کے حوالے کر دیا۔ ”مرحوم کی خواہش تھی کہ آپ دونوں اسے ایک ساتھ پڑھیں۔ وفات سے ایک روز قبل ہی اس نے یہ میرے حوالے کیا تھا۔“

مہ وش کے دل کی دھڑکنیں یکدم تیز ہو گئیں۔ بوڑھا شخص لفافہ بلال کو تھما کر چلا گیا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ چارپائی پر آ بیٹھی۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی میں سفید رنگ کا وہ لفافہ اسے کسی اہم انکشاف کا امین لگ رہا تھا۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

بلال سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ تھی۔ اس نے نرمی سے مہ وش کے کندھے پر تھپکی دی اور دائیں جانب تپائی پر موجود پلاسٹک کے جگ سے پانی گلاس میں نکال کر گھونٹ گھونٹ اسے پلانے لگا۔ مہ وش کی ہیجانی کیفیت دھیرے دھیرے معمول پر آ گئی۔ اس نے ملتجی نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا۔ بلال ان نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ دوسری چارپائی پر بیٹھ کر اس نے احتیاط سے لفافہ چاک کیا۔ اس میں بچوں کے استعمال میں رہنے والی کسی کاپی کے چند صفحات تھے۔ کچی پنسل سے گل خان کی صاف ستھری لکھائی میں لکھا گیا پیغام کہیں کہیں آنسوؤں کی نمی سے مٹا مٹا بھی دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ اس بوجھل سناٹے کو بلال کی دھیمی آواز نے ہی چھناکے سے توڑا۔

”انسان بھی کس قدر عجیب مخلوق ہے۔ تخلیق ہوا تو فرشتوں نے بحکمِ الٰہی اسے سجدہ کیا۔ نافرمان ہوا تو جنت بدر کر کے اس دنیا میں بھیج دیا گیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس قدر سخت سزا کے باوجود وہ آج بھی اپنی اس سرشت سے باز آ ہی نہیں سکا۔ تم لوگ بھی سوچ رہے ہو گے کہ گل خان بھی کیا فلسفے لے کر بیٹھ گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں کی کشمکش، خود احتسابی اور کڑی اذیت سے گزرنے کے بعد بھی میں اس قابل نہیں ہو سکا کہ کسی پھوڑے کی طرح اپنے وجود میں رستے اس کرب کو الفاظ کے قالب میں ڈھال سکوں۔ بہت دفعہ چاہا کہ دل کا بوجھ کسی بھی اپنے کے سامنے ہلکا کر لوں لیکن ہر بار الفاظ کسی ضدی بچے کی طرح روٹھ کر بھاگ جاتے، چھپ جاتے۔ آج بھی ہمت مجتمع کرنے کے بعد مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ اپنا مدعا کیسے بیان کروں؟ آغاز کہاں سے کروں؟ انجام تک کیسے پہنچاؤں؟ تو چلو آغاز ہی سے آغاز کرتے ہیں۔ میں تمہیں ایک بھولی بسری داستان یاد کرواتا ہوں۔

”یہ داستان ایک ایسی وادی کی ہے جس کا سب سے بڑا جرم اس کی خوبصورتی تھا۔ اس ناکردہ گناہ کی سزا وہ صدیوں سے بھگتتی آئی ہے اور خدا جانے آئندہ کب تک اسی کشمکش میں جتلا رہے گی..... اس نے مختلف حکمرانوں کی کج روی اور اطوار برداشت کیے۔ موریہ سلطنت کا حصہ بنی تو کبھی بدھ مت اور ہندو مت کا ایک اہم تعلیمی و مذہبی مرکز بن گئی۔ ایشیائی جنگجو خانہ بدوشوں نے تورمان کی قیادت میں کوہ ہندوکش عبور کرنے کے بعد کشمیر پر اپنا قبضہ جمایا تو آٹھویں صدی میں کرکوٹا سلطنت کے جانبازوں نے حکمرانی قائم کر کے اسے ایک سامراجی طاقت کا درجہ دے دیا۔ پھر مغل اور درانی سلطنت کے بعد سکھ قوم کی وحشت سہتی تاریخ نے ایک ایسا نیا موڑ لیا جو پہلے کبھی ہوا اور نہ ہی دوبارہ ہو سکے گا۔

”روئے کائنات میں پہلی مرتبہ خالق کی تخلیق انسانی فرعونیت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کو پچھتر لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض فروخت کر دی۔ اس وقت ریاست کا رقبہ تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار میل تھا۔ وادی اور اس کے رہائشی محض چند روپوں فی مربع و فی کس کے مول میں اپنا وجود، شناخت اور آدمیت کی معراج کھو بیٹھے۔

”وقت کچھ اور آگے سرکا تو برصغیر کو آزادی کا پروانہ مل گیا لیکن اس کی قسمت کا فیصلہ پھر بھی نہ ہو سکا۔ یہ ایک ایسے شخص کی ضد اور انا پرستی کی بھینٹ چڑھ گئی جس کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ اس لیے واجب ہو چکا تھا کہ یہ وادی اسی کی قوم کی میراث ٹھہرتی۔ اس ضد اور ہٹ دھرمی کے نتیجے میں کشت و خون کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تاریخ بن کر کتابوں میں موجود تو ہے لیکن اس کا اصل کرب تو کوئی بھی جان ہی نہیں سکا۔ اس کے وارث آزادی کے لیے کٹتے رہے، مرتے رہے، دشمن کو بھی جہنم واصل کرتے رہے لیکن کامیابی مل کے ہی نہ دی۔

”میں نے بھی ہوش سنبھالتے ہی اپنی سماعتوں میں یہی قصے سنے۔ میرے بزرگوں نے بچپن ہی سے پابند بنا دیا کہ اس میراث کا حق ادا کرنے کے لیے مجھے بھی آخری حد تک جانا ہے۔ میرا رب گواہ ہے کہ میں نے وہ عہد نبھایا بھی۔ میں نے اپنی اولاد کو اس سفر کا راہی بنایا۔ میرے وہ جیالے بیٹے سینہ تان کر مقبوضہ وادی میں گئے اور جامِ شہادت نوش کر کے امر ہو گئے۔ قاسم، عاطف، سہیل کے بعد وادی کے کئی دوسرے لڑکے بھی سر پر کفن باندھے اپنی میراث حاصل کرنے گئے اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آ سکے۔ میں اپنی اس خوش قسمتی پر جتنا بھی رشک کروں کم ہے۔ شہداء کا باپ ہونا کسی اعزاز سے کم تھا کیا؟ لیکن میں ذاتی حیثیت میں بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ روزِ محشر میرا رب مجھ سے پوچھتا کہ گل خان! تم نے میرے احکامات پر خود کس حد تک عمل کیا تو محمد ﷺ کا یہ امتی کیا جواب دے گا بھلا؟ میری یہ خواہش مزید گہری ہوتی جا رہی تھی اور اسی دوران سلطان پور میں صداقت علی کی آمد ہوئی۔

”صداقت ایک نیوز چینل کا نمائندہ تھا اور یہاں ایک خصوصی مشن پر آیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ہمارے درمیان خلوص اور ذہنی ہم آہنگی کا ایک انوکھا رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کر لیا کرتا تھا۔

”میں ان علاقوں کا دورہ کر کے بہت حیران ہوا ہوں خان!“ ایک ہفتے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

”ایسا کیوں صاحب!“

”عالمی برادری میں اصل حقائق اور مسائل کی تصویر تو دکھائی ہی نہیں جاتی۔ میں نے مقبوضہ علاقے بھی دیکھے ہیں۔ بخدا! اس قدر بربریت دیکھ کر میں انسانیت پر شرمسار ہونے لگا ہوں۔“

”آپ لوگوں کی لاعلمی دکھ نہیں دیتی صاحب! بااختیار طبقے کی خاموشی ہی ہمارا اصل روگ ہے۔“

”مجھے تم لوگوں کی بہادری اور ہمت پر بہت ناز ہے خان! تم نے اپنے بیٹوں کے لہو سے آزادی کا جو چراغ جلانے کی کوشش کی ہے، یہ حوصلہ ہر کسی کے پاس کہاں ہوتا ہے؟“

”آج ہم قربانی نہیں دیں گے تو آنے والی نسلیں ہمیں معاف کیسے کریں گی؟“

’’درست کہتے ہو......لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا جائے۔‘‘

’’میں اس وقت تو صداقت علی کی بات سمجھ ہی نہ سکا لیکن جب اس نے مجھے آسان الفاظ میں تفصیل سے اپنا مقصد سمجھایا تو بات میرے دل کو لگنے لگی۔ وہ مقامی افراد کو اپنے نیوز چینل کے ذریعے سامنے لاکر اصل حقائق بتانا چاہتا تھا۔ مقصد نیک تھا۔ میں نے ہامی بھرلی۔ روشن کو سمجھانا تھوڑا مشکل ثابت ہوا۔ وہ اپنا گھر اور اولاد کی یادیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر میرے اصرار پر سر تسلیم خم کرنے کے سوا اس کے پاس اور چارہ بھی تو کوئی نہ تھا۔

’’صداقت ہمیں اپنے شہر لے آیا۔ اب تم لوگ اس شہر کا نام جاننا چاہو گے۔ بس اتنا جان لو کہ وہ ان بے شمار شہروں جیسا تھا جہاں عمارتیں بڑی اور انسان بونے ہوتے ہیں۔ ان بونے انسانوں کو وہ بڑی بڑی اور تلخ باتیں سمجھانا چاہتا تھا اور یہی اس کی غلطی ثابت ہوئی۔

’’اس نے مجھ سمیت کئی افراد کو نیوز چینل پر متعارف کروایا۔ ہم نے اپنے جیون بھر کا کرب اور بے بسی بیان کر دی۔ قومی سطح پر ایک ہلچل پیدا ہونے لگی۔ کئی عالمی اخبارات نے بھی ان باتوں کو بہت سنجیدگی سے اٹھایا۔ اخبارات اور ٹی وی سے اندازہ ہوتا تھا کہ غاصبوں پر دباؤ بڑھایا جارہا ہے۔ ہم سب خوش ہونے لگے لیکن پھر وہ ہوا جس کا ہم میں سے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

’’صداقت کچھ دنوں سے بہت الجھا الجھا دکھائی دینے لگا تھا۔ ہر آہٹ پر چونک سا جاتا۔ بات کرتے کرتے کھو سا جاتا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو بالآخر ایک روز پوچھ ہی لیا۔

’’کیا بات ہے صداقت صاحب؟ اتنے تناؤ زدہ کیوں رہنے لگے ہیں؟‘‘

’’بشر جو ٹھہرا......زندگی کی چاہ تو انسان کی جبلت میں رکھ دی گئی ہے۔ اسی لیے موت کا خیال مضطرب کر دیتا ہے۔‘‘

’’موت تو اپنے مقررہ وقت پر ہی آتی ہے۔‘‘

’’مجھ جیسے کمزور دل افراد کے لیے یہی بہتر ہے ورنہ اس وقت سے پہلے ہی ہزار ہا اموات کا شکار ہو جائیں۔‘‘

’’مایوسی کی باتیں آپ جیسے بہادر انسان کو زیب نہیں دیتیں۔ آپ جس دلیری سے یہ کام کر رہے ہیں......اس سے بڑھ کر کیا جرأت ہوگی بھلا؟‘‘

’’میں نے تو اپنی طرف سے ایک کوشش ہی کی تھی ......لیکن میری یہ جرأت بعض لوگوں کو پسند نہیں آئی۔‘‘

’’ک......کیا مطلب؟‘‘ میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔

’’مجھے کئی روز سے متواتر دھمکیاں مل رہی ہیں۔ فون کالز، خطوط کے بعد ان کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ دفتر آتے جاتے میری گاڑی کا تعاقب بھی ہونے لگا ہے۔‘‘

’’کون لوگ ہیں یہ؟ پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کرتے آپ؟ یہ تو ایک آزاد ریاست ہے نا......؟ یہاں یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘

’’سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ یہی تو المیہ ہے...... ہمارے درمیان کالی بھیڑیں بھی موجود ہیں۔ ہماری سادگی کہہ لو یا کوتاہ بینی۔ ہم ان شرپسند عناصر کو اب تک پہچان ہی نہیں سکے اور وہ موقع ملتے ہی اپنا وار کر دیتے ہیں۔ غاصب کبھی بھی بہادر نہیں ہوتا اور بزدل ہمیشہ سازشوں کا ہی سہارا لیتا ہے۔ وہ کبھی بھی سینہ ٹھونک کر میدانِ جنگ میں سامنا نہیں کرے گا بلکہ اپنے لیے خطرہ بننے والے کسی بھی شخص کو فوراً رستے سے ہٹا دے گا۔ ہمارا مشترکہ دشمن بھی ایسا ہی ہے۔ ہم ذہین ہونے کے باوجود اس کی مکاری اور چالاکی سے مات کھا جاتے ہیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ہماری صفوں میں نقب لگا رکھی ہے۔ ہر حق گو کی زبان بند کروا دی جاتی ہے......اور اب شاید میری باری ہے۔‘‘

’’ایسا نہ بولو صاحب! پروردگار آپ کو لمبی عمر دے۔‘‘

’’تم سے ایک التجا ہے میری......اپنی رہائش گاہ الگ کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس آتشِ انتقام کی لپیٹ میں آجاؤ۔‘‘ وہ شکست خوردہ تھے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا۔ اپنے مکمل ساتھ کی یقین دہانی بھی کروائی لیکن وہ مان کے ہی نہ دیے......اور پھر ایک ہفتے بعد ہی ان کے سب خدشات حقیقت ثابت ہو گئے۔ ایک خصوصی پروگرام کے بعد واپسی پر گاڑی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ صداقت صاحب کے ساتھ وہ دو افراد بھی جان کی بازی ہار گئے جو اس پروگرام کا حصہ بن کر سچائی اور حقائق سامنے لانے کے لیے گناہ گار ٹھہرائے گئے تھے۔

’’ان کی وفات کے فوری بعد وہ گھر بھی نذرِ آتش کر دیا گیا تا کہ کسی بھی قسم کا تحریری یا ویڈیو کی صورت میں کوئی بھی ’سچ‘ منظرِ عام پر نہ آسکے۔ ان کی بیوی کا انتقال تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ صداقت صاحب کی آخری خواہش پر عمل کرنے کے لیے بیٹی پہلے ہی میرے ساتھ تھی اور اب تو شہر کی تبدیلی بھی ناگزیر ہو چکی تھی۔ میں اپنے محسن کی اسی خواہش کا احترام کرتے ہوئے واپس آنے سے بھی قاصر تھا۔ لہٰذا چار سالہ مدثر کو لیے ایک چھوٹے سے شہر میں آبسا۔

’’مجھے علم ہے تم یہ جان کر چونک گئی ہو گی لیکن میری بچی! خدا گواہ ہے کہ ہم میاں بیوی نے تمہیں اپنے بچوں سے بڑھ کر محبت دی۔ پال پوس کر جوان کیا اور شادی سے قبل تمہارے شریک حیات سے بھی کوئی سچائی پوشیدہ نہیں رکھی۔

’’خیر! یہ بات ذرا دور نکل گئی۔ میں تمہیں ان کٹھنائیوں اور اذیت کے بارے میں تو بتا ہی نہیں سکا جو گزشتہ ایک دہائی سے زائد عرصے میں میری ناتواں ذات کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرتی رہی۔

’’میں اس قوم کے افراد کو گمراہی کے اندھیروں کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ وہ ان غاصبوں کے رنگ میں رنگتے جا رہے تھے۔ لباس، نظریات، فیشن، ثقافت، شادی بیاہ تک کے معاملات میں ان کی نقالی ہونے لگی۔ اس خوب صورت میں اپنے حصے کا چراغ جلائے رکھنے کے لیے میں نے گھروں میں سیپارہ پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ مجھے قوی امید تھی کہ میری کوششیں ضرور رنگ لائیں گی اور میں ذہن سازی میں مقدور بھر حصہ بھی ڈالنے میں کامیاب رہوں گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد!

’’پہلے پہل تو صرف یہ ہوتا تھا کہ مجھے صرف دس منٹ دیے جاتے اور تحکمانہ کہا جاتا کہ مولوی صاحب! ذرا جلدی پڑھانا بچوں کو......انہیں ٹیوشن پڑھنے بھی جانا ہے۔ پچھلا سبق سننے کی باری آتی تو علم ہوتا کہ وہ تو یاد ہی نہیں ہو سکا کیونکہ ٹیوشن اور کوچنگ سینٹرز سے لیٹ چھٹی ملی تھی۔ جب میں انہیں کہتا کہ بچوں کو سبق دہرانے کا بھی وقت دیا کرو تو والدین جواب دیتے۔

’’بچے کو کھیل کود اور تفریح کے لیے بھی تو وقت چاہیے ہوتا ہے۔ آپ ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔‘‘

’’پھر کچھ اور وقت گزرا تو ہدایات ملنے لگیں کہ بچے کو ڈانٹنا نہیں۔ مارنے یا ہلکی پھلکی سزا کا تو تصور ہی ناپید ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نماز، روزے جیسے بنیادی ارکان کی ادائیگی سے بے نیاز ہوتے جا رہے تھے۔ ماہِ صیام آتا تو والدین توجیہہ پیش کرتے۔ بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ یہ کہاں اتنے سخت روزے برداشت کر پائیں گے۔ رہی نماز کی بات! تو جمعہ اور عیدین کی ادائیگی ان کے لیے کوہِ ہمالیہ سر کر لینے کے مترادف بن چکی تھی۔

’’سالہا سال میں یہ سب دیکھتا رہا، کڑھتا رہا۔ اپنی فطرت اور فرائض سے مجبور ہو کر جب اصلاح کی کوشش کرتا تو دوسرے ہی روز رخصتی کا پروانہ تھما دیا جاتا۔ والدین

ماسک

ایک بیوٹیشن کی سرِ راہ اپنے گاہک سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگی۔ ’’میں نے آپ کی بیگم کو ملتانی مٹی کا ماسک لگانے کا جو مشورہ دیا تھا اس سے ان کا چہرہ بہتر ہوا؟‘‘

’’جی ہاں! جب تک ماسک لگا رہتا ہے چہرہ کافی بہتر لگتا ہے۔‘‘ شوہر نے جواب دیا۔

☆☆☆

بچے کی تعلیم کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ اسے ضدی اور خود غرض نہ بننے دیں، اس کی بے جا ضد کو بھی پورا نہ کریں، اس کی خوشنودیِ مزاج کا ہرگز خیال نہ رکھیں۔

اس میں فرمانبرداری کی عادت پیدا کریں تو سمجھیں کہ آپ نے اسے آفاتِ زمانہ سے بچا لیا۔

سوچ و فکر

☆ بڑوں بڑوں کی بڑی بڑی خدمت کرنے کے بجائے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورت پوری کر دی جائے۔

☆ آج انسان سکون کی خاطر آسمانوں کے دروازے کھولنے چلا گیا ہے لیکن دل کا دروازہ نہیں کھولتا۔ وہ مسافر جسے گاڑی میں سیٹ نہ ملے اپنے آپ کو بدنصیب سمجھتا ہے اور جب گاڑی حادثے کا شکار ہوتی ہے تو وہی انسان اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتا ہے۔

☆ صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض نہیں ملتا، بزرگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے بات بنتی ہے۔

☆ جہاں دعا مانگنے والا ہے وہیں دعا قبول کرنے والا بھی ہے۔

☆ اس عمل کو پسند کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور مالک کو بھی۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ ہل ہزارہ)

کو اپنے بچوں کے لیے استاد نہیں ملازم درکار تھا۔ متبادل راہ کے طور پر میں نے تعلیمی اداروں سے بھی رجوع کیا تاکہ وہاں دینی تعلیم کے ذریعے اپنی وراثت انہیں منتقل کرسکوں۔ میری اس کوشش کا نتیجہ بھی مثبت برآمد نہ ہوا۔ تعلیمی اداروں میں انگریزی بولنے اور سکھانے والے افراد کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا لیکن وہاں مجھ جیسے معلم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"وقت گزرتا گیا۔ میں یونہی خوار ہوتا رہا۔ نوجوان نسل کے اطوار دیکھ کر میری رگیں چٹخنے لگتیں۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا جب پورے ملک میں وادی سے اظہارِ یک جہتی کے لیے مخصوص کردہ دن اگر کسی عوامی تعطیل پر آ جاتا تو نوجوان' بڑے' بوڑھے' بچے صرف اس بات پر ملول دکھائی دیتے کہ ایک چھٹی ماری گئی۔ کشمیر کے گلی کوچوں میں بہنے والا خون ایک ڈرائنگ روم گوسپ بننے لگا اور اختتام پر کندھے اچکا کر صرف اتنا کہہ کر بات سمیٹ دی جاتی کہ۔

"یہ تو آئے روز کا معمول بن چکا ہے۔ اپنی زندگی کے آزار کیا کم ہیں جو ٹی وی اور اخباروں میں بھی یہی کچھ دیکھ کر اپنا بلڈ پریشر بڑھالیں۔"

"یہ سب سن کر میرے دل پر قیامت گزر جاتی۔ مجھے صداقت صاحب کی وہ آخری ملاقات بہت یاد آتی جس میں انہوں نے کتنے دلدوز انداز میں کہا تھا۔"

"سن اکہتر میں ملک دولخت اس لیے بھی ہوا تھا کہ ریاست کے اہم ترین ستون 'ذرائع ابلاغ' نے اپنے فرائض سے مجرمانہ کوتاہی کی تھی۔ وہ 'سب اچھا ہے' کی خبریں دے کر غافل عوام کو مزید خواب غفلت میں مبتلا کرتے ہیں۔ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ آج پھر وہی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔ دشمن نے ہمارا یہ اہم ریاستی ستون نہایت مکاری اور چالاکی سے اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ وہ اپنا ایجنڈا براہِ راست لوگوں کے ذہن میں انڈیل رہے ہیں۔ ہم ان کی ثقافتی یلغار میں بہتے ایک گرداب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ خدا جانے! یہ غفلت ہم سے مزید کیا تاوان وصول کرے گی؟"

"ان کے وہ خدشات حرف بحرف مجسم صورت اختیار کرتے جارہے تھے۔ یہ سب دیکھتے' سنتے' سہتے میری زندگی میں ایک ایسی رات آئی جب میں نے اپنا یقین مکمل طور پر کھو دیا۔ اس روز آس کا جزیرہ مایوسی کے سمندر میں اپنا آخری نشان بھی گنوا بیٹھا تھا۔

"ان دنوں تمہارے میٹرک کے پرچے ہو رہے تھے۔ میں نے ایک گھر میں الماریاں بنانے کا کام بھی شروع کررکھا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ میں نے بقیہ کام اگلے روز پر چھوڑ کر روانگی کا ارادہ کرلیا۔ اسی وقت گھر سے دو نوجوان بھی نکلتے دکھائی دیے۔ انہوں نے عجیب و غریب کپڑا اپنے جسموں پر لپیٹ رکھا تھا۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی سیاسی جلسے میں شرکت کے لیے جارہے ہیں۔ مجھے کبھی بھی سیاست سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں ٹھہرا خبطی' سنکی اور بیک ورڈ بوڑھا جس نے تمام عمر ایک ہی نظریے کو سنبھالے رکھا کہ جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی...... لیکن اس روز جانے ایسی کیا چیز تھی جو مجھے ان کے پیچھے جانے کے لیے مجبور کررہی تھی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ جسم پر لپیٹے گئے اس کپڑے کا کیا مقصد تھا؟ تجسس بہت بڑا روگ ہوتا ہے اور لاعلمی کو یونہی تو نعمت قرار نہیں دیا جاتا..... اسی تجسس کی تسکین کے لیے میں ایک بہت بڑے گراؤنڈ کے باہر پہنچ گیا......

"وہ جگہ بقعۂ نور تھی۔ وہاں ہزاروں لوگ موجود تھے اور سبھی نے ویسے ہی کپڑے پر مشتمل پرچم تھام رکھے تھے۔ نعروں اور صداؤں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ شور میری سماعت کو چھلنی کرنے لگا۔ لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دینے والی آوازیں' دعوے' الزامات اور ذاتیات پر حملے اس سے بھی بڑھ کر سمع خراش تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں غلطی سے کسی اور سیارے یا غیر ملک تک پہنچ گیا ہوں۔ لیکن نہیں...... وہ سب حقیقت تھا...... ایک ٹھوس حقیقت......

"اس روز مجھے یقین ہوا کہ بے نیازی' بے حسی اور ذاتی مفادات ڈرائنگ روم سے نکل کر قومی مزاج کا حصہ بن چکے ہیں۔ عوامی مزاج حکمرانوں کے لب و لہجے اور انداز میں مجسم روپ اختیار کرگیا ہے۔ میری نظروں کے سامنے ہمارے ان لاکھوں سپوتوں کے لہولہان لاشے گھومنے لگے جو اس ملک کے پرچم کی محبت اور تقدس کی خاطر کٹ مرے تھے۔ مجھے وہاں سہیل نظر آیا جس کے تن پر سبز ہلالی پرچم لپٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور آنکھوں میں شدید غم تھا۔

"اباجان! یہ کیسا کھیل کھیلا جارہا ہے؟"

میں اس کے سوال کا جواب کیا دیتا؟ میں تو خود اس سے بھی زیادہ اذیتناک سوالوں میں گھرا تھا۔ قاسم' عاطف' حذیفہ' ناصر' علی' وسیم' کلیم اور ممتاز بھی تو وہیں نوحہ کناں تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر غاصبین کو اچھے ہمسائے قرار دے کر ان سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی بات چھڑی تو میری آنکھوں نے ان باعصمت لڑکیوں کو دیکھا جنہیں ان درندوں نے وادی کی آئندہ نسل میں اپنی نسل کی ملاوٹ کے لیے پامال کردیا تھا۔

"میرے صبر کے تابوت میں وہ آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس جگہ اور ان لوگوں سے وحشت و اجنبیت کا وہ احساس اس قدر ہولناک تھا کہ پل بھر میں ہی میرے وجود میں ایک خلا پیدا ہوگیا اور اس رات گل خان کا وجود پاش پاش ہوکر راکھ کی صورت میں ہوا میں بکھر گیا۔ اس رات مجھے یہ حقیقت سمجھ آئی کہ میرا سفر رائگاں رہا تھا۔ خیر! اپنی یہ کیفیت تو میں کبھی کسی کو بھی سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنا جان لو کہ وہاں ایک بہت بڑا.. عفریت تھا جو لاکھوں کروڑوں نوجوانوں پر منڈلاتا نظر آرہا تھا لیکن وہ بے خبر تھے' مگن تھے' سرشار تھے...... یہ وہ لوگ تھے جو کبھی میری بات سمجھ ہی نہ سکے۔ مجھے ان پر بہت غصہ آیا۔ دل چاہا کہ ہر ایک کو جھنجوڑ کر اس خطرے سے آگاہ کروں لیکن وہ میری بات سنتے ہی کب تھے؟

"آناً فاناً میرے دل میں شدید ناراضگی نے جڑیں پیوست کرلیں۔ اسی پل میں نے فیصلہ کیا کہ واپس جا کر ان کو اپنی میراث سونپوں جو میری سن سکتے تھے' سمجھ سکتے تھے۔ میں سلطان پور واپس چلا آیا اور یہاں اسی مشن کا آغاز کردیا جس نے مجھے برسوں وہاں خوار کیے رکھا تھا۔ کامیابی قدم چومنے لگی۔ میراث منتقل ہونے لگی۔ اضطراب تو اب بھی میرے وجود میں طوفان مچائے رکھتا تھا۔ انہی سوچوں سے مغلوب ہوکر میں نے اپنا کرب تم لوگوں کو بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔

"میرے بچو! تم لوگ بھی اسی عفریت کی زد میں ہو اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم سب اپنی میراث سے منہ موڑے بیٹھے ہو۔ میراث کا یہ بوجھ کوئی بھی اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ صداقت علی جیسے جیالے کی بیٹی یہ بار اٹھالے گی۔ ملک منصور جیسے فرشتہ صفت انسان کا بیٹا اس سفر میں ہر قدم پر اس کا ساتھ دے گا۔

"جانِ پدر! جب یہاں سے لوٹ کر اپنے لوگوں میں جاؤ تو انہیں ضرور بتانا کہ اپنی اصل شناخت پہچانیں۔ اس حقیقت سے آشنائی حاصل کریں کہ ہم لوگوں کے لیے ان کی بے عملی' ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر کیا جانے والا اظہارِ ہمدردی' یک جہتی کے لیے مخصوص کی جانے والی چھٹیاں' ریلیاں' بلند و بانگ دعوے اسی وقت اپنی موت مرجاتے ہیں جب غاصبین کی تیار کردہ فلمیں وہ اپنے سنیما گھروں میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ ان کا یہی پیسا بارود بن کر ہماری نئی نسل کی ہلاکت بن جاتا ہے۔ میں اپنی سالہاسال کی کوششوں کے بعد بھی انہیں سمجھا ہی نہ سکا کہ اس کشت و خون میں تم لوگ بھی عملی شریک ہورہے ہو۔ میں ٹھہرا خبطی' سنکی اور ایک پس ماندہ بوڑھا لیکن تم لوگ اسی نسل کے نمائندے ہو۔ یہ ذمے داری نبھانا۔ یہ میراث ضرور منتقل کرنا ورنہ کیا خبر کہ مستقبل میں تم میں سے بھی کوئی گل خان کا سا کرب لیے اپنوں کی بے حسی پر ماتم کناں ہو۔ مجھے تو وقت نے یہ موقع دے دیا ہے۔ یہ مہربانی دوبارہ ملنے کی بھی کیا ضمانت ہے؟

"واپس لوٹ جاؤ میرے بچو! اپنے لوگوں کو اس مہلک نیند سے جگاؤ۔ اس آزاد ریاست کو ایک اور وادیٔ کشمیر بننے سے روک لو۔ غفلت کی یہ میراث یونہی منتقل ہوتی رہی تو تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں......"

☆☆☆

کمرے میں خاموشی چھاگئی تھی۔

بلال کے ہاتھ میں موجود وہ کاغذات کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا کے باعث پھڑپھڑا رہے تھے۔ باہر برسنے والی بارش کے ساتھ مہ وش اور بلال کی آنکھوں سے بھی ایک جھڑی رواں تھی۔ خود شناسی اور حقائق کی تلخی نے انہیں خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"ہم سب بحیثیت قوم کس جانب گامزن ہوچکے ہیں...... نسلِ نو کے لیے تباہی کیوں مقدر ٹھہرا رہے ہیں؟" مہ وش سسکنے لگی۔

"اپنی بنیاد اور الہامی کتاب سے منہ موڑنے کے بعد یہی سب ہوگا...... بہت اذیت جھیلی ہے گل چاچا نے...... پروردگار ان کی آخری منازل آسان فرمائے۔"

"اباجان کا یہ خواب عملی تعبیر کیسے پائے گا؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

"ہماری محنت اور لگن سے...... گل چاچا کی دعائیں بھی تو زادِ راہ ہوں گی۔"

"غفلت اور بے حسی کی یہ میراث اب کبھی منتقل نہیں ہوگی۔"

"انشاء اللہ......" بلال نے ایک عزم سے جواب دیا۔

گل خان کو لہولہان رکھنے والی کنکریاں اپنے دامن میں سمیٹے وہ ایک نئے سفر پر روانگی کے لیے تیار ہوچکے تھے۔



چوتھا حصہ

رنگ آسماں

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب بے کران کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

مہا پجاری بدری ناتھ اپنی سانپ جیسی چیکی آنکھوں سے ان سب کو... مندر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا اور اپنے کالے بدہیت ہونٹ چبائے جا رہا تھا۔ اس کا چیلا پجاری پرس رام کن انکھیوں سے اپنے "گرو" کے چہرے کو تک رہا تھا اور اس کی پریشانی کو بھانپ رہا تھا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے گرو کو اس پریشانی سے نکالے۔ بالآخر وہ، جو اس کے عقب میں چل رہا تھا، ایک موقعے پر بہ سرعت اس کے قریب کھسک آیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"چنتا مت کریں مہاراج! میں ہوں نا آپ کا سیوک..... بس انہیں آگے ہونے دیں۔"

اپنے چیلے کی بات پر بدری ناتھ کو قدرے تسلی ہوئی اور اس نے اپنے قدموں کی رفتار دانستہ آہستہ کر دی۔ مقصد پرس رام کو آگے کرنا تھا۔ یہ سب لوگ مندر کے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہال میں پہنچ کر رک گئے۔

ڈرائیور امجد خان، شانتا اور نند دبابا کو اندر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ اس پر ریناوغیرہ کو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن..... چونکہ شوکت حسین بھی انہی کی طرح ان کے ملازمین کی حیثیت سے شامل تھا اس لیے اسے بھی مندر کے باہر روکنا چاہا تھا مگر رینا نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا اور شوکی کو بھی یہ کہہ کر اندر لے آئی کہ وہ ان کا ملازم ضرور تھا مگر اس کے آنجہانی پاپا پروفیسر ہنری برنارڈ نے شوکی کو اس کی دلیری اور فہم و فراست کے بل بوتے پر اپنے نائب سالار کی حیثیت دے رکھی تھی۔

یہ سب لوگ ہال کے وسط میں آ کر رک گئے۔ رینا اور شوکی بہ غور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ ہال کی چھت زیادہ بلند نہ تھی، جو اوپر جا کر محراب سی بناتی محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے ہی انہیں چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر کچھ عجیب سی پتھر کی مورتیاں بنی نظر آئیں۔ ان میں کسی کا منہ بندر جیسا تھا تو کسی کی سونڈ نکلی ہوئی تھی۔ ہال کے دائیں بائیں چند دروازے دکھائی دے رہے تھے جو بند تھے۔ البتہ ایک دروازہ ذرا ابھرا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ پجاری وہاں موجود تھے۔ ان کے انداز میں احترام نظر آتا تھا۔

رینا نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر غور سے ان دروازوں کو دیکھتے ہوئے کمروں کا شمار کیا جو تین تھے جن میں ایک کمرا دروازے کی چوکھٹ کے اعتبار سے کشادہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک زینہ بل کھاتا ہوا اوپر بھی جاتا نظر آیا تھا جو اسی آخری الذکر کمرے کے قریب تھا۔

"میں پہلے یہ والا کمرا دیکھنا چاہوں گی اور میرے ساتھ اندر شوکی چلے گا۔" رینا نے قریب کھڑے چھوٹے راجکمار ایش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اور ہاتھ کا ایک اشارہ کر کے بولا۔

"تشریف لے چلیے مس رینا!"

رینا نے رابرٹ اور اس کی بہن گارشیا سے کہا۔ "تم ادھر ہی ذرا محتاط ہو کے کھڑے رہنا اور کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کرو تو فوراً اس سے مجھے آگاہ کرنا۔" اس کی بات پر رابرٹ نے تھوڑا سا منہ بنایا تھا۔ رینا کا شوکت کو اپنے ساتھ لے جانا برا لگا تھا۔ اس نے کوئی جوابی تاثر تک نہ دیا البتہ گارشیا نے رینا کی بات پر فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ بدری ناتھ بڑے بڑے برے منہ بنا کر رینا کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ پرس رام ان کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔ رینا اور شوکی کے ہمراہ ایش کمار تھا۔ یہ چاروں مذکورہ کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہال میں رابرٹ، گارشیا، ایش کی بہن سوجنا اور بدری ناتھ کھڑے رہ گئے تھے۔

ادھر یہ چاروں کمرے میں داخل ہو گئے۔ اندر چراغوں اور شمعوں کی روشنی تھی۔ اسی روشنی میں انہیں سامنے کمرے کے وسط میں وہی کالی دیوی کی عجیب و غریب مورتی ایستادہ نظر آ گئی، جس کا نظارہ رابرٹ بھی کر چکا تھا۔ شوکی کے لیے ہندو مذہب کی ایسی مورتیاں دیکھنا کوئی خاص بات نہ تھی مگر رینا اس مورتی کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایکا ایکی ایک سناٹے کے سے آثار نمودار ہوتے چلے گئے تھے۔ چند ثانیے وہ اس مورتی کو تکتی رہی۔

"یہ کالی ماتا کہلاتی ہے۔ جو ہمیں شیطانی عوامل اور ہر قسم کی آفات سے بچاتی ہے۔" ایش کمار نے رینا سے کہا۔ شوکی اس کی بات سے قطع نظر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور تب ہی وہ چونکا۔ اسے کالی ماتا کی مورتی کے عقب سے سیاہ اور دراز بالوں کی چٹیا سی جھولتی نظر آ گئی۔ ساتھ ہی اسے کالی.. ماتا کے ایک ترشول پکڑے اور خم کھائے ہوئے بازو کی کہنی سے دو سیاہ چمکتی ہوئی گھورتی آنکھیں بھی نظر آئیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا، اس نے چشم زدن میں ان آنکھوں اور سیاہ گھنا جیسے بالوں کے گچھے کو غائب ہوتے دیکھا۔

"مس رینا! میں نے مورتی کے پیچھے کچھ دیکھا ہے۔"

شوکت کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"چلو اس طرف......" رینا نے کہا۔ وہ آگے بڑھے۔ وہ مورتی کے قریب پہنچے تو انہیں ایک چھوٹا دروازہ نظر

آ گیا جو بھڑا ہوا تھا اور ایسا ہی لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اس کے اندر داخل ہوا تھا۔

رینا نے اسی طرف قدم بڑھا دیے۔ پجاری پرس رام نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ..... چھوٹے راجکمار ایش نے اسے اشارے سے چپ رہنے کی تلقین کی۔ رینا کے ساتھ شوکت بھی تھا۔ پہلے اسی نے اندر قدم رکھا تھا اس کے بعد شوکی وغیرہ نے......

اندر قدم رکھتے ہی ان کی سماعتوں نے سانپوں کی پھنکاریں سنی تھیں۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ایش کے کہنے پر پرس رام نے ایک زوردار تالی بجائی۔ اچانک کمرا روشنی میں نہا گیا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی یہ لوگ چونک پڑے اور رینا کا تو چہرہ بھی کسی اندرونی جوش تلے سرخ ہو گیا جبکہ چھوٹا راج کمار ایش بھی یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کمرے کے فرش پر کوڑیالے سانپ رینگ رہے تھے۔ ان کی خوفناک پھنکاروں سے کمرے میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو کنوؤں کی تین فٹ بلند منڈیریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ سانپ یہاں بھی رینگتے نظر آ رہے تھے۔ تین نیم عریاں سی حسین و جمیل دبلی پتلی لڑکیاں بھی دکھائی دیں۔ ان کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ایک کی تو حالت ناگفتہ تھی، وہ ننگے فرش پر پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے نیم عریاں جسم پر دو تین سیاہ اور گول چنکبرے سانپ رینگ رہے تھے۔ لڑکی ہوش میں تو تھی، مگر مدہوش سی نظر آتی تھی۔ البتہ وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے قریب دو پجاری بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ..... جھاڑیوں کے جنگل پنکھ تھے۔ باقی دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی سی ایک طرف کو سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ دو اور تنگ دھڑنگ سے پجاری جن کے ہاتھوں میں سرخی شمع دان تھے، وہ پاس ہی کھڑے تھے۔

"یہ ہیں وہ سانپ..... جن سے ہم پر ایک سازش کے تحت حملہ کروایا گیا تھا۔" رینا نے بالآخر چلا کر کہا۔ چھوٹا راج کمار ایش پریشان سا ہو گیا۔ پجاری اور دیگر افراد اس کی طرف تکنے لگے۔ پرس رام رینا سے ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"یہ آپ کیا بول رہی ہیں۔ کالی ماتا کے حکم کے بغیر ان سانپوں کو باہر جانے کی اجازت تک نہیں ہے۔"

"میں یہ نہیں مانتی۔" رینا غصے سے بولی۔ "اور تم نے ہم سے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا کہ مندر کے اندر سانپ نہیں ہیں۔"

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ اندر سانپ نہیں ہیں؟ میں نے صرف زہریلے سانپوں کے بارے میں کہا تھا۔" بدری ناتھ مکاری سے بولا پھر ایش کمار کی طرف دیکھ کر مزید بولا۔

"چھوٹے راج کمار صاحب! یہ فرنگن ہمارا دھرم بھرشٹ کرنے کے لیے یہاں آئی ہے؟" ایش کمار..... جو خود بھی مخمصے میں مبتلا نظر آ رہا تھا، اس نے رینا کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"مس رینا! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ ان کے پالتو سانپ ہیں اور ان کے حکم کے بغیر نہ یہاں سے باہر جاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو ڈستے ہیں۔ آپ دیکھ رہی ہیں ان سانپوں کو جو لڑکی کو نہیں ڈس رہے ہیں۔" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ پجاری پرس رام نے وہاں موجود ایک پجاری سے کچھ کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا اور قریب رکھا ایک تھیلا کھولا۔ اندر سے انڈے نکالے اور کنوئیں میں پھینکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے چوبی مرلی نکالی اور اسے مخصوص انداز میں بجانے لگا۔ سارے سانپ رینگتے ہوئے منڈیر پر اور اس کے بعد کنوئیں کے اندر جانے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد سانپ غائب ہو گئے اور ان کی گونجتی پھنکاریں بھی دم توڑ گئیں۔ لڑکی کی بھی جان میں جان آئی تھی۔

"دیکھ لیا آپ لوگوں نے..... کہ یہ سانپ کس طرح ہمارے کہنے پر ہیں۔ ایسا کالی دیوی کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ یہ ان کے چرنوں کے سیوکار ہیں۔" پرس رام مکاری سے بولا۔

شوکت جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مناسب نہ جان کر چپ رہا لیکن جو بات وہ کرنا چاہتا تھا، وہ رینا نے کر ڈالی اور پجاری پرس رام سے بولی۔

"سانپ واقعی پالتو ہیں، اسی لیے تو تمہارے حکم پر کسی پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں اور یہ لڑکی فرش پر کیوں لیٹی ہوئی ہے؟ یہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی ہے۔"

"یہ ان کا علاج کر رہے ہیں۔" ایش نے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر زیادہ دیر اسی طرح یہاں کھڑے ہو کر بحث و مباحثہ کیا گیا تو معاملہ سنگین صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے رینا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مس رینا! آپ جس بات کی تسلی کرنا چاہتی تھیں، وہ ہو گئی مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ کا شبہ بجائے کم ہونے کے مزید پختہ ہو گیا ہے۔ ابھی آپ کو میرا مشورہ ہے کہ واپس راج محل تشریف لے چلیں اس کے بعد..... وہیں چل کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کوئی چنتا نہ کریں، پروفیسر صاحب کی موت کا ہمیں بھی دکھ ہے۔"

ریناہونٹ چبانے لگی۔ وہ ادھر ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینے کا عزم رکھے ہوئے تھی، لیکن پھر شوکی نے بھی رینا کے کان میں کچھ کہا اور یوں وہ سب پلٹ گئے۔

☆☆☆

''ہماری کامیابی قریب تر ہونے کے باوجود شدید قسم کے خطرے کی زد میں بھی ہے۔''

مہمان گاہ کے ایک دور افتادہ کونے میں فرشی نشست پر بیٹھے تینوں میں سے علی ریحان نے سرگوشی میں اپنے دونوں ساتھیوں شاہ زمان اور اریبہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

''اسی لیے ہمیں انتہائی محتاط ہو کر اپنی کارروائی انجام تک پہنچانا ہوگی۔''

''تم شاید اس انگریز افسر کی بات کر رہے ہو؟'' اریبہ نے استفساریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، اریبہ!'' علی کے بجائے شاہ زمان اس سے بولا کیونکہ اس وقت ان کے مشن کی راہیں ہموار کرنے والی اریبہ ہی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سے کوئی ذرا سی بھی غلطی ہو جائے۔

اریبہ ان دونوں کی باتیں سن کر دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''میں سمجھ رہی ہوں، یہ انگریز افسر میری نگاہوں کو بھی کھٹکا ہے اور وہ یقیناً ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش بھی کرے گا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میرا کام تم دونوں کو یہاں لا کر ختم ہو چکا، اب تم دونوں نے جو کچھ کرنا ہے وہ کر چلو، کیونکہ مہاراجا ہمیں زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس لیے کہ میں کوئی سکہ بند شاعرہ نہیں ہوں، میرے پاس شاعری کا جتنا خزانہ ہے وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ نئی شاعری کرنے کے میں قابل نہیں ہوں۔ اسی لیے یہ مہاراجا مجھ سے جلد ہی اکتا جائے گا اور ایک دن ہمیں نکال باہر کرے گا۔ میں ان کے مزاج شاہانہ سے خوب واقف ہوں۔''

اس کی بات پر علی اور زمان سوچ میں پڑ گئے تھے۔

وہ تینوں اس بات سے بے خبر تھے کہ لیفٹیننٹ بروجر جسے یقین کی حد تک ان تینوں پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا، وہ ان کی خفیہ نگرانی اور ان کی سن گن لینے کا انتظام کر چکا تھا، جب وہ مہاراجا چندر گپتا کو شیشے میں اتار چکے تھے۔ یہی نہیں ان تینوں کے تو یہ تک بھی سان گمان میں نہ تھا کہ وہی جاسوس جارج اس وقت مہمان گاہ کے اسی گوشے کی ایک تنگ سی بیرونی راہ گزر پر موجود ان کی باتوں پر کان لگائے ہوئے تھا جہاں سے ایک چھوٹا دریچہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ وہ ان کی باتیں سن رہا تھا اور سر دھن رہا تھا۔

''ہم مہاراجا اور اس انگریز افسر کی وہ گفتگو سن چکے ہیں جو ہمارے سامنے ہوئی تھی۔'' علی ریحان دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''کل ہی ہمارے اس اہم مشن کی ابتدا اور اختتام ہر ممکن طریقے سے کامیابی سے ہم کنار ہونے والا ہے۔ جنرل مائیکل شا کا ایلچی جان پال اہم میٹنگ اور اپنے مذموم ارادوں کے ساتھ کل ہی پہنچ رہا ہے۔''

''لیکن...... ہمیں پہلے خاموشی سے گھات لگا کر مہاراجا گپتا اور جان پال کی اس اہم نشست سے متعلق باتیں غور سے سننا ہوں گی تاکہ اس غاصب انگریز جنرل مائیکل شا کے ناپاک عزائم کا صحیح طور پر ادراک ہو سکے۔'' شاہ زمان نے کہا۔

''شا کے ارادے ظاہر ہیں۔ وہ ان تینوں ریاستوں کے مابین جنگ کروانا چاہتا ہے تاکہ ''مدد'' کی صورت میں وہ اپنی مداخلت کا ٹھوس جواز بنا سکے۔'' علی ریحان بولا۔

''لیکن تمہاری بات بھی رد نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ان کے بیچ کسی خفیہ معاملہ داری کی غرض وغایت سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے۔''

اچانک ہوا کے کسی تیز جھونکے نے ان کی پشت کا دریچہ وا کر دیا۔ باہر کان لگائے کھڑا جارج گڑبڑا سا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ جلد بازی سے کام لے بیٹھا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ وہاں سے ایک جوش تلے کھسکنے لگا تھا تاکہ اپنے افسر کو جا کر بتا ڈالے کہ اس کا شبہ غلط نہیں تھا...... شاہ زمان، جس کی جھونکے کی جھپک سے غیر ارادی طور پر نظریں اس طرف کو اٹھ گئی تھیں، کسی انسان کی جھلک اسے تشکیک میں مبتلا کر گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ اریبہ اور ریحان کچھ سمجھتے شاہ زمان بجلی کی سی سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا اور دریچے کے پاس والے دروازے کی طرف لپکا اور مذکورہ راہ گزر پر آ گیا۔

اس سے شام کی کجلاہٹ راہ گزر پر بچھی ہوئی تھی اور شاہ زمان کو ایک سایہ تیزی سے حرکت کرتا نظر آیا، جسے اس نے راستے ہی میں جھاپ لیا۔ یہ سارجنٹ جارج تھا۔ شاہ زمان پہلے اسے کوئی مخبر سمجھا تھا، اس لیے اس کی گرفت ذرا ڈھیلی تھی لیکن جب سارجنٹ جارج نے شاہ زمان کی گرفت سے نکلنے میں غیر معمولی اور پیشہ ورانہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تو...... شاہ زمان کو اس کی طاقت کا اندازہ ہوا اور اس نے بھی ایک تربیت یافتہ داؤ کھیلتے ہوئے اپنے دائیں بازو کا حلقہ اس کے گلے کے گرد کس ڈالا اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔

سارجنٹ جارج کے حلق سے دبی دبی کراہ، بس ایک لمحے کو ہی خارج ہوئی اور اگلے ہی لمحے وہ اس کے بازو میں ہی

جھول گیا۔ شاہ زمان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ پل کے پل پسینے میں نہا گیا تھا۔ شکار کو قابو کرنے کی جفاکشی اس کی وجہ ہرگز نہ تھی۔ بلکہ فکر و تشویش اور ذہنی دباؤ تھا۔ یوں کامیابی لب بام پر پل کر چھن جانے کا ڈر بھی، جسے انہوں نے اپنے بہادر ساتھیوں کی قربانی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر حاصل کیا تھی۔

لیفٹیننٹ بروجر کا جاسوس ان کا بھانڈا پھوڑنے سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا لیکن اس کی موت...... ایک نئے شبہے کو جنم دینے کے لیے کافی تھی۔ شاہ زمان کے لیے لاش کو ٹھکانے لگانا نہایت مشکل تھا۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا مکان نہ تھا بلکہ ایک قلعہ نما حویلی تھی جہاں ملازموں اور پہرے داروں کی کمی نہ تھی۔ کسی بھی وقت کوئی بھی اسے لاش کاندھے پر ڈالتے یا گھسیٹتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ مہاراجا چندر گپتا کی حویلی میں یہ قتل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ شاہ زمان کو اس وقت کچھ سجھائی نہ دیا تو وہ لاش کو وہیں ایک کونے میں ڈال کر واپس پلٹ آیا۔

علی اور اریبہ کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔

''کیا وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گیا؟'' علی نے تفکر آمیز تشویش سے پوچھا۔

''کیا واقعی اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں؟'' اریبہ نے بھی گہری تشویش سے دریافت کیا۔ دونوں کی فکر انگیز نگاہیں شاہ زمان کے ستے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بولا۔

''ہاں! وہ کوئی مخبر ہی تھا لیکن میں نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اسے یقیناً اسی فرنگی افسر بروجر نے ہی ہمارے پیچھے لگایا تھا۔''

''اوہ...... یہ تو بہت برا ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی اس خبیث فرنگی افسر پر شک تھا کہ وہ ضرور اپنا کوئی آدمی ہمارے پیچھے لگائے گا مگر......'' علی کے منہ سے نکلا۔

''تت...... تم نے لاش کا کیا کیا......؟''

''یہی سجھائی نہ دے سکا اب تک...... اب اس کی لاش کا کیا کریں......؟'' شاہ زمان نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا۔

''کک...... کیا اس جاسوس کی لاش باہر ہی پڑی ہے؟'' اریبہ نے کسی قدر متوحش ہو کر پوچھا۔

''ہاں!''

''اس کی لاش ہمارے گلے کا پھندا بن جائے گی، اسے کم از کم مہمان گاہ کے پاس نہیں پڑے ہونا چاہیے۔''

''لیکن اسے ٹھکانے لگانا ناممکن حد تک مشکل ہے۔''

''تم ایک کام کرو...... لاش کو ادھر ہی گھسیٹ لاؤ۔ رات ہونے والی ہے پھر کچھ سوچتے ہیں۔'' اریبہ نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم اریبہ......؟'' زمان حیران سا ہو گیا۔ ''یہ تو اپنے ہاتھوں سے اپنی ہی قبر کھودنے والی بات ہے۔''

''سنو، لاش کا برآمد ہو جانا اس فرنگی افسر کا شبہ درست ہونے کے مترادف ہوگا۔ ابھی کوئی دم کو رات ہونے والی ہے۔ ہمارے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ رات کے اندھیرے میں لاش کو غائب کرنے کی کوئی تدبیر سوچی جا سکتی ہے۔''

''اور اگر لاش کی ڈھنڈیا پڑ گئی تو......؟'' علی کے منہ سے نکلا۔

''میرا خیال ہے اتنی جلدی ڈھنڈیا نہیں پڑے گی۔'' اریبہ بولی۔ ''کم از کم آج کی رات تو نہیں۔ صبح کی اور بات ہے۔'' پھر وہ زمان سے مخاطب ہو کے بولی۔

''تم جاؤ، لاش ادھر گھسیٹ کر لے آؤ...... اس سے پہلے کہ کسی کی اس پر نظر پڑ جائے۔'' شاہ زمان جانے کے لیے پلٹا تو علی ریحان بھی اس کے ہمراہ ہو گیا۔

علی نے گرد و پیش پر نظریں ڈالے رکھیں اور شاہ زمان جاسوس جارج کی لاش کندھے پر ڈالے اندر آ گیا۔

لاش اب مہمان خانے میں پڑی تھی۔ اس مہمان گاہ کے تین کمرے تھے اور ایک کشادہ نشست گاہ تھی۔ تیسرا کمرا ان کے حوالے تھا۔ اس میں چارپائی چار کا ایک گوشۂ تنہائی بھی تھا۔ علی ریحان اور زمان نے دیگر کمروں کا بھی جائزہ لیا۔ ان کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

جلد ہی ان پر یہ انکشاف ہوا کہ باقی دو کمروں میں بھی مہمان فروکش ہو چکے تھے۔ وہ خود تو نہیں تھے مگر ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ گویا لاش کو چھپانے کی جگہ ماسوائے ان کے اپنے کمرے اور گوشۂ تنہائی کے اور کہیں نہیں تھی۔ لہٰذا یہی فیصلہ کیا گیا کہ لاش کو رات تک گوشۂ تنہائی میں رکھا جائے مگر ان کے لیے تشویش کی ایک اور لہر پیدا ہو گئی تھی، جس کا اظہار کرتے ہوئے اریبہ نے کہا۔

''یہاں بھی ہمارے ساتھ کچھ مہمان موجود ہیں۔ پتا نہیں یہ کون ہیں اور اس وقت کہاں ہیں۔ ان کی یہاں موجودگی میں لاش کو ٹھکانے لگانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔''

''وہ جو بھی ہوں اور کہیں سے بھی لوٹیں، یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے۔'' زمان نے تجزیہ کیا۔ ''آتے ہی سو جائیں گے۔ رات بہت سے رازوں کو بھارتی بھی ہے اور سلاتی بھی ہے۔ اصل مسئلہ اس حویلی سے لاش کو بے دخل

کرنے کا ہے۔ جو میرا خیال ہے کہ اب رات کو ہی انجام دینا پڑے گا۔"

رات کو ان کے لیے دو ملازمین کھانوں کی طشتریاں اٹھا لائے۔ علی کے ذہن میں آیا بھی کہ ان سے پوچھا جائے کہ دیگر کمروں کے مہمان کون ہیں اور کب تک لوٹیں گے مگر کچھ سوچ کر وہ چپ ہو رہا۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر اریبہ اور زمان نے بھی اپنے منہ بند رکھے تھے اور خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

شام کی کجلاہٹ رات میں ڈھلنے لگی تو اچانک ان کے کانوں سے شور سا ٹکرایا۔ تینوں پریشان ہو گئے کہ کہیں اس فرنگی جاسوس کی ڈھنڈیا تو نہیں پڑ گئی ہے؟

"تم لوگ ادھر ہی رکو میں جا کر دیکھتی ہوں ماجرا کیا ہے۔" اریبہ نے سرگوشی میں کہا۔

"اس فرنگی افسر سے محتاط رہنا...... اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ تمہارے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکلے جو کسی کے لیے چونکنے کا سبب بنے۔ مت بھولنا کہ ہم ان کے لیے صرف شاہی گویّے ہیں اور بس......" شاہ زمان نے کہا۔

"میں جانتی ہوں اور مجھے حالات کا بھی ادراک ہے۔" اریبہ نے اس کی طرف دلکش مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

مہمان گاہ سے نکل کر وہ حویلی کے ان گوشوں کی طرف گئی تو وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ سارے نوکر چاکر، پہرے دار حتیٰ کہ وہ انگریز افسر بروجر بھی وہاں موجود تھا۔ صورتِ حال کی سن گن اور جان کاری لینے میں اریبہ کو بمشکل نصف گھنٹا ہی لگا تھا اور واپس آ کر اس نے علی ریحان اور شاہ زمان کو بتایا۔

قصہ وہی تھا۔ لہٰذا یہ ساری تفصیل سننے کے بعد علی اور زمان نے طمانیت کی سانس لی، ان کے خیال میں جاسوس کی گمشدگی سے متعلق ابھی ایسی کوئی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن لاش کو نصف رات میں ٹھکانے لگانے کا معاملہ انہیں ایک بار پھر کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا تھا۔ کیونکہ چندر گپتا کے ایک بڑے اور معزز مہمان (پروفیسر ہنری برنارڈ) کی اچانک ہلاکت کے سبب حویلی میں رات گئے تک رت جگہ، ہنگامہ اور چہل پہل لازمی بات تھی۔ لہٰذا اریبہ نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس مذکورہ پروفیسر کی ہلاکت کو ناگہاں اور قتل قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کی بیٹی رینا نام کی ایک فرنگن دوشیزہ ہے جو مہاراجا چندر گپتا سے اس بات پر بضد ہے کہ قاتل کا سراغ لگا کر...... اسے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ نیز صورتِ حال آگے جا کر ایک گمبھیرتا میں بدلنے والی ہے کیونکہ پروفیسر ہنری برنارڈ دلّی کے جنرل مائیکل شا کے خاص مہمان اور دوست تھے۔ ان کی موت اور وہ بھی ایک قتل کے الزام تلے معمولی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

علی اور زمان نے جو یہ سنا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا......؟" اریبہ انہیں پریشان دیکھ کر فکر مند ہو گئی۔

"لاش کو ٹھکانے لگانا اب ممکن نظر نہیں آ رہا۔" علی بولا۔

"مجھے تو کل والی نشست بھی ہوتی نظر نہیں آ رہی۔" زمان نے بھی خدشے کا اظہار کیا۔

"نہیں، میرا نہیں خیال کہ کل والی اہم نشست منسوخ کر دی جائے۔" علی کچھ سوچتے ہوئے بولا اور اریبہ کی طرف پُرسوچ نظروں سے دیکھنے لگا، پھر اسے دھیرے سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"اریبہ بہن! تم ایک کام کر سکتی ہو مشکل تو ہے مگر دیکھیں تمہاری فراست کیا کام کرتی ہے۔"

"جی، بولیں؟"

"تم آج رات ذرا ان لوگوں کے قریب رہنے اور ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتی رہو۔ جب تک میں اور زمان لاش کو کہیں ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بناتے ہیں۔"

اریبہ نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ تب ہی زمان نے بھی اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا اور اس انگریز افسر سے بھی ہوشیار رہنا۔" اریبہ اس کی بات سن کر دلنشین انداز میں مسکرائی اور اسی انداز میں بولی۔

"آپ بے فکر رہیں، میں اپنا کام بہتر طور پر کرنا جانتی ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے......" زمان نے اس کی طرف دیکھ کر جوابی مسکراہٹ نچھاور کر کے کہا۔

وہ چلی گئی۔ یہ دونوں بیٹھ گئے۔ جارج کی لاش کو انہوں نے گوشۂ تنہائی میں رکھ دیا تھا اور اس پر تھوڑا بہت سامان ڈال کر اس پر کپڑا ڈال دیا تھا تاکہ کوئی اگر یہاں آ بھی جاتا تو اسے شک نہ پڑتا۔

کافی وقت گزر گیا۔ اریبہ کو گئے ہوئے نصف گھنٹے سے زائد ہو چکا تھا۔ انہوں نے مہمان گاہ کے دیگر کمروں کا جائزہ لیا تو وہاں ابھی تک کوئی اور نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ سب وہیں حویلی میں ہی موجود تھے۔ تھوڑی دیر اور گزر گئی۔

رات جب اپنے نصف پہر میں تھی تو زمان نے مہمان

گاہ سے باہر کا تھوڑا جائزہ لیا تو اسے ہر طرف خاموشی محسوس ہوئی۔ راج محل کی طرف سے البتہ کبھی کبھار تھوڑی بہت باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ زمان کے خیال میں لاش کو ٹھکانے لگانے کا یہ بہترین موقع تھا۔

وہ گوشۂ تنہائی میں آ گیا اور لاش کو کندھے پر ڈالنے لگا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" علی نے اس سے کہا۔

"نہیں، تم ادھر ہی رہو۔ اریبہ لوٹنے والی ہوگی۔" اس نے کہا۔ "ویسے بھی یہ کام مجھ اکیلے کے ہی نمٹانے کا ہے۔"

زمان لاش کو کندھے پر ڈال کر دھڑکتے دل سے مہمان گاہ سے باہر آ گیا۔

اس نے وہی راہ گزر اختیار کی تھی...... جہاں اس نے یہ تازہ ترین "کارنامہ" انجام دیا تھا۔ وہاں سناٹا اور قدرے اندھیرا تھا۔ زمان یہاں کا پہلے ہی جائزہ لے کر اور اپنا راستہ جانچ کر جا چکا تھا۔ وہ اسی راستے سے لاش کندھے پر اٹھائے محتاط روی سے چلتا رہا۔

اس کا دل خدشات تلے بری طرح دھڑک بھی رہا تھا۔ وہ اپنے اس خطرناک عمل کے سنگین نتائج کا اندازہ کر سکتا تھا کہ اگر کسی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو شور مچ جاتا۔ مشن تو خاک ہو ہی جاتا، ساتھ میں اریبہ سمیت علی ریحان کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جاتیں۔ لہٰذا وہ از حد صبر اور محتاط روی سے اپنا "کام" نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

راہ گزر کا اختتام دو ملازمین کے کمروں کے سامنے سے ہو کر ایک ایسے موڑ پر ہوا تھا جس کے باہر...... فصیل کی وہ جنوب مشرقی سمت تھی جہاں سے نیچے کئی سو فٹ کی گہری کھائی تھی لیکن وہاں سے لاش کا گرانا تو درکنار اس طرف کندھے پر ڈال کر لے جانا ہی دوبھر تھا۔ کیونکہ وہاں مسلح محافظوں کا پورا ٹولہ ہر وقت تعینات رہتا تھا۔ اس لیے فصیل کی طرف رخ کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ انہیں چندر گپتا کی حویلی میں آئے چند ہی تو گھنٹے بیتے تھے، ابھی تک انہیں اس کے پیچ کل وقوع کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔

ایک بار پھر شاہ زمان کی پریشانی سوا ہونے لگی۔ لاش اس کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی اور وہ ایسی راہ گزر پر موجود تھا جہاں کوئی بھی بھولا بھٹکا اس طرف آ سکتا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ لاش ادھر ہی پھینک کر واپس پلٹ جائے کیونکہ اور کوئی چارہ اب اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اوپر کھلا تاروں بھرا آسمان تھا۔ حویلی پر سناٹا طاری تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچے چند ثانیے مزید کچھ سوچا تو اس کے دل نے کہا کہ اسے تھوڑی اور کوشش کر لینی چاہیے۔ لہٰذا وہ لاش اٹھائے پھر آگے بڑھنے لگا۔

تب ہی اس کی نظر راہ گزر کے اختتام پر پڑی۔ وہاں اسے ایک وسیع راہداری دکھائی دی، اس طرف خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور چند ایک لوگوں کی آوک جاوک بھی دیکھنے میں آئی، ایسا منظر اس نے صرف کچھ سیکنڈوں کے لیے دیکھا تھا۔ اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

شاہ زمان کو لگا تھا کہ وہ حصہ شاہی خاندان کی رہائشی اقامت گاہ کا ہے...... لاش کو اگر وہ وہیں کہیں چھوڑ جائے تو ان کی طرف سے شبہ کم سے کم کیا جائے گا۔

لیکن اس گوشے کی طرف جانا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ وہاں بھی پہرے دار موجود ہو سکتے تھے۔ کیا خبر کون کس ڈیوڑھی یا ستون کے پیچھے چھپا بیٹھا ہو اور ایک اجنبی کو دیکھتے ہی اچانک شور مچا دے لیکن یہ رسک تو اسے لینا ہی تھا۔ اس نے تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر سوچا اور اسی جانب بڑھ گیا۔

مذکورہ گوشے میں آ کر اس کا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ دائیں بائیں...... ستون بنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کھلی جگہیں بنی ہوئی تھیں جہاں پہرے دار بندوقیں اور تلواریں لیے کھڑے ہوتے تھے مگر اس وقت وہاں اسے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایسی ہی ایک خالی جگہ پر جاسوس جارج کی لاش رکھ دی اور اسی رازداری کے ساتھ پلٹ آیا۔

☆☆☆

یہ سب لوگ راج محل لوٹ آئے تھے۔ مہاراجا چندر گپتا پروفیسر کی ہلاکت پر خاصا پریشان تھا۔ اس کے بیٹے اور بیٹی نے اسے سارے واقعے سے تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور رینا کے شبہے سے بھی آگاہ کر دیا تھا جبکہ رینا نے خود بھی مہاراجا سے بات کی تھی اس درخواست کے ساتھ...... کہ اس کے باپ کی موت کو حادثاتی رنگ دیا جا رہا ہے لیکن ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ کسی گہری اور سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کے باپ کو زہریلے سانپوں کے ذریعے ڈسوا کر ہلاک کیا گیا ہے اور یہ ایک قتل کا مقدمہ ہے۔ اس ضمن میں رینا نے کالی کے مندر کے مہاپجاری بدری ناتھ اور اس کے حواریوں کا ذکر بھی کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے باپ پروفیسر ہنری کے قتل کی سازش کے تانے بانے اسی مندر میں بُنے گئے ہیں اور مذکورالذکر افراد اس میں شریک کار ہیں، وغیرہ۔

رینا نے انگریز افسر لیف بروجر سے بھی "تحکمانہ" قسم کی درخواست کر ڈالی تھی کہ وہ اس کی اطلاع صبح ہوتے ہی فوراً جنرل مائیکل شا تک بھی پہنچا دے۔ نیز علی الصباح

پروفیسر ہنری کی بھی شاہانہ طریقے سے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جائے۔ اس سلسلے میں رینا کی لیف بروجر سے تنہائی میں بھی باتیں ہوئی تھیں اور لیف بروجر جو پہلے ہی جنرل مائیکل شا کے حوالے سے مرعوب ہوا جا رہا تھا، اس نے دست بستہ رینا کو اس بات کی امید دلا دی تھی کہ اس کی ہر طرح سے تسلی اور مدد کی جائے گی۔

رینا نے اب دو باتوں کا عزم کرلیا تھا۔ ایک تو یہ کہ...... وہ اپنے آنجہانی باپ کے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑے گی اور دوسرے یہ کہ اس کے قتل کی سازش کو ضرور بے نقاب کرے گی۔

رینا وغیرہ کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں اس کے ساتھ رابرٹ اور گارشیا کے علاوہ شوکت بھی آ گیا تھا۔ اس میں رینا کی مرضی کا دخل تھا۔ جبکہ رابرٹ کو سخت اعتراض ہوا تھا کہ وہ ایک نوکر کو اپنے ساتھ بالکل بھی برداشت نہیں کرے گا جبکہ باپ کے مرنے کے بعد رینا اب رابرٹ کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی اور نہ ہی اس کے کسی دباؤ میں آ رہی تھی۔ جب اس نے شوکی کے سلسلے میں یہ اعتراض اٹھایا تو رینا نے بڑی رکھائی سے رابرٹ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مہاراجا چندر گپتا سے اپنی رہائش کا الگ بندوبست کرلے۔

اس کی بات پر رابرٹ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کل صبح ہوتے ہی اس سارے قصے پر لعنت بھیج کر اور اپنی بہن گارشیا کو لے کر یہاں سے واپس دلی لوٹ جائے گا لیکن پھر منتقمانہ فطرت اور کسی کو خوش نہ دیکھنے کی مخاصمانہ جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کے اس نے سوچا کہ وہ اس طرح ایک نوکر کی رینا کے سلسلے میں راہ ہموار کردے گا۔

وہ پہلے شوکت کو حریف اور اب اپنا پکا دشمن سمجھنے لگا تھا۔ نفرت تو اسے شوکت سے اسی روز ہو چکی تھی، جب پروفیسر ہنری برنارڈ نے اسے ایک نوکر پر ترجیح دی تھی اور شوکت کے جی میں آئی بھی تھی کہ وہ اپنے انکل کو اس کے خاندان پر اپنے کیے گئے احسانوں کو جتا ڈالے اور وہ آئندہ ایسا کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا مگر شاید زندگی یہ نہیں چاہتی تھی کہ پروفیسر ہنری کو اپنے کم ظرف بھتیجے کے منہ سے یہ تکلیف دہ جملے سننا پڑیں اور یہ سننے سے پہلے ہی وہ دنیا سے گزر چکے تھے۔

چنانچہ رابرٹ نے یہی سوچ کر اپنے واپس لوٹ جانے کا ارادہ بدل ڈالا تھا۔ وہ انگلستان ضرور جائے گا مگر اکیلا نہیں رینا اس کے ساتھ ہوگی۔ رینا ہی نہیں اس کی ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت کو سونیتا بھی بھا گئی تھی۔ وہ یہ معرکہ بھی فتح کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی تھی۔

بہر طور...... طے یہی پایا کہ کل ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا کہ رینا کے الزام تلے... مندر کے پجاریوں کو زیرِ تفتیش لایا جانا چاہیے یا نہیں۔

ادھر یہ سب باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر...... راج محل کے ایک دیوانِ خاص میں موجود مہاراجا چندر گپتا، اس کی پتنی مہارانی نجو بائی، اس کا بڑا بیٹا پرتاب...... تینوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ مہاراجا چندر گپتا نے اپنی پریشانی، بیوی اور بیٹے کے سامنے رکھ دی تھی۔ جسے سننے کے بعد پرتاب تو سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنے لگا تھا جبکہ نجو بائی ایک دم بھڑک اٹھی تھی اور اسی لہجے میں سب سے پہلے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس نے شوہر سے کہا۔

''اس فرنگن کو الزام دیتے ہوئے سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ کن لوگوں پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔ کالی مندر کی پوتر تا پر یا پھر اپنے کسی جرم کی پردہ پوشی پر......''

''کیا مطلب......؟'' مہاراجا حیرت سے اپنی بیوی کا چہرہ تکنے لگا۔ ''رینا نے بھلا کیا جرم کیا ہوگا؟''

پرتاب بھی اپنی سوتیلی ماں کا چہرہ قدرے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

مہارانی نجو بائی کھنچی ہوئی ابرو سے شوہر کی طرف تکتے ہوئے بولی۔

''یہ دونوں باپ بیٹی اپنے کسی خاص اور خفیہ مقصد کے لیے یہاں آئے تھے، ریسرچ اور تحقیق کا تو محض بہانہ تھا۔''

''ذرا کھل کر کہو نجو! مجھے تمہاری یہ پہیلیوں میں گفتگو سمجھ نہیں آ رہی ہے۔'' چندر گپتا قدرے جھنجلا کر بولا۔

نجو بائی نے جواب دینے کے بجائے تیکھی کمانوں سے بیٹے پرتاب کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کہتے ہو پرتاب؟ کیا رینا کا اس طرح ہماری پوترتا پر گندا الزام لگانا اچھی بات ہے؟''

''اگر رینا نے کسی ٹھوس بنیاد پر ہی یہ الزام لگایا ہے تو ہمیں بھی انصاف سے کام لینا چاہیے، بہ صورتِ دیگر الزام رد کردیا جائے۔'' پرتاب نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

مستقبل کا۔ ولی عہد...... پرتاب، جو نجو بائی کی آنکھ میں ہر سمے کھٹکتا رہتا تھا، اس کی بات نے نجو بائی کو برافروختہ کردیا۔ وہ پرتاب کی طرف دیکھ کر تیکھے چتونوں سے بولی۔

''تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ آوارہ مزاج فرنگن ہمارے

دھارمکیوں پر جو الزام تراشی کر رہی ہے، وہ ٹھیک ہے؟ مت بھولو کہ تم مستقبل کے ولی عہد ہو لیکن مجھے افسوس ہوا کہ تمہاری فراست اس قدر کمزور ہے...... تمہیں دوست دشمن کی ہی پہچان نہیں ہے تو آگے چل کر ریاست کی باگ عنان کیسے سنبھالو گے؟'' نجو بائی نے چوٹ کی۔ وہ ایسا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی، بالخصوص مہاراجا کے سامنے اور یہ بات مہاراجا نے محسوس کی ہو یا نہیں لیکن...... پرتاب ضرور محسوس کیا کرتا تھا، وہ بولا۔

''ماتا جی! اسی لیے تو میں کسی پر اندھا الزام نہیں لگاتا۔ پہلے انصاف کے مروجہ تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہوں۔ چاہے سامنے والا دوست ہو یا دشمن پھر کچھ حالات اور ریاستی مصلحتوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا میں پھر یہی کہوں گا کہ...... کل مقدمہ لگانے کا بندوبست کیا جائے اور فریقین کو اپنا اپنا موقف بیان کرنے دیا جائے پھر اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔''

''ہونہہ...... تم تو وہ بات سمجھ ہی نہ سکے جو میرے بیٹے چھوٹے راج کمار نے ان لوگوں کی یہاں آمد کے بعد ہی اپنی غیر معمولی دانش مندی اور فہم و فراست کے بل بوتے پر جان لی تھی۔'' مہارانی نجو بائی مہاراجا کے سامنے اپنے بیٹے کی تعریف کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتی تھی۔ اس پر مہاراجا چندر گپتا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر قدرے چونک کر پوچھا۔

''آخر ایسا کیا جانچا تھا ہمارے چھوٹے راج کمار نے...... نجو بائی؟''

''یہ بات کب ڈھکی چھپی رہی ہے کہ ان فرنگیوں کے لیے مشرق کی یہ دنیا شروع ہی سے ایک کشش کا باعث بنی رہی ہے۔ وہ یہاں چھپے ہوئے خزانے تلاشنے آتے ہیں۔'' مہارانی نجو بائی جیسے سنسنی خیز انکشافات کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔

''یہ فرنگی باپ بیٹی بھی یہی کچھ کرنے آئے تھے مگر اس کی آوارہ بیٹی رینا اپنے ہی ایک، شوکت حسین نامی میلے نوکر کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ باپ کو پتا چلا تو وہ بیٹی کو خوب لعن طعن کرتا تھا، یہی سبب ان دونوں باپ بیٹی کے درمیان جھگڑے کا سبب بنا جو آگے چل کر اس کے قتل کی سازش پر ختم ہوا۔''

نجو بائی اپنی بات ختم کرکے چپ ہوگئی۔ دیوان خانے کے ایک پردے کے پیچھے کان لگائے چھپا کھڑا، بچھو رام یہ سب سن اور دیکھ بھی رہا تھا۔ اندر بیٹھی صرف نجو بائی کو معلوم تھا کہ پردے کے پیچھے کون کھڑا تھا اور کیوں......؟

درحقیقت یہ بچھو رام ہی تھا جس نے مہارانی نجو بائی کو یہ ساری پٹی پڑھائی تھی، ورنہ نجو بائی کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ...... یہ سارا آخر معاملہ کیا تھا... معلوم تو بچھو رام کو بھی کچھ نہیں تھا...... لیکن وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گندی مکھی ہمیشہ گند پر ہی اور سارے جسم کو چھوڑ کر زخم پر ہی بیٹھتی ہے، اسی طرح سازشیں کرنے والے اور موقعے کی تاک میں رہنے والے بھی اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

رینا وغیرہ کے کالی کے مندر سے واپس راج محل روانہ ہوتے ہی دوسری طرف مہا پجاری نے اپنے چیلے پرس رام کو بھی چپکے سے ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا، نیز یہ بھی کہ اب آگے کیا کرنا چاہیے اور اسے سب کچھ سمجھا بجھا کر راج محل نجو بائی کی طرف روانہ کردیا تھا۔ لہٰذا وہ بچھو رام کو جلدی جلدی ساری باتوں سے آگاہ کرکے اسی وقت واپس لوٹ آیا تھا۔

بدری ناتھ کی زیرک اور مکار نظروں نے نہ صرف پہلے ہی رینا کے شوکت پر اعتماد کرنے اور غیر معمولی پن کو بھانپ کر ایک نئی کہانی گھڑلی تھی۔ یہی نہیں، بعد میں اس نے عمر رسیدہ ہندو نوکر جوڑے نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا سے بھی کچھ آگاہی لی تھی جس پر بچھو رام نے ان لوگوں کے راج محل آتے ہی نندو بابا اور شانتا سے گفتگو کی تھی۔ اس کم علم اور افواہ طراز جوڑے نے بھی انہی باتوں کا اظہار کیا تھا کہ پروفیسر ہنری برنارڈ دراصل تحقیق کے بہانے یہاں کسی چھپے ہوئے خزانے کی تلاش میں آیا تھا۔ جس کا ذکر وہ اکثر سفر کے دوران نہایت بیزاری سے ڈرائیور امجد خان سے بھی کرتے رہتے تھے اور وہ شوکت سے کرتا مگر شوکت ان جھوٹ اور لغو باتوں کو جھٹلا دیا کرتا تھا۔

قصہ مختصر...... رینا کے رد الزام کے طور پر راتوں رات یہ سازش تیار کرلی گئی تھی۔ بچھو رام نے نجو بائی کو مکمل طور پر ''گائیڈ'' کردیا تھا۔ وہ اب پردے کے پیچھے یہی کچھ سن رہا تھا کہ نجو بائی ٹھیک بول رہی ہے یا نہیں۔

لہٰذا جب مہاراجا، ولی عہد اور مہارانی کی یہ نشست برخاست ہوئی تو...... بچھو رام فوراً مہارانی کے کمرۂ خاص میں داخل ہوگیا۔

''میں کچھ بھولی تو نہیں بچھو رام......؟'' نجو بائی نے اپنے چیلے بچھو رام سے پوچھا۔

''بالکل نہیں مہارانی صاحبہ! ایک دم کمال کردیا آپ نے......'' بچھو رام خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن...... پجاری

بدری ناتھ نے آپ کے لیے ایک الگ سے بھی پیغام بھیجا تھا۔ وہ تو آپ سے خود ہی ملنا چاہتا تھا لیکن حالات دیکھ کر نہیں آسکا، آپ بھی خود ہی وقت اور موقع نکال کر ان سے جا کر مل لیجیے۔"

"پیغام کیا تھا.....؟" مہارانی نجو نے اپنے دلکش لبادے کا ایک پلو سنبھالتے ہوئے خاصے تفکر سے پوچھا۔

بچھورام نے ایک لمحہ کو ادھر اُدھر اپنی نظریں گھمائیں اور انتہائی مدھم سرگوشی میں بولا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اب صورت حال پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ جو داؤ بڑے راج کمار کے لیے بچار کھا تھا وہ اس پروفیسر کے لیے کام آچکا۔ اب دوسرا داؤ تیار کرنا پڑے گا مگر پہلے کل اس معاملے سے جان چھڑانا ہوگی اور یہ کام صرف آپ ہی کر سکتی ہیں۔"

بچھورام کی اس بات پر مہارانی نجو بائی کا دلکش چہرہ ایک دم مسخ ہو کے سیاہ پڑ گیا اور وہ اسی لہجے میں اندرونی جذبات تلے خود کلامیہ بڑبڑائی۔

"بڑی مشکلوں سے اس موئے ولی عہد (پرتاب) کی کھٹیا تیار کی تھی۔ اب نئی منجی ٹھونکنے کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"میں تو کہے ہوں مہارانی صاحبہ! آپ خوامخواہ ہی ولی عہد کے معاملے کو اتنا لمبا کر رہی ہیں۔ کہیں تو میں یہ کام کر ڈالوں.....؟" بچھورام بولا تو مہارانی اس کی طرف سانپ کی سی پھنکتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

"بے وقوف! کسی عام آدمی کو ٹھکانے نہیں لگانا ہے۔ یہ ریاست کے ولی عہد اور مہاراجا چندر گپتا کے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کا معاملہ ہے۔ بات گلے پڑ گئی ہمارے تو مہاراجا چندر گپتا کبھی بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

نجو بائی کے وحشت زدہ لہجے نے بچھورام کو خجل سا کر دیا۔ یک دم خفیف سا ہو کے بولا۔ "معافی چاہتا ہوں مہارانی صاحبہ! آپ کی وفاداری میں ایک جوش تلے غلط بات منہ سے نکل گئی۔"

"تم ایک کام کرو..... ابھی جاؤ اور بدری ناتھ کو ادھر بلا لاؤ۔ میں اس سے پوچھوں تو سہی کہ آخراتنی محنت سے تیار کیا ہوا ہتھیار اس نے بلاوجہ ضائع کیوں کیا؟"

بچھورام مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔ "جیسا آپ کا حکم مہارانی صاحبہ! لیکن..... اب یہ مناسب نہ ہوگا۔ بدری ناتھ کا اس وقت آنا مخالفوں کو مزید شکوک و شبہات میں مبتلا کر سکتا ہے۔ پرس رام نے آکر مجھے ساری تفصیل بتادی ہے جو میں آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں۔ اب صبح کا انتظار کر لیں۔ پہلے دیکھیں کہ مقدمہ ڈالا بھی ہے یا نہیں..... اور اس کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔"

مہارانی نجو بائی اپنے چیلے کے مشورے پر پُرسوچ سی خاموشی اختیار کیے رہی۔

☆☆☆

اسرار بھری دھڑکتی رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ راج محل کے جس گوشے میں رینا وغیرہ سکونت پذیر تھے، وہ دو کشادہ کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں دو مسہریوں پر رینا اور گارشیا لیٹے ہوئے تھے جبکہ دوسرے کمرے میں رابرٹ اور شوکت تھا اگرچہ رابرٹ کے لیے یہ بات انتہائی ناقابل برداشت تھی کہ شوکی بھی اسی کمرے میں فروکش ہو۔ وہ چاہتا تو..... ایش کمار سے کہہ کر اپنا یا شوکی کا بندوبست کہیں اور بھی کروا سکتا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس کا ارادہ بدل گیا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کا وہ مقصد پورا نہیں ہو پائے گا جس کے لیے اس نے رینا وغیرہ کے ساتھ رہنے کا کڑوا گھونٹ بھر رکھا تھا کیونکہ اس طرح وہ رینا اور شوکت پر نظر نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ اپنی مسہری پر آکر لیٹ گیا تھا۔ اس نے شوکی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹنے کی اداکاری کیے ہوئے تھا مگر اس کا شیطانی دماغ بہت سے پراگندہ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پہلا خیال اسے راج کماری سوبجنا کا ستانے لگا تھا۔ آج وہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے موقع نہ مل سکا تھا۔ بھائی اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا تھا۔ تاہم موقع محل کے مطابق وہ سوبجنا کے چہرے پر اپنی گرم نظریں ڈال کر اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ..... وہ اسے پسند کرتا ہے۔ جواب میں سوبجنا نے بھی اس کی معنی خیز نظروں کا جواب اپنی مسکراتی نگاہوں سے دیا تھا۔ رابرٹ کے لیے سوبجنا کی طرف سے اتنی حوصلہ افزائی بھی کافی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسرور بھی ہوا تھا کہ اب بس..... یہ لال پری پھنسی کہ پھنسی۔

ادھر شوکی بھی اپنی آرام دہ مسہری پر بہ ظاہر آنکھیں موندے لیٹا رینا اور موجودہ حالات کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ رینا کے دکھ کو وہ اپنا دکھ سمجھتا تھا۔ دکھ تو اسے بھی تھا کہ پروفیسر ہنری جیسا بااصول اور اس سے شفقت و محبت سے پیش آنے والا ایک شریف اور قابل انسان یوں ناگہانی موت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے تو ان کی ایسی جانکاہ موت کا یقین ہی نہیں آرہا تھا لیکن اس نے یہ بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ

رینا کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے باپ کے مشن کو ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی باپ کے قاتلوں کو..... مگر بدقسمتی یہ تھی کہ ماسوائے رینا کے سب کا خیال یہی تھا کہ یہ محض ایک "حادثہ" تھا، خود شوکت نے بھی رینا کی اس بات پر بہت غور کیا تھا۔ آخر وہ کیا عوامل تھے جن کی بنا پر رینا یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اس کے باپ کی موت حادثاتی نہیں بلکہ قتل تھی؟ جبکہ رینا کی اس سلسلے میں فقط اتنی دلیل تھی کہ سانپ نے ان کے قافلے کے اتنے لوگوں کو چھوڑ کر پروفیسر ہنری کو ہی کیوں ڈسا تھا؟

اس کے پس منظر میں دو باتیں اپنی جگہ ٹھوس تھیں۔ پہلی تو یہ کہ پروفیسر ہنری کو دورانِ سفر ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کچھ نامعلوم لوگ ان کا خفیہ طور پر تعاقب کر رہے ہیں۔ ان کے پیروں کے نشانات بھی انہوں نے سب کو دکھائے تھے۔ ان کے الفاظ سب کو یاد تھے، جب انہوں نے کہا تھا کہ.....

"کچھ لوگ ہماری منزل دیکھنا چاہ رہے ہیں، جبکہ ہمارے تعاقب میں ان کا ضرور کوئی ایسا مقصد کارفرما ہو سکتا ہے، جسے جان لینے کے بعد شاید یہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔"

دوسری بات کے تو تین گواہ بھی تھے۔ ایک رابرٹ، چھوٹا راج کمار ایش، اس کی بہن سوبجنا، جب یہ لوگ ان سے پہلے مندر پہنچے تو انہوں نے دو ایسے پجاریوں کو جنگل کی طرف سے اسی راستے پر نمودار ہوتے دیکھا تھا جس راستے سے یہ لوگ (شوکی وغیرہ) آئے تھے۔ ان دونوں پجاریوں کے کاندھوں پر پیلے رنگ کے تھیلے لدے ہوئے تھے۔ جس کی تہ میں کوئی گول گول سی شے پڑی نظر آئی تھی۔ یہ شے بھلا ان پٹاریوں کے سوائے اور کیا ہو سکتی تھی جن میں سانپ رکھے جاتے ہیں۔

یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

صبح یہ سب لوگ جاگے تو راج محل میں شور مچا ہوا تھا۔ لیف بروجر کے جاسوس جارج کی لاش ایک نیا معما کھڑا کیے ہوئے تھی۔ اس پر مستزاد..... دلی سے آئے ہوئے پانچ رکنی وفد کی آمد کا بھی چرچا ہو رہا تھا۔ یہ جنرل مائیکل شا کا خصوصی نمائندہ جان پال تھا جس کی آمد تو خیر پہلے سے ہی متوقع تھی۔ تیسرا کھٹراگ..... پروفیسر ہنری کی ہلاکت یا قتل کا تھا لیکن سب سے زیادہ شور جاسوس جارج کی لاش پر مچا ہوا تھا۔

لیف بروجر کو جب اپنے جاسوس کی ہلاکت کا پتہ چلا تو وہ سناٹے میں آگیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ گویّوں کے بہروپ میں جو تین جاسوس (علی، ادریس اور شاہ زمان) آئے ہوئے ہیں یہ انہی کی حرکت ہو سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ جارج نے ان کی اصلیت بھانپ لی ہو مگر بدقسمتی سے مارا گیا ہو۔

اس نے فی الفور شک کی بنا پر اپنے سپاہیوں کو ان تینوں گویوں کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے۔ اس کے اپنے سپاہیوں کی تعداد صرف چار تھی، باقی راج محل سے تعلق رکھتے تھے جو اسی کے زیر تحکم تھے، مگر اس کے لیے بھی وہ راج محل کے سیناپتی موج سنگھ کے احکامات کے پابند تھے۔ جب انہیں یہ پتا چلا تو انہوں نے موج سنگھ کو یہ بات بتائی۔ اس نے فوراً لیف بروجر کو طلب کر لیا۔ دونوں افسر اپنے اپنے دائرۂ اختیارات تک محدود تھے۔ اسی لیے باہم مشاورت کو لازمی سمجھتے تھے۔

"کمال ہے مسٹر بروجر! آپ نے میرے علم میں لائے بغیر اتنا بڑا حکم کیسے صادر کر دیا؟" موج سنگھ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو جواباً بروجر بھی اپنی چست نگاہیں اس پر گاڑتے ہوئے بولا۔

"مجھے ان تینوں پر پہلے ہی شبہ تھا۔ یہ حرکت ان تینوں کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔"

"کیا آپ نہیں جانتے مسٹر بروجر کہ وہ تینوں راج محل کے شاہی گویوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور مہاراجا صاحب کی خصوصی توجہ اور اجازت سے ہی یہاں مقیم ہیں؟"

"جانتا ہوں مگر....."

"اس کے لیے آپ کو کوئی.. ٹھوس ثبوت پیش کرنا ہوگا..... ورنہ مہاراجا صاحب بہت سخت برا منائیں گے۔" سیناپتی موج سنگھ نے بڑی رعونت کے ساتھ لیف بروجر کی بات کاٹ دی۔ لیف بروجر بھی اسی تمکنت کے ساتھ ترکی بہ ترکی بولا۔

"تو پھر مہاراجا صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے بھی یہاں پر..... برٹش گورنمنٹ نے اسی لیے بھیجا ہے کہ ریاستوں میں باغی جاسوسوں کی آمد و رفت اور ان کی خفیہ نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ ایسا سب کے لیے وسیع تر مفادات میں کیا گیا ہے۔"

"جانتے ہیں ہم....." موج سنگھ نے کہا۔ "مگر یہ سب کسی حکم نامے کے تحت نہیں ہوا، ایک خیرسگالی معاہدے کے تحت کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک آزاد ریاست کا معاملہ ہے۔ یہاں کسی بیرونی حکم نامے کا کوئی اطلاق نہیں ہوتا۔"

گھاگ سیناپتی کی اس بات پر زیرک مغز لیف بروجر

کو مسلحاً تھوڑا خفیف ہونا پڑا۔ اس نے اپنے لہجے میں اس پرحکم سونے کے بجائے مفاہمت کی فضا کو قائم کرنے کی کوشش میں کہا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے۔ لیکن کیا یہ غلط ہے کہ اگر ہم ان تینوں گویوں پر شبہ کررہے ہیں تو وہ آپ کی ریاست کے مفاد میں نہیں؟''

''بالکل ہے، اس پر ہم آپ کے شکر گزار بھی ہیں۔'' موج سنگھ نے بھی اپنی کڑی گفتگو کے بعد معاملہ فہمی سے ہی کام لینا ضروری سمجھا اور آگے بولا۔ ''لیکن اس طرح بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے راج محل کے مہمان گویوں کی گرفتاری، ریاست میں مہاراجا چندر گپتا صاحب کے خلاف لوگوں کے دلوں میں فن دشمنی بھی جائے گی جس کا غلط اثر پڑے گا اور مہاراجا صاحب فن کے دلدادہ ہیں۔'' چند لمحہ توقف کے بعد موج سنگھ دوبارہ بولا۔

''ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ اگر ہمیں ان تینوں گویوں پر شبہ ہے تو ہم ان پر یہ سب کچھ ظاہر کیے بغیر نظر تو رکھ ہی سکتے ہیں۔ تب تک تم اپنی تفتیش کو ٹھوس بنیادوں پر آگے بڑھا سکتے ہو۔''

لیف بروجر کو لاجواب کرنے کے بعد سیناپتی موج سنگھ نے دیوار کی طرف اپنا رخ پھیر لیا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی بات ختم کرچکا ہے اور اب اس پر مزید بحث کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیف بروجر دانت پیستا ہوا وہاں سے چلا گیا اور اس نے گرفتاری کے احکامات واپس لے لیے۔

جارج کی لاش کے معمے کو حل کرنے کے لیے لیف بروجر لگ گیا تھا۔ یہ معاملہ ابھی یہیں پر ہی تھا کہ انہیں راج محل کے خصوصی ہال کمرے میں پہنچنے کا عندیہ ملا جدھر مہاراجا چندر گپتا اور جان پال کی اہم میٹنگ ہونا تھی۔

☆☆☆

جان پال اور مہاراجا چندر گپتا کے مابین اہم نشست کا انتظام راج محل کی اوپری منزل کے ایک بڑے ہال نما کمرے میں کیا گیا تھا۔ وہاں جان پال اپنے ساتھ آئے ہوئے چار عدد آرمی سطح کے فوجیوں کے ہمراہ موجود تھا جبکہ مہاراجا چندر گپتا کے ساتھ، اس کی فوج کا سالار موج سنگھ اور تین شاہی مشیر براجمان تھے۔

گفتگو کا آغاز باغیوں کی شہری سطح سے ہٹ کر اب شمالی ہند کی آزاد ریاستوں میں اپنی خفیہ کمین گاہوں اور بچی کھچی طاقت کو یکجا کرکے نئے سرے سے گروپ بندیوں کے موضوع سے کیا گیا، جو زیادہ طویل نہ تھا۔

اس کے لیے جان پال نے اپنے منہ میں پائپ دباتے ہوئے جن تحفظات کا ذکر مہاراجا کے سامنے کیا تھا، اس کا جواب ..... مہاراجا نے دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی وہ اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے سیناپتی موج سنگھ نے بڑے پرعزم انداز میں برٹش آرمی کے ایلچی جان پال کو خاطر خواہ طریقے سے دے دیا تھا، لہٰذا..... جان پال مطمئن انداز میں سر ہلانے کے بعد فوراً ہی اصل اور اہم موضوع کی طرف آتے ہوئے پائپ کا ایک گہرا کش لگا کر براہ راست مہاراجا چندر گپتا سے مخاطب ہوکے بولا۔

''یور ہائنس اب سے پہلے تو ایجنسی جنرل مائیکل شا کا آپ کی طرف سے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کے سلسلے میں شکریے کا پیغام قبول کیجیے۔ ان کے ایک پہلے سے بھیجے گئے پیغام کے مطابق ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اس منصوبے کو اب آخری شکل دے ڈالیں۔ پالن پور اور ترپال کی ریاستیں آپ کی ریاست ناگرہ کے ساتھ ملحق ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی تھی کہ ان دونوں ریاستوں سے معاملہ فہمی کی بنیاد پر تعاون حاصل ہوسکے۔ لیکن ان کی طرف سے مسلسل عدم تعاون، ہٹ دھرمی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ڈبونے کی پالیسی کو دیکھتے ہوئے سرکار انگلشیہ نے ان پر چڑھائی کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

اس کے لب و لہجے سے جھوٹ، مکروفریب اور دغابازی کی بو کو سوائے اس کے اپنے چار کارپردازوں کے اور کوئی نہیں سمجھ پایا تھا جبکہ حرص و طمع میں مہاراجا چندر گپتا کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں ریاستوں پر قابض ہوجائے اور پورے کوہ شمالیہ میں صرف اسی کے نام اور طاقت کا ڈنکا بجے۔ لیکن وہ ان مکار انگریزوں کی سیاست کو نہیں جانتا تھا کہ وہ پہلے آپس میں لڑاتے تھے اس کے بعد ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہی پر قابض ہوجایا کرتے تھے۔

کوہ شمالیہ کا علاقہ ہمیشہ سے ہی انگلشیہ سرکار کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا تھا۔ اس گنجان پہاڑی اور جنگلاتی علاقے کو وہ باغیوں اور حریت پسندوں کا من پسند خفیہ ٹھکانا سمجھے ہوئے تھے جہاں وہ اپنی رہی سہی طاقتوں کو یکجا کرنا چاہتے تھے۔ چندر گپتا نہیں جانتا تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے لیے ایک ساتھ تین ریاستوں کے خلاف جنگ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے ناگرہ کے مہاراجا کو ساتھ ملا کر اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کے چلانے کی سازش تیار کی تھی کیونکہ

وہ ان مہاراجوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے'یہ سب ان کے غاصبانہ مفادات میں شامل تھا۔

بہرطور...... جان پال کی بات سن کر چندر گپتا کی آنکھوں میں حرص وطمع کی لہر چمکی تھی۔اپنی خوشی و مسرت دباتے ہوئے وہ دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''ہم نے میجسٹی کے ساتھ ہر ممکن تعاون کی قسم کھا رکھی ہے۔سرکار انگلشیہ اگر عسکری اور افرادی مدد کرنے کا دم بھرتی ہے تو ہمارا منصوبہ سینا پتی موج سنگھ پہلے ہی تیار کر چکے ہیں۔وہ ہم آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہمارا منصوبہ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ہم بھی اپنے ساتھ جنگی منصوبے کی پری پلاننگ کا پلاٹ لے کر آئے ہیں۔دونوں کو ملا کر جنگی حکمتِ عملی کو مشترکہ طور پر آخری شکل دے ڈالیں گے۔''یہ کہتے ہوئے جان پال نے اپنے ساتھ بیٹھے چاروں افراد میں سے ایک کی طرف مخصوص نظروں سے دیکھا جس نے فوراً ہی اپنی گود میں رکھا ہوا ایک چرمی تھیلا اٹھا کر اسے کھولا۔ادھر موج سنگھ نے بھی ایک بڑا سا نقشہ نکال کر درمیان میں پڑی مستطیل میز پر پھیلا دیا۔

☆☆☆

ان تینوں کو اپنے خلاف کوئی ہلچل ہوتی محسوس نہیں ہوئی تھی۔انہوں نے مہمان گاہ تک ہی خود کو محدود کیے رکھا۔ان کے لیے ناشتا بھجوا دیا گیا تھا۔وہ ناشتے میں مصروف ہو گئے۔مہمان گاہ کے دوسرے کمرے میں شانتا اور نندو بابا کے ساتھ ڈرائیور امجد خان بھی شامل تھا۔وہ بھی ناشتا کرنے میں مگن تھے۔علی ریحان نے ناشتا ختم کیا اور بولا۔

''میں ذرا ساتھ کے کمرے میں جا کر پتا کرتا ہوں کون لوگ ہیں۔''

وہ چلا گیا۔اب کمرے میں اریبہ اور شاہ زمان تنہا رہ گئے۔شاہ زمان جارج کی لاش کی طرف سے فکرمند تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ معاملہ گمبھیر ہو گیا تو سب سے پہلے ان کی شامت آئے گی۔گرفتاری نہ بھی عمل میں آئے،انہیں راج محل سے بے دخل کیا جا سکتا تھا۔اس صورت میں بھی ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا اور پھر آج کا دن تو ان کے منصوبے کے حوالے سے اور بھی اہم تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟''اریبہ نے اس کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔

''یہی سوچ رہا تھا کہ...... لاش کے سلسلے میں کیا ہوا ابھی تک ...... یہ بھی کہ جان پال پہنچا یا نہیں۔آج کے دن ہم نے بہت ...... اہم کام نمٹانا ہے۔ان کی نشست کا احوال سننا ضروری ہے۔''شاہ زمان گہرے تفکر سے بولا۔

''یہ کام ہم لوگ نہیں کر سکتے۔''اریبہ بھی گہری متانت سے بولی۔''اس اہم اور خفیہ کام...... کے لیے ایک ہی آدمی کافی ہے اور وہ میں ہی ہوں۔''

''تم......؟نہیں، میں تمہیں اس خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔یہ کام میں خود کروں گا۔''شاہ زمان جلدی سے بولا۔

''ہرگز نہیں۔''اریبہ نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔''مت بھولو کہ ہم اس وقت راج محل کے اندر بیٹھے ہیں اور کسی غیر مرد کا محل کے اندر گھومنا پھرنا نظروں میں آ جائے گا اور معیوب بھی ٹھہرے گا۔''

شاہ زمان پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اس کی بات پر غور کرنے لگا۔

''میں ایک عورت ہوں، کہیں بھی آ جا سکتی ہوں۔''اریبہ نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔''لیکن جہاں پابندی ہوئی وہاں میں بہ آسانی چھپ کر یہ کام انجام دے لوں گی۔''

''علی سے مشورہ کیے بغیر میں تمہاری بات کو حتمی شکل نہیں دے سکتا۔''شاہ زمان بولا۔

''لیکن تم بتاؤ...... کیا میرا منصوبہ غلط ہے؟''اریبہ نے اس کی طرف دیکھا۔شاہ زمان اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا ورنہ تو اسے خود بھی ذاتی طور پر اریبہ کا مشورہ برا نہیں لگا تھا۔لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اس خطرناک مشن کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے کے کندھے پر بار ڈالے کیونکہ اریبہ کا بہرحال کسی حریت پسند گروپ یا باغیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔وہ محض یا شاید شاہ زمان کے ساتھ ایک تعلق خاطر کی وجہ سے ساتھ دے رہی تھی۔

''کیا سوچنے لگے شاہ زمان...... ؟''اریبہ نے رسان سے پکارا تو وہ ایک پھنسی پھنسی سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''تجویز تو تمہاری بری نہیں ہے اریبہ! لیکن میں نہیں چاہوں گا کہ اپنے اس خطرناک مشن کا بار تمہارے سر ڈالوں۔ اسے مجھے اور علی ریحان کو ہی انجام دینا چاہیے۔''

''اچھا! تو یہاں میں تم دونوں کے ساتھ آ کر خطرے میں نہیں ہوں۔''وہ مسکرا کر بولی۔ایسے میں شاہ زمان نے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھا۔وہ جب بھی اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔اس کا دل بے اختیار اس کی جانب کھنچا جاتا تھا۔ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اریبہ کو کسی ایسے رسکی کام میں ڈالنے سے ہمیشہ کتراتا تھا جس میں اس کی جان جانے کا ذرا بھی

خدشہ ہوتا۔

''طنز کر رہی ہو مجھ پر......''اس نے مصنوعی لہجے میں شکایتاً کہا۔

''ہرگز نہیں، میں بھلا تم پر کیوں طنز کروں گی؟''وہ ایک دم بولی۔''دل کی بات کہوں تو میں خود کو بھی اس عظیم مقصد کے حامل مشن کی ایک مجاہدہ سمجھنے لگی ہوں۔کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔کیا مجھ پر فرض نہیں عائد ہوتا کہ میں ان غاصب فرنگیوں کے خلاف تم لوگوں کی مدد کروں؟''

شاہ زمان کو دکھ ہوا تھا کہ اس نے اریبہ سے مذاق میں بھی ایسی بات کیوں کی تھی جس سے اریبہ کا دل شاید دکھا تھا لہٰذا وہ اس سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''اریبہ! مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارے اس عظیم مشن میں ہمارے شانہ بشانہ ہو اور سچی بات تو یہ ہے کہ تمہاری مدد سے ہی ہم یہاں تک پہنچ سکے ہیں۔جہاں تک تمہارا کام تھا۔وہ تم نے بلاشبہ بڑی خوش اسلوبی اور دلیری سے انجام دیا ہے لیکن اس کے بعد والا کام بہت خطرناک نہیں جان لیوا بھی ہے۔سمجھو تو یہ تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے برابر ہے اور کسی تجربہ کار اور تربیت یافتہ آدمی کے کرنے کے لائق ہے جیسے میں یا...... علی ریحان کیونکہ تم بہرحال تربیت یافتہ نہیں ہو۔''

اریبہ مسکرا کر کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ علی ریحان آ گیا۔دونوں اپنی گفتگو چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔علی کا چہرہ فکروتردد کا شکار تھا۔

''خیریت ہے؟ کیا ہوا؟''شاہ زمان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔

''معاملہ کچھ گمبھیر سا لگتا ہے۔''علی بولا۔''کل کا حال تو ہمیں اریبہ بہن نے بتا ہی دیا تھا مگر اس کی تفصیل اب میں نے معلوم کی ہے۔''یہ کہتے ہوئے اس نے ریتا اور پروفیسر ہنری سے متعلق وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے نندو بابا، شانتا اور امجد خان کی سنگت میں بیٹھ کر ان سے باتوں باتوں میں پوچھا تھا۔اسے ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔دیکھیں اب جان پال سے متعلق ان کی نشست کا کیا بنتا ہے؟''شاہ زمان نے کہا اور اپنے اور اریبہ کے درمیان ہونے والی اس سے متعلق گفتگو کے بارے میں بھی بتا دیا۔جسے بڑے غور سے سننے کے بعد علی بولا۔

''اریبہ صرف اس حد تک کام کرے کہ ہمیں جان پال کی آمد اور ان کی مہاراجا سے ہونے والی اس اہم نشست کے متعلق بتا دے کہ وہ کب اور کہاں ہونے والی ہے۔''

''یہ کام تو نسبتاً آسان ہی ہے۔کیوں شاہ زمان! اب تو تم مطمئن ہو نا...؟''کہتے ہوئے اریبہ نے مسکرا کے شاہ زمان کی طرف دیکھا تھا۔

''ہوں... دیکھنا یہ ہے کہ جان پال کی آمد ہوئی ہے یا نہیں؟ لیکن تم اس فرنگی افسر لیف بروجر سے بھی محتاط رہنا۔وہ ہماری کڑی نگرانی کر رہا ہے۔''زمان بولا۔

''ویسے اس وقت ریتا والے مسئلے کی وجہ سے یوں بھی راج محل میں ہلچل کی سی فضا ہے۔میرا خیال ہے تم ابھی سے ان کے درمیان گھلنے ملنے کی کوشش کرو اور پتا چلاؤ کہ جان پال آیا ہے یا نہیں۔''

اریبہ اسی وقت نکل گئی۔تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ لوٹی تو اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔وہ بولی۔

''جان پال اپنے چار رکنی وفد کے ساتھ آ چکا ہے اور راج محل کی اوپری منزل میں ان کی نشست لگنے والی ہے۔''

دونوں یہ سن کر ٹھٹک گئے اور ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔علی ریحان بولا۔''ہمیں فوراً وہاں گھات لگانا ہو گی۔ان کی باتیں سننا انتہائی ضروری ہیں۔یہ کیا جنگی پلان تیار کرنے والے ہیں، وہ سب ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''کیا تم نے حکمتِ عملی تبدیل کر دی ہے علی؟''شاہ زمان اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔''ہمیں جان پال کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا اور میرا خیال ہے کہ سینا پتی موج سنگھ کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں، لیکن پہلے ان کے عزائم تو جان لیں،ان کا منصوبہ کیا ہے اور مہاراجا چندر گپتا کس حد تک ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو۔میں ذرا اوپر جا کر ان کی خفیہ میٹنگ کی کارروائی خود سننے کی کوشش کرتا ہوں اور جیسے ہی مجھے موقع ملے گا میں جان پال کو تو سب سے پہلے ٹھکانے لگاؤں گا۔''

''تم دونوں ہی یہ کام نہیں کر سکتے۔''اریبہ نے کہا۔دونوں اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''میں خود جا کر یہ کام کروں گی۔''

''کیا تم جان پال کو موت کے گھاٹ اتارو گی......؟''علی اس کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، یہ کام تو میں نہیں کر سکتی۔''وہ جواباً بولی۔''البتہ میں ان کی میٹنگ کی کارروائی سن کے آ جاتی ہوں کہ انہوں نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔جان پال کو بعد میں تم دونوں میں سے کوئی ایک ہلاک کر سکتا ہے۔''

اس کی بات سن کر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ان کے بشروں پر فکر و تردد کے آثار نمودار ہو گئے۔اریبہ دوبارہ بولی۔

"میری بات اور ہے، میں کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ جاؤں گی۔لیکن تم دونوں کے لیے راج محل کے اندرونی گوشے میں جانا ممکن نہ ہوگا۔یہ وقت بھی دن کا ہے۔دیکھ لیے جانے کا پورا خدشہ موجود ہے۔لیف بروجر پہلے ہی ہم پر دانت نکوسے ہوئے ہے اور موقعے کی تاک میں بھی ہے۔جلدی فیصلہ کرلو۔"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو اریبہ! تم جاؤ اور...... ساری کارروائی کا احوال اپنی آنکھوں سے دیکھو اور ہمیں آکر اس کی تفصیل بتاؤ۔اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" علی ریحان نے فوراً کہا اور...... اریبہ نے شاہ زمان کی طرف دیکھا،تھوڑا سا مسکرائی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

یہ چاروں بھی بیدار ہو گئے تھے۔ان کے لیے خوبصورت طشتریوں میں ناشتا بھیجا گیا تھا۔ریتا اور شوکت نے تو بے دلی سے ناشتا کیا تھا جبکہ...... گارشیا اور رابرٹ نے ڈٹ کر پرتکلف ناشتے پر ہاتھ صاف کیا تھا۔

پروفیسر ہنری کی لاش کی تدفین وغیرہ سے متعلق رات ہی فیصلہ کرلیا گیا تھا۔پہلے تو اسے دلی لے جانے پر غور ہو رہا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس کی لاش کو وہیں دفنا دیا گیا تھا۔

متوقع مہمانوں (جان پال) کی آمد ہو چکی تھی اور...... مہاراجا چندر گپتا ان کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ریتا منتظر تھی کہ کب اس کے باپ کے قتل سے متعلق مقدمے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔وہ اسی انتظار میں تھی، ورنہ اس نے راکاشی کی جانب کوچ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن اب وہ پہلے اپنے باپ کے قاتلوں کو بے نقاب کرنا چاہتی تھی۔

رابرٹ، سونجا کے چکر میں اس کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ اسے تسلی تھی کہ ابھی ریتا کا راج محل سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔گارشیا ان کے ساتھ تھی۔یہ لوگ میٹنگ ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔تھوڑی دیر گزری تھی کہ چھوٹا راج کمار ایش وہاں آگیا۔ریتا کو افسردہ دیکھ کر وہ بھی کچھ متفکر تھا۔اس کی کوشش تھی کہ وہ اس خوبصورت گڑیا جیسی دوشیزہ کے ساتھ کچھ تنہا لمحے گزارے، اسے راج محل کی سیر کرائے، باغ میں لے جائے اور اس کے ساتھ تھوڑی سی سیر و تفریح کرے اور اس کے ساتھ .... تنہائی کے کچھ لمحے مستعار ہی سہی چرانے کی سعی کرے۔وہ اس وقت بھی اسی غرض سے اس کے پاس آیا تھا۔اسے دیکھ کر یہ تینوں احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ لوگوں نے ناشتا کرلیا؟" وہ ریتا کی طرف دیکھ کر مسکرا کے بولا۔"اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" ریتا تو مغموم سی خاموشی اختیار کیے رہی تھی،جبکہ گارشیا نے فوراً ایش کمار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ناشتا واقعی پرتکلف تھا مسٹر ایش! کاش انکل والا افسوسناک واقعہ پیش نہ آتا تو ہم اور بھی زیادہ انجوائے کرتے۔"

"پروفیسر صاحب کے انتقال کا ہمیں بھی بے حد افسوس ہے۔بہت نفیس انسان تھے۔بھگوان انہیں سورگ باشی کرے۔" چھوٹے راج کمار نے کلمۂ افسوس ادا کیا تو ریتا اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مسٹر ایش! میں آپ سے اور مہاراجا صاحب سے انصاف کی درخواست کروں گی لیکن مجھے نہیں لگتا کہ...... کالی کے مندر کے پجاریوں کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں لائی جائے۔" ریتا نے اپنے خدشے کا بھی اظہار کر دیا۔شوکت خاموش تھا۔

ایش، ریتا کی بات سن کر بولا۔"آپ فکر نہ کریں مس ریتا! مہاراجا صاحب ایک اہم نشست میں مصروف ہیں۔ان کے فارغ ہوتے ہی اس مقدمے کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔"

"کیا اب بھی کچھ سوچنے کی گنجائش آپ سمجھتے ہیں مسٹر ایش؟" ریتا نے کسی قدر تلخی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ایش گڑبڑا گیا۔اسے ان معاملات کا بالکل بھی تجربہ نہ تھا۔اس کا بچپن لاڈ پیار اور سیر سپاٹے میں گزرا تھا۔اسے ان محلاتی معاملہ داری و امور سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔یہ اس کی ماں نجوبائی ہی تھی جو اسے گاہے بگاہے جتاتی رہتی تھی کہ مستقبل کا والیِ ریاست بڑا راج کمار پرتاب نہیں بلکہ وہ خود ہے، اس لیے اسے امورِ ریاست بھی سیکھنا چاہئیں مگر آزاد منش ایش ماں کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا کرتا تھا۔اس کے نزدیک بس یہی عیش و آرام والی شاہانہ زندگی کافی تھی جو وہ بسر کر رہا تھا۔

ریتا کی بات پر اس کا بوکھلا جانا اس کی ناتجربہ کاری کو ہی ظاہر کر رہا تھا۔وہ تو یہاں ریتا کو اپنے ساتھ لے جانے کی نیت سے آیا تھا مگر ریتا نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔وہ اب اس سے جان چھڑانے کی کوشش میں تھا۔وہ بولا۔

"نن...... نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا مس ریتا! میں موقع ملتے ہی پتاجی سے بات کرتا ہوں۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ولی عہد پرتاب وہاں آگیا۔اس کے انداز

واطوار میں شاہانہ رعب اور بردباری جھلکتی تھی۔ایش اسے دیکھ کر موقع پاتے ہی وہاں سے کھسک گیا۔

ولی عہد کو دیکھتے ہی ان تینوں نے اسے سلام پیش کیا جس کا جواب بھی ولی عہد پرتاب نے نہایت انکساری سے دیا۔

"ہم آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتے ہیں مس ریتا!" پرتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ریتا نے اس کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور سوگوار سے انداز میں اپنا سر جھکا لیا۔

"ہمیں آپ کے دکھ کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ریاست کے مہمان کے جان و مال کی پوری پوری ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے،لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاید یہ ذمے داری پوری کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"

ولی عہد پرتاب کی بات سن کر ہی ریتا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ راج محل میں صرف مہاراجا چندر گپتا کا بڑا بیٹا اس کے مقدمے میں سنجیدگی رکھتا ہے۔لہٰذا بہت دھیرے سے بولی۔

"آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟"

"ہاں!" پرتاب نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

"لیکن پہلے ہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بتا دیں کہ مہاراجا اپنی بعض اہم ریاستی مصروفیات کے باعث شاید اس مقدمے میں شریک نہ ہو سکیں،لیکن ہمارے ایما پر انہوں نے یہ اختیار اب ہمیں سونپ دیا ہے۔لہٰذا ہم جاننا چاہیں گے کہ آپ بلا جھجک وہ نام ہمیں گنوا دیں جن پر آپ کو اس قتل کا شبہ ہے۔"

ولی عہد پرتاب کمار کی بات پر ریتا حیران سی ہو گئی۔اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔اس نے فوراً کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کا نام بتا دیا۔ساتھ ہی ان دونوں پجاریوں کا بھی ذکر کر ڈالا تھا جنہیں جنگل سے نمودار ہوتے وقت رابرٹ اور ایش وغیرہ نے دیکھا تھا۔کیونکہ یہی وہ وقت تھا جب حادثے کے تھوڑی ہی دیر بعد یہ دونوں اپنی پشت پر پٹاریاں لیے نمودار ہوئے تھے اور بعد میں ریتا وغیرہ بھی وہیں پہنچ گئے تھے۔ریتا کی بات پر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد پرتاب کمار بولا۔

"ہم وہی بدری ناتھ اور اس کے ان دونوں ساتھی پجاریوں کو جن کی نشاندہی کی گئی ہے،راج محل میں حاضر ہونے کا حکم صادر کرتے ہیں اور انہیں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے۔دھارمک (مذہبی) ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ہر قانون اور انصاف کے تقاضوں سے مستثنٰی اور ماورا ہو جائے۔"

ریتا اور شوکت، ریاست ناگرہ کے ولی عہد کی باتوں پر اش اش کر اٹھے تھے۔شوکی نے ریتا کے چہرے پر پہلی بار افسردگی کو، ایک امید اور آشا کے جلتے دیپ کی صورت دمکتے دیکھا تو اسے بھی یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا کہ محبوب کی راحت میں اس کا سکون جو تھا۔

"پہلے میں یہی سمجھی تھی کہ شاید یہاں راج محل میں انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے اور شاید یہاں کسی مصلحت کوشی سے کام لیا جائے۔شاید مذہب کی آڑ میں انصاف کو دفن کر دیا جائے مگر اب آپ کی باتوں سے مجھے بہت تسلی ہو گئی۔میں اب مقدمہ ہار بھی گئی تو کوئی غم نہیں ہوگا کہ...... کسی نے تو یہاں انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا......"

ریتا نے ممنونیت بھرے انداز میں یہ الفاظ ولی عہد پرتاب سے بڑے دل کی گہرائیوں سے کہے تھے۔وہ بھی ریتا کے مغموم سے چہرے کی اداسی کو پل کے پل خوشی کی چمک میں دیکھ کر اپنے دل میں کچھ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا تھا۔اسی سبب پرتاب کی اس کے چہرے پر جمی ہوئی نظروں میں عمیق گہرائیوں کی ایک ذرا رمق سی ابھری تھی اور پھر وہ واپس اسی شاہانہ تمکنت سے پلٹ گیا تھا جس انداز...... سے وہ یہاں آیا تھا۔"بہت متاثر کن شخصیت تھی بڑے راج کمار پرتاب کی...... اب تو آپ مطمئن ہیں ریتا صاحبہ؟"

ولی عہد پرتاب کے جاتے ہی شوکت نے ریتا سے مخاطب ہو کے کہا۔گارشیا کی موجودگی میں وہ ریتا سے بے تکلفی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔گارشیا بولی۔"باتیں تو اس کی متاثر کن تھیں، کاش! کہ اب یہ واقعی انکل ہنری کے قاتلوں کو صدق نیت کے ساتھ بے نقاب بھی کر دے۔"

"ایسا ہی کریں گے راج کمار صاحب۔" شوکی نے کہا۔

ادھر ولی عہد پرتاب وہاں سے سیدھا اپنے کمرۂ خاص میں آیا اور کرسی پر بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا اس کے بعد کچھ سوچ کر اس نے ایک خادم کو بلایا اور فوراً یہ حکم نامہ جاری کر دیا کہ مقدمہ راج محل میں نہیں بلکہ کالی کے مندر کے باہر پنڈال لگا کر کیا جائے گا۔اس لیے ریاست کے ہر خاص و عام کو وہاں آنے کی اجازت ہے۔

ولی عہد کے اس حکم کی فوراً منادی کرا دی گئی۔

☆☆☆

مہارانی نجوبائی کے جاسوس بچھو رام کو جب اس حکم نامے کی بھنک ملی تو اس نے فوراً مہارانی کے سامنے پیش ہو کے بتا دیا کہ ولی عہد راج کمار پرتاب نے کالی کے

مندر کے باہر ہی مقدمہ لگانے کا حکم دیا ہے اور خود وہ فریقین کے ساتھ وہاں پدھارنے کا قصد کیے ہوئے ہے۔

یہ خبر مہارانی نجو بائی پر بجلی بن کر گری۔ اس کا چہرہ طیش اور غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔

''یہی نہیں، ولی عہد نے چھوٹے راج کمار جی اور راج کماری کو بھی مقدمے کی شرکت میں گواہوں کی حیثیت سے حاضر ہونے کا پابند کیا ہے۔'' بچھورام نے بتایا تو مہارانی نے اسی وقت اپنے دونوں بچوں کو کمرے میں طلب کیا اور تحکمسانہ کہا۔

''تم دونوں ہرگز اس مقدمے میں شرکت کے لیے نہیں جاؤ گے۔''

''میں تو نہیں جانا چاہ رہا ہوں مگر یہ تیار ہے۔'' چھوٹے راج کمار ایش نے اپنے ساتھ کھڑی بہن سونجنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

''بس، میں نے کہہ دیا تم دونوں میں سے کوئی نہیں جائے گا وہاں۔''

''لیکن...... ماتا جی! یہ بڑے بھیا کا حکم ہے۔'' سونجنا ماں سے بولی۔ ''اگر ہم نہیں گئے تو پتاجی سخت ناراض ہوں گے۔ وہ ولی عہد کے حکم کو اپنا حکم گردانتے ہیں۔''

مہارانی نجو بائی بری طرح تلملانے لگی۔ بچھورام سے بولی۔

''آخر پرتاب کو یہ اختیار دیا کس نے ہے؟''

''ظاہر ہے مہاراجا صاحب نے ہی دیا ہے مہارانی صاحبہ!'' بچھورام نے دست بستہ جواب دیا۔

''ہوں...... تو یہ بات ہے۔'' مہارانی دانت بھینچ کر بولی۔

''ٹھیک ہے، لیکن خبردار! تم نے مہا پجاری تو کیا وہاں کالی کے مندر سے تعلق رکھنے والے کسی بھی آدمی کے خلاف کوئی بھی گواہی نہیں دینا۔ ہر طرح سے لاعلمی کا اظہار کرنا ہوگا۔''

سونجنا کے لیے ماں کی یہ بات ماننا ممکن نہ تھا۔ جبکہ ایش کمار بھی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اس کی نظروں کے سامنے رینا کا گلاب سا چہرہ رقصاں ہوگیا۔ ڈرتے ڈرتے ماں سے بولا۔

''لیکن ماتا جی! یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اس وقت ہمارے ساتھ رابرٹ بھی تھا۔''

''بے شک ہوگا۔ اس کی کیا حیثیت ہے۔'' نجو بائی غصے سے پھنکتے ہوئے بولی۔ تب ہی سونجنا بھی بھائی کی حمایت میں ماں سے بولی۔

''بھیا ٹھیک کہتے ہیں ماتا جی! رینا کا کزن رابرٹ بھی اس وقت وہاں موجود تھا جب ہم نے اس واقعے کے فوراً بعد دو پجاریوں کو سانپوں کی پٹاریاں بغلوں میں دبائے کالی ماتا کے مندر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔''

''کچھ بھی ہو، تم فوراً مکر جانا کہ تم نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ رہا وہ انگریز لڑکا تو اس کی گواہی کی بھلا کیا حیثیت ہوگی۔ بس، مقدمے کے وقت تم دونوں اپنا منہ بند رکھنا۔''

مہارانی صاحبہ! ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے۔'' بچھورام جس کا سازشی دماغ خاصی دیر سے اس مسئلے کو حل کرنے کی سوچ رہا تھا، بولا۔

''ہاں، بولو، بچھورام! کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' مہارانی نے اس کی طرف تحکمسانہ نگاہوں سے گھورا۔

''چھوٹے راجکمار اور راج کماری صاحبہ کو جانے ہی نہ دیا جائے وہاں۔ ہم ان کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا سکتے ہیں۔''

''ایسا کرنا غلط ہوگا اور الٹا رینا کا مقدمہ زور پکڑے گا۔'' سونجنا بولی۔ ''بڑے بھیا کی ضدی طبیعت سے کون واقف نہیں۔ وہ یہاں آدمی بھیج کر بھی ہمیں لے جائیں گے۔ کم از کم میں تو جھوٹ نہیں بول سکتی۔'' بیٹی کے اس جواب پر ماں اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگی تو سونجنا تھوڑا خفیف ہو کے دوبارہ ماں سے بولی۔

''ماتا جی! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہماری گواہی سے بھلا کیا ہوجائے گا۔ ضروری تو نہیں کہ رینا مقدمہ جیت جائے۔ لیکن ہماری عدم شرکت اس کیس کو اور مضبوط بنا دے گی۔''

سونجنا ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے بات غلط نہیں کہی تھی۔ مہارانی نجو بائی نے کچھ ٹھہر کر بیٹی کی بات پر غور کیا... اور چپ ہوگئی تھی۔ ایش کمار نے سکون کی سانس لی تھی کیونکہ وہ مقدمے میں شرکت نہ کر کے اور جھوٹی گواہی دے کر رینا کو اپنی طرف سے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اریبہ مہمان گاہ سے نکلی اور...... راج محل کے اندرونی گوشے کی راہ لی۔ اس نے ہاتھوں میں اپنا گٹار تھامے رکھا تھا۔ اس کی سریلی اور مدھ بھری آواز اور گیتوں کے سب ہی دیوانے تھے۔

وہ یونہی گٹار تھامے کہیں بھی کھڑی ہو کے شاعری یا کوئی گیت گنگنانے لگ جاتی تو پہرے دار اپنی جگہیں اور خدام اپنے کام چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہونا شروع ہوجاتے۔ وہ اسی طرح دلنشیں انداز میں مسکرا مسکرا کر انہیں پھڑکتے اشعار اور

سریلے گیت سناتی جاتی اور ذرا دیر بعد آگے بڑھ جاتی۔ ایسے میں اس نے دیکھا تھا کہ لیف بروجر کے دو فرنگی سپاہی اسے مسلسل کڑی نظروں میں لیے ہوئے تھے جبکہ خود لیف بروجر اوپر ہونے والی خصوصی میٹنگ میں شریک تھا اور اس کی ان تینوں گویوں سے متعلق کڑی ہدایت پر ہی دو فرنگی سپاہی ان پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اریبہ کو بھی انہوں نے اپنی نظروں میں لے رکھا تھا۔ اگرچہ اریبہ نے انہیں بھی مسکرا مسکرا کر اپنی شاعری اور سریلے گیتوں کا گرویدہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کی مدھر بانی پر سر دھننے کے بجائے اسے گھورتے رہے۔

ایک جگنو نام کے شخص سے اس کی دوستی ہوگئی۔ اس ''دوستی'' میں اریبہ کی بھی خصوصی توجہ اور التفات کا ہاتھ تھا۔ ایسا دانستہ اس نے کیا تھا کیونکہ جگنو کو پورے راج محل میں خادم اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اریبہ کی ایک ہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے آگے ریشہ خطمی ہونے لگا تھا۔ جگنو بھی خاصا دل پھینک ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک تگڑا اور دراز قامت آدمی تھا۔ رنگت سانولی تھی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ صورت کا بدشکل تھا مگر اندر سے معصوم فطرت تھا۔ جلد ہی اریبہ نے اسے اپنی مدھر بانی اور دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ وہ اس کا دیوانہ بن گیا اور اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا۔

اریبہ لہراتی بل کھاتی گٹار سنبھالے اسی منڈیر کے قریب جارکی تھی جدھر سے ایک غلام گردش اوپری زینے کی طرف جاتی تھی اور یہیں پر جگنو سے اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ دن خوب چمک رہا تھا۔ نیلے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ نرم ہوا کے جھونکوں کی لطافت سے فضا خاصی خوشگوار ہو رہی تھی۔

اریبہ دانستہ یہاں آکر ایک ستون سے ٹک کر کھڑی ہو گئی، وہ ایک گیت چھیڑ چکی تھی۔ لیف بروجر کے دونوں سپاہی...... مسلسل اسے نظروں میں لیے ہوئے تھے اور اس وقت بھی وہ اس کے تعاقب میں چلتے ہوئے ذرا فاصلے پر ایک نشیمن کے پاس کھڑے ہو کر بہ ظاہر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

اریبہ ان سے لاتعلق سی بنی گیت گنگنا رہی تھی کہ خادم اعلیٰ جگنو کے کانوں تک اس کی مدھر بانی پہنچی تو وہ بے چین ہو کے گویا کچے دھاگے سے بندھا اس طرف کو چلا آیا۔ اریبہ کو دیکھتے ہی اس کے سیاہ رو چیچک زدہ چہرے پر بدہیت سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی، وہ تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔

اریبہ نے حسب سابق اس کی طرف مسکرا کر دیکھا مگر گاتا گاتی رہی۔ اس کے کالی گھٹاؤں جیسے سیاہ دراز گیسو کھلے ہوئے تھے اور مست خرام ہواؤں کے جھونکوں میں لہرا رہے تھے۔ جگنو بھدے دانتوں کی نمائش کیے اس کی طرف گھورے جا رہا تھا اور سر دھن رہا تھا۔ اریبہ بھی اسی کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی اور سریلے گیتوں کے پھول اس پر نچھاور کیے جا رہی تھی۔

''واہ...... واہ، کیا کہنے...... کیا آواز ہے اور کیا ادائے حسن کی بے خود کر دینے والی بے نیازی ہے۔ ایک تان ہے دیپک کہ فروزاں رہے چراغ حیات کے لرزتے شعلے کی طرح، اسی طرح......'' جگنو بھی گویا شاعرانہ انداز اور بھرے بھرے لہجے میں کہتا چلا گیا۔ اس کی نظریں اریبہ کے دلکش چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اریبہ خاموش ہوئی تو یوں لگا جیسے تان ہی ٹوٹ گئی ہو، جیسے حیات فروزاں کا جلتا چراغ ایک دم گل ہوگیا ہو۔

''نوازش، قدر افزائی اور اس حسن نظر کا کنیز شکریہ ادا کرتی ہے حضور! آداب عرض......'' اریبہ نے بھی اپنی دلنشیں آواز میں لہک لہک کر یہ الفاظ ادا کیے تو جگنو پر بے اختیاری مسلط ہونے لگی۔ وہ ریشہ خطمی ہونے کے انداز میں اسے چھونے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ اریبہ نے ہولے سے کھنکھار کر اس طرف اشارہ کر دیا جدھر وہ دونوں فرنگی سپاہی بہ ظاہر آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر کن انکھیوں سے اریبہ پر نگاہ بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس اشارے پر جگنو کے چہرے پر ایک لحہ حیرت چمکی، اس کے بعد اس نے اریبہ کے اشارے کی سمت دیکھا تو ایک دم اس کے چہرے پر تلخی عود کر آئی۔

وہ دونوں مذکورہ سپاہی بھی خادم اعلیٰ کو اپنی جانب گھورتا پا کر اریبہ کی طرف سے لاتعلق بنے آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنی چیسٹ پاکٹ سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بھی نکالا تھا۔

جگنو ان دونوں کو کباب میں ہڈی سمجھ کر ان کی جانب بڑھا۔ اریبہ نے گٹار سنبھال لیا اور پھر گنگنانے لگی۔ یوں جیسے اسے اس طرف کی کوئی پروا ہی نہ ہو۔ مگر ایک موقع پر اس نے کن انکھیوں سے اس طرف بھی دیکھا تھا۔ جگنو ان دونوں سپاہیوں کے پاس جا کھڑا ہوا تھا اور ان سے بڑے بارعب انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں سپاہی مخمصے کا شکار تھے۔ اریبہ جانتی تھی کہ اس کا جادو چل گیا تھا اور جگنو اپنا ''راستہ'' صاف کرنے کے لیے انہیں وہاں سے چلتا کرنا چاہتا تھا۔

وہ اپنا گیت گاتی رہی۔ اس نے دانستہ اپنی آواز تھوڑی اور بلند کر لی تھی۔ جیسے اسے گیت گانے کے سوا کسی کی پروا ہی

نہ ہو۔

چند سیکنڈوں بعد ہی جگنو اس کی طرف آ گیا۔ اس کی باچھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اریبہ نے نرم اور میٹھی سی مسکان سے اس کی طرف دیکھا۔ ساتھ دزدیدہ نگاہیں اس طرف بھی ڈالیں تو یہ دیکھ کر اس کا دل یکبارگی دھڑک گیا۔ دونوں سپاہی وہاں سے غائب تھے۔ اس کا داؤ چل گیا تھا۔ اب وہ اگلا داؤ کھیلنے والی تھی۔

''لو...... جاناں! بلبل کوہستاں! اب ہمارے بیچ کوئی نہیں رہا۔'' جگنو کی لہکتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''یہ دیوانہ تمہارے ان پھول جھڑتے اور رسیلے ہونٹوں سے...... خوشبو چرانے کے لیے بے چین ہے۔'' خمار آلودہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا چیچک زدہ چہرہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اس پر جھکتا چلا گیا تو اریبہ کھنکتی ہنسی کے ساتھ بھرّا مار کے ایک ادائے دل آرا کے ساتھ، اس سے پرے جا کھڑی ہوئی۔

جگنو بھی ڈھیٹ عاشقوں کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اریبہ کھنکتی ہنسی کے ساتھ اس زینے کے قریب پہنچی جو اوپر کی طرف جاتا تھا۔ جگنو نے اسے اوپر جاتے دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ اسے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اوپر کسی کو بھی نہیں آنے دیا جائے، ماسوائے خادم اعلیٰ کے...... لہٰذا اس نے جب اریبہ کو ان ''اٹکھیلیوں'' میں زینے کی طرف جاتے دیکھا تو جگنو کے سر سے عشق کا بھوت ذرا سرکا۔ وہ فوراً اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے اسے روکتے ہوئے دور سے ہی چلایا۔

''ارے...... رے...... رکو! ادھر مت جانا۔'' اریبہ فوراً رک گئی اور معصوم بن کر اس کی طرف اپنی آنکھیں پٹپٹا کر دیکھنے لگی اور پوچھا۔

''ک...... کیوں کیا ہوا؟ اوپر کیا جن ہے؟''

''جن تو نہیں ہے... مگر جن سے بڑھ کر میری مصیبت آ جائے گی اگر تم نے اوپر ایک قدم بھی رکھا۔'' جگنو بولا۔ اریبہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی اور اٹھلا کر بولی۔

''جھوٹے! یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے اوپر کی سیر سے روکنا چاہتے ہو۔ جانتے نہیں ہو کہ میں مہاراجا صاحب کی چہیتی ڈومنیا ہوں۔ راج محل میں کہیں بھی آزادی کے ساتھ آ جا سکتی ہوں۔''

''کیا بات کرتی ہو میری جان! اوپر تم تو کیا کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔''

''بس دیکھ لی تمہاری محبت۔'' وہ ایک دم روٹھ کر بولی۔

''ایک میں بے وقوف ہوں جو مانگ میں سیندور سجانے اور ایک عدد شوہر رکھنے کے باوجود تم سے یہاں محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہوں۔ کیا مجھے اپنے پتی بھوپت کا خوف نہیں ہو سکتا؟ اس نے اگر یہاں مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا نا، تو میری شامت آ جائے گی۔'' اس کے بعد وہ شرمانے کی بے مثل اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

''میں تو اسی لیے اوپر جا رہی تھی کہ وہاں مجھے اپنے پتی بھوپت کا کوئی ڈر نہ ہوتا اور تم میرے ساتھ ہوتے اوپر۔'' جگنو نے اریبہ کے منہ سے یہ بات سنی تو اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اس کے دل میں خوشی اور مسرت کے مارے لڈو پھوٹنے لگے مگر وہ ڈر بھی رہا تھا۔ ایک طرف حکم سخت تھا تو دوسری طرف اس طرح دار حسینہ کی جادو بھری ادائیں تھیں، جو اسے دیوانہ اور پاگل بنائے ہوئے تھیں۔ وہ عجیب مخمصے کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔

''اچھا تمہاری مرضی!'' اسے متردد پا کر اریبہ نے چالاکی دکھائی۔ ''میں واپس جاتی ہوں، بھوپت میرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

''ارے ٹھہر تو جا۔'' جگنو نے ادھر ادھر چور سی نظروں سے تکتے ہوئے اس سے کہا۔

''اگر تیرا دل چاہ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ پر دیکھ میں نہیں جا سکتا تیرے ساتھ، میں ادھر موجود رہوں گا۔ تو سیر کر کے ترنت لوٹ آنا اور کوئی گانا بجانا مت کرنا۔ کسی کو اوپر تیری موجودگی کا پتا بھی نہ چلے۔ پھر ہم دونوں آرام سے اندر کمرے میں چل کر باتیں کریں گے۔ وہاں نہ مجھے کوئی ڈر ہوگا نہ تجھے بھوپت کا...... ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں! ٹھیک ہے۔'' اریبہ فوراً خوش ہو کے بولی اور تیزی سے اوپر چڑھتی چلی گئی۔

وہاں اس نے مذکورہ ہال کمرے کا رخ کیا اور ایک دریچے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اندر ہونے والی گفتگو کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے تھوڑی سی اور کوشش کرتے ہوئے اندر بھی جھانک لیا۔

کافی دیر بیت چلی۔ نیچے کھڑے اس کے انتظار میں جگنو کو بے چینی کے ساتھ اب تشویش بھی ہونے لگی تھی۔ وہ بار بار زینے کی طرف دیکھتا، کچھ سوچ کر وہاں تک جاتا اور پھر واپس لوٹ آتا۔

''سسری! کہاں رہ گئی۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میرا خیال ہے خود ہی دیکھ لوں جا کر، سسری کہاں رہ گئی ہے۔'' یہ سوچ کر وہ اوپر کو لپکا۔

ادھر اریبہ دریچے سے لگی یہ ساری کارروائی باتفصیل دیکھتی رہی۔ اسے بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ ایک خطرناک کام کر رہی تھی۔ اگر کوئی اسے یوں بھی دیکھ لیتا تو مصیبت آ جاتی۔ یہ بھی کہ نیچے اس کے انتظار میں کھڑا جگنو بھی اوپر آ سکتا تھا۔ جگنو کا تو اس نے بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ اس کارروائی کو مکمل ہوتے دیکھنا چاہتی تھی تاکہ بعد میں اس کی کامیاب کارکردگی کے بل بوتے پر علی اور شاہ زمان اپنے مشن کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

معاً اسے اپنے عقب میں کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ چونک کر پلٹی۔ اس نے جگنو کو پریشانی کے عالم میں اسے تلاش کرتے دیکھا۔ وہ اس طرف نہیں آیا تھا، شاید اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ...... اریبہ اس اہم میٹنگ والے کمرے کے پاس کھڑی ہوگی۔ اسی لیے وہ اسے دوسری جگہوں پر تلاشتا رہا پھر اس طرف آیا تو اریبہ ایک کونے میں جا دبکی۔

''کدھر چلی گئی سسری؟ شاید واپس نہ چلی گئی ہو۔'' اس نے جگنو کو یہ بڑبڑاتے ہوئے سنا اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ واپس جانے کے لیے پلٹ گیا۔ اریبہ دوبارہ دریچے کے پاس سرک آئی۔

☆☆☆

مہا پجاری بدری ناتھ بری طرح بولایا ہوا تھا۔ اس نے ایک عرصے تک اس مندر کے اسرار کو کامیابی سے چھپایا تھا۔ وہ اب کھل چکا تھا اور جو رہا سہا تھا، وہ ریاست کے لوگوں کے سامنے آشکار ہونے والا تھا۔ تاہم ایک مصیبت گلے پڑ گئی تھی، اسے بھگتانا تو ضروری تھا۔ یوں بھی وہ اور مہارانی نجو بائی ولی عہد کا کانٹا دور کرنے کے لیے جو ہتھیار تیز کیے ہوئے تھے وہ کند اور بے اثر ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ معاملہ ہی الٹا گلے پڑ گیا تھا، چنانچہ دونوں نے (مہارانی اور بدری ناتھ) نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہلے اس مصیبت سے جان چھڑالی جائے اس کے بعد کوئی دوسرا ہتھیار تیز کریں گے۔

کالی کے مندر کے آگے پنڈال لگ چکا تھا۔ لوگ ہاک آنا شروع ہو گئے تھے۔ فریقین پہنچ گئے تھے۔ مقدمے سے متعلق کورم بھی پورا ہو چکا تھا۔ کارروائی کا آغاز ہوا......

ولی عہد پرتاب کمار کو اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ مقدمہ ایک ہی پیشی میں بھگتانا تھا اور سہ پہر سے پہلے پہلے بھی۔ اس کی وجہ مہاراجا چندر گپتا کی وہ ہدایت تھی جس کے مطابق پرتاب کو مقررہ وقت میں اس مقدمے کو نمٹانا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ مہاراجا چندر گپتا اپنی جان پال کے ساتھ اہم نشست کے بعد شام تک پرتاب سے بھی مشورہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مہارانی نجو بائی کے بھڑکانے، کان بھرنے اور ورغلانے کے باوجود...... مہاراجا اپنے بڑے بیٹے پرتاب پر اور اس کے فہم و ادراک پر بھی بڑا بھروسا کرتا تھا۔ چاہے وہ حتمی فیصلہ کر بھی ڈالتا تھا تو اس کے بارے میں ولی عہد سے رائے لینا ضروری خیال کرتا تھا۔

اسی سبب اس نے پرتاب کو یہ مقدمہ ایک ہی پیشی میں اور سہ پہر تک نمٹانے کی خاص اور ضروری تاکید کر رکھی تھی۔

مقدمے کی کارروائی کا آغاز کیا جا چکا تھا۔ پہلے رینا کا موقف پوری تفصیل سے سنا گیا۔ اس کے بعد گواہوں کے طور پر چھوٹے راج کمار ایلش اور سوجنا کو ساتھ بلایا گیا۔ ان دونوں بہن بھائیوں نے رینا کے حق میں ہی گواہی دی۔ اس کے بعد رابرٹ کو گواہی کے لیے بلایا گیا۔ اس نے رینا کے حق میں گواہی دینے سے صاف انکار کر کے جیسے ایک دھماکا کر دیا۔ رینا پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ شوکت کا چہرہ رابرٹ کی اس جھوٹی گواہی سے سرخ ہو گیا۔ وہ اس کی طرف سلگتی نظروں سے گھورتا رہ گیا اور پھر اس نے رینا کے چہرے پر بھی نظر ڈالی تھی۔ رینا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں، جو شوکت کے لیے فقط ایک دید کا خزانہ رکھتی تھیں، آب دیدہ سی نظر آنے لگی تھیں۔ وہ ڈبڈبانے لگی تھیں۔ چہرہ ستے کے رہ گیا تھا۔ شوکت گھائل ہونے لگا، وہ ہی نہیں، اس کا دل بھی محسوس کر رہا تھا کہ رینا اندر سے کس قدر اذیت ناک انداز میں ٹوٹنے کے عمل سے گزر رہی تھی۔

وہاں موجود کون نہیں جانتا تھا کہ...... کسی اپنے کی گواہی اس مقدمے پر کس طرح برے اثرات مرتب کر سکتی تھی۔ رابرٹ کی یہ جھوٹی گواہی تو ایلش کمار اور سوجنا کی گواہی کی سچائی کو بھی کھا گئی تھی۔ ورنہ اگر رابرٹ بھی یہی گواہی دیتا تو اس کی گواہی محض سہارے کا ہی کام کرتی، مگر ایلش اور سوجنا کی گواہی اس مقدمے کو پلٹنے کے لیے ہی کافی تھی مگر اب وہ سچی گواہی، رابرٹ کی جھوٹی گواہی کے سامنے پھیکی پڑ گئی تھی۔ بے شک تین کے مقابلے میں دو گواہیاں رینا کے حق میں سہی مگر رابرٹ کی گواہی اس لیے ان دو گواہیوں پر بھاری پڑ گئی تھی کہ ان کے اصول کے مطابق رابرٹ ان کا اپنا ساتھی تھا۔ جس کی گواہی مخالفین کی رو سے سوجنا اور ایلش کے مقابلے میں بلکہ مگر رینا کے فریق کی حیثیت سے بھاری پڑتی تھی۔

مذکورہ دو پجاریوں کی جنگل کی طرف سے دیکھی جانے والی آمد کو ابہام میں بدلتے ہوئے رابرٹ نے کہا تھا کہ پجاری جنگل کے بجائے مندر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے

تھے، یوں اس نے بڑی مکاری سے پجاریوں کے گروہ کو "بچاؤ" کا راستہ بھی دکھا دیا تھا کہ اب انہوں نے جواب میں کون سا موقف اختیار کرنا تھا۔ لامحالہ انہوں نے بھی فوراً یہی موقف اختیار کرتے ہوئے بتا دیا کہ مذکورہ دونوں پجاری جنگل کی طرف سے آنے کے بجائے مندر سے باہر نکل رہے تھے وغیرہ۔ رہی سانپوں والی بات تو انہیں پالتو ہی بتایا گیا تھا۔

"ررر..... رابرٹ! ی ی..... یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم.....؟" ریتا لرزتے لہجے میں اور بہ مشکل تمام اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ریتا کو گواہ سے اس طرح بولنے پر منع کیا جائے۔" مخالف فریق جماعت سے فوراً اعتراض اٹھایا گیا۔ پرتاب کی نظروں نے بھی ریتا کے چہرے کا درد محسوس کیا تھا، بے اختیار اس کا جی چاہا تھا کہ..... پیاری سی گڑیا مثل، پرستان سے آئی ہوئی نیلی اور تتلی جیسی اس فرنگن شہزادی کا درد بانٹ لے۔ بس اول کی گواہی سنے اور فیصلہ فوراً اس کے حق میں دے ڈالے لیکن وہ انصاف کی جس مسند پر براجمان کیا گیا تھا، اس سے انحراف کرنا اس کے بس کی بات کہاں تھی۔

پہلی بار ولی عہد پرتاب کمار کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ باپ کے کہنے پر اس مقدمے کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے کر..... وہ تو بڑے جوش و جذبے سے اس مسند انصاف پر براجمان ہوا تھا۔ انصاف کے تقاضوں کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کتنا پرعزم تھا وہ۔ اس لیے کہ اسے یقین کامل تھا کہ فیصلہ ریتا کے حق میں ہی ہوتا تھا، مگر یہاں تو محض ایک گواہی سے گویا امید کی بساط ہی الٹ گئی تھی تو بساط دل بھی کیسے بچتی۔

فریق کے اٹھنے والے اعتراض پر پرتاب کو اپنی خاموشی چوری محسوس ہوئی تو اس نے بہ جبر دل..... ریتا کی طرف بڑی کرب انگیز سی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"مس ریتا! مخالف اعتراض درست گردانا جائے گا۔ کارروائی کو آگے بڑھنا چاہیے۔"

ریتا سے یہ الفاظ کہتے ہوئے پرتاب کو تو اس سے نظریں ملانے کا بھی یارا نہ رہا تھا۔ اپنی آواز میں اسے وہ شاہانہ تمکنت بھی مفقود ہوتی محسوس ہونے لگی تھی، جو اس کا خاصہ تھی۔

ریتا اپنا دل مسوس کر چپ ہو رہی۔ ادھر شوکت ریتا کے دکھ کا اندازہ کر کے بوجھل ہو گیا۔ وہ خاموش تھا۔ کارروائی آگے بڑھتی رہی، مگر رابرٹ کی جھوٹی گواہی نے جیسے جل کی گندی مچھلی جیسا کام کیا تھا۔ جو سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ اچھا بھلا مقدمہ جو ریتا کے حق میں جاتا ہوا نظر آتا تھا وہ..... اس کی مخالفت میں چلا گیا تھا۔

ادھر اس مقدمے کی جھوٹی جیت نے مخالفین کو ایک اور گل کھلانے کا موقع دے ڈالا۔ انہوں نے ریتا کے خلاف..... محاذ قائم کر لیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جھوٹ کے خلاف اگر سچ کی ہار ہو جائے تو جھوٹ ایک عفریت بن جاتا ہے اور سچ کو کھا جاتا ہے۔

کالی دیوی کے مندر کے پجاریوں نے اپنی جیت پر وہیں نعرے لگانے شروع کر دیے اور وہاں موجود اس مقدمے کو دیکھنے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی حمایت لینے کے لیے پُرجوش خطاب بھی کر ڈالا .... جس میں ان کے مذہبی جذبات کو ابھارا گیا کہ باہر کے لوگوں نے اپنے گندے مفادات کی خاطر ان کی پوتر تا پر کیچڑ اچھالنے کا پاپ کیا۔ لہٰذا اب انہیں راج محل سے ہی نہیں بلکہ ریاست سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔

مجمعے میں شور مچ گیا اور راج محل کے مہمانوں کے خلاف اور لوگ بھی پجاریوں کی آوازوں کے ساتھ ہم آواز ہونے لگے۔

پرتاب اپنے خداموں کے ساتھ بگھی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بہ مشکل اپنے قدموں اور چال پر قابو پائے ہوا تھا۔ اس میں وہاں کھڑے رہنے اور ریتا کی نگاہوں کی تاب سہنے کی سکت نہ تھی۔ ریتا جبیر جبیر تھی۔ رابرٹ کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں کمینہ پن رقصاں تھا۔ شوکت بڑی خار باز نظروں سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ اس کا رواں رواں جوش غیظ تلے لرز رہا تھا۔ ایک آگ تھی جو اس کے سینے میں نفرت کی صورت بھڑکنے لگی تھی اور رابرٹ کے لیے اس نے پہلی بار اپنے سینے میں نفرت و عناد کی آتش غضب بھڑکتی محسوس کی۔ وہ جان گیا تھا کہ..... رابرٹ نے ریتا کے خلاف جھوٹی گواہی محض رقیبانہ جذبے اور ریتا سے مخاصمت کے برتے پر دی تھی۔

ادھر رابرٹ بدستور شوکت کی خار آلودہ نظروں کو محسوس کرتے ہوئے حظ اٹھانے اور تپا دینے والی مسکراہٹ سے تکے جا رہا تھا۔ وہ ریتا کے ساتھ کھڑا تھا۔ ریتا کو صدمے و غم کی شدت سے غش آ گیا۔ وہ گرنے لگی تھی کہ شوکت نے فوراً اسے تھام لیا۔ سوجنا اور ایش پرتاب کے ہمراہ شاہی بگھی میں سوار ہو کے جا چکے تھے۔ ریتا، شوکت، گارشیا، امجد خان، نند دبابا اور شانتا وہیں موجود تھے۔ شوکت نے ریتا کو سنبھالا

دیا۔ ریتا کی حالت کو دیکھ کر شوکت کی غضب ناکی اب انتہا کو چھونے لگی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب گارشیا نے بھی ریتا کو سنبھالا دیا تو شوکت پُرطیش نظروں سے قریب کھڑے رابرٹ کو گھورتے ہوئے اس کی جانب لپکا۔ رابرٹ کے چہرے کی شیطانی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ لحہ بھر کو متغیر ہوا۔ شوکت کو غضب ناکی کے انداز میں اپنی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھ کر اس نے اپنے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال دیا مگر تب تک شوکت اس کے ساتھ ٹکرا چکا تھا اور اسے بھربھری مٹی والی زمین پر دور تک رگیدتا ہوا لے گیا۔ رابرٹ کی پستول نکالنے کی حسرت ہی رہ گئی تھی جبکہ شوکت نے اس پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ امجد خان ہی وہ واحد شخص تھا جو انہیں چھڑانے کے لیے آگے بڑھا۔

"شوکی! چھوڑ دو اسے..... مت مارو اسے..... یہ غلط ہے۔" مگر شوکی پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے رابرٹ کا گلا دبوچ لیا۔ تب ہی مہا پجاری بدری ناتھ نے وہاں موجود چند پجاریوں کو اشارہ کیا۔ چار مسٹنڈے سے پجاری..... رابرٹ کو بچانے کے لیے فوراً آگے بڑھے اور پھر شوکت کو انہوں نے دبوچ کر رابرٹ سے الگ کر دیا۔

دیگر لوگ باگ واپس جا چکے تھے۔ اب وہاں یہی دونوں ایک دوسرے کا مخالف ٹولہ موجود رہ گیا تھا۔ ان پجاریوں نے شوکت کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ شوکت کو پٹتے دیکھ کر امجد خان غصے میں آ گیا۔

"اوئے..... تمہاری ایسی کی تیسی..... دھارمک ہو کے بدمعاشی کرتے ہو۔ ایک کو چار مارتے ہو۔" پھر وہ بھی ان کے بیچ کود پڑا۔ اس نے ایک تنگ دھڑنگ پجاری کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ دوسرے کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ وہ بھی پرے ہو گیا۔ اس نے باقی دو پجاریوں کے نرغے سے شوکت کو چھڑایا تو ان دونوں نے ہی بیک وقت امجد خان کو دبوچ لیا۔ شوکت ان چاروں بدمعاش پجاریوں کے نرغے سے آزاد ہوتے ہی مزید جوش میں آ گیا اور ایک کے سینے پر گھونسا اور دوسرے کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ غرضیکہ وہاں اچھا خاصا رن پڑ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے، بند کرو یہ لڑائی..... فار گاڈ سیک....."

گارشیا ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ریتا بھی خود کو قدرے سنبھال چکی تھی۔ اس نے شوکت کو آواز..... دی۔ گارشیا نے بھائی کو سنبھالا۔ امجد خان نے شوکت کو۔

"ہم اس بدمعاشی کا بدلہ لیں گے، تم لوگوں کی مہاراجا صاحب سے شکایت کریں گے۔ پوتر جگہ پر بدمعاشی کر رہے ہو۔" مہا پجاری بدری ناتھ کالے بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔

امجد خان اور گارشیا نے شوکی اور ریتا وغیرہ کو راج محل چلنے کا کہا اور یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اریبہ..... جب اپنا کام "تسلی بخش" انداز میں نمٹا کر پلٹی اور نہایت بچ بچا کر وہ زینے کی جانب لپکی تو وہاں پہنچ کر اس نے ذرا دیر کے لیے نیچے اور اطراف میں جھانکا۔ اسے زیادہ دھڑکا جگنو کا تھا۔ وہ اس سے جتنا کام لینا چاہتی تھی وہ لے چکی تھی۔ وہ اب اس کے لیے بیکار ہو چکا تھا مگر وہ اس کالے اور بدشکل دیو کی دست درازیوں سے کتراتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ایک حد تک صبر و برداشت سے کام لے رہا تھا۔ ممکن تھا آج والے واقعے پر وہ غصے کے اظہار کے طور پر اپنا "خراج" اس سے وصول کرنے کی... کوشش کرتا۔ اسی لیے وہ اس کی نظروں اور قبضۂ گرفت سے بچنا چاہ رہی تھی۔

بہرطور..... جگنو اور کسی اور کو وہاں یا اطراف میں نہ پا کر اریبہ تیر کی طرح زینے سے اتری اور ایک راہ گزر سے نکلنے والی تھی کہ اچانک عقب سے کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ سی خارج ہو گئی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ جگنو تھا۔ اس کے چیچک زدہ چہرے پر شیطانیت ناچ رہی تھی اور آنکھوں میں برہمی کا بھی تاثر تھا۔

"آہ..... چھوڑو میری گردن وحشی انسان!" اریبہ تھوڑا چیخی۔

"تو کہاں چلی گئی تھی مجھے جل دے کر..... بتا؟" وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کتنی دیر میں نے تیرا انتظار کیا۔ تو ابھی تک اوپر ہی تھی؟ میں تو سمجھا تھا تو جا چکی ہے۔ کیا کر رہی تھی اتنی دیر تک اوپر..... تیرے لیے میں نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔"

اریبہ پریشان اور فکرمند ہو گئی۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں یہ جنگلی سا انسان اس کا پول ہی نہ کھول دے۔

"ہائے میں مری! میری گردن تو چھوڑو و بتاتی ہوں۔" اریبہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"ایسے نہیں چھوڑوں گا، میں تجھے اب اس فرنگی افسر کے حوالے کر کے رہوں گا۔ وہ پہلے ہی تیرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔" اس نے دھمکانے کے انداز میں کہا تو اریبہ نے چالاکی سے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر کر دے مجھے اس فرنگی کے حوالے۔ تو تو چاہتا ہی یہی تھا۔ میں تو ذرا دیر کے لیے اوپر گئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس کمرے میں اتنی شاندار، آرام دہ اور کم خواب سے ڈھکی ہوئی مسہری ہوگی، بیٹھی تو میری آنکھ ہی لگ گئی۔ اب کھلی تو سیدھا بھاگی ہوئی آئی اور تجھے ڈھونڈنے لگی۔ بس اب تیری میری ختم۔ میں نے بھی تو اپنے کھسم سے بے وفائی کا خطرہ مول لے کر تجھ سے دوستی لگائی تھی۔ پر تو دل کا اتنا ہلکا نکلے گا، ہونہہ......" اریبہ کی اس چال میں وہ احمق سا جگنو فوراً آ گیا۔ اس نے اریبہ کی گردن چھوڑ دی اور بھدے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا! تو تو اوپر جا کے سو گئی تھی؟"

"ہاں نا......" اس نے بڑے دلار سے جگنو کی طرف دل نواز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم غریب ہیں نا جی۔ آج تک نیچے زمین پر ہی سوتے آئے تھے۔ دری بھی کبھی کبھی ہی نصیب ہوتی تھی۔ اوپر شاندار مسہری پر تو میں یونہی بیٹھی تھی کہ بس...... دل چاہا تھوڑا لیٹ کر بھی دیکھ لوں، پھر لیٹی تو موئی اکھیا ہی لگ گئی۔" اریبہ کی لوتنکیاں جاری تھیں۔ "پر تو کیوں نہیں اوپر آیا؟ سمجھ گئی تجھے بھا گن رلیاں منانے کے لیے کوئی اور جو مل ہو گئی۔"

"ارے...... انہیں...... نہیں...... میں تو تیرا ہی انتظار کرتا رہا تھا۔" وہ اس کی چلترکاری میں آتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "اچھا چل چھوڑ۔ آ میرے ساتھ...... میرا کمرا دیکھ، وہ بھی آرام دہ ہے اور وہاں بھی تجھے بہت آرام ملے گا۔"

اریبہ شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

"ضرور چلوں گی، پر ابھی نہیں۔ دیکھ نا...... مجھے دیر ہوگئی بہت۔ بھوبت میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں نہ گئی تو وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا ہی نہ آ جائے۔ وعدہ کرتی ہوں اسے مطمئن کر کے سیدھا ادھر ہی آتی ہوں، اب تو یہاں سے مت ہلنا۔" جگنو اس کی چالاکی میں آتے ہوئے بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے، جا اور ترنت لوٹ۔ میں ادھر ہی کھڑا ہوں تیرے انتظار میں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اریبہ کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اریبہ کو اس سے گھن آنے لگی مگر مجبور تھی۔ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تو جگنو نے تھوڑی اور ہمت پکڑی اور اریبہ کو گلے سے لگانے لگا۔

"ارے...... یہ کیا کرتے ہو، ابھی آ تو جاؤں گی۔ اتنے بے صبرے نہ ہو، کہیں بھوبت ادھر نہ آ جاوے۔" اریبہ نے فوراً خود کو اس کی دست درازی سے بچاتے ہوئے کہا اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

ابھی وہ اپنی مطلوبہ راہ گزر پر سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھی کہ کسی سے ٹکرا گئی۔ وہ فرنگی افسر بروجر تھا۔ اس سے ٹکراتے وقت اریبہ کو اس سے شراب کی بو آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ڈر بھی گئی۔ بروجر بھی آخر ایک پکا مرد تھا۔ اپنے گھر اور بیوی سے دور...... بال بچے اس کے انگلستان میں ہی تھے۔ تین ماہ بعد وہ بیس دن کی چھٹی پر گھر جاتا تھا۔ اس بار اس نے جانا تھا، مگر بعض اہم وجوہ کی بنا پر اسے چھٹی نہ مل سکی تھی۔ اسی باعث وہ چڑچڑا بھی رہنے لگا تھا۔

اریبہ جب اپنے شباب آور اور سیم تن وجود کے ساتھ اس سے ٹکرائی تو بروجر کے سخت اور کسرتی وجود میں ایک گداز یت سی سرایت کر گئی۔ طیش اور غصہ اس کا جیسے بھاپ بن کر اڑ گیا۔

خود اریبہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ جس سے وہ زیادہ ڈر رہی تھی وہی اس سے ٹکرا گیا تھا۔

"ش...... شما کر دیں سرکار!" وہ مترنم اور سریلی آواز میں لیف بروجر سے بولی۔ "مم...... میں آپ کو دیکھ نہ پائی۔"

لیف بروجر جتنا کرخت مزاج سہی، آخر ایک مرد تھا، اور مرد بھی کیسا، جو کئی ماہ سے ایسے نزاکتوں بھرے لمس سے دور بھی تھا۔ پھر اریبہ کے حسن و جمال کی بھی تو کیا بات تھی، وہ تو ایک مجسم رعنائی و گداز یت کا شاہکار تھی۔ اس کے دراز گیسو لیف بروجر کے چہرے سے بھی ٹکرائے تھے جس کی نکہت نے اس کے شراب میں بجھے حواسوں کو اور بھی مدہوش کر دیا۔ دونوں کو جھٹکا لگا تھا۔ اریبہ تھوڑا دور ہٹی تھی۔ صرف ایک ثانیے کے لیے ہی بروجر کے چہرے پر برہمی کی تیز چمک ابھری تھی مگر دوسرے ہی لمحے یہ چمک اس کے دل اور حواسوں میں بجلی بن کر کڑ کی۔

اس نے اریبہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بہ ظاہر درشت روئی سے بولا۔

"کہاں گئی تھیں اور کہاں سے آ رہی ہو......؟" اسے اپنے اختیارات اور راج محل میں اپنی حیثیت کا غرور تھا اور یہی ہتھیار وہ اس چنچل سی دوشیزہ پر آزما رہا تھا۔

"ج...... جی! وہ ادھر تھی میں......" اریبہ نے اس کی طرف اپنی گھنیری پلکوں کو اٹھاتے ہوئے دیکھ کر سامنے ایک فصیل کے قریب کشادہ گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بروجر سے وہ واقعی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اس کی یوں مداخلت اس کا بنا بنایا سارا کام بگاڑ سکتی تھی لیکن ساتھ ہی اس کی نگاہوں کی فطری گہرائیوں نے اس فرنگی افسر کی درشتی میں چھپی ایک خاص چمک کو بھی محسوس کیا۔ یہی نہیں وہ

اس کے پکڑے ہوئے ہاتھ کو سختی کے بجائے اس کی گداز یت اور نرماہٹ کو مسلتا ہوا بھی لگا۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوئی خاص کوشش نہ کی تھی۔ ایک خود سپردگی کے انداز بے نیازانہ سے وہ اسی طرح بہ ظاہر ڈری سہمی کھڑی رہی۔

"وہاں کیا کر رہی تھیں؟" لیف بروجر نے پوچھا۔ اس کا اندر اتھل پتھل ہونے لگا تھا۔ حسن و شباب کی قربت نے اس کا نشہ دو آتشہ کر دیا تھا۔

"مم...... میں وہاں گیت گا رہی تھی۔"

"ہوں...... تیری تعریفیں تو بہت سنی ہیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ تم، تمہارا شوہر اور بھائی باغیوں کے جاسوس ہو۔" لیف بروجر نے اسے اپنے دباؤ میں لانے کی غرض سے کہا۔

اریبہ کے نسوانی وجدان نے لوہا گرم محسوس کیا تو...... اک ادائے دل آرا سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"اگر سرکار نے اس کنیز کے خوش گلو کی تعریفیں سن رکھی ہیں تو پھر جاسوس ہونے کا شبہ اس غریب پر کیوں کیا جا رہا ہے؟ سرکار! ہم تو جدی پشتی گویے ہیں۔ گا بجا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔"

"تو پھر چلو میرے ساتھ ہم بھی تمہارا امتحان لیں گے۔" لیف بروجر بولا۔ اس نے ابھی تک اریبہ کا ہاتھ پکڑے رکھا تھا۔

اریبہ سوچنے لگی۔ مشن کے لیے اسے یہ اتنی سی قربانی دینا پڑے گی۔ یہ ضروری بھی تھا، اس سخت مزاج فرنگی افسر کے فرض کی دیوار میں اگر دراڑ ڈالنے کا موقع مل رہا تھا تو یہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے مفاد میں تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"سرکار! میرا ہاتھ تو چھوڑیے۔ کیا اس طرح مجھے لے کر جائیں گے اپنے ساتھ؟" اریبہ کی اس ادا پر بروجر کی بوالہوسی دوچند ہونے لگی۔ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آؤ میرے ساتھ......" بروجر نے کہا۔

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کے ساتھ چلوں اور آپ کو گیت اور شاعری سناؤں، لیکن کیا آپ اردو ہندی شاعری سمجھ سکتے ہیں؟" اریبہ نے چالاکی سے کام لیا۔ وہ اسے ایسے وقت میں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بروجر بولا۔

"سمجھ نہیں سکتا مگر تمہاری لہکتی ہوئی آواز تو سمجھ سکتا ہوں نا...... آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے اپنے بیرک نما کمرے میں لے جانے پر بضد تھا۔ اس پر شراب اور اریبہ کے حسن و شباب کا نشہ چڑھنے لگا تھا۔ اریبہ پریشان سی ہونے لگی۔ بولی۔

"سرکار! ایک ذرا ٹھہر جاؤ، میں اپنے پتی بھوبت سے مل آؤں، کہیں وہ مجھے تلاشتا ہوا ادھر ہی نہ نکل آئے۔ پھر آتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر لیف بروجر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد ایک ٹھنڈی سی سانس خارج کر کے اسے گھورنے کے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن یاد رکھنا، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے۔ ورنہ میں سپاہی بھیج کر تمہیں بلوالوں گا، مہمان گاہ سے......" اریبہ کو اس کے بولنے کا انداز ایسا ہی لگا جیسے...... وہ کہہ رہا ہو...... "مہمان گاہ سے تمہیں اٹھوا لوں گا۔"

"میں ابھی آئی سرکار...... میرا پتی بہت غصے والا ہے...... تھوڑی دیر اس کا دل لبھانے کے بعد تمہارے پاس آتی ہوں گانا سنانے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

"ہونہہ...... گانا سنانے...... میں ایسی خرافات نہیں پالتا۔" وہ زیر لب حقارت سے بڑبڑایا۔ "میں تو تیری قربت سے اپنی شراب کا نشہ گاڑھا کرنا چاہ رہا ہوں۔"

اریبہ جب ان ساری آزمائشوں سے گزر کر مہمان گاہ پہنچی تو علی ریحان اور شاہ زمان کو بڑی بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔ وہ اس کے لیے خاصے پریشان اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ اسے بہ خیر و عافیت دیکھ کر دونوں نے طمانیت کی سانس لی تھی۔

اریبہ نے جگنو اور لیف بروجر کی خرافات چھوڑ کر...... انہیں جان پال اور مہاراجا چندر گپتا کے درمیان ہونے والی اہم میٹنگ اور گفتگو مع ان کے آئندہ کے خونیں جنگی عزائم کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔

علی ریحان اور شاہ زمان بڑے غور اور توجہ سے اس کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اریبہ اپنی بات ختم کر چکی تو دونوں کافی دیر تک غور و خوض کرتے رہے۔

"ہمیں جان پال کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتار کر راج محل سے کوچ کر جانا چاہیے۔" بالآخر علی ریحان نے کہا تو شاہ زمان پُر غور انداز میں بولا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اب ایک آدمی کے مرنے سے وہ سارا خون خرابا ختم نہیں ہو سکتا جس کا منصوبہ عملی بنیادوں پر کیا جا چکا ہے۔" شاہ زمان یہ کہہ کر خاموش ہوا۔ اس کی پُرسوچ نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ علی ریحان کے بشرے پر الجھن مگر اریبہ کے چہرے سے فکر و فہم کے تاثرات ہویدا تھے۔ وہ شاید شاہ زمان کی بات پر انہی خطوط پر سوچ

رہی تھی جو بدلتے ہوئے موجودہ حالات کے تقاضوں کے عین مطابق تھے جبکہ علی کے پیشِ نظر کچھ اور تھا۔ وہ فردِ واحد کو وجۂ نزاع سمجھے ہوئے تھا مگر شاہ زمان اس میٹنگ کا احوال، بالتفصیل، اریبہ کی زبانی سننے کے بعد اپنی زیرک دماغی اور زود فہمی سے اس کی غایت درجے کی مقصدیت کو سمجھ رہا تھا۔ علی ریحان بھی اس کی باتوں کو فوقیت دیا کرتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اس کی بات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی ریحان کو بدستور اپنی جانب دیکھتا پا کر شاہ زمان پُرخیال لہجے میں آگے بولا۔

''جان پال کو جہنم داصل کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن اسے ہلاک کرنے سے...... ان کے جنگی منصوبوں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ الٹا ہمیں فرار کی راہ لینی پڑ جائے گی اور ہم ایک بڑے کاز کو پورا کرنے سے محروم ہو جائیں گے۔ تو کیوں نہ اس موقعے سے فائدہ اٹھایا جائے۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی ٹھوس بنیادوں پر مبنی کوئی منصوبہ ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''ہاں! میں اسی پر بات کرنا چاہتا ہوں۔'' زمان نے اثبات میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' علی دھیرے سے بولا۔

''یہ فرنگی اپنے وسیع تر جنگی منصوبے اور برصغیر میں اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے...... شمالی علاقوں کی آزاد ریاستوں کو بھی اپنے غلبے میں لانے کے لیے بڑی گہری اور گھناؤنی چال چل رہے ہیں۔ لوگوں کو خونیں جنگ میں ڈال کر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ یہ چال باز فرنگی مہاراجا چندر گپتا کو اپنا اقتدار چار دانگ پھیلانے کا لالچ دے کر اس کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتے ہیں۔ بعد میں چالا کی اور دباؤ سے اسے اپنا مطیع بنالیں گے۔ یوں فرنگی جن کی نگاہوں میں برصغیر کا یہ علاقہ ابتدا سے ہی باغیوں کی خفیہ کمین گاہوں کی حیثیت سے کھٹکتا آیا ہے، اسے اپنے اثر میں لے آئیں گے۔ اس طرح حریت پسندوں کی آخری دم توڑتی طاقت کو بھی کچلنے کا ان فرنگیوں کا ناپاک ارادہ کامیاب رہے گا۔ لہٰذا اس میٹنگ کی کارروائی کو مدنظر رکھ کر سوچا جائے تو...... ہمارا مشن پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل اور حساس ہو گیا ہے۔ اب میں ان نئے تقاضوں کے تحت ایک لائحہ عمل پیش کروں گا۔'' شاہ زمان نے لحہ بھر کو توقف کیا۔

اریبہ اور علی ریحان بڑے غور سے اس کی باتیں سن اور سمجھ رہے تھے۔ شاہ زمان نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''یہ خدا کا خاص کرم ہے کہ ہمیں دشمنوں کے گڑھ میں ایک ایسا ٹھکانا میسر آ گیا ہے جہاں رہتے ہوئے ہم...... بہ آسانی دشمنوں کی کھٹیا کھڑی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ایک کام کرنا ہوگا۔ ہم میں سے کسی ایک کو کسی بہانے راج محل سے نکل کر تریپال پہنچنا ہوگا اور وہاں کے مسلم نواب شہباز خان سے مل کے فرنگیوں کی اس سازش اور ناپاک منصوبے کے بارے میں بتانا ہوگا۔''

''اور ریاست پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ...... انہیں کیسے اعتماد میں لیا جائے؟'' علی ریحان بولا۔

''اسے نواب شہباز خان اعتماد میں لینے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ پالن پور ریاست ان کی حلیف ریاست ہے۔'' شاہ زمان بولا۔

''ٹھیک ہے پھر یہ کام میں کروں گا۔'' علی ریحان نے فوراً کہا۔ شاہ زمان نے ضد کی کہ اسے یہ کام کرنے دیا جائے، مگر ریحان نہیں مانا۔ اس کا کہنا تھا کہ شاہ زمان اور اریبہ کا ابھی یہاں راج محل میں رہنا ضروری تھا۔ کیونکہ ساری منصوبہ بندیوں کی جڑیں یہیں راج محل سے ہی شروع ہوتی تھیں۔ یوں بھی اب راج محل سے کوچ کرنا کسی صورت میں مناسب نہ تھا۔

راج محل...... ریاستی فرماں رواؤں کے ایک اہم ٹھکانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں جگہ بنالینا کوئی عام یا معمولی بات نہیں تھی اور اگر علی ریحان شاہ زمان اور اریبہ نے یہاں اپنی حیثیت اور جگہ بنائی تھی تو یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تو تھا ہی مگر ایک طرح سے یہی جگہ ان کے لیے مقتل گاہ بھی ہو سکتی تھی۔ موجودہ حالات میں یہ جگہ جس قدر اہم ہو گئی تھی اسی قدر سنگین بھی۔ تاہم اپنی فہم و فراست کے بل بوتے پر انہوں نے اس اہم ٹھکانے میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ یوں کہ ان تینوں پر کہیں آنے جانے کی کوئی پابندی بھی نہ تھی۔

چنانچہ علی ریحان نے بغیر وقت ضائع کیے آج ہی نکل جانے کا قصد کر لیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ لہٰذا وہ اریبہ اور زمان کو خدا حافظ کہہ کر سہ پہر میں راج محل سے کوچ کر گیا۔

انسان جتنا بھی احتیاط کرے کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی اس سے کوئی غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ اس میں حد سے زیادہ خود اعتمادی، جلد سے جلد مشن مکمل کرنے کا عزم اور اچانک بڑی کامیابی ملنے کا جوش بھی شامل ہوتا ہے۔ علی ریحان اور اریبہ تو کیا شاہ زمان جیسا زیرک دماغ اور زود فہم شخص بھی یہاں مار کھا گیا تھا۔ ان سے ایک بڑی فاش غلطی ہو گئی تھی جو ان کے خواب و خیال میں نہ آسکی تھی مگر اس کی بڑی کڑی سزا اریبہ کو بھگتنا پڑی۔

☆☆☆

یہ لوگ منہ لٹکائے راج محل واپس لوٹ آئے تھے۔ رینا کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔ اس میں شوکت کی سمجھداری کا دخل بھی تھا اور خود رینا کی اپنی اولوالعزم فطرت کا بھی۔ شوکت نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کریم بخش کے ناصحانہ الفاظ رینا کے سامنے دہرائے تھے جو وہ اکثر اپنے جوان بیٹے شوکت حسین سے کیا کرتا تھا کہ جو انسان حق اور سچائی کے راستے پر ہوتا ہے، اس پر صرف آزمائشیں ہی نہیں مصیبتیں بھی آتی ہیں۔ کامیاب وہی ہوتے ہیں جو ان آلام کا جواں مردی اور بلند ہمتی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ رینا کو شوکت کے ان الفاظ سے بڑی تسلی ملی تھی لیکن رینا نے اس وقت واقعی بڑا حوصلہ پکڑا تھا جب شوکت نے اس سے یہ کہا تھا۔

''رینا! تم اب ہرگز بھی اس طرح حوصلہ مت ہارنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، ایک سچے وعدے کی طرح......''

راج محل میں آتے ہی انہوں نے اسی گوشۂ خاص کا رخ کیا تھا جہاں ان کے رہنے کا شاہانہ بندوبست کیا گیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا...... یہاں دو کمرے ملحقہ تھے۔ ایک میں رینا اور گارشیا تھے جبکہ دوسرے میں شوکت اور رابرٹ سکونت پذیر تھے۔ جبکہ امجد خان، نندو بابا اور شانتا مہمان گاہ میں تھے۔ جدھر علی، اریبہ اور شاہ زمان رہائش پذیر تھے......

رابرٹ ان کے ساتھ یہ دغابازی کر کے بھی بڑے ڈھیٹ پن کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ گارشیا کو اپنے بھائی پر سخت طیش چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اس کے کمرے میں جا کے بھائی کو سخت کھری کھری سنانے کے لیے رخ کرنا چاہا تھا مگر رینا اور شوکت نے اسے روک لیا تھا۔ رابرٹ بھی اپنے رقیبانہ جذبات کا خوب اظہار کر رہا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑی ڈھٹائی اور کمینے پن سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے جاتا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اب واپس دلی لوٹ جانا چاہیے۔ یہ بہاری لوگ ہماری بھی جان کے دشمن بن گئے ہیں۔'' گارشیا نے ان سے کہا۔ شوکت بھی ان دونوں کے ساتھ وہیں بیٹھا تھا۔ اس کا اپنے کمرے میں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے میں جبکہ رابرٹ جیسا گھٹیا انسان بھی وہاں موجود ہو، وہ کیسے وہاں کا رخ کر سکتا تھا۔ رابرٹ تو ان کے سینوں پر مونگ دلنے کے لیے جان بوجھ کر اپنا آپ ان کے سامنے رکھتا تھا۔ وہ ایسا اتفاقاً کرتا تھا۔

گارشیا کی اس بات پر رینا بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''گارشیا سسٹر! تم اگر جانا چاہو تو جا سکتی ہو واپس، بلکہ تمہاری بہ حفاظت واپسی کا بندوبست میں کر دوں گی۔ سوچ رہی ہوں نندو بابا اور شانتا کو بھی واپس بھیج دوں۔ امجد خان کو بھی۔ میرا خیال ہے کہ پاپا کے مرنے کے بعد اب ان بے چاروں کا کیا کام رہ گیا ہے؟ یہ کیوں ہمارے ساتھ خوار ہوتے پھریں۔''

''نہیں، میں تم دونوں کو چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی۔'' گارشیا نے یہ کہتے ہوئے ایک نگاہ قریب بیٹھے شوکت پر ڈالی اور رینا کی طرف دیکھ کر مزید بولی۔ ''میں تو تمہاری خاطر یہ مشورہ دے رہی تھی کہ...... تم دونوں کی جانوں کو یہاں بہت خطرہ ہے۔ بہاریوں کا ٹولہ اور خاص طور پر بدری ناتھ تم لوگوں کا پکا جانی دشمن بن چکا ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس سازش کے بعد چپکا نہیں بیٹھے گا۔ وہ ایک خونی انسان ہے اور اب یہ مقدمہ جیتنے کے بعد اس کا اثر رسوخ اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔''

رینا سے قطع نظر شوکت کو گارشیا کی بات سے پورا اتفاق تھا مگر رینا کی وجہ سے اس نے گارشیا کی بات سے اتفاق کرنے کا اظہار نہیں کیا تھا اور چپ رہا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ رینا دھن کی پکی تھی۔ وہ ایک تو اپنے باپ کے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اور اس کے قاتل بہاری بدری ناتھ کو تو بالکل بھی نہیں۔ جبکہ شوکت، رینا کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ تو اس کا دیوانہ اور اس کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ رینا بھی اس سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی اور اس ''دوطرفہ'' اظہار کے بعد تو...... شوکی کو اپنی منزل بے حد قریب نظر آنے لگی تھی، تقدیر آگے کیا گل کھلانے والی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

''شوکی! تم کیوں خاموش ہو؟'' اچانک گارشیا نے اسے ٹہوکا دیا۔ ''تم کیوں نہیں سمجھاتے رینا کو کہ وہ یہ ضد چھوڑ دے اور واپس دلی لوٹ چلے۔''

شوکی اس کی بات سن کر بے تاثر انداز میں مسکرایا اور پھر ایک نظر رینا کے افسردہ سے چہرے پر ڈال کر بولا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں تو خود ایک ملازم ہوں۔''

''تم ملازم نہیں ہو اور رینا کے لیے کیا ہو یہ میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ رینا کو سمجھاؤ شوکی! ایسا نہ ہو کہ تمہاری اس کے ساتھ دلجوئی رینا کے لیے کسی مصیبت کا پیش خیمہ بن جائے۔'' شوکی ہی نہیں، رینا بھی گارشیا کی اس بات پر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ تب ہی رینا نے اس سے کہا۔

''گارشیا! پلیز، تم نے واپس جانا ہے تو چلی جاؤ۔ میں کل ہی تم سب کی واپسی کا، جو بھی جانا چاہے، بندوبست کرائے دیتی ہوں۔''

''اور تم دونوں یہاں کیا کرو گے؟ کب تک یہاں رہ پاؤ گے؟ مجھے نہیں لگتا کہ مقدمہ ہارنے کے بعد تمہارے اب یہاں رہنے کی کوئی جگہ بھی بچے گی۔ کیا جنگلوں کی خاک چھانتے رہو گے؟ میرا بھائی رابرٹ کینہ پرور آدمی ہے۔ وہ شوکی اور تمہارے بیچ کے تعلقات کو جان چکا ہے۔ جھوٹی گواہی اس دشمنی کا شاخسانہ ہے۔'' گارشیا بولی۔

''رابرٹ کو بھی میں نہیں روکتی۔ بے شک چلا جائے وہ بھی۔'' رینا بولی۔

''وہ نہیں جائے گا۔ وہ ایک بھونرا ہے۔ میں اس کی بہن ہوں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ ضدی ہے بلا کا۔ اس نے تم دونوں کو اپنی ضد بنا لیا ہے۔ ہر راہ پر تم دونوں کا راستہ کھوٹا کرنے کا اس نے اٹل عزم کر رکھا ہے۔''

''گارشیا!'' شوکی نے مداخلت کی۔ اس نے دیکھا تھا کہ گارشیا کی باتوں سے رینا کا بوجھل پن سوا ہونے لگا تھا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ...... کیا انکل کے مشن کو ادھورا چھوڑ دیں؟ اور ان کے قاتلوں کو بھی؟ رینا، انکل ہنری کی بیٹی ہیں۔ ایک بیٹی کے اپنے باپ کے لیے جذبات کا تمہیں اندازہ ... کر لینا چاہیے۔ ہمیں ان حالات میں مس رینا کا ساتھ دینا ہوگا۔'' شوکت خود بھی چاہتا تھا کہ یہ لوگ بھی ساتھ شامل رہیں، اگرچہ رینا کی طرح پروا اسے بھی نہیں تھی کہ کوئی ان کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ خود کو ہی رینا کے لیے کافی سمجھتا تھا لیکن وہ رینا کی خاطر چاہ رہا تھا کہ...... یہ سب لوگ اس کے ساتھ موجود رہیں۔ اس طرح رینا کا مورال بڑھتا۔ اس کا حوصلہ بلند ہوتا۔ کیا خبر ان کے چلے جانے سے...... وہ ڈھے جاتی۔

''میں کہیں نہیں جا رہی اور میرا نہیں خیال کہ نندو بابا، شاہنا اور امجد خان بھی واپس لوٹنا پسند کریں گے۔ مگر کیا تم دونوں یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح یہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟'' گارشیا بولی۔ درحقیقت وہ بھی نہیں لوٹنا چاہتی تھی اور اس کی وجہ شوکی ہی تھا۔ یہ سب جاننے کے باوصف کہ رینا اور شوکی کے درمیان کس قسم کے دلی جذبات پنپ چکے تھے۔ وہ ان دونوں کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی شاید...... کہ...... دیکھا تو جائے آگے ہوتا کیا ہے۔ فرضیکہ ہر کوئی کسی نہ کسی وجہ، کسی نہ کسی حوالے کے تحت رینا اور شوکی سے منسلک رہنا چاہتا تھا۔

''میرا خیال ہے تم دونوں کو آرام کر لینا چاہیے۔ میں بھی اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شوکی کھڑا ہوا تو رینا فوراً اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''شوکی! رابرٹ کے منہ بالکل مت لگنا۔ اس کے عزائم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔''

''ہوں......'' شوکی کے منہ سے کوگو انداز میں برآمد ہوا اور پھر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی طبیعت اس بات پر مکدر سی ہو رہی تھی کہ اسے رابرٹ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا پڑ رہا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو چونک گیا۔ رابرٹ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ رابرٹ نے یہاں آتے ہی اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔

''یہ کدھر چلا گیا؟'' بے اختیار شوکی کے منہ سے خود کلامیہ سی بڑبڑاہٹ نکلی تھی۔

☆☆☆

لیف بروجر کافی دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھا اریبہ کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا رہا تھا۔ اریبہ کے جسم کا گدرایا ہوا لمس اس کے اندر مستیاں بکھیر رہا تھا۔ وہ جام لنڈھاتا رہا، اس کا انتظار کرتا رہا لیکن جب خاصی دیر ہو گئی تو وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

''اس دو کوڑی کی ڈومنی کی یہ مجال کہ مجھے چکمہ دے۔ میں ابھی اسے گھسیٹ کر یہاں لاتا ہوں۔'' وہ طیش کے مارے بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر دروازے کے پاس جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے سوچا یہ سب اچھا نہیں ہوگا۔ وہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی تھی۔ قابو میں آ جائے گی۔ اسے تھوڑا صبر سے کام لینا ہوگا۔ وقت اس کی مٹھی میں تھا۔ جلد بازی میں وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

سہ پہر کو کہیں جا کر اس کے دو سپاہیوں میں سے ایک نے اسے ایسی اطلاع دی کہ وہ بری طرح چونک گیا۔

اسے بتایا گیا کہ...... ان تینوں گوتوں میں سے ایک ساتھی سوشیل (علی ریحان) راج محل سے کہیں روانہ ہو چکا ہے۔

اس اطلاع پر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ جان پال اور مہاراجا کی اہم میٹنگ بھی آج ہی کے دن ہوئی تھی۔ اسی وقت میں اس نے اریبہ کو اس طرف منڈلاتے بھی دیکھا تھا۔ کڑی سے کڑی ملی تو اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچنے لگا۔

(جاری ہے)

شراکت دار

محمد یاسر اعوان

مغرب ہو یا مشرق ... روزگار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا سب کا حق ہے مگر ... حقدار کو حق سے محروم کرتے کرتے اسے مرحوم کر دیا جائے، یہ تو کہیں کا انصاف نہیں ہے ... لیکن وہ نادانی میں اس ناانصافی کا مرتکب ہو چکا تھا اور ساتھ ہی بے قصور دوست کو بھی اپنی تعفن زدہ دوستی کی چادر میں لپیٹ لیا ... گویا ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی ...''

ریاکار دوست اور ناتجربے کار مجرم کی خطاؤں کا قصہ



وہ دن میں خواب دیکھنے والا ایک سہل پسند شخص تھا۔ اس کی زندگی کا زیادہ حصہ یہ سوچتے ہوئے گزر رہا تھا کہ مفت کا مال کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جائے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ کبھی کبھی بے ایمانی اور چھوٹا موٹا فراڈ بھی کر لیتا تھا لیکن ڈرپوک ہونے کی وجہ سے کبھی اسے بڑا ہاتھ مارنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پورا نام گریگ جیسن تھا لیکن دفتر میں سب اسے جیسن کہتے تھے۔

ایک دن وہ اپنے خاص دوستوں ہیرس اور کیتھی کے ہمراہ ایک فرانسیسی ریسٹوران میں کافی پی رہا تھا۔ اس ریسٹوران کے ہر بوتھ میں کسی آرٹسٹ کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ان سب کے اوپر برائے فروخت کی چٹ لگی ہوئی تھی...... ریسٹوران کی انتظامیہ نے آرٹسٹ کی حوصلہ افزائی کے لیے ان تصویروں کو وہاں لگانے کی اجازت دے رکھی تھی...... وہ اس آرٹسٹ سے کوئی کمیشن وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ انہیں صرف اتنا فائدہ تھا کہ ان تصویروں کی وجہ سے ریسٹوران کی آرائش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب کوئی تصویر

فروخت ہوجاتی تو آرٹسٹ اس کی جگہ پر نئی تصویر آویزاں کردیتا تھا۔ باتوں باتوں میں جیسن نے کہا۔ ”آج میں ایک انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔“

ہیرس نے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم تو روز ہی ایک انکشاف کرتے ہو۔“

”جلدی سے بتاڈالو۔“ کیٹی نے کہا۔ ”ورنہ میرے پیٹ میں بل پڑنا شروع ہوجائے گا..... میں سسپنس کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتی۔“

جیسن ان کے مذاق سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ”میں عنقریب آرٹسٹ کی حیثیت سے مشہور ہونے والا ہوں۔“

کیٹی نے اپنی خوب صورت، سیاہ آنکھیں پھیلا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آرٹسٹ..... تمہارا مطلب ہے کہ تم پینٹنگز وغیرہ بنانے کا پروگرام بنارہے ہو؟“

”ایسا کرو، پہلے رنگوں کی پہچان کا کورس کرلو۔“ ہیرس نے کہا۔

”میں کام شروع کرچکا ہوں۔“ جیسن نے کہا پھر ریستوران کی دیواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب میری پینٹنگز لگی ہوئی ہیں ... میرے فن پارے۔“

”بہت خوب!“ ہیرس نے کہا۔ ”آرٹسٹ بننے کا اس سے آسان طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔“

کیٹی اپنی کرسی سے اٹھی اور اس کاروباری کارڈ کو دیکھنے لگی، جو پینٹنگ کے دائیں کونے میں پن سے لگا ہوا تھا۔

”اوہ..... کتنے افسوس کی بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ کسی ڈی ولسن نے اپنا کارڈ یہاں لگا رکھا ہے۔ نیچے فون نمبر بھی ہے۔ یہ شخص تمہاری محنت سے اپنا نام چمکانے کی فکر میں ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں.....“ گریگ جیسن نے کہا اور جیب سے پین نکال کر کارڈ پر اپنا فون نمبر لکھ دیا پھر ڈی ولسن کے فون نمبر پر قلم پھیرتے ہوئے بولا۔ ”یہ غلطی ٹھیک ہوگئی..... اب آرڈر براہ راست میرے پاس آئیں گے۔“

ہیرس اور کیٹی نے اس بات کو مذاق سمجھ کر نظرانداز کردیا لیکن جیسن کے سہل پسند ذہن نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچنا شروع کردیا تھا۔

چند روز بعد جب ہیرس اور کیٹی اس کے خستہ حال اپارٹمنٹ میں پہنچے تو اس کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا..... کمرے کی دیواروں کے ساتھ چند پینٹنگز رکھی تھیں اور وسط میں ایک ایزل ایستادہ تھا۔ جیسن کے کپڑوں پر جابجا پینٹ کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ایک برش اس کے کان میں اڑسا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا..... کیٹی نے آنکھیں جھپکائیں۔

”کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟“

جیسن مسکرایا۔ ”بعض حقیقتیں خواب سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ تمہیں یہ سن کر مزید حیرت ہوگی کہ مجھے آرڈر بھی ملنا شروع ہوگئے ہیں۔“

ہیرس دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تصویروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ تمہارے شاہکار ہیں؟“

”میرے ہی سمجھو۔“ جیسن نے کہا۔ ”ویسے آپس کی بات ہے۔ میں نے انہیں ایک مفلوک الحال آرٹسٹ سے خریدا ہے۔ یوں سمجھو کہ میری وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ہیرس نے حیران سے لہجے میں پوچھا۔

”آرٹسٹ میں سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ کاروباری نہیں ہوتا۔ اپنے فن کو بیچنے کا فن نہیں جانتا، سوائے چند ایک کے۔ یہ مفلوک الحال آرٹسٹ ایک تنگ و تاریک اپارٹمنٹ میں رہتا ہے اور پینٹنگز بنا کر انہیں جمع کرتا رہتا ہے۔ تین روز پہلے جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ تین دن سے بھوکا تھا اور صرف سیاہ کافی پر گزارہ کررہا تھا۔“ گریگ جیسن بتارہا تھا۔ ”اگر اس کا اپارٹمنٹ دوسری منزل کے بجائے ساتویں یا آٹھویں منزل پر ہوتا تو وہ اب تک خودکشی کرچکا ہوتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوسری منزل سے چھلانگ لگانے پر ہاتھ پیر تو ٹوٹ سکتے ہیں پر موت واقع نہیں ہوسکتی اور نقاہت کی وجہ سے ساتویں یا آٹھویں منزل پر جانا اس کے لیے محال تھا۔ بہرحال میں نے اسے اتنی رقم دے دی ہے کہ وہ بقائے زندگی کا سامان کرسکتا ہے۔“

”لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“ ہیرس نے پوچھا۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں ایک پینٹنگ فروخت بھی کرچکا ہوں۔“ جیسن نے جواب دیا۔ ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے فرانسیسی ریستوران میں آویزاں پینٹنگز پر اپنا فون نمبر لکھ دیا تھا۔ اس کے دو روز بعد ہی ایک خاتون نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اس نے فرانسیسی ریستوران میں میری پینٹنگز دیکھی ہیں اور وہ میرا کوئی تازہ ترین فن پارہ خریدنا چاہتی ہے..... پہلے میں سمجھا کہ وہ تم ہو۔“ اس نے کیٹی کی طرف دیکھا۔ ”اور آواز بدل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہی ہو لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے ریستوران والی پینٹنگز پر اپنا فون نمبر لکھا تھا۔ میں نے خاتون کو دو روز بعد کا وقت دیا اور بھاگ دوڑ کرکے اس غریب آرٹسٹ سے چند تصویریں خریدلیں۔“

”کیا تم یہ بتانے کی کوشش کررہے ہو کہ وہ خاتون تمہارے پاس آئی اور تمہیں ڈی ولسن سمجھ کر پینٹنگ خرید کر

لے گئی؟“ کیٹی نے کہا۔

”یہی حقیقت ہے۔“ جیسن خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور معلوم ہے، میں نے وہ پینٹنگ کتنے میں فروخت کی ہے؟ خاتون خاصی مالدار تھی۔ اس نے ایک پینٹنگ کی جو قیمت ادا کی ہے وہ ان تمام پینٹنگز کی مجموعی قیمت سے زیادہ ہے۔“

”جیسن! تم پاگل ہوگئے ہو۔“ کیٹی نے کہا۔ ”یہ سراسر دھوکا ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”دھوکا کیسے ہوا؟ میں نے چیز دکھا کر فروخت کی ہے۔ اس میں دھوکے کی کیا بات ہے؟“ گریگ جیسن نے جواب دیا۔

”دھوکا یہ ہے کہ تم ڈی ولسن کا نام استعمال کررہے ہو اور جعلی آرٹسٹ بنے ہوئے ہو۔“ کیٹی نے کہا تو جیسن نے جوش دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی ایک فن ہے اور میں اس فن کو فروغ دینے کا تہیہ کرچکا ہوں۔ آج کل دنیا میں ایسے ہی طریقے کامیابی کی بنیاد ہیں۔ جو طریقے نہیں جانتا وہ ساتویں منزل سے چھلانگ لگانے کی باتیں سوچتا ہے۔ بیٹھو! آج میں تمہیں پہلی کامیابی کی خوشی میں کافی پلاتا ہوں۔“

کافی کے دوران تینوں زیادہ تر تصویروں کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے پھر کیٹی رخصت ہوگئی اور ہیرس، گریگ جیسن کے ”فن“ میں حصے دار بننے کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔

”ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ آج ایک گاہک آنے والا ہے۔ اس نے کل فون کیا تھا۔“ گریگ نے بتایا۔

ہیرس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”واقعی؟“

”یہ صرف ایک فون نمبر کا کمال ہے۔“ جیسن نے کہا۔

”اگر ہم اس کام کو وسیع پیمانے پر شروع کردیں تو بہت فائدہ ہوگا۔“ ہیرس نے کہا۔ اس نے خود کو اس کا پارٹنر سمجھنا شروع کردیا تھا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ شہر کے دس بیس ریستورانوں میں اس مفلوک الحال آرٹسٹ کی پینٹنگز آویزاں کردیتے ہیں اور خوب صورت کاروباری کارڈ چھپوا کر ہر پینٹنگ کے کونے پر لگادیتے ہیں۔“

”اسکیم تو اچھی ہے مگر اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہوگی۔“ جیسن بولا۔

”فی الحال تھوڑی رقم سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ہیرس نے کہا۔ ”کچھ رقم میں ڈال دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چند مہینوں کے اندر ہم ایک آرٹ گیلری کے مالک بن جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ اس مفلوک الحال آرٹسٹ کو کچھ اور رقم دے دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ ساتویں منزل سے چھلانگ لگادے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔“

”تم ان فنکاروں کی ذہنیت نہیں سمجھتے۔“ جیسن نے کہا۔ ”یہ تھوڑے سے بھوکے رہیں تو کام اچھا کرتے ہیں اور مرہون منت بھی رہتے ہیں۔ اگر ان کی جیب میں زیادہ پیسا آجائے تو انہیں ہرا ہرا سوجھنے لگتا ہے۔“

”پھر بھی اسے مرنا نہیں چاہیے۔“ ہیرس نے کہا۔

”تم خوا مخواہ پریشان ہورہے ہو۔ یہ شہر ایسے فنکاروں کے حوالے سے خاصا زرخیز ہے۔ ہر کھنڈر میں تمہیں ایک فنکار مل جائے گا۔ دو چار آرٹسٹوں کے مرنے سے آرٹ گیلریاں بند نہیں ہوسکتیں..... تلاش کرنے کا فن آنا چاہیے..... بلکہ ایک اور راز کی بات سنو، جب آرٹسٹ مرحوم ہوجاتا ہے تو اس کے فن کی قیمت ایک دم آسمان کی طرف پرواز کرجاتی ہے۔“

اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”آگیا۔“ گریگ نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایک پستہ قد اور دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ اس نے تنکوں کا ہیٹ اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس جسم نے کسی زمانے میں اچھے دن دیکھے تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے جیسن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مسٹر، ڈی ولسن؟“

”جی میں ہوں۔“ گریگ جیسن نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”اندر آجاؤ، غالباً تم کوئی پینٹنگ خریدنا چاہتے ہو۔“

”میں نے فرانسیسی ریستوران میں تمہاری تصاویر دیکھی ہیں۔“ نو وارد نے کہا۔ ”کیا وہ سب کی سب برائے فروخت ہیں؟“

”وہ بھی اور یہ سب بھی۔“ گریگ جیسن نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تصاویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا نیا شاہکار ہے۔ اس میں ایک قدیم گرجے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔“ نو وارد نے مذکورہ پینٹنگ اٹھائی اور کھڑکی کے قریب جاکر اس کا جائزہ لینے لگا۔ غالباً وہ اطمینان سے فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

”کیا تم اس شہر میں نئے ہو؟“ ہیرس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ملاقاتی نے تصویر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ”مجھے یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہوچکا ہے۔“ اس نے پینٹنگ واپس رکھ دی اور کہا۔ ”یہ اس اسٹائل کی پینٹنگ نہیں

ہے جو ریستوران میں لگی ہوئی ہیں۔‘‘
جیسن نے اندازہ لگایا کہ نو وارد آرٹ کی شناخت میں ماہر تھا۔ لہٰذا اس سے محتاط انداز میں بات کرنا ضروری تھا۔ اس نے کہا۔ ’’میں ہمیشہ مختلف اسٹائل استعمال کرتا ہوں۔ اس سے انسان یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا۔‘‘
ملاقاتی نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ ’’میں اپنی معلومات کے لیے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ ریستوران میں تمہاری جو تصویریں لگی ہوئی ہیں، ان میں تم نے کون سا میٹریل استعمال کیا ہے؟‘‘
جیسن نے آنکھیں جھپکائیں۔ ’’کیا مطلب؟‘‘
’’کیا وہ آئل پینٹنگز ہیں یا واٹر کلر؟ ان میں سے تم نے کون سی چیز استعمال کی ہے؟‘‘ نو وارد نے پوچھا۔
’’آں ہاں..... مختلف قسم کی چیزیں ..... زیادہ تر آئل پینٹنگز ہیں۔‘‘ ہیرس، گریگ جیسن کی مدد کرتے ہوئے بولا۔ ’’دراصل یہ ایک قسم کا سیکرٹ بزنس ہے۔ کوئی آرٹسٹ، میٹریل اور کلر اسکیم کے بارے میں بتانا پسند نہیں کرتا۔‘‘
ملاقاتی نے دھیرے سے کہا۔ ’’حیرت انگیز!‘‘
’’تصویریں؟‘‘
’’مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم خود کو آرٹسٹ ظاہر کر رہے ہو حالانکہ تم آرٹ کی اے بی سی بھی نہیں جانتے۔‘‘ ملاقاتی نے کہا۔
جیسن کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آ کر چلا گیا۔ ’’میں تمہیں تصویر خریدنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ تم بخوشی واپس جاسکتے ہو۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔‘‘
’’تم خاصے مضبوط اعصاب کے مالک معلوم ہوتے ہو۔‘‘ ملاقاتی نے کہا۔ ’’ایک آرٹسٹ برسوں کی محنت کے بعد اپنے نام اور کام کو منظرِ عام پر لانے کے قابل ہوتا ہے اور تم......‘‘ اس نے انگلی سے جیسن کی طرف اشارہ کیا۔ ’’قزاق بن کر راتوں رات اس کی محنت سے دولت مند بننا چاہتے ہو۔ تف ہے تمہاری شکل پر۔‘‘
جیسن نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ اس نے سوچا کہ اس کام میں وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ لہٰذا تحمل سے کام لینا ضروری تھا۔ ’’میں دراصل ایک آرٹسٹ کا ایجنٹ ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں آرٹ کی باریکیاں نہیں جانتا۔ صرف تصویریں فروخت کرتا ہوں اور اپنا کمیشن وصول کرتا ہوں۔‘‘
’’خوب! تم ڈی ولسن کے ایجنٹ ہو؟ یہ نئی کہانی غالباً ابھی ابھی تمہارے ذہن میں آئی ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اتفاق سے میں ڈی ولسن کو جانتا ہوں۔ اس کا کوئی ایجنٹ نہیں ہے۔‘‘
گریگ جیسن کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے ملاقاتی کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ ’’نکل جاؤ یہاں سے..... تمہارے ساتھ لین دین نہیں ہوسکتا۔‘‘
ملاقاتی اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولا۔ ’’تم دونوں بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہو۔ غالباً تم نے ڈی ولسن کو نہیں دیکھا۔ وہ خاصا کیم شحیم آدمی ہے اور اگر غصے میں آجائے تو بالکل وحشی بن جاتا ہے۔ جب میں اسے بتاؤں گا کہ تم کس طرح اس کی شہرت سے فائدہ اٹھا رہے ہو تو وہ یہاں آ کر ہر چیز کو تہس نہس کر دے گا۔ ہوسکتا ہے تم دونوں کو اسپتال جانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔‘‘
جیسن غصے سے کھولنے لگا۔ اس نے دوبارہ ملاقاتی کا بازو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم ابھی جاؤ اور اس لکڑہارے کو ہمارے بارے میں بتادو۔ ہیرس! ادھر آؤ ذرا میری مدد کرو۔ میں اس کمینے شخص کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔‘‘
’’میرا خیال ہے کہ اب یہ خود بھی یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرے گا۔‘‘ ہیرس نے کہا۔
’’نہیں، میں اسے دھکے دے کر نکالنا چاہتا ہوں۔‘‘ جیسن نے کہا۔ ’’ادھر سے اس کا بازو پکڑو۔‘‘
بعض اوقات شکست اور ندامت کا احساس انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جیسن اپنے ملاقاتی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے پرے دھکیل رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہیرس بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ انہوں نے دونوں طرف سے اس کے بازو پکڑ لیے اور اسے کھینچتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف لے آئے۔ ملاقاتی ان کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر انہوں نے اسے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا...... ملاقاتی چونکہ مسلسل ہاتھ پیر چلا رہا تھا اس لیے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ ان سیڑھیوں کے کناروں پر لوہے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ملاقاتی، ہالی وڈ کے کسی اسٹنٹ مین کی طرح لڑھکتا ہوا گیا تھا۔ اس کا تنکوں والا ہیٹ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ گریگ نے ہیٹ کو ٹھوکر مار کر نیچے پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ ’’دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرنا۔‘‘
ہیٹ ملاقاتی کے اوپر جا کر گرا۔ اس وقت شام ہوچکی تھی اور سیڑھیوں پر ہلکی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہیرس اور

جیسن چند لمحوں تک اوپر کھڑے ملاقاتی کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہا۔ ’’شاید بے ہوش ہوگیا ہے۔‘‘ ہیرس نے کہا۔
’’مکر کر رہا ہے۔‘‘ جیسن نے کہا پھر نیچے کی طرف آواز لگائی۔ ’’اے مسٹر! یہاں ڈراما نہیں کرو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔‘‘
’’نیچے جا کر دیکھنا چاہیے۔‘‘ ہیرس نے فکرمندی سے کہا۔ ’’معلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی مہلک چوٹ آگئی ہے۔‘‘
گریگ جیسن بھی پریشان نظر آنے لگا۔ دونوں جلدی سے نیچے پہنچے اور ملاقاتی کو سیدھا کر کے اس کا معائنہ کرنے لگے۔ جیسن نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، نبض دیکھی، پلکوں کو ہٹا کر دیکھا پھر بولا۔ ’’لگتا ہے اسے کچھ ہوگیا ہے۔‘‘
ہیرس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔ ’’اسے جلدی سے اوپر لے چلو۔ ایسا نہ ہو کوئی آجائے۔ پتا نہیں یہ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔‘‘
انہوں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا اور اس کے بازوؤں کو اپنے کندھوں پر ڈال کر اوپر پہنچ گئے۔ ’’شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔‘‘ جیسن نے کہا اور بے حرکت ملاقاتی کا معائنہ کرنے لگا۔
ہیرس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور احتیاط کے ساتھ ملاقاتی کا معائنہ کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور پریشانی سے بولا۔ ’’یہ مر چکا ہے۔‘‘ جیسن کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔
’’ذرا اچھی طرح دیکھو۔‘‘ وہ بولا۔
’’تم خود دیکھ لو۔‘‘ ہیرس نے کہا۔ ’’اس میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی۔‘‘
’’شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔‘‘ جیسن نے دوبارہ کہا۔ ’’اس کم بخت کو یہیں آ کر مرنا تھا۔‘‘
’’یہ قتل کا کیس ہے، جیسن! ہمیں عمر قید بھی ہوسکتی ہے۔‘‘ ہیرس بولا۔
’’لیکن ہم پولیس کو پتا نہیں چلنے دیں گے۔‘‘ گریگ نے کہا۔
’’کیا تم لاش کو ٹھکانے لگانے کی بات کر رہے ہو؟‘‘ ہیرس نے پوچھا۔
’’ظاہر ہے، ہم اسے اپنے اپارٹمنٹ میں تو نہیں رکھ سکتے۔‘‘ جیسن نے جواب دیا۔
’’لیکن کیسے؟‘‘ ہیرس نے پوچھا۔ ’’لاش کو کیسے ٹھکانے لگاؤ گے؟ میرا تو خیال ہے کہ پولیس کو اطلاع ..... کر دینی چاہیے...... ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سیڑھیوں سے پیر پھسل گیا تھا۔‘‘
’’نہیں نہیں، ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔‘‘ گریگ نے کہا۔ ’’پولیس ہزار سوال کرے گی۔ ان کے لیے معاملے کی تہ تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ذرا تاریکی ہوجانے دو پھر ہم اسے یونیورسٹی کیمپس میں پھینک آئیں گے۔ صبح جب لاش دریافت ہوگی تو پولیس یہی سمجھے گی کہ کسی اچکے نے اسے لوٹنے کے لیے قتل کر دیا ہے۔‘‘
’’کیٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔‘‘ ہیرس بڑبڑایا۔ ’’تم واقعی پاگل ہوگئے ہو۔ تم نے آرٹسٹ بننے کے چکر میں ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔‘‘
’’اس احمق نے ہمیں آرٹ کے اسرار و رموز سمجھانے شروع کر دیے تھے۔‘‘ جیسن نے کہا۔ ’’بلکہ دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں۔‘‘
’’یہ اس کا نہیں تمہارا قصور ہے۔ تمہیں آرٹسٹ بننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔‘‘
’’اس کی موت میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔‘‘ جیسن نے کہا۔ ’’ہم اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے اور ڈیئر یہ مت بھولو کہ اصل دھکا تمہاری طرف سے دیا گیا تھا۔ میں نے تو اسے ایسے ہی چھوڑ دیا تھا۔‘‘
ہیرس کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان میں جھگڑا ہوگیا تو پھر دونوں کی خیر نہیں۔ ’’تم ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ اس نے مزید کہا۔ ’’اصل قصور میرا ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟ ذرا سی غلطی ہمیں بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔‘‘
گریگ جیسن چونک کر بولا۔ ’’حیرت ہے، ہمیں ابھی تک یہ بھی نہیں پتا کہ یہ ہے کون؟ اس کی جیبیں تو دیکھو شاید کوئی دولت ہی ہاتھ آجائے۔‘‘
اس کی جیبوں سے ایک بٹوا، چابیوں کا گچھا اور تھوڑی سی ریزگاری برآمد ہوئی۔ ہیرس نے بٹوا کھول کر دیکھا۔ اس میں سے صرف پچاس ڈالر نکلے۔ اس کے علاوہ بٹوے میں کریڈٹ کارڈ، ملاقاتی کارڈز اور ایک شناختی کارڈ تھا۔ جب ہیرس نے شناختی کارڈ دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ’’جانتے ہو یہ کون ہے؟‘‘ اس نے کہا۔ ’’یہ بذاتِ خود ڈی ولسن ہے۔‘‘

”اوہ میرے خدا! اس احمق کو چاہیے تھا کہ آتے ہی اپنا تعارف کرادیتا۔“ گریگ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”تمہارے کام کی بنیاد ہی غلط تھی۔“ ہیرس بولا۔

”تمہیں کم از کم یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ یہ شخص ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور اپنی پینٹنگز چیک کرتا ہوگا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم اس کی برسوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔ اس کی پینٹنگ پر اپنا فون نمبر لکھنا سب سے بڑی غلطی تھی۔“

”زیادہ فلاسفر نہ بنو۔“ جیسن نے کہا۔ ”اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ ایسا کرو یہ ڈالرز مجھے دو اور بٹوا اس کی جیب میں ڈال دو۔ کیمپس میں جاکر یہ بٹوا اس کی لاش کے پاس پھینک دیں گے۔“

ہیرس نے نوٹ گریگ جیسن کو دیے اور بٹوا متوفی کی جیب میں ڈال دیا۔

”ایک منٹ۔“ جیسن نے کہا۔ ”بٹوا نکالو ذرا۔“

”کیا ہوا؟“ ہیرس نے بٹوا نکالتے ہوئے پوچھا۔

”احمق! بٹوے پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کردو۔“ گریگ جیسن نے کہا تو ہیرس نے حیرت اور خوف سے آنکھیں پھیلائیں۔

”واقعی! یہ تو بڑی خطرناک غلطی ہونے لگی تھی۔“ اس نے بٹوا نکال کر اسے اپنے رومال سے اچھی طرح صاف کیا اور واپس لاش کی جیب میں ڈال دیا۔ ”ہمیں ہر کام بڑی باریکی اور سوچ کر کرنا ہوگا۔ مثلاً یہ چابیاں کس چیز کی ہیں؟ اوہ..... یہ تو کار کی چابیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کار نیچے کھڑی ہے۔“

”یہ کار ہمارے لیے بڑی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔“ جیسن نے کہا۔ ”لاش کار میں ڈال کر لے جائیں گے۔ تم ایسا کرو کہ مارکیٹ جاؤ اور دو جوڑی دستانے خرید لاؤ۔ اب ہم کسی چیز کو دستانوں کے بغیر ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ان چابیوں کو بھی رومال سے صاف کردو۔“

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیرس نے گلی میں جاکر آس پاس کا جائزہ لیا۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ ڈی ولسن کی کار کو دروازے کے قریب لے آیا اور انجن بند کرکے اوپر پہنچ گیا۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔

”گلی بالکل سنسان پڑی ہے۔“ ہیرس نے سرگوشی میں گریگ جیسن کو بتایا۔ ”آس پاس کوئی نہیں ہے۔ گاڑی کو میں دروازے کے بالکل سامنے لے آیا ہوں.....“

دونوں نے ڈی ولسن کی لاش کو سیدھا کھڑا کردیا۔ اس کے بازو اپنے کندھوں پر ڈالے اور اس طرح نیچے لے جانے لگے جیسے کسی بیمار آدمی کو لے جایا جاتا ہے۔ دونوں نے دستانے پہن رکھے تھے اور اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی پولیس کا آدمی ادھر نہ آنکلے۔ انہوں نے لاش کو پچھلی سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ لاش اکڑ چکی تھی..... مجبوراً اسے سیٹ پر لٹانا پڑا۔ ہیرس لاش کے ساتھ پچھلی سیٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور گریگ جیسن نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

چند منٹوں کے اندر وہ کیمپس کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ نیم تاریک کیمپس سنسان پڑا تھا۔ گریگ نے بتیاں بجھادیں اور انجن آف کردیا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں آگے جاکر ایک نظر اندر ڈال لینی چاہیے۔“ گریگ بولا۔

”اس وقت کیمپس میں کون ہوگا؟“ ہیرس نے جواب دیا۔ ”ہمیں جلد از جلد اس بوجھ سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ آؤ میری مدد کرو۔“

”جلدی نہیں کرو ہیرس! ذرا سی غلطی ساری زندگی کے پچھتاوے کا باعث بن سکتی ہے۔“ گریگ جیسن نے تنبیہ کی۔

”ابھی ہمیں گاڑی کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔“ ہیرس نے یاد دلایا۔ ”اور مجھ پر اس لاش کے قرب سے وحشت طاری ہورہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے منہ سے عجیب سی آواز برآمد ہوئی تھی۔“

”ایک منٹ صبر کرو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ گریگ نے کہا۔ اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا پھر رک گیا۔

”ذرا دیکھنا تو وہ سامنے سے کون آرہا ہے..... دو آدمی معلوم ہوتے ہیں؟“

ہیرس نے اشارے کی سمت دیکھا۔ گیٹ سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر دو پولیس آفیسر گیٹ کی طرف آرہے تھے۔ ”جلدی سے نکل چلو۔“ ہیرس نے سرگوشی کی۔ ”وہ پولیس آفیسر ہیں۔“

گریگ جیسن نے گاڑی کو اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادیا۔ ”دیکھا تم نے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر ہم جلد بازی سے کام لیتے تو دھر لیے جاتے۔“ وہ سیدھے آگے نکل گئے اور پھر ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر

مڑ گئے۔ ہیرس بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا کہ کوئی پولیس کی گاڑی تو ان کے پیچھے نہیں لگ گئی۔

”ہیرس! میرا خیال ہے کہ ہماری عقل رخصت ہوچکی ہے۔“ گریگ نے چونک کر کہا۔ ”ہمارے حواس صحیح کام نہیں کررہے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ ہیرس نے کہا۔ ”مجھے اس لاش سے سخت وحشت ہونے لگی ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی نیا منصوبہ آیا ہے؟“

”کیوں نہ کار کو لاش سمیت کہیں کھڑا کرکے رخصت ہوجائیں؟“

”بات تو ٹھیک ہے لیکن اس میں ایک خطرہ ہے کہ پولیس یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے گی کہ قتل کسی اور جگہ پر ہوا ہے۔ کار اور لاش الگ الگ رہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

دس منٹ بعد وہ ایک پارک کے قریب پہنچ گئے۔ پارک بالکل ویران پڑا تھا اور دور و نزدیک کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد انہوں نے لاش کو باہر نکالا اور پارک میں لے جاکر ایک بنچ کے قریب ڈال دیا۔ جب وہ واپس کار کے قریب پہنچے تو بارش شروع ہوگئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کار کو کسی ایسی جگہ پر چھوڑیں گے جہاں سے انہیں بس یا ٹیکسی مل سکے۔ یہ موزوں جگہ انہیں ریلوے اسٹیشن کے پاس مل گئی۔ کار سے اترنے سے پہلے انہوں نے اطمینان کرلیا کہ آس پاس کوئی شخص کار کی طرف متوجہ تو نہیں ہے۔ جب وہ کار سے اترے تو بارش تھم چکی تھی لہٰذا دونوں پیدل چل پڑے۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں بس یا ٹیکسی میں سفر کرنے کے بجائے پیدل ہی گھر جانا چاہیے۔“ ہیرس نے کہا۔ ”یہ زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ اس طرح کوئی بس کنڈیکٹر یا ٹیکسی ڈرائیور یہ گواہی نہیں دے سکتا کہ ہم رات کے بارہ بجے ریلوے اسٹیشن کے قریب جہاں مقتول کی کار کھڑی تھی، دیکھے گئے ہیں۔“

گریگ جیسن دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”بارہ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں، آدھے گھنٹے میں ہی سارا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”آؤ کسی بار میں چلتے ہیں۔ ایک ایک ڈرنک ہوجائے۔“

ہیرس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے ذہن پر لاش سوار ہے۔ اگر میں نے کچھ کھایا تو مجھے الٹی ہوجائے گی۔“

”تو پھر میرے ساتھ چلو۔ مجھے تنہا اپنے اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے خوف سا آرہا ہے۔“ گریگ نے التجا کی۔

ہیرس اپنے ماتھے اور گردن پر ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے بخار ہورہا ہے، میں اس لاش کے تصور سے دور ہوجانا چاہتا ہوں۔“

گریگ جیسن نے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن فٹ پاتھ پر ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ”آہستہ بات کرو۔“ اس نے کہا۔ ”تم بار بار لاش کا ذکر کررہے ہو۔ ہمیں قتل کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ جو کچھ ہوا وہ محض ایک حادثہ تھا۔ پولیس یہی خیال کرے گی کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے قتل کردیا ہے۔ اوہ.....“ وہ چونکا۔ ”ہم سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔ ہم اس کا بٹوا جیب میں ہی چھوڑ آئے ہیں حالانکہ پروگرام کے مطابق ہمیں اس کا بٹوا اس کے قریب زمین پر پھینکنا تھا۔“

ہیرس جو چلتے چلتے رک گیا تھا دوبارہ چل پڑا اور بولا۔ ”تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بٹوے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس اب جو چاہے، سوچتی رہے۔ کم از کم وہ ہمارے ساتھ اس معاملے کا کوئی تعلق نہیں جوڑ سکتے۔ اخبار میں تین چار لائنوں سے بڑی خبر نہیں چھپے گی.....“ چلتے چلتے دونوں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہیرس کا راستہ الگ ہوجاتا تھا۔ جیسن نے کہا۔

”آج رات میرے ساتھ گزارلو، کل صبح چلے جانا۔“

”نہیں، میں گھر جارہا ہوں۔“ ہیرس نے جواب دیا۔

جیسن نے بھویں سکیڑیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دوست کے لہجے میں تلخی پائی جاتی تھی۔ ”کل ملاقات ہوگی؟“ اس نے پوچھا۔

”اسے آخری ملاقات سمجھو۔“ ہیرس نے کہا۔ ”تمہاری حماقت کی وجہ سے میں قتل کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ آئندہ مجھ سے دور ہی رہنا۔“

”بھول جاؤ ہیرس..... دوست کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ اوکے خدا حافظ..... امید ہے کہ جلد ملاقات ہوگی۔“ ہیرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دونوں اپنے اپنے راستے پر ہولیے۔ دس منٹ بعد گریگ جیسن اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈی ولسن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا مگر..... وہ ذرا بھی بھوک محسوس نہیں کررہا تھا۔ جب وہ سونے کے لیے اپنا بستر ٹھیک کررہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ غیر شعوری طور پر کانپ رہے ہیں۔ اس کے تصور میں ڈی ولسن کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ شاید وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے بیوی بچے اس کی واپسی کا

''انتظار کر رہے ہوں گے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد گریگ جیسن کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اس نے سوچا اگر ڈی ولسن کے بیوی بچے ہوئے تو وہ اپنے جرم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضرور ان کی مدد کرے گا۔ اگلی صبح دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی۔ کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے پتا چلا کہ وہ کافی دیر تک سوتا رہا ہے۔ اس وقت دن کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر کی چمک میں آنکھیں جھپکاتا ہوا ان دو اشخاص کو دیکھنے لگا جو پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ جیسن کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اتنی جلدی پولیس اس کے دروازے تک کیسے پہنچ گئی؟

ایک پولیس آفیسر نے اپنا نام سارجنٹ میکلے بتایا اور جیسن سے اس کا نام پوچھا۔

''م...... میرا نام گریگ جیسن ہے۔''

''مسٹر جیسن! کیا تم آرٹسٹ ہو؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''میں آرٹسٹ؟ نن...... نہیں، میں آرٹسٹ تو نہیں ہوں۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ گریگ جیسن نے پولیس آفیسروں کے پیچھے دیکھا تو سیڑھیوں میں اسے کچھ اور وردیوں والے نظر آئے۔ ان میں سے ایک جھک کر سیڑھیوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

''کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟'' سارجنٹ نے کہا۔ ''ہم آپ سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔'' جیسن تامل کرتا ہوا دونوں آفیسروں کو اندر لے گیا۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پینٹنگز اور ایزل اسے مشکل میں ڈال سکتی تھیں۔

سارجنٹ پُرخیال نظروں سے تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر گریگ جیسن! کیا...... تمہارے ساتھ کوئی آرٹسٹ رہتا ہے؟''

''آرٹسٹ؟ نن...... نہیں، میں اکیلا رہتا ہوں۔ دراصل میں آرٹ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''کیا یہ تصویریں تمہاری بنائی ہوئی ہیں؟'' سارجنٹ نے پوچھا اور آگے بڑھ کر ایزل پر لگی ہوئی تصویر کو گھورنے لگا۔ ''بہت خوب! بہت عمدہ تصویر ہے۔ تمہارے ہاتھ میں خاصی پختگی ہے۔ انکساری کی بات اور ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ تم نوآموز ہو۔''

جیسن نہ انکار کرسکتا تھا اور نہ اقرار...... اگر انکار کرتا تو یہ بتانا پڑتا کہ ان تصویروں اور ایزل کی وہاں موجودگی کا کیا جواز تھا۔ اگر اقرار کرتا تو ایک معمولی ٹیسٹ اس کے بیان کو غلط ثابت کرسکتا تھا۔

''مسٹر جیسن! کیا تم ڈی ولسن نامی آرٹسٹ کو جانتے ہو؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

''نن...... نہیں، م...... میں اسے نہیں جانتا۔'' جیسن نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''گزشتہ رات ہمیں اس کی لاش ایک پارک میں پڑی ہوئی ملی ہے...... میڈیکل ایگزامنر کے بعد ایگزامنر کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اسے کسی دوسری جگہ پر قتل کر کے لاش وہاں ڈال دی گئی تھی۔ قاتل یا قاتلوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے لوٹنے کے لیے قتل کیا گیا ہے جبکہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ کسی بلند اور سخت جگہ پر سے گرنے کی وجہ سے ہلاک ہوا ہے۔ غالباً سیڑھیوں پر سے۔'' گریگ جیسن صوفے پر بیٹھ گیا کیونکہ اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔

''تت...... تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

سارجنٹ میکلے نے جیب سے ایک کاروباری کارڈ نکالا۔ ''یہ کارڈ ہمیں متوفی کے بٹوے سے ملا ہے۔ یہ اس کا کاروباری کارڈ ہے۔ اس پر تمہارا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارا فون نمبر اس کارڈ پر کیوں لکھا ہے؟''

اسی لمحے ایک باوردی اہلکار، ایک سوٹ والے شخص کے ہمراہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اہلکار نے سارجنٹ سے کہا۔ ''متوفی انہی سیڑھیوں سے گرا تھا یا گرایا گیا تھا۔ ہمیں سیڑھیوں سے چپکے ہوئے اس کے بال مل گئے ہیں۔''

''مسٹر گریگ جیسن! تم زیرِ حراست ہو۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''کیا تم نے تنہا ڈی ولسن کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

گریگ جیسن کو ہیرس کی گزشتہ رات والی بے رخی یاد آگئی...... اس نے سوچا کہ اگر جیل میں ایک دوست ساتھ ہوگا تو وقت اچھا گزر جائے گا۔ جو کچھ ہوا اس میں وہ دونوں شریک تھے۔ لہٰذا اس نے کہا۔ ''میرے ساتھ میرا دوست ہیرس بھی تھا۔''

سارجنٹ میکلے نے گریگ جیسن کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور اسے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا...... آدھے گھنٹے بعد دو آفیسروں نے ہیرس کو بھی گرفتار کر کے وہاں پہنچا دیا...... ہیرس نے جیسن کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''کیا تم واقعی میرے دوست ہو؟''



بے خبر

ناہید سلطانہ اختر

کبھی کبھی بعض معاملات میں لاعلمی، حق میں فائدہ پہنچاتی ہے مگر کچھ ایسے پہلو بھی ہیں زندگی کے جن پر اگر گہری نگاہ رکھ لی جائے تو بہت پیارے رشتے، بہت پیار سے رکھے جاسکتے ہیں جو... ان کا حق بھی ہے لیکن... افسوس ہم ذرا سی غفلت سے انتہائی قریب کے منظر کو فراموش کردیتے ہیں... یہی بات ان کی بھی خطا بن گئی۔

والدین اور اولاد...... کے بیچ در آنے والے فاصلوں کا فکر انگیز پہلو

اس ٹیلی فونک رابطے کی ایک جانب مس تھی، دوسری طرف ڈاکٹر دمی جنہیں ان کی سینیارٹی اور پیشہ ورانہ لیاقت و مہارت کے باعث شہر کے طبی حلقوں میں نہایت احترام حاصل تھا۔

ڈاکٹر دمی سائیکاٹرسٹ تھے اور میں سائیکولوجسٹ۔ وہ ڈگری یافتہ میڈیکل ڈاکٹر اور دماغی

وذہنی امراض کے خصوصی تربیت یافتہ معالج تھے اور اپنے مریضوں کا دواؤں سے علاج کرتے تھے۔ میں ماہر نفسیات تھی۔ میرا دائرۂ کار انسانی جذبات اور رویے تھے۔ مجھے اپنے مریضوں کا علاج ان کی نفسیات پر توجہ مرکوز رکھ کر کرنا ہوتا تھا۔ سائیکوتھراپی کے ذریعے ان کے جذباتی مسائل کی تہ تک پہنچنا ہوتا اور پھر ان مسائل کا علاج۔ مریضوں کے جذباتی مسائل کا علاج کبھی کبھی دواؤں کے استعمال کا متقاضی ہوتا اور مجھے سائیکاٹرسٹ کی مدد کی ضرورت بھی پڑ جاتی تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وصی اور میں اکثر رابطے میں رہتے۔ ڈاکٹر وصی کے کلینک پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ جن مریضوں کو سائیکوتھراپی کی ضرورت ہوتی انہیں وہ اکثر میرے پاس بھجوا دیتے۔ ضروری سمجھتے تو مریض کو میرے پاس بھجوانے سے قبل فون بھی کر دیتے جیسا کہ اس روز کیا۔

"ڈاکٹر بتول! میں ایک کیس آپ کو ریفر کر رہا ہوں۔ ایک ہی فیملی کے تین نوجوان بچے ہیں بلکہ چار کہیے...... دو لڑکے، دو لڑکیاں...... بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے مگر اپنی سسرال میں وہ بھی نان ایڈجسٹمنٹ کی شکار ہے...... والدین بہت پریشان ہیں۔ کافی عرصہ تو جھاڑ پھونک، پیروں، فقیروں اور مزاروں پر چڑھاووں کے چکر میں رہے پھر حکیموں، ہومیو پیتھ اور جنرل پریکٹیشنرز سے علاج کرواتے رہے۔ کسی نے مجھے ریفر کیا لیکن اس کیس میں سائیکاٹرسٹ نہیں سائیکو تھراپسٹ کی ضرورت ہے۔ میں انہیں آپ کے پاس بھجوا رہا ہوں۔ والد بے چارہ معمولی ملازم ہے فیس میں ممکنہ رعایت دیجیے گا۔"

"نو پرابلم سر...... آپ بھجوا دیجیے۔"

"تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ...... ویسے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بچوں کو آپ کے پاس لانے سے قبل کیس ہسٹری آپ کے گوش گزار کرنے کے لیے پہلے والدین کا آپ سے ملنا بہتر ہوگا۔"

"جو آپ بہتر سمجھیں سر۔"

"مہربانی۔" انکساری ڈاکٹر وصی کا خاصہ تھی۔

☆☆☆

اگلے دن شام کے وقت جب میں حسب معمول مریضوں کو دیکھ رہی تھی میرے معاون کار نے مجھے بتایا ڈاکٹر وصی کی جانب سے ریفر کیے گئے کوئی صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

"انہیں بٹھائیے...... ابھی کتنے لوگ رہ گئے ہیں؟"

"تین میڈم۔"

"ٹھیک ہے۔ ان کے بعد انہیں بھجوائیے گا۔"

"رائٹ۔"

جن مریضوں نے پہلے سے وقت لے رکھا تھا، ان سے فارغ ہو کر میں نے ڈاکٹر وصی کے بھجوائے ہوئے صاحب کو بلوایا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا نام سعید اللہ ہے اور یہ میری وائف ہے۔" آنے والے شخص نے اپنا اور اپنے ہمراہ موجود خاتون کا تعارف کرایا۔ حلیے اور چہرے مہرے سے دونوں سادہ سے میاں بیوی لگتے تھے۔

میں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ وہ میری میز کے اس پار کرسیوں پر میرے روبرو بیٹھ گئے۔

"جی۔" میں ہمہ تن ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

میاں نے بیوی کو دیکھا۔ دھیرے سے کھنکھارا پھر اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ میں سولہ گریڈ کا سرکاری ملازم ہوں۔ شام کو ایک جگہ تین گھنٹے پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا ہوں...... میری بیوی ہاؤس وائف ہے...... یہ بھی دس جماعتیں پاس ہے۔ ہم نے بچوں کو بڑی محنت سے پالا پوسا۔ انہیں محبت بھی دی۔ جس حد تک ممکن تھا ان کی ضرورتیں بھی پوری کیں۔ انہیں پڑھایا لکھایا۔ بڑی بیٹی کی ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی بھی کی ہے۔ اب ایک بیٹی گھر میں ہے، دو بیٹے۔ بیٹی گیارہویں جماعت میں ہے۔ بڑا بیٹا ایف ایس سی کر رہا ہے چھوٹا نویں جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ بچے میری نسبت اپنی ماں کے زیادہ قریب ہیں۔ چھوٹے تھے تب بھی مجھ سے دور دور ہی رہتے تھے مگر اب تو......" اس شخص کی آنکھیں اچانک چھلک اٹھیں اور آواز رندھ کر معدوم ہی ہو گئی۔ اس کے ہمراہ بیٹھی عورت نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھنا شروع کر دیں۔

میں کچھ دیر اس کا سلسلۂ کلام بحال رہنے کی منتظر رہی پھر میں نے کہا۔ "جی!"

اس "جی" کا مطلب تھا میں اپنے روبرو بیٹھے شخص سے اس کا سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی متقاضی تھی۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اپنی آنکھوں کا پانی انگلیوں کی پوروں سے پونچھا پھر سر جھکا کر بولا۔ "آپ سوچ نہیں سکتیں ڈاکٹر صاحب میں نے ان بچوں کے لیے کتنی محنت کی ہے...... اس عمر میں بھی صبح کو گھر سے نکلا رات کو واپس لوٹتا ہوں اور یہ میری بیوی...... صبح سے شام تک گھر کے دھندوں میں لگی رہتی ہے...... پتا نہیں کیا ہوا ڈاکٹر صاحب...... کسی نے جادو کر دیا ہے یا پڑھ کر پھونک دیا ہے، ہمارے بچے ہمارے دشمن ہو گئے ہیں...... میرے کچھ زیادہ ہی مگر اس کے بھی ہو گئے۔" ...... سعید اللہ نے گردن کی جنبش سے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

"اچانک؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے بتایا نا...... مجھ سے تو پہلے بھی دور دور ہی رہتے تھے۔ کوئی ضرورت کی بات ہوئی تو کر لی ورنہ الگ تھلگ...... اپنی ماں سے البتہ بہت نزدیک تھے مگر جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے اپنی ماں سے بھی ان کی پہلے جیسی قربت نہیں رہی بلکہ بدتمیزی کرنے لگے مگر کچھ عرصے سے تو حالات بہت ہی خراب ہو گئے ہیں۔"

"کیا خراب ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ ہم دونوں کے دشمن بن گئے ہیں...... نفرت کرتے ہیں ہم دونوں سے۔ میری تو خیر وہ صورت ہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو وہ اکثر کمرے میں اور کبھی گھر کی چھت پر بیٹھے رہتے ہیں...... حالانکہ مجھے ان سے بہت محبت ہے۔"

"آپ ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جب چھوٹے تھے تو میں انہیں چومتا بھی تھا۔ چھٹی والے دن باہر گھمانے پھرانے بھی لے جاتا تھا۔ فرصت ملنے پر اپنی وائف کے ساتھ مل کر ان کے لیے ان کی پسند کے کھانے بھی بناتا تھا۔ میری چھوٹی بیٹی ساگ بہت شوق سے کھاتی ہے۔ میں سردیوں میں اس کے لیے خود ساگ پکایا کرتا تھا۔ اب بھی پکاتا ہوں مگر تقریباً دو سردیاں ایسی گزریں کہ اس نے میرے ہاتھ کا پکا ساگ چکھا تک نہیں۔" سعید اللہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"بلکہ ڈاکٹر صاحب۔" سعید اللہ کی بیوی نے جو چپ بیٹھی تھی پہلی بار زبان کھولی۔ "ابھی جو سردیاں گزری ہیں ان میں تو ایسا ہوا ہے جی کہ انہوں نے بڑے شوق سے بیٹی کے لیے ساگ پکایا اور تنور سے نان لینے گئے کہ آج میں نے اپنی چھوٹی کے لیے ساگ بنایا ہے۔ روغنی نان لے آؤں شوق سے کھائے گی مگر یہ بازار گئے اور میں نے اس سے کہا، اٹھ تیرے ابو نے تیرے لیے ساگ پکایا ہے۔ برتن نکال لے سب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ وہ اٹھی اور اس نے ساری ہانڈی گھر کے باہر گندی نالی میں انڈیل دی۔"

"کیوں؟" مجھے خاتون کی یہ بات قدرے حیرت انگیز لگی۔

"اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔" سعید اللہ نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے میرے بچوں کو...... بڑا بیٹا تو رات کو چھری اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہے۔ اپنی ماں سے کہتا ہے کسی روز تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔"

"دونوں کو؟" میں نے سوال کیا اور اپنے روبرو بیٹھے میاں بیوی میں سے کسی کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "یعنی آپ کو اور اپنی والدہ کو؟"

"جی ہاں۔"

"آپ نے کبھی اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی؟ میرا مطلب ہے مار پیٹ، گالم گلوچ۔"

"تم بتاؤ ڈاکٹر صاحب کو۔" سعید اللہ نے بیوی سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! انہیں تو زیادتی کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا...... صبح سے رات تک گھر سے باہر رہتے ہیں۔ چھٹی والے دن سو کام ہوتے ہیں انہیں۔"

"سچی بات تو یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ بچوں نے مجھے کبھی زیادتی کا موقع ہی نہیں دیا۔ پڑھائی میں ہمیشہ ٹاپر رہے۔ خاندان میں ان کی تعریف رہی۔"

"تو پھر ایسا کیوں؟ میرا مطلب ہے بچے اتنے بدظن کیوں ہو گئے آپ سے؟" میں نے کہا۔

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" سعید اللہ نے کہا۔ "ان کی ماں کہتی ہے کسی نے تعویذ گنڈے کرا دیے ہیں ان پر...... توڑ کے لیے ہم نے دم بھی کروایا بچوں پر...... ایک پیر صاحب سے تعویذ بھی لے کر ڈالے ان کے گلوں میں...... مزاروں پر بھی لے گئے...... مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔"

''ڈاکٹر وسی بتا رہے تھے آپ کی شادی شدہ بیٹی بھی پرابلم میں ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس کی وجہ سے تو ہم میاں بیوی زیادہ پریشان ہیں۔ کوئی سات ماہ ہوگئے اس کی شادی کو...... اس کی اپنے شوہر سے نہیں بن رہی۔''

''کیوں؟''

''بتاؤ جی۔'' سعید اللہ نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' بیوی ہچکچائی۔ ''اس کا مسئلہ عجیب ہے جی۔''

''کیا؟''

''مرد کسی لڑکی سے شادی کرکے اسے بیوی بنا کر کیوں لے جاتا ہے جی...... اس لیے تو نہیں ناکہ اس نے اسے ماں بہن بنا کر رکھنا ہوتا ہے اپنے گھر میں......''

سعید اللہ کی بیوی نے توقف کیا پھر بولی۔ ''ہم داماد کو الزام کیوں دیں غلطی ہماری بیٹی کی ہے۔''

''کیسی غلطی؟''

''وہ جی...... رات کو اپنے شوہر کے کمرے میں سونے کے بجائے اپنی ساس کے کمرے میں سونا چاہتی ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

خاتون خاموش رہی۔

''شادی اس کی مرضی سے ہوئی ہے؟''

''شادی تو جی ہماری مرضی سے ہوئی ہے۔''

''وہ آپ کی مرضی سے خوش تھی یا ناخوش؟''

''خوش ہی تھی۔''

''کہیں اور تو انٹرسٹڈ نہیں تھی وہ؟''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' خاتون نے جلدی سے کہا۔

''ہماری دونوں بچیاں بہت شریف بچیاں ہیں جی۔'' سعید اللہ بولا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے جو آپ کی بیٹی اپنے شوہر کے کمرے میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''اللہ ہی بہتر جانے۔ وہ شوہر کو اپنے نزدیک ہی نہیں آنے دیتی۔ بہت مسئلہ بنا ہوا ہے اس کی سسرال میں اور ہم بھی پریشان ہیں۔''

''ہر مسئلے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔''

''وجہ نہ وہ بتاتی ہے، نہ ہمیں سمجھ آتی ہے...... شوہر اس کا یہ کہتا ہے کہ میرا اور اس کا گزارہ نہیں ہوسکتا...... بڑی مشکل سے منتیں سماجتیں کرکے ہم نے داماد کو سنبھالا ہوا ہے، ورنہ وہ تو فارغ کرنے لگا تھا اسے۔''

''بیٹی سے پوچھا آپ لوگوں نے کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''جناب محترمہ ڈاکٹر صاحبہ اسی لیے تو ہم لوگ ڈاکٹر وسی صاحب کے پاس گئے تھے، ان کی شہرت سن کر اور اسی لیے ڈاکٹر وسی صاحب نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' سعید اللہ نے کہا پھر قدرے توقف سے اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے تو لگتا ہے کوئی آسیب لگ گیا ہے میرے بچوں کو یا پھر نظر لگ گئی۔ پڑھائی میں اچھے تھے جی...... اب بھی ہیں۔ بڑی سمجھ کی باتیں کرتے ہیں، تمیز دار ہیں...... دوسروں کے ساتھ تو اب بھی...... سب تعریف کرتے ہیں کہ سعید کے بچے بہت اچھے ہیں...... بس ہم دونوں ہی کے دشمن بن گئے ہیں...... میں گھر میں ہوتا ہوں نا جی تو جہاں میں بیٹھا ہوں' وہاں وہ بیٹھنا پسند نہیں کرتے اور جہاں وہ بیٹھے ہوں، اگر میں وہاں جاکر بیٹھ جاؤں تو وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر بہت دل دکھتا ہے جی۔''

''پھر آپ کے ساتھ میرے پاس کیونکر آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''بڑا بیٹا چھوٹوں کو لے کر آجائے گا آپ کے پاس۔''

''ٹھیک ہے انہیں بھجوایئے میرے پاس۔''

''کب ڈاکٹر صاحب؟''

''آپ باہر ریسپشن سے اپائنٹمنٹ لے لیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! بہت پریشان ہوں جی۔'' سعید اللہ دونوں ہاتھ باندھ کر گڑگڑایا۔

''اللہ بہتر کرے گا۔'' میں نے تسلی دی۔

''شکریہ۔''

میاں، بیوی دونوں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

سعید اللہ کے تینوں بچے نہایت خوش شکل، خوش لباس اور مہذب تھے۔ میری ہر بات کا انہوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا لیکن جونہی میں ان سے ماں باپ کی بابت ان کے رویے پر آئی' وہ ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے اور انہوں نے کچھ بتانے سے احتراز کیا۔

حیرت انگیز امر یہ تھا کہ انہیں والدین سے کوئی خاص شکایت بھی نہ تھی۔ ان سے میری بات چیت کے مطابق ماں اور باپ دونوں ہی ان سب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ممکنہ حد تک بلکہ بعض اوقات تو اپنی حد سے بھی بڑھ کر ان کی ضرورتیں پوری کرتے۔ باپ کے مزاج میں کچھ درشتی ضرور تھی مگر بحیثیت باپ وہ اپنے فرائض سے غافل نہ تھا۔ بڑی بیٹی کی اپنے قریبی لوگوں میں شادی کی تھی اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر لینا دینا کیا تھا۔ بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی ان کوششوں اور صعوبتوں کا بھی اعتراف تھا جو دونوں نے بحیثیت والدین ان کے لیے برداشت کی تھیں اور ہنوز کر رہے تھے۔

پھر دشمنی اور نفرت کا سبب؟

تینوں بچوں کے ساتھ کئی نشستوں کے باوجود میں وہ سبب تلاش نہیں کر پا رہی تھی۔

''جب تمہاری والدہ بقول تم بہن بھائیوں کے تم لوگوں کا اتنا خیال رکھتی ہیں، صبح سے شام تک تمہی لوگوں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ ایک اچھی ماں اور اچھی ہاؤس وائف ہیں اور والد تمہارے ایک ذمے دار باپ ہیں۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے دو دو ملازمتیں کرتے ہیں اور تم لوگوں کو ان کی اتنی محنت کی وجہ سے ان پر ترس بھی آتا ہے۔ تمہاری بڑی بہن کو انہوں نے جہیز میں اس کی ضرورت کی ہر چیز دینے کے لیے ادھر ادھر سے ادھار لینے سے بھی دریغ نہیں کیا پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری والدین یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ تم لوگ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہو، نفرت کرتے ہو ان سے؟'' میں نے نہایت تفصیل سے اپنا سوال ان کے سامنے رکھا۔

وہ دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''بتاؤ کیا بات ہے؟''

''بڑے لوگوں کی بڑی باتیں''

1۔ اے انسان! بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام کررہے ہیں تاکہ تیرے ہاتھ میں روٹی آئے اور تو اسے غفلت سے نہ کھائے۔ سب تیرے لیے مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بجالا رہے ہیں۔ یہ ناانصافی نہیں کہ یہ سب فرماں بردار ہیں اور تو نافرمان ہے۔

2۔ اچھے اور کھرے دوست بدحالی میں کام آتے ہیں۔ دسترخوان پر تو دشمن بھی دوست نظر آتے ہیں جو تیری خوشحالی کے وقت تیری رفاقت کا دم بھرتے ہیں اور جب تو بدحالی کی گرفت میں آجاتا ہے تو تجھ سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

3۔ جس کا دل کالا ہوچکا ہو اسے نصیحت کرنے کا کیا فائدہ۔ لوہے کی کیل پتھر میں نہیں گھس سکتی۔

4۔ ادنیٰ دشمن کو بے حقیقت سمجھنا ایسا ہے جیسے تھوڑی سی آگ کو سلگتا چھوڑ دینا۔

5۔ موتی اگر کیچڑ میں بھی پڑا ہو تو پھر بھی موتی ہے۔ اگر گرد و غبار آسمان پر بھی پہنچ جائے تو گرد و غبار ہی ہے۔

6۔ دنیا کا دوزخ یہ ہے کہ گھر میں بیوی بدمزاج ہو۔

7۔ میں ہمیشہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور اس کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو اللہ سے نہیں ڈرتا۔

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

کترنیں

☆ پرخلوص دعاؤں جیسا کوئی اور تحفہ نہیں۔

☆ آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔

☆ خاموشی دانا کا زیور اور احمق کا بھرم ہے۔

☆ دوستی کنول کا وہ پھول ہے جو خلوص کی جھیل میں کھلتا ہے۔

☆ سونے کو آگ پرکھتی ہے اور انسان کو مصائب۔

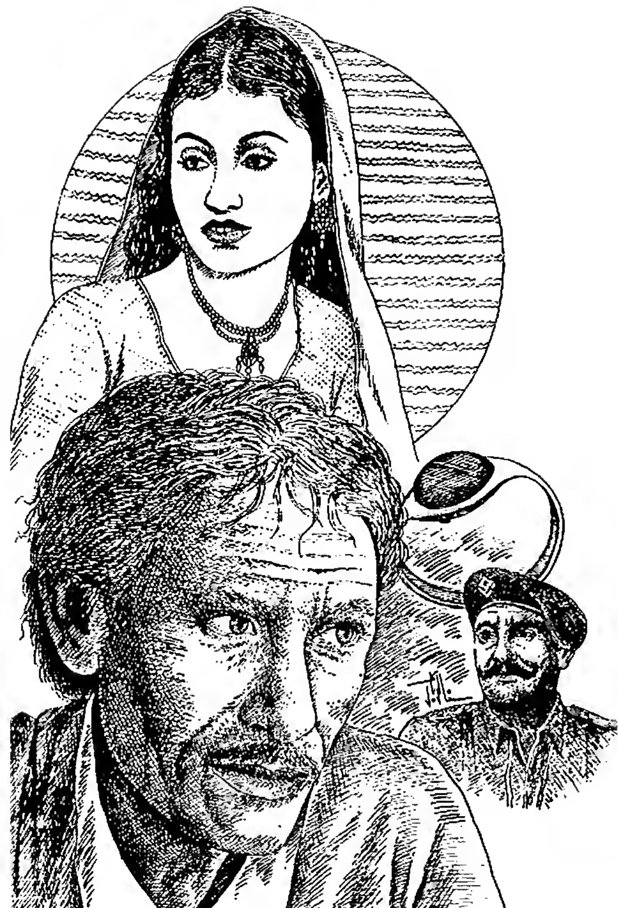
☆ نیک کام وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے چہرے پر خوشی کی مسکراہٹ بکھیر دے۔

☆ کسی کی زندگی میں اس کے لیے زندہ رہنے کے اسباب پیدا کرنا، اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل)

''آپ آپا کو بلائیں' وہ بتائیں گی آپ کو؟''
سعید اللہ کے بڑے بیٹے نے کہا۔
اگلی نشست میں، میں نے سعید اللہ کی بڑی بیٹی کو بھی بلوا لیا۔ وہ چھوٹے تینوں بہن بھائیوں سے زیادہ سمجھدار دکھائی دی۔
''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اپنے گھر میں خوش نہیں ہو...... کیوں؟'' میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے بے تکلفی کی راہ ہموار کرنے کے بعد کہا۔
وہ مجھے دیکھنے لگی پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ہیجانی سی کیفیت میں باہم مروڑنے لگی۔
''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔
بڑی بہن نے چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھا۔ چاروں کی معنی خیز نظریں باہم ملیں پھر انہوں نے ایک دوسرے سے نظریں چرا لیں۔
''ہاں...... بتاؤ۔'' میں نے بڑی بہن کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے سوال کے جواب کا تقاضا کیا۔
وہ کسمسائی اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتایا کہ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے نہیں بتانا چاہتی۔
میں اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔
''اب ٹھیک ہے؟''
''جی...... یہ بات نہیں کہ انہیں معلوم نہیں مگر بھائیوں کے سامنے یہ بات کرتے شرم آتی ہے مجھے۔'' اس نے کہا۔
''کوئی بات نہیں، اب یہاں تم ہو اور میں...... تیسرا کوئی نہیں جو بات ہے کھل کر اطمینان سے بتاؤ۔'' میرا خیال تھا وہ شادی سے قبل کسی اور سے وابستگی کا اعتراف کرے گی۔
''ڈاکٹر! ہمارا بچپن ایک عجیب سے خوف میں گزرا ہے...... مجھے آپ کو بھی بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' اس نے قدرے تامل سے بتایا۔
''بعض باتیں کہنا ضروری ہوتی ہیں۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
وہ چند ثانیے متذبذب سی رہی پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہمارا بچپن بڑے عجیب سے خوف میں گزرا ہے ڈاکٹر۔''
''کیسا خوف؟'' میں نے پوچھا۔
''چھوٹا سا گھر تھا...... ابھی بھی وہی گھر ہے۔ دو کمروں کا تنگ سا فلیٹ۔ ایک میں آنے جانے والے مہمانوں کے لیے ڈرائنگ روم سجا ہوا تھا۔ دوسرے میں ہم سب سوتے تھے۔ امی، ابو اور ہم چاروں بہن بھائی۔ رات کو کمرے کی لائٹ آف ہوتی مگر اکثر ہم بہن بھائیوں کی کمرے کے گھپ اندھیرے میں آنکھ کھل جاتی تھی۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا...... یہ میں آپ کو صرف اپنی نہیں بلکہ چاروں بہن بھائیوں کی بات بتا رہی ہوں کیونکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہ باتیں شیئر کرتے رہے ہیں...... ان دنوں جب ہم چھوٹے تھے اور ناسمجھ۔ ایک روز میں نے اور مجھ سے چھوٹے بھائی نے تہیہ کیا کہ ہم امی کو ابو کے تشدد سے چھٹکارا دلوانے کے لیے اپنے پڑوس میں رہنے والے ایک پولیس والے انکل کو ساری بات بتا دیں گے مگر ہوا یہ کہ پولیس والے انکل کی مدد لینے سے قبل ہی ہماری ایک کزن جو عمر میں ہم بھائی بہنوں سے بڑی اور سمجھدار تھی' چھٹیوں میں ہمارے گھر رہنے آ گئی۔ رات کو ہمارے ساتھ ہی سوئی اور ہماری طرح رات کو اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس نے مجھے جاگتے دیکھا اور ہم دم سادھے پڑے رہے۔ صبح ہم بھائی بہنوں نے اسے پولیس والے انکل سے مدد حاصل کرنے کا پروگرام بتایا تو اس نے قہقہہ مار کر کہا۔
''بے وقوفو ایسا کرنا بھی مت...... ہمارے گھر میں بھی امی ابا کا یہی قصہ ہے۔ پھر اس نے ہمیں سمجھایا کہ بس چپ چاپ دیکھو...... ہمارا سارا بچپن اسی طرح گزرا ڈاکٹر...... چپ چاپ' ڈر اور دہشت میں...... شام ہوتی تو ہمیں اس خیال سے وحشت ہونے لگتی تھی کہ اندھیرا اور ڈراؤنی رات بھی آنی ہے۔''
''او مائی گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''پھر ہم بڑے ہوتے گئے۔ کمرے میں جگہ کم پڑنے لگی۔ ابو اور بھائیوں کے بستر لاؤنج کے فرش پر بچھائے جانے لگے مگر اب بھی وہی سلسلہ اکثر و بیشتر چلتا رہتا ہے۔'' دفعتاً اس کے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ''یہ سلسلہ ابھی بھی چلتا رہتا ہے' ابو اور امی کو یہ خیال نہیں کہ ان کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ بچپن کے خوف کی جگہ

غصے اور کراہیت نے لے لی ہے۔ میرے بہن بھائی کھل کر امی ابو کو یہ نہیں بتا پاتے کہ انہیں ان دونوں پر غصہ کیوں آتا ہے۔ وہ ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ میرا ایک بھائی تو چھری اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کسی روز مجھے طیش آ گیا تو امی، ابو دونوں کو مار دوں گا۔ ڈاکٹر! میرے بہن بھائی تینوں بہت اچھے ہیں۔ بہت ذہین اور ٹیلنٹڈ ہیں مگر اس مسئلے نے انہیں نفسیاتی بنا دیا ہے۔''
''نفسیاتی تو تم بھی ہو۔'' میں نے کہا۔
اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔
''اپنے شوہر کے کمرے میں سونے کے بجائے ساس کے کمرے میں کیوں سونا چاہتی ہو؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''اسی لیے نا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''کس لیے؟'' میں نے سوال کیا۔
''مجھے رات سے ڈر لگتا ہے ڈاکٹر......'' وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔
''پاگل لڑکی۔'' مجھے اس پر پیار آنے لگا اور اس سے ہمدردی محسوس ہوئی بلکہ اس کے بہن بھائیوں سے بھی جنہیں میں اپنی مشورہ گاہ میں بیٹھے چھوڑ کر ان کی بڑی بہن کو دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''دیکھو بیٹا۔ یہ اللہ کا نظام ہے...... جب تک اللہ چاہے نسلِ انسانی کو چلانے کے لیے یہ نظام چلتا رہے گا۔''
وہ مجھے الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگی پھر قدرے توقف سے شاکی لہجے میں بولی۔ ''چاہے بچے گھٹ گھٹ کر نفسیاتی مریض بن جائیں؟''
''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے کہا پھر اپنی بات مکمل کی۔ ''نسلِ انسانی کی بقا کے اس نظام میں پرائیویسی البتہ ضروری ہے۔''
اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ ''یہ...... بالکل یہی بات امی اور ابو دونوں کو بھی تو سمجھنی چاہیے تھی نا......''
''صرف تمہارے امی ابو ہی کو نہیں...... تمام والدین کو...... اور تمہیں بھی۔''
''مجھے!'' وہ بے ساختہ چونکی۔
''ہاں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کہا۔ ''نظام فطرت کے مطابق اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی رہو اور جب ماں بن جاؤ اور بچوں کو سمجھ آنے لگے تو اپنے اور اپنے شوہر کی یکجائی کے لیے گھر میں کوئی علیحدہ اور پردے کا گوشہ ضرور بنانا۔''
وہ جھینپ گئی پھر گڑگڑا کر بولی۔ ''پلیز! امی ابو کو بھی سمجھائیے نا...... مجھ سے اپنے بہنوں بھائیوں کی ذہنی حالت دیکھی نہیں جاتی۔''
''پہلی فرصت میں۔ تم بے فکر رہو۔'' میں نے اسے زبان دی۔
''تھینک یو۔''
اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نہ جانے کتنی لاینحل نفسیاتی گتھیاں سلجھائی ہوں گی میں نے مگر اس گتھی کو سلجھا کر مجھے جو مسرت، طمانیت اور کیف حاصل ہوا اس کا اندازہ میں ہی کرسکتی تھی' شاید اس لیے کہ اپنے بچپن میں، میں خود بھی تو اسی مسئلے کا شکار رہی تھی۔ چھوٹا سا گھر، رات، اندھیرا، ہم بہن بھائی اور امی ابو!
میں نے سعید اللہ اور اس کی بیوی کو بلوایا اور ان سے کہا۔ ''آپ دونوں رات کو اپنے سونے کا بندوبست بچوں سے علیحدہ کرلیں...... گھر چھوٹا ہے تو ڈرائنگ روم میں ہی سہی...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
دونوں نے حیران ہو کر مجھے دیکھا پھر ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں میرے صحیح العقل ہونے میں شک ہوا!
''بات یہ ہے کہ خدا کے بعد بندے کے لیے سب سے پیارا، اٹوٹ اور مقدس رشتہ اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے۔ اس تقدس کو کسی بھی حال میں مسخ نہیں ہونا چاہیے۔ خدانخواستہ ایسا ہو تو اکثر بچے اسی طرح الجھ جاتے ہیں جیسے آپ کے بچے...... میری خواہش ہے کہ بچوں کی نظر میں آپ دونوں کا تقدس جلد بحال ہو جائے۔'' میں اپنے روبرو بیٹھے مرد و زن کو ان کی ذمے داری کا احساس دلانے کے لیے اور کیا کہہ سکتی تھی سوائے اس کے کہ بچے اپنے والدین کو اپنا آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط، خوبصورت اور باشعور سمجھتے ہیں' بچوں کا زعم یہ ہوتا ہے کہ ان کے والدین کبھی بھی کوئی غلطی یا غلط کام نہیں کرسکتے...... ایسے میں جب اچانک والدین یا ان دونوں میں سے کسی کی کوئی کمزوری یا کمزور پہلو سامنے آتا ہے تو بچوں کے ذہن میں سجا سجایا شیش محل بکھرنے لگتا ہے اور شیشے میں ذرا بھی دراڑ آ جائے تو پھر وہ ٹوٹتا چلا جاتا ہے...... اس شیشے اور شیش محل کو ایسی ہر شکست و ریخت سے بچائے رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔



جرم زادہ

ملک صفدر حیات

قانون کی بات ہو یا عشق کی... دونوں کو ہی اندھا کہا جاتا ہے مگر... بینائی سے محروم یہ دونوں احساس دانائی کے عروج پر لوگوں کی زندگیوں پر مثبت یا منفی کسی بھی طرح اثرانداز ہوکر ان کے سفر کی سمت ہی بدل دیتے ہیں۔ ان میں بھی ایک محبت کے پودے کی آبیاری میں مصروف تھا تو دوسرا قانون کے تقاضوں کو پورا کرنے میں غرقِ عمل... لہٰذا جب وہ اپنی چاہت کی حفاظت میں قانون شکنی کا مرتکب ہوا تو قانون کے رکھوالے بھی اسے بخشنے پر تیار نہ ہوئے... محبت جیسے گداز جذبے کے ہاتھوں کوئی اتنی سنگدلی کا بھی مظاہرہ کرسکتا ہے... یہ بات گہری سوچ میں ڈال دیتی ہے۔ شاید بے راہ روی کبھی درست سمت میں نہیں چلا سکتی۔

محبت کے نام پر بے حیائی کا کھیل کھیلنے والوں کا

تماشائے عبرت

خبر تھی ہی اتنی واہیات اور شرمناک کہ پورے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ جس نے بھی سنا، حیرت، بے یقینی اور غصے سے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ ہر طرف یہی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں......

''بابے رجو نے یہ کیا کر ڈالا۔ چٹا چھاٹا تے عقل دا گھاٹا۔ بڈھے بارے اسے ذرا بھی حیا نہ آئی۔ نگی تو اس کی بیٹیوں سے بھی دس پندرہ سال چھوٹی ہے۔ اس کم بخت بابے نے تو مقدس رشتے کا سوا ستیاناس مار ڈالا۔ ہائے رہا یہ دن بھی دیکھنا تھا......!''

الغرض، جتنے منہ اتنی باتیں۔ موضع کڑیاں والا کے طول وارض میں اسی نوعیت کے تبصرے گردش کر رہے تھے اور اس تمام تر سنسنی خیزی کا مرکزی کردار تھا ستر سالہ رمضان۔ بابے رجو نے اپنی بہو صغریٰ عرف نگی کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی!

ان دنوں میری تعیناتی ضلع گجرات کے ایک تھانے میں تھی۔ موضع کڑیاں والا میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ آج کل کڑیاں والا ایک ترقی یافتہ قصبے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور وہاں پر شہر جیسی تمام سہولیاتِ زندگی میسر ہیں لیکن جن دنوں کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں کڑیاں والا ایک عام سا چھوٹا روایتی گاؤں ہوا کرتا تھا۔ کڑیاں والا اور دھوڑاں والا پاک و ہند کی سرحد پر واقع موضعات ہیں۔

ایک روز میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو بابے رجو کا قصہ مجھ سے پہلے وہاں رسائی حاصل کر چکا تھا۔ جب میں تھانے کے برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا تو

میں نے وہاں چند افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی کرسی سنبھالی ہی تھی کہ کانسٹیبل فیاض میرے پاس چلا آیا۔

اس نے حسبِ معمول مجھے سیلیوٹ مارا۔ میں نے گردن کی جنبش سے اس کے اسلام کا جواب دیا پھر پوچھا۔

''یہ باہر کون لوگ جمع ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''یہ فریادی ہیں ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

''ادھر کڑیاں والا میں ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

میرے استفسار پر کانسٹیبل فیاض نے مجھے مختصر الفاظ میں رمضان عرف بابے رجو کے ''کارنامے'' سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔

''بھیجوان سب کو اندر۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے سامنے موجود تھے۔ فریادیوں کی تعداد پانچ تھی۔ دو مرد اور تین عورتیں۔ مردوں میں ایک سگی کا بھائی الطاف عرف طافو اور دوسرا کڑیاں والا کا وسنیک عدیل عرف کاکا تھا جبکہ عورتوں میں ایک سگی کی ماں برکت بی بی، دوسری برکت بی بی کی پھوپی زاد خورشید بیگم اور تیسری ایک بیوہ عورت نذیراں تھی۔ طافو اور اس کی ماں دھوڑاں والا سے آئے تھے جبکہ نذیراں، خورشید اور کاکا کا تعلق کڑیاں والا سے تھا۔ فیاض مجھے تازہ ترین حالات کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس افسوسناک واقعے کی آگاہی میں جو رہی سہی کسر تھی وہ ان لوگوں نے پوری کر دی۔

میں نے پوری توجہ سے ان کا دکھڑا سنا۔ واقعات کے مطابق، دو روز قبل بابے رجو نے بہو کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی تاہم وہ اپنے مذموم ارادے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ جیسے ہی سگی کو احساس ہوا کہ رجو کی نیت ٹھیک نہیں اور وہ اسے کسی مجرمانہ کارروائی کا نشانہ بنانا چاہتا ہے، سگی نے شور مچا کر آس پڑوس کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس کی پکار پر دیکھتے ہی دیکھتے نصف درجن مرد و زن گھر کے اندر جمع ہو گئے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ سگی نے روتے ہوئے سب کو بتایا کہ اس کا سسر کس طرح شیطان بن گیا تھا لیکن اس نے رجو کے ناپاک عزائم کو پورا نہیں ہونے دیا۔ موقع پر موجود افراد نے رجو کو لعن طعن کی۔ سگی کا میکا دھوڑاں والا میں تھا۔ اگلے روز اس اندوہناک واقعے کی خبر دھوڑاں والا پہنچ گئی۔ دھوڑاں والا سے برکت بی بی اور طافو آ گئے۔ ایک مرتبہ پھر گھر میں کچہری لگی اور برکت بی بی نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے جائے گی۔ طافو بھی اپنی ماں کی حمایت میں ایسا ہی چاہتا تھا لیکن گاؤں والے صلح صفائی کے حق میں تھے۔ دو دن سے اسی موضوع پر بحث و تکرار کا عمل جاری تھا۔ جب یہ بحث نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تو سگی کی ماں اور بھائی انصاف کے حصول کے لیے میرے پاس چلے آئے تھے۔

''تھانے دار صاحب! مجھے انصاف چاہیے۔'' برکت بی بی نے بڑے جوش سے کہا۔ ''اس گھر میں میری بیٹی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے کر ہی جاؤں گی۔ آپ کو اس سلسلے میں میری مدد کرنا چاہیے۔''

اس معاملے کی کئی کڑیاں میری نگاہ سے اوجھل تھیں۔ صورت حال کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ''برکت بی بی!'' میں نے سگی کی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس افسوسناک واقعے کا مرکزی کردار بابا رجو ہے جس نے تمہاری بیٹی یعنی اپنی بہو کے ساتھ دست درازی کی۔ تمہاری بیٹی کی خوش قسمتی کہ بابا رجو اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ قانون کی نظر میں بابا رجو مجرم ہے لیکن تم اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کر رہی ہو۔ اگر تمہیں سگی کو اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے کر جانا ہے تو اس سلسلے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ یہ تو خالصتاً تمہارا گھریلو معاملہ ہے۔''

''بابا رجو جائے دوزخ میں جی۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''اسے کوئی سزا دلوانے کا مجھے کوئی چاؤ نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میری سگی کی عزت محفوظ رہے اور ظاہر ہے، یہ کام کڑیاں والا میں تو ہو نہیں سکتا۔''

''ہم نے سگی کو تو یہاں چھوڑنا ہی نہیں جناب۔'' طافو بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تو اس شادی کے حق میں ہی نہیں تھا۔ ابا کی زور زبردستی سے یہ رشتہ ہو گیا۔ ابا تو اس دنیا سے چلا گیا اور ہم بھگت رہے ہیں۔''

نذیراں نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ سگی کو تو یہ لوگ اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے ہی جائیں گے۔ آپ کے پاس آنے کا مقصد یہ ہے کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ان پر الزام نہ آئے۔''

ان لوگوں کی آمد کے سبب کا سیدھا سادہ جواب تو یہ تھا کہ...... میری طرف سے اجازت ہے۔ برکت اور طافو سگی کو اپنی ساتھ لے جائیں۔ ظاہر ہے، کڑیاں والا میں جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے بعد بابا رجو کے ساتھ رہتے ہوئے

ہر لمحہ سگی کو خطرہ لاحق تھا لیکن سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ...... میں کون ہوتا ہوں یہ اجازت دینے والا؟ اگر یہاں پر فریق ثانی یعنی بابا رجو بھی موجود ہوتا اور وہ سگی کے راستے کی رکاوٹ بن رہا ہوتا تو پھر قانون اس خالصتاً گھریلو معاملے میں مداخلت کا حق رکھتا تھا لیکن ابھی تک میرے سامنے جو کچھ بھی آیا وہ یکطرفہ تھا۔

میں نے باری باری ان پانچوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر برکت بی بی سے سوال کیا۔ ''سگی کی عزت کا رکھوالا کہاں ہے؟''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب؟'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے تکنے لگی۔

''میں سگی کے خاوند کا پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس منظر میں کہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔ سگی کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا اور وہ دم دبا کر کہاں چھپا بیٹھا ہے؟''

خورشید بیگم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جمیل ادھر نہیں ہوتا۔''

خورشید کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ برکت بی بی ... کی پھوپی زاد تھی۔ جمیل سے اس کی مراد یقیناً سگی کا شوہر ہی تھی۔ اب بات کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ جمیل کے غیاب میں بابا رجو نے اپنی بہو پر ہاتھ ڈالا تھا۔

''ادھر نہیں تو پھر کدھر ہوتا ہے سگی کا گھر والا؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''جمیل گوجرانوالہ میں ہوتا ہے تھانے دار صاحب۔'' برکت بی بی نے بتایا۔

''جب سگی کڑیاں والا میں ہے تو پھر جمیل گوجرانوالہ میں کیوں ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ وہاں کپڑے کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مہینے میں ایک بار دو دن کے لیے جمیل کڑیاں والا آتا ہے پھر واپس گوجرانوالہ چلا جاتا ہے۔ آج کل بھی وہ وہاں فیکٹری ہی میں ہے۔''

''کیا جمیل کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی ہے؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''نہیں جناب! اس بے چارے کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے باپ نے سگی کے ساتھ کیسا برا سلوک کیا ہے۔'' خورشید بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے برکت بی بی سے کہا ہے کہ وہ سگی کو اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے جائے۔ جب جمیل اپنی ماہ وار چھٹی پر آئے تو پھر سب کو سامنے بٹھا کر بات کریں گے۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جمیل کے آنے میں کتنے دن باقی ہیں؟''

''ہر مہینے کی سات تاریخ کو اسے فیکٹری سے تنخواہ ملتی ہے۔'' برکت بی بی نے بتایا۔ ''اس کے بعد ہی وہ کڑیاں والا کا چکر لگاتا ہے۔''

سات تاریخ آنے میں ابھی دس بارہ دن باقی تھے۔ میں نے برکت بی بی سے پوچھا۔ ''کیا سگی کو دھوڑاں والا لے جانے سے کسی نے تمہیں روکا ہے؟''

''روکا ہے۔۔۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کون رکاوٹ ڈال رہا ہے؟''

''وہی منحوس بڈھا رجو......'' وہ تلخی سے بولی۔

''کیا کہتا ہے وہ؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''وہ ایک ہی بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک جمیل گھر نہیں آتا، وہ سگی کو کہیں نہیں جانے دے گا۔'' خورشید بیگم نے بتایا۔ ''وہ کہتا ہے، ساری بات جمیل کے سامنے ہو گی پھر وہ جو فیصلہ کرے گا، اسے منظور ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بابے رجو کے پاس بھی اپنے حق میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ورنہ وہ قصوروار نظر آنے کے باوجود بھی اس ضد پر اڑا نہ رہتا......''

''اس کے پلے کچھ نہیں ہے تھانے دار صاحب۔'' برکت بی بی نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔ ''وہ صرف کھمبا نوچ رہا ہے۔ اس کا کالا کرتوت سب کے سامنے کھل چکا ہے۔ شاید اس کا یہ خیال ہو کہ وہ اپنے بیٹے کے کان بھر کر اسے سگی کے خلاف کر دے گا لیکن میں اس کی یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

''جناب! اس بڈھے مردود کی ضد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' طافو نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت سگی کو اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے جاؤں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا راستہ روکے لیکن میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا، اسی لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ لوگ اپنے مسئلے کے حل کے لیے میرے پاس آئے ہو۔'' میں نے باری باری ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا آپ میرے فیصلے کو ماننے کے لیے بھی تیار ہوجائیں گے؟"

"جی تھانے دار صاحب۔" برکت بی بی سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "آپ سیانے بیانے ہیں۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔"

میں نے طافو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جوان! مجھے تمہاری یہ ادا بہت اچھی لگی ہے کہ تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم آیندہ بھی اسی روش کو اپنائے رکھو.....!"

"میں وعدہ کرتا ہوں جناب کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں بہت امن پسند بندہ ہوں لیکن بہن کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ بابے رجو کی حرکت سے میرا خون کھول اٹھا ہے۔ جی چاہتا ہے، اس بڈھے کی مکی مروڑ دوں۔"

"کنٹرول.....!" میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "اپنے غصے کو قابو میں رکھو طافو۔ جذباتی فیصلے بہت نقصان دہ... ہوتے ہیں۔"

"تھانے دار صاحب! آپ کوئی فیصلہ سنانے والے تھے.....!" عدیل عرف کاکا نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"فیصلہ تو بعد میں سناؤں گا۔" میں نے کاکا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے ذرا تم اپنا تعارف تو کرادو؟"

عدیل عرف کاکا کی عمر بتیس تینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ اکہرے بدن کا مالک درمیانہ قد سنگل پسلی کا شخص تھا تاہم اس کی آنکھوں میں مقناطیسی چمک پائی جاتی تھی۔ اس کا بدن بھی خاصا پھرتیلا نظر آتا تھا۔ اسے صحیح معنوں میں چاق و چوبند کہا جاسکتا تھا۔ میں نے اس کا تعارف اس لیے بھی مانگ لیا تھا کہ ابھی تک میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں آیا تھا۔ میں اس کی حیثیت کا تعین کرنا چاہتا تھا جبکہ طافو، برکت بی بی اور خورشید بیگم کے بارے میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ تینوں متاثرہ سگی کے رشتے دار ہیں اور نذیراں بھی کڑیاں والا سے تعلق رکھتی تھی۔

"میں ادھر کڑیاں والا ہی میں ہوتا ہوں تھانے دار صاحب۔" کاکا نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "گاؤں میں میری کریانے کی دکان ہے۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ اس معاملے سے میرا کیا لینا دینا..... تو میں خود ہی بتا دیتا ہوں کہ میں طافو کی وجہ سے ساتھ آ گیا ہوں۔"

"کاکا ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب۔" طافو نے کاکا کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "کاکا سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ یہ میرا دوست ہے اور میں ہی اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

میں نے اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلائی پھر برکت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "سگی کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"لگ بھگ تین سال۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "اس کے کتنے بچے ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں تھانے دار صاحب۔"

"کیا مطلب!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ان تین سالوں میں اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی؟"

"نہیں جناب۔" وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"اس گھر میں سگی اور بابے رجو کے علاوہ اور کتنے افراد رہتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"کوئی نہیں۔" برکت بی بی نے سادگی سے بتایا۔

"اوہ.....!" میں نے متاسفانہ انداز میں ایک گہری سانس خارج کی۔

"اسی لیے....." خورشید بیگم زور دے کر بولی۔ "اسی لیے تو ہم نہیں چاہتے کہ سگی شیطان بڈھے کے ساتھ اس گھر میں رہے۔"

"بابے رجو کی نیت میں فتور ہے تھانے دار صاحب۔" نذیراں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "یہ تو دو دن سے سگی کی ماں اور بھائی اس گھر میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں تو ذرا اطمینان ہے ورنہ اس بڈھے نے جیسی حرکت کی ہے اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔"

"تھانے دار صاحب! میں تو آپ سے یہی درخواست کروں گی کہ آپ برکت بی بی اور طافو کو اس بات کی اجازت دے دیں کہ یہ لوگ سگی کو.... دھوڑاں والا لے جائیں۔" خورشید بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔"

"چارے کا دروازہ تو توبہ کے دروازے کی طرح کبھی بند نہیں ہوتا خورشید بیگم۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا..... "بہ شرطیکہ کوئی چارہ گر میسر آجائے۔"

"تو آپ کوئی چارہ گری کریں نا تھانے دار صاحب۔" برکت بی بی نے کہا۔ "ہم آپ کے پاس اسی

لیے تو آئے ہیں....."

ان لوگوں نے اپنی اپنی باری پر حسب توفیق صورت حال کو جس انداز میں میرے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی روشنی میں تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ بابا رجو گندے کردار، غلیظ نیت کا مالک ایک ہوس پرست بڈھا تھا لہٰذا اس کے سائے میں کسی بھی عورت کی عزت محفوظ نہیں تھی چنانچہ ان سب کا خواہش بھرا اصرار یہی تھا کہ سگی کو پہلی فرصت میں اپنے میکے دھوڑاں والا چلے جانا چاہیے۔

ان خواتین و حضرات کی خواہش رہی ایک طرف۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ تھا بابا رجو.....!

ابھی تک میں نے اس ستر سالہ بڈھے کا نام ہی سنا تھا یا پھر اس کے "کارنامے" سے مجھے آگاہ کیا گیا تھا۔ میں اس سے ملا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں اس "کارنامے" کے سوا اور کچھ جانتا تھا۔ جو حالات میرے سامنے رکھے گئے تھے ان کے مطابق تو واقعی رجو کے سائے میں سگی کی عزت کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی مگر یہاں پر یہ سوال سر اٹھاتا تھا..... سگی تو پچھلے تین سال سے رجو کے ساتھ اس گھر میں رہ رہی تھی۔ اس عرصے کے دوران میں کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما کیوں نہ ہوا؟ دو روز پہلے ایسا کیا ہو گیا تھا کہ بابے رجو کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور وہ اپنی بہو کی عزت سے کھلواڑ کرنے کا سوچ بیٹھا؟

صورت حال اگرچہ واضح نہیں تھی لیکن میرے ذہن کے کسی حصے میں یہ خیال موجود تھا کہ اس سارے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا گڑبڑ؟ یہ سردست مجھے معلوم نہیں تھا تاہم اس حوالے سے میرا دل پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میں ایک تھانے دار تھا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کی تربیت کی وجہ سے میں ہر معاملے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی تھا۔

"آپ لوگوں کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ فی الحال سگی کو کڑیاں والا ہی میں رہنے دو۔" میں نے برکت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کا دھوڑاں والا جانا مناسب نہیں ہے۔"

"آپ بھی بابے رجو والی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" برکت بی بی نے قدرے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ "ہم جمیل کا انتظار نہیں کر سکتے۔ اس کے آنے میں تو ابھی آٹھ دس دن باقی ہیں۔"

"آٹھ دس نہیں، صرف دو دن۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو کیا جمیل دو دن بعد کڑیاں والا آنے والا ہے؟" خورشید بیگم نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

"فی الحال آپ لوگ جمیل کو بھول جائیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دو دن میں اپنی تفتیش کے لیے مانگ رہا ہوں۔ میں ایک ہی دن میں پتا چلا لوں گا کہ گڑبڑ کہاں پر ہے پھر اگر ضرورت پڑی تو جمیل کو بھی گوجرانوالہ سے بلا لیا جائے گا۔"

"تو کیا ہم دو دن تک ادھر ہی بیٹھے رہیں؟" برکت بی بی نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ "میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اپنی بیٹی کو اس شیطان کے پاس اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم سگی کو رجو کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "تم اگر واپس دھوڑاں والا نہیں جانا چاہتی ہو تو ادھر ہی رک جاؤ اور اگر تمہاری واپسی ناگزیر ہے تو ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔"

"کون سا دوسرا راستہ؟" برکت بی بی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"خورشید بیگم تمہاری پھوپی زاد ہے۔" میں نے کہا۔ "اس رشتے سے یہ سگی کی پھوپی، چاچی، خالہ یا ممانی ہوئی نا۔ خورشید بیگم کڑیاں والا کی وسنیک ہے۔ دو دن یہ سگی کی حفاظت کرلے گی۔"

"نہ جی نہ....." خورشید بیگم اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "میں تو بابے رجو کے گھر میں قدم بھی نہ رکھوں۔ اپنی عزت سب کو پیاری ہوتی ہے تھانے دار صاحب.....!"

"میں نے یہ کب کہا کہ تم دو دن تک رجو کے گھر میں قیام کرنا؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "پھر..... کیا مطلب ہے، آپ کا جی؟"

"تم ایک دو دن کے لیے سگی کو اپنے گھر میں بھی تو رکھ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہاری بیٹیوں جیسی ہے۔"

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔" وہ رضامندی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں سگی کو اپنے گھر میں رکھ لوں گی..... آپ جتنے دن کے لیے بھی کہیں گے۔"

"جتنے دن بھی نہیں....." میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "کم از کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ دو دن!"

"خورشید! اگر ایک دو دن کی بات ہے تو ہم ماں بیٹا بھی تمہارے پاس ہی رک جاتے ہیں۔" برکت بی بی

نے کہا۔ ''پھر ہم سگی کو اپنے ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔''
خورشید بیگم نے برکت بی بی کی تجویز سے اتفاق کرلیا۔

☆☆☆

میں نے ان لوگوں سے دو دن کی مہلت اس لیے نہیں لی تھی کہ میں اس دوران میں حقائق کی تہ تک پہنچنے کے لیے کوئی چلہ یا وظیفہ کرنا چاہتا تھا۔ میں ایک پریکٹیکل انسان ہوں اور ''عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی'' کے مصداق عمل کے میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کو ترجیح دیتا ہوں اور یہی میرے پیشے کا تقاضا بھی ہے۔ اگر پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ڈھانچا ضعیف الاعتقادی پر استوار ہوتا تو چاق و چوبند بیدار مغز اہل کار بھرتی کرنے کے بجائے کسی دور تک پہنچے ہوئے بابا کو تھانے میں بٹھا دیا جاتا۔

برکت بی بی اینڈ کمپنی کے جانے کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر حسنہ کو تھانے بلالیا۔ حسنہ کا تعلق گجرات کے ایک معروف علاقے بھالیہ سے تھا لیکن وہ کسی ایک جگہ ٹکتی نہیں تھی۔ گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ وغیرہ کے مختلف علاقوں میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ حسنہ کا کوئی باقاعدہ گھر بار نہیں تھا۔ اکیلی جان تھی دو کمرے نہ تو اس کے ساتھ ہزار دکھ تھے اور نہ لاکھ غم۔ وہ ایک من موجی قسم کی عورت تھی اور وہ مرد و زن دونوں اصناف انس میں یکساں طور پر گھلنے ملنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔

''جی ملک صاحب!'' رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''حکم کریں جناب......''

حسنہ میرے لیے بہ حیثیت مخبر کام کرتی تھی۔ مجھے جب بھی درپردہ رہ کر کہیں سے اہم معلومات حاصل کرنا ہوتی تھیں تو میں اس مقصد کے لیے حسنہ کو ایک مہرے کے طور پر آگے بڑھا دیا کرتا تھا۔ اگر اس کی فراہم کردہ اطلاعات مفید ثابت ہوتیں تو میں اسے اپنی جیبِ خاص سے انعام بھی دیا کرتا تھا۔

میں نے حسنہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''میں اس واقعے کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کرسکتی ہو؟''

''وقت کتنا ہے آپ کے پاس؟'' اس نے دلچسپی بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ایک سے دو دن۔''

''یہ تو اچھا خاصا وقت ہے ملک صاحب۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے چاہییں ہوں گے۔ ایک مختصر سی ملاقات بابے رجو سے، چند ہمدردی بھری باتیں سگی سے اور بس...... اپنا مقصد حاصل ہوگیا۔''

حسنہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی تاہم اس نے کبھی اپنا خیال نہیں رکھا تھا لہٰذا پچاس کے آس پاس دکھائی دیتی تھی۔ اس کی رنگت سانولی تھی مگر چہرے اور بدن کے خال و خد میں ایک خاص نوعیت کی کشش پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی شخصیت اور بات چیت سے سامنے والے کو بہ آسانی مرعوب کرلیتی تھی۔ حسنہ نام اس کی ذات پر بہت جچتا تھا۔

اس کے انداز اور آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کیس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''کیا تم بابے رجو یا سگی کو پہلے سے جانتی ہو؟''

''رجو سے دو چار بار میری ملاقات ہوچکی ہے مگر یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن سگی سے آج پہلی مرتبہ ملوں گی۔ پچھلے چار سال سے میرا کڑیاں والا کی طرف جانا نہیں ہوا۔''

''بابے رجو کے بارے میں تمہارے کیا تاثرات ہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا اس سے ایسی گھٹیا حرکت کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟''

''کسی حد تک رکھی جاسکتی ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ ذرا کھل کر بتاؤ۔''

''کھل کر تو واپسی پر ہی بتاسکوں گی ملک صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''اپنا کام مکمل کرنے کے بعد......''

''تمہاری باتیں میرے اندر بہت زیادہ تجسس پیدا کررہی ہیں حسنہ۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی پڑے گا اور وہ بھی کام شروع کرنے سے پہلے!''

''فی الحال یہ جان لیں کہ بابا رجو خاصا ٹھرکی بڈھا ہے۔'' وہ ایک خاص زاویے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''عورت کو دیکھتے ہی اس کی رگ پھڑک اٹھتی ہے۔ دو چار بار ہنسی مذاق میں مجھ پر بھی ڈورے ڈال چکا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ اپنی بہو کے ساتھ ایسی نیچ حرکت بھی کرسکتا ہے۔''

''مجھے تمہاری واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک آنکھ دبا کر بولی۔ ''مینے گئی تے مُڑ کے آئی......''

میں حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گئی۔ وہ جس عزم کے ساتھ میرے پاس سے رخصت ہوئی تھی اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑا تیر مار کر ہی لوٹے گی!

حسنہ کی باتوں نے میری سوچ کو ایک نئے دھارے پر ڈال دیا تھا۔ اگر بابا رجو واقعی اسی ٹائپ کا بڈھا تھا جیسا حسنہ نے بتایا تھا تو پھر برکت بی بی اور اس کے ساتھ آنے والے افراد کے کلیم کو رد کرنا آسان نہیں تھا۔ جب ماضی میں رجو حسنہ کو پھنسانے کی تگ و دو میں بھی رہا تھا تو پھر اسے ایک سیدھا سادہ بی بابڈھا نہیں سمجھا جاسکتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں، رجو کے بارے میں اس انداز میں سوچتے ہوئے میرا دل مطمئن نہیں تھا۔

بعض رشتے اتنے مقدس ہوتے ہیں کہ ان کے حوالے سے اس طرز کا خیال بھی ناقابلِ یقین ہی لگتا ہے۔ بہو اور سسر کا رشتہ بھی اسی نوعیت کے تقدس کا حامل ہوتا ہے۔ ساس بہو کے رشتے میں تو پھر بھی ازلی بدی بیر پایا جاتا ہے لیکن عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہو اور ساس کے بالعکس بہو اور سسر کے رشتے میں خاصا اتفاق پایا جاتا ہے لیکن شیطان کی موجودی اور کاری گری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جب یہ مردود کسی کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے تو پھر بعض پارسا کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور بابے رجو کے بارے میں تو حسنہ خاصے مشکوک خیالات کا اظہار کرکے گئی تھی۔

مرد کے بارے میں کسی عورت کے ریمارکس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور حسنہ نے تو رجو کے لیے ''ٹھرکی بابا'' کا ٹائٹل بھی اناؤنس کردیا تھا مگر میرا دل اس حوالے سے ہرگز مطمئن نہیں تھا۔ چور چوری سے جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے نہیں۔ اگر رجو کا کردار حسنہ کے بیان کے عین مطابق تھا تو پھر سگی تین سال سے بچی ہوئی کیسے تھی؟ حقیقت جو بھی تھی اس پر سے پردہ اٹھنے ہی والا تھا۔ میں بے تابی سے حسنہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

حسنہ اپنے کام کی ماہر اور ہرفن مولا قسم کی عورت تھی۔ اس نے زیادہ دیر تک مجھے انتظار کی کوفت میں مبتلا نہیں رکھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی وہ کڑیاں والا سے لوٹ آئی۔ اس کے چہرے سے جھلکنے والے جوش نے مجھے بتادیا کہ وہ ادھر سے خاصا سنسنی خیز مواد اکٹھا کرکے لائی تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے میرے سامنے آکر بیٹھی اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ملک صاحب! نکالیں میرا انعام۔''

''کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم کڑیاں والا سے کوئی ایسی خبر لائی ہو جس کی روشنی میں تمہیں انعام کا حق دار ٹھہرایا جائے......!''

''ملک صاحب! میں تو آپ سے اپنی محنت کا صلہ مانگ رہی ہوں۔'' وہ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے بولی۔ ''اس بات کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے کہ میری فراہم کردہ معلومات آپ کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہیں یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''تم رپورٹ پیش کرو۔''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں حسنہ نے جو سنسنی خیز انکشاف کیے میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس تنازع کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ کسی بھی لحاظ سے تھانے کچہری کا کیس نہیں بنتا تھا لیکن سگی کے ورثا اور حمایتی اس معاملے کو میرے پاس لے ہی آئے تھے تو ان کی دادرسی کرنا میرا فرض بنتا تھا اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کتنا فرض شناس ہوں! اس کے علاوہ میں اگر کسی انسان سے کوئی وعدہ کرلیتا ہوں تو اسے ہر حال میں ایفا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے ایفائے عہد کے اصول کو نبھاتے ہوئے حسنہ کو اپنی جیب سے پورے پانچ روپے انعام دے کر رخصت کردیا۔ پانچ روپے کے اماؤنٹ پر میرا مذاق اڑانے کی کوشش نہیں کیجیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آج کل کسی بچے کو پانچ روپے دیں تو وہ برا سا منہ بناتا ہے مگر یہ واقعہ آج سے برسوں پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں پانچ روپے میں دو ڈھائی من گندم آجاتی تھی۔ آپ اس رقم کو آج کے ساڑھے تین، چار ہزار روپے سمجھ لیں۔

☆☆☆

حسنہ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، رمضان عرف بابا رجو کی تین اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بڑی بیٹی صفیہ کی عمر چالیس کے آس پاس تھی اور وہ وزیر آباد کے ایک گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ صفیہ سے چھوٹی رضیہ پینتیس سال کی تھی۔ اس کی سسرال حافظ آباد میں تھی۔ بیٹا جمیل جیسا کہ آپ کو معلوم ہوچکا کہ وہ گوجرانوالہ کی ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم تھا اور ابھی تک جمیل کو اس واقعے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ بابے رجو

کی بیوی زبیدہ کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ زبیدہ نے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی تھی۔ اس کے بعد سے رجو اور سکی اس گھر میں اکیلے رہ گئے تھے۔

حسنہ نے مجھے بتایا کہ بابا رجو جوانی اور ادھیڑ عمری میں خاصا تیز تھا اور عورتوں سے بات کرنے، بے تکلف ہونے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ کڑیاں والا میں رجو کی ذات سے منسوب اس قسم کے بہت سے واقعات گردش کرتے رہتے تھے۔ حسنہ نے مجھے ایک دو اپنے قصے بھی ایسے ہی سنائے جب رجو نے اسے اپنی جانب راغب کرنے کے لیے جال پھینکا تھا۔ میں ان واقعات کی تفصیل میں جائے بغیر آگے بڑھتا ہوں۔

اس وقت بابا رجو ستر سال کا ہو چکا تھا۔ یہ ایک اچھی خاصی سمجھ داری اور تجربہ کاری کی پختہ عمر ہوتی ہے۔ انسان کے مزاج میں ٹھہراؤ اور بات میں وزن پیدا ہو جاتا ہے مگر۔۔ بابا رجو نے خود کو زیادہ تبدیل نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر گاؤں کے ایک چوراہے میں چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا اور آتی جاتی عورتوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سیکتا رہتا تھا۔ وہ لوگوں کو یہی باور کراتا تھا جیسے اس کی نگاہ کمزور ہو گئی ہے۔

جب کوئی اس کے قریب پہنچ کر سلام کرتا تو وہ اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ کا چھجا بنا کر چند لمحے اسے دیکھتا رہتا پھر انجان سے انداز میں پوچھتا۔

''توں کون ایں۔۔۔۔۔؟''

مطلب، تم کون ہو؟ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو ضعفِ نگاہ کے سبب پہچانا نہیں لیکن اگر کسی عورت کا معاملہ ہوتا تو بابے رجو کاری ایکشن بہت ہی منفرد اور جداگانہ ہوتا تھا۔ وہ پچاس، ساٹھ اور سو گز کے فاصلے سے گزرنے والی عورت کو دیکھ کر فوراً سے پیشتر پکار اٹھتا تھا۔

''اے چیرے تیلی دی زنانی کدھر جا رہی اے۔۔۔۔۔؟''

''او نیلی قمیص والی نیاز موچی دی دھی اے۔۔۔۔۔!''

اسی نوعیت کے لاتعداد تبصرے بابے رجو کی زبان سے جاری وساری رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کڑیاں والا کی چند لڑکیاں گاؤں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جا رہی تھیں تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ان لڑکیوں کو بابے رجو کے قریب سے گزر کر کھیتوں میں جانا تھا۔ بابا بہت دیر سے اپنی تجربہ کار کیمرا آنکھوں کو ان مٹیاروں پر لگائے بیٹھا تھا۔ لڑکیوں کو بابے رجو کی عادت کا بہ خوبی علم تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ بابا بڑے خضوع وخشوع سے انہیں تاڑ رہا ہے۔ جب وہ بابے کے سامنے سے گزر گئیں تو ان میں سے ایک شوخ و شنگ لڑکی پلٹ کر واپس آئی اور رجو سے شرارت بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''بابا جی۔۔۔۔۔کوئی کڑی پسند وی آئی یا ٹائم ضائع کیتا جے۔۔۔۔۔؟''

اس پر باقی مٹیاروں نے دل کھول کر قہقہے لگائے اور چہلیں کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ بابا رجو ایک لمحے کے لیے جھینپ کر رہ گیا پھر غصیلے لہجے میں بڑبڑایا۔

''اوئے خانہ خراب دی بچیو۔۔۔۔۔اپنے پیو کے ساتھ بھی ایسا مذاق کرتی ہو۔۔۔۔۔؟''

بابا رجو کی جیسی حرکتیں تھیں اس کے باعث بابے کو اکثر وبیشتر اس قسم کی صورتِ حال سے گزرنا پڑتا تھا لیکن وہ تھا بڑا مستقل مزاج۔ وہ گردن کے ایک جھٹکے سے ساری ہزیمت اور کوفت کو دور بھگا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا تھا۔ اس ٹائپ کا ایک آدھ بڈھا ہر گاؤں اور ہر علاقے میں پایا جاتا ہے۔ کڑیاں والا کے بابے رجو پر اچانک بڑا سنگین الزام آ گیا تھا۔ یہ محض دل پشوری کرنے اور آنکھیں سینکنے کا معاملہ نہیں تھا۔ سکی کے حوالے سے جو خبر وہاں کی فضا میں گردش کر رہی تھی وہ اس بڈھے ٹھرکی بابا کا کباڑا بھی کر سکتی تھی۔ اس نوعیت کے شوق ایک دن انسان کو بری طرح ذلیل کراتے ہیں۔ رجو بھی مصیبت میں آ گیا تھا۔

حسنہ نے جب سکی سے اظہارِ ہمدردی کیا تو وہاں سے یہ اسٹوری نکل کر سامنے آئی تھی۔ حسنہ نے سکی سے ہونے والی بات چیت کو اس انداز میں میرے سامنے پیش کیا۔

''سکی! تمہارے ساتھ جو بھی ہوا مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔'' حسنہ نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بابا رجو تمہارے باپ کی جگہ ہے۔ یہ حرکت کرتے ہوئے اسے ذرا شرم نہ آئی۔ انسان بعض اوقات اپنی حیثیت کو کس قدر گرا لیتا ہے نا۔۔۔۔۔''

''انسان۔۔۔۔۔!'' سکی نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے حسنہ کی طرف دیکھا۔ ''رجو کو انسان کہنا انسانوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ چاچی! تم بھی تو اس کے بارے میں کافی کچھ جانتی ہو۔۔۔۔۔!''

سکی نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا اور حسنہ اس فقرے کے اندر چھپے ہوئے طنز کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے اشارے تک پہنچ گئی ہوں کیونکہ اس حوالے سے میرے چند ذاتی تجربات بھی ہیں۔ تم مجھے بتاؤ،

اس دن کیا ہوا تھا؟''

''جب تک میری ساس زبیدہ زندہ تھی، سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ چاچی! تم جانتی ہو، جمیل ادھر گوجرانوالہ میں ہوتا ہے اور مہینے میں دو تین دن کے لیے ہی گاؤں آتا ہے لیکن زبیدہ کی وجہ سے مجھے بڑا حوصلہ رہتا تھا۔'' سکی نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''بابے رجو کے بارے میں، میں نے بہت سی باتیں سن رکھی ہیں لیکن میں نے کبھی ایسے قصوں پر دھیان نہیں دیا۔ میں نے ہمیشہ رجو کو اپنے باپ کی جگہ سمجھا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس انسانی شکل والے بڈھے کے اندر کوئی شیطان چھپا بیٹھا ہے۔۔۔۔۔''

بولتے بولتے سکی کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور وہ اپنے دوپٹے سے بھیگی ہوئی آنکھوں کو خشک کرنے لگی۔ حسنہ چند لمحات تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پوچھا۔

''کیا اس سے پہلے بھی رجو نے اس قسم کی کوئی حرکت کی؟''

''نہیں!'' سکی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اتنا حوصلہ رجو میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔''

''اتنا حوصلہ۔۔۔۔۔!'' حسنہ نے اس کے الفاظ پکڑ لیے۔ ''میں سمجھی نہیں سکی۔ اتنا حوصلہ سے تمہاری کیا مراد ہے۔۔۔۔۔کیا پہلے وہ اس سے کم حوصلے کا مظاہرہ کر چکا ہے؟''

''چاچی! بات دراصل یہ ہے کہ جب تک میری ساس اس گھر میں موجود تھی، مجھے کسی قسم کی کبھی فکر نہیں رہی تھی۔'' سکی بوجھل آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس کے بعد سے مجھے اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس رہنے لگا تھا۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔۔۔۔۔''

حسنہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا اس دھڑکے کا سبب بابا رجو ہی تھا؟''

''ہاں۔۔۔۔۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔ ''میں نے رجو کے رویے میں بڑی واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ مجھے دیکھنے اور بات کرنے کے حوالے سے اس کا انداز بدل گیا تھا۔ میں اس تبدیلی کو محسوس تو کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رجو ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ بس۔۔۔۔۔ مجھے اس کی طرف سے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا۔''

''کیا تم نے کبھی اپنے اس ڈر اور خوف کے بارے میں جمیل کو بتایا تھا؟'' حسنہ نے بہت اہم سوال کیا۔

''ایک آدھ بار میں نے جمیل سے اپنے احساسات کا ذکر کیا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''پھر۔۔۔۔۔ پھر جمیل کیا بولا؟'' حسنہ نے کرید کا عمل جاری رکھا۔

''جمیل نے میری بات سن کر بہت مذاق اڑایا تھا۔'' سکی نے بتایا۔

''مذاق کیوں اڑایا تھا؟'' حسنہ نے کہا۔ ''یہ تو خاصا سنجیدہ معاملہ تھا!''

''کاش۔۔۔۔۔جمیل نے اس معاملے کو سنجیدہ لیا ہوتا!'' سکی نے دکھی لہجے میں کہا۔

''جمیل نے کس طرح تمہارا مذاق اڑایا تھا؟'' حسنہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''مطلب، اس نے کیا کہا تھا؟''

''وہ بولا، میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' سکی ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کہا بابا رجو میرے باپ کی طرح ہے۔ وہ مجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے اس لیے مجھے ایسی فضول باتوں کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دینا چاہیے۔ میں نے جمیل سے پوچھا اور وہ جو پورے کڑیاں والا کے لوگ بابے کے بارے میں رائے رکھتے ہیں اس کا کیا؟ وہ بولا، تم نے پورے پنڈ کا ٹھیکا نہیں لیا ہوا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم ابا کے سائے میں محفوظ ہو لہٰذا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''جمیل کی تسلی اور تشفی بھری باتوں سے میں مطمئن ہو گئی اور جمیل گوجرانوالہ چلا گیا پھر چند روز بعد یہ واقعہ پیش آ گیا۔۔۔۔۔''

یہاں تک پہنچ کر سکی رک گئی، حسنہ نے بڑی اپنایت سے سوال کیا۔ ''واقعہ کے روز کیا ہوا تھا؟''

''اس دن میں گھر کے کام کاج سے نمٹنے کے بعد سودا سبزی لینے دکان پر چلی گئی۔'' سکی نے جواب میں بتایا۔ ''تھوڑی دیر کے بعد میں واپس آ گئی۔ میں نے سودا باورچی خانے میں رکھا اور خود اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ہمارے گھر میں پہلو بہ پہلو دو کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک میں بابا رجو اور دوسرے میں جمیل اور میں رہتے ہیں اور جمیل کی غیر موجودگی میں، اس کمرے میں، میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔ مجھے چارپائی پر لیٹے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ بابا رجو میرے کمرے میں آ گیا۔۔۔۔۔''

''پھر۔۔۔۔۔؟'' سکی کے توقف کرتے ہی حسنہ نے

اضطراری انداز میں سوال کیا۔ ”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”بابا سیدھا آ کر میری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بابا دھیمی آواز میں بولا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہم تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔“

”کیسی باتیں؟“ میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا اور چارپائی سے اتر آئی۔

بابے نے میری کلائی پکڑ لی اور ہوس بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دو چار پیار بھری باتیں.....“

اس کی مکروہ بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے برہمی سے کہا۔ ”بابا، تمہیں ذرا بھی حیا نہیں۔ چھوڑ میرا ہاتھ۔ مجھے نہیں کرنا کوئی بات۔“

”گھبراؤ نہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ وہ میری کلائی کو اور مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔“

”اس کے شیطانی عزائم کھل کر میرے سامنے آ گئے تھے۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ بابا رجو کی نیت میں فتور آ چکا تھا۔ وہ میری عزت کا جنازہ نکالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں کوئی ایسی بھی گئی گزری نہیں تھی کہ اس کی ہوس کا نشانہ بن کر اپنی عزت گنوا بیٹھتی۔ میرے اندر اتنی طاقت تھی کہ رجو جیسے دس باباؤں سے نمٹ سکتی تھی۔ میں نے ایک جھٹکا دے کر بابے کی گرفت سے اپنی کلائی کو چھڑا لیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”کوئی اور دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو لیکن اللہ تو دیکھ رہا ہے نا.....“

”دیکھو، میری بات مان لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دونوں بازو کھول کر میری جانب بڑھا۔ ”تھوڑی دیر کے لیے میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”منحوس بڈھے! میرے قریب نہیں آنا۔“ میرا دماغ گھوم گیا۔ ”اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو میں شور مچا دوں گی۔“

”میری دھمکی کا اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ اس وقت بابے کا دماغ پوری طرح شیطان کے قبضے میں تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہوس ٹپکتی تھی۔ وہ ہمارے مقدس رشتے کو بھول کر مجھے بے آبرو کرنے کی ٹھان چکا تھا۔

وہ مجھے دبوچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”شور مچاؤ گی تو اپنا ہی منہ کالا کرو گی۔ سارا الزام تمہارے ہی اوپر آئے گا۔ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا اس لیے چپ چاپ شرافت سے میری بانہوں میں آ جاؤ۔ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔“

”میری برداشت جواب دے گئی۔ میرا ذہن سود و زیاں کا حساب کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگے بڑھ کر میں نے بابے رجو کو زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر چارپائی پر جا گرا۔ میں نے گھر کے صحن میں نکل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی کہانی پورا پنڈ جانتا ہے۔“

اپنی بات کے اختتام پر سنگی سسک اٹھی۔ حسنہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”اس واقعے کو دو دن گزر گئے ہیں۔ ابھی تک جمیل کو اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟“

”یہ بابا بڑا چال باز ہے۔“ سنگی برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”یہ جان بوجھ کر دیر کر رہا ہے۔ اس نے دیکھ لیا ہے کہ معاملہ کافی حد تک دب گیا ہے۔ گاؤں والے بھی مجموعی طور پر یہی چاہتے ہیں کہ جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالو لیکن بابے رجو نے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔“

”رجو کے ذہن میں کیا ہے؟“ حسنہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”میں نے جو محسوس کیا ہے وہ بتاتی ہوں جی۔“ سنگی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”باقی رب دیاں رب ای جانے۔“

”ہاں ہاں، بتاؤ۔“ حسنہ نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہی ہوں۔“

”بابا رجو جمیل کا انتظار کر رہا ہے۔“ سنگی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”اور جمیل کے آنے میں ابھی دس بارہ دن باقی ہیں۔ اس دیر کرنے میں بابے کے دو فائدے ہیں۔ نمبر ایک، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کی ہمدردیاں بابے کے ساتھ ہو جائیں گی۔ نمبر دو، جمیل پر اس واقعے کا آدھا اثر بھی نہیں ہو گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر جمیل کو اس واقعے کے اگلے روز ہی پتا چل جاتا تو اس کی ہمدردی میرے ساتھ زیادہ اور بابے کے ساتھ کم ہوتی لیکن دس بارہ دن گزر جانے کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہو گا۔ بابا رجو اپنے بیٹے کو اپنی مرضی کی پٹی پڑھا کر میرے خلاف کر سکتا ہے۔ اس طرح سارا الزام مجھ پر آ جائے گا کہ میں نے اپنے سسر کو بدنام کرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے۔ میں بابے کی بدنیتی کے حوالے سے جمیل سے پہلے ہی ایک دو بار بات کر چکی ہوں اور اس نے اسے میرا پاگل پن کہا تھا۔

اب تو اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ سارا چکر میں نے ہی چلایا ہے اور اس کا باپ معصوم اور بے قصور ہے۔ آپ خود اندازہ لگا لو، میری پوزیشن کتنی نازک ہے.....!“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو گی۔“ حسنہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے حق میں دعا کروں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ اللہ مہربانی کرے گا۔“

حسنہ، سنگی کو تسلی دلاسا دے کر خورشید بیگم کے گھر سے اٹھ آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سنگی کی سسرال یعنی بابے رجو کے گھر میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ رجو نے پہلی ہی نظر میں حسنہ کو پہچان لیا تھا اور وہ قدرے روکھے لہجے میں بولا تھا۔

”آؤ حسنہ آؤ..... بیٹھو۔“

حسنہ اس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی اور انجان بن کر پوچھا۔ ”سنگی نظر نہیں آ رہی۔ کیا وہ دھوڑاں والا گئی ہوئی ہے؟“

”تم نے تو کافی عرصے کے بعد کڑیاں والا کا چکر لگایا ہے حسنہ۔“ بابا شاکی لہجے میں بولا۔ ”آخری مرتبہ جب تم یہاں آئی تھیں تو اس وقت ابھی جمیل کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اللہ بخشے، جب میری گھر والی زبیدہ بھی زندہ تھی۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔“ حسنہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پتا چلا تھا کہ تم نے جمیل کی شادی ادھر دھوڑاں والا کر دی ہے۔ میں نے سوچا، ادھر آئی ہوں تو چلو تمہاری بہو کو بھی دیکھ لیتی ہوں.....“ ذرا دیر کو رک کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر بابے رجو سے استفسار کیا۔

”سنگی مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟“

”ہاں..... وہ گئی ہوئی ہے۔“ بابے نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

”کہاں گئی ہے وہ؟“ حسنہ نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے بابے کی طرف دیکھا۔

وہ نفرت آمیز انداز میں بولا۔ ”جہنم میں.....!“

”رجو.....“ حسنہ چونک اٹھی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ وہ بہ دستور زہریلے انداز میں بولا۔ ”ایسے بدکردار اور بدمعاش لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہی میں ہے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھی رجو۔“ حسنہ الجھن بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

رجو چند لمحات تک بے یقینی سے حسنہ کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”کیا تمہیں کچھ بھی پتا نہیں کہ دو دن پہلے کڑیاں والا میں کون سی قیامت گزری ہے؟“

”مجھے واقعی کچھ علم نہیں۔“ حسنہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی انجان بن گئی۔ ”تم بتاؤ مجھے، آخر ہوا کیا ہے۔ کیا سنگی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے.....؟“

حسنہ کے آخری جملے میں اتنی زیادہ سنسنی خیزی تھی کہ بابا رجو دیدے گھما کر بولا۔ ”اگر وہ کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا اس کے گھناؤنے فعل سے ہوا ہے۔“

”سنگی نے ایسا کیا کر دیا رجو۔“ حسنہ اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ”تم اس پر اتنے زیادہ تپے ہوئے کیوں ہو۔ اس نے کون سا گھناؤنا کام کیا ہے؟“

”اس حرام زادی نے مجھ پر الزام لگایا ہے۔“ بابا رجو پھٹ پڑا۔ ”دو دن پہلے اس نے چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو گھر میں جمع کر لیا پھر رو رو کر انہیں بتایا کہ میں نے اس کی عزت پر مجرمانہ حملہ کیا ہے، اسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی ہے.....“

”مجھے یقین نہیں آ رہا رجو۔“ حسنہ نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔

”تمہارے یقین نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا حسنہ!“ وہ نفرت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”یہ تماشا اس نے کیا ہے تاکہ میں کڑیاں والا اور اس کے آلے دوالے والے گاؤں کے لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو کر رہ جاؤں۔“

”مگر وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟“ حسنہ اتنی آسانی سے بابے رجو کی جان چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ”آخر تم نے سنگی کا کیا بگاڑا ہے؟“

”اگر میں نے اس کا کچھ بگاڑا ہوتا تو پھر اس کی گھٹیا حرکت پر مجھے ذرا افسوس نہ ہوتا۔“

وہ مایوس کن انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اس کا سب کچھ سنوارنے کی کوشش کر رہا تھا مگر... میری بات اس بدذات کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے الٹا مجھ پر سارا ملبا ڈال دیا۔“

حسنہ کے مزید کریدنے پر بابے رجو نے اسے بتایا کہ سنگی کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ جب تک زبیدہ زندہ تھی تو اس نے سنگی پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی مگر ساس کے انتقال کے بعد سنگی کو خاصی آزادی مل گئی تھی۔ جمیل تو ویسے بھی گھر سے دور تھا لہٰذا سنگی نے خوب پر پرزے نکال لیے تھے۔ رجو کے مطابق، وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کا ارتکاب کر رہی تھی۔ رجو نے اشاروں کنایوں میں سنگی کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کی لیکن اس کی آوارگی میں کوئی فرق نہیں آیا چنانچہ ایک روز رجو نے اپنی بہو سے

دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اسی روز یہ واقعہ پیش آ گیا تھا جس کے مطابق، بابے رجو کا بیان تھا کہ وہ سنگی کو سمجھانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسی نیت سے وہ اس کے کمرے میں گیا تھا جبکہ دوسری جانب سنگی کا یہ دعویٰ تھا کہ ہوس پرست بڈھے نے موقع پا کر اس کی آبروریزی کرنے کی کوشش کی تھی۔ حقیقت جو بھی تھی، سردست وہ دونوں ایک دوسرے کی کردارکشی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

''مجھے تو لگتا ہے، یہ کسی عورت کی بددعا کا نتیجہ ہے۔'' اپنی رنج بھری داستان کے اختتام پر رجو نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''کس عورت کی بددعا؟'' حسنہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ عورت تم بھی ہوسکتی ہو......''

''رجو! یہ کیا کہہ رہے ہو'' حسنہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہیں بھلا کیوں بددعا دوں گی؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک میں کافی چکر بازیاں کرتا رہا ہوں۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے اپنی حرکتوں سے جن بہت سارے لوگوں کا دل دکھایا ہے ان میں تم بھی شامل ہو حسنہ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ زبیدہ کی موت کے بعد میں بالکل بدل گیا ہوں۔ اب میں وہ پہلے والا رجو نہیں رہا ہوں جس کا نام سن کر عورتیں اپنا راستہ تبدیل کرلیا کرتی تھیں۔ تم کافی دیر سے میرے پاس بیٹھی ہوئی ہو۔ کیا اس دوران میں تم نے مجھے کوئی نیچ اور چھچھوری حرکت کرتے دیکھا ہے یا میری کسی بات سے تمہیں محسوس ہوا ہے کہ میں کسی غلط روش پر ہوں؟''

''نہیں!'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت میں ایک بالکل مختلف بابے رجو سے ملاقات کررہی ہوں ایک سنجیدہ، بے ضرر اور عمر رسیدہ شخص۔''

''کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ انسان کا ماضی اس کے تعاقب میں رہتا ہے۔'' بابا رجو خلا میں گھورتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''انسان تمام تر کوشش کے باوجود بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ جب میں بہت کچھ کرتا تھا تو کبھی مجھ پر ایسا سنگین الزام نہیں لگا اور اب...... جبکہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سیدھی راہ پر چل پڑا ہوں تو بیٹھے بٹھائے میری بہو نے عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ میرا اللہ جانتا ہے کہ اس معاملے میں، میرا کوئی گناہ، کوئی قصور نہیں ہے لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرسکتا۔ جو بھی اس واقعے کے بارے میں سنتا ہے، اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آتا ہے...... ہاں، رجو نے یہ حرکت کی ہوگی۔ وہ تو سدا کا ایسا ہی ہے۔''

اچانک رک کر اس نے بڑی گہری نظر سے حسنہ کو دیکھا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچ رہی ہونا؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ''اگرچہ تمہارے حوالے سے ماضی میں میرا تجربہ خاصا تلخ رہا ہے مگر موجودہ صورت حال میں مجھے تمہارے الفاظ سے سچائی کی خوشبو آرہی ہے۔ میرا خیال ہے، تم غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' وہ حسنہ کی طرف دیکھتے ہوئے دعائیہ انداز میں بولا۔ ''میرے لیے بھی دعا کرنا۔ میں تو بس جمیل کا انتظار کررہا ہوں۔ وہ آئے تو اسے ساری کہانی سناؤں گا۔ پھر اس کے سامنے تین راستے رکھوں گا۔ آگے اس کی مرضی، وہ جس بھی راستے کو چن لے۔''

بابے رجو کی بات نے حسنہ کو الجھا کر رکھ دیا۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ''کون سے تین راستے؟''

''نمبر ایک......'' وہ انگلیوں پر گنواتے ہوئے بولا۔ ''جمیل گوجرانوالہ کو چھوڑ کر ادھر کڑیاں والا ہی آجائے اور یہاں پر کوئی بھی کام کاج کرلے۔ نمبر دو...... اگر وہ گوجرانوالہ کو خیرباد نہیں کہہ سکتا تو پھر سنگی کو بھی ادھر ہی لے جائے اور اپنے ساتھ رکھے۔ میاں بیوی کو زیادہ عرصے کے لیے ایک دوسرے سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ اسی سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔''

''بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے بابا۔'' حسنہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔ اب تم مجھے تیسرے راستے کے بارے میں بھی بتاؤ......!''

''تیسرا راستہ یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ سنگی کو فارغ کردے۔'' بابے رجو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''فارغ کردے......!'' حسنہ نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے بابا؟''

''مطلب بڑا سیدھا اور واضح ہے حسنہ۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر جمیل اپنی نگرانی میں سنگی کو کنٹرول نہیں کرسکتا، اس کی عزت کی حفاظت نہیں کرسکتا تو پھر اس رشتے کو ختم کرکے سنگی کو دھوڑاں والا روانہ کردے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ میں اس عمر

میں کہاں تک اس آوارہ عورت پر نظر رکھوں اور اب تو یہ میری دشمن بھی ہوگئی ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ خورشید بیگم کے گھر چلی گئی ہے ورنہ مجھے تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں، کب وہ اپنی قمیص پھاڑ کر گلی میں جا کھڑی ہو اور لوگوں کو پکار پکار کر بتانے لگے کہ میں نے اس کی عزت کو تار تار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، بدنا لوں بدنام برا......" لمحاتی توقف کرکے بابے رجو نے اپنی سانس درست کی پھر ایک افسردہ سی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"حسنہ، میرے لیے دعا ضرور کرنا۔ میں بیٹھے بٹھائے بڑی مشکل میں آ گیا ہوں۔ میں اب سگی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے اس کے سائے سے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے۔"

حسنہ نے ایک خطرناک مگر فکر انگیز سوال کیا۔ "اگر جمیل نے تمہارے بیان کردہ ان تین راستوں میں سے کسی کا بھی انتخاب نہ کیا تو......؟"

"تو پھر مجھے چوتھے راستے کا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

"چوتھا راستہ......؟" حسنہ تعجب خیز انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں...... چوتھا اور آخری راستہ۔" بابا رجو گمبھیر انداز میں بولا۔ "اگر میری بات جمیل کی سمجھ میں نہ آئی یا اگر اس نے میری بات پر یقین نہ کیا اور سگی کو سچا اور مجھے جھوٹا سمجھا تو پھر میں چپ چاپ اٹھ کر کہیں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں......؟" حسنہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کہیں بھی۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں تو مجھے بھی سر چھپانے کی جگہ مل ہی جائے گی۔ ذلت بھری اس زندگی سے تو عزت کی موت لاکھ درجے بہتر ہے۔ کسی مزار پر جا کر ڈیرا ڈال دوں گا۔ آگے جو اللہ کو منظور......"

ان لمحات میں حسنہ کو بابے رجو پر بہت ترس بھی آیا۔ وہ کہیں سے بھی ماضی والا بڈھا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حسنہ مزید تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ سگی نے جمیل سے بے وفائی کی راہ اختیار کرنے کے لیے کون سے کھونٹے کا چناؤ کیا تھا؟ مگر بابے رجو نے اس حوالے سے کوئی واضح بات نہیں کی تھی۔ حسنہ سمجھ گئی کہ وہ دانستہ سگی کے آشنا کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا یا پھر یہ کہ اس سلسلے میں کوئی نام اس کے سامنے نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ اسے کڑیاں والا کے کسی خاص وسنیک پر شک نہیں تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ سگی کو مردوں سے دل پشوری کرنے کا چسکا پڑ گیا ہے جیسا کہ اسے عمر بھر عورتوں سے دل پشوری کرنے کا شوق رہا تھا اور ایک امکان یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بابا رجو سگی کے بارے میں جو کچھ بھی سوچ رہا تھا یہ اس کے ذہن کی پیداوار تھی۔ وہ ماضی میں خود چونکہ مشکوک کردار کا مالک رہا تھا لہٰذا اسے سگی کے اندر بھی اسی نوعیت کے جراثیم دکھائی دینے لگے تھے۔

حسنہ یہ تمام تر معلومات فراہم کرنے اور اپنا انعام وصول کرنے کے بعد رخصت ہوگئی تھی۔ اس داستان کو سن کر میری سمجھ میں جو بات آئی وہ یہ تھی کہ سگی اور رجو میں سے کوئی ایک سچا اور کوئی ایک جھوٹا تھا۔ جب تک میں سچے اور جھوٹے کی شناخت نہ کر لیتا، اس کیس کو حل نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس شناخت کے لیے جمیل کا کڑیاں والا میں ہونا ضروری تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اگلی صبح کسی پولیس اہلکار کو گوجرانوالہ روانہ کردوں گا تاکہ وہ فی الفور جمیل کو اپنے ساتھ لے کر کڑیاں والا لے آئے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ اس کہانی کے تمام کرداروں کو تھانے بلا کر ان کے بیچ پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کرکے مصالحت کروانے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆

کسی سیانے کا قول ہے.... تدبیر کنند بندہ، تقدیر کنند خندہ!

اس تنازع میں بھی یہی سب ہوا تھا۔ میری تدبیر پر تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے جو کسی بندے کو گوجرانوالہ بھیج کر جمیل کو یہاں بلوانے کا پروگرام بنایا تھا وہ ایک طرف دھرا رہ گیا۔ اگلی صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک سنسنی خیز خبر میری منتظر تھی۔

بابے رجو کا پچھلی رات انتقال ہوگیا تھا!

عام حالات میں اگر رجو کی موت واقع ہوئی ہوتی تو یہ چونکنے والی بات نہیں تھی لیکن یہاں پر حالات عام نہیں تھے۔ پچھلے تین دن سے کڑیاں والا میں بابے رجو کی ذات موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس کے انتقال کی خبر نے مجھے تشویش میں ڈال دیا اور میں کانسٹیبل عارف کو ساتھ لے کر کڑیاں والا پہنچ گیا۔

ہم ایک تانگے پر سوار ہوکر کڑیاں والا آئے تھے۔ کوچوان نے تانگا رجو کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر چوک میں روک دیا۔ ہم تانگے سے اتر کر رجو کے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

رجو کے دروازے پر آٹھ دس افراد جمع تھے، جن

میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ میں اور کانسٹیبل عارف یونیفارم میں تھے لہٰذا ہمیں دیکھتے ہی وہ لوگ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ میں نے ایک سنجیدہ صورت شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا ہوا رجو کو۔ اس کی موت کیسے واقع ہوئی ہے؟"

"یہ تو کسی کو پتا نہیں جناب کہ رجو کی موت کا سبب کیا ہے۔" وہ شخص معصومیت بھرے لہجے میں بولا۔

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "لگتا ہے، گناہ کے بوجھ نے اس کی جان لے لی ہے۔"

"مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے اسے صدمے نے ختم کردیا۔" میرے عقب سے ایک آواز ابھری۔ "اس پر سگی نے جتنا بڑا الزام لگایا تھا، رجو اسے برداشت نہیں کرسکا۔"

"بس جی۔ سب خدا کی مرضی ہے۔" ایک ادھیڑ عمر عورت نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب انسان کا وقت پورا ہوجاتا ہے تو اس کی زندگی کی بتی کو بجھنا ہی ہوتا ہے۔"

"تھانے دار صاحب!" میں نے جس شخص سے سوال کیا تھا وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "رجو کی لاش گھر کے اندر پڑی ہے۔ آپ خود جا کر اس کا معائنہ کرلیں۔ ہمیں تو یہ طبعی موت ہی لگتی ہے۔ آگے آپ خود اندازہ لگالیں۔"

اس بندے کی تجویز خاصی معقول تھی اور میں تو یہاں آیا ہی اسی لیے تھا۔ رجو کی اچانک موت کی خبر مجھے ہضم نہیں ہو پائی تھی۔ ویسے تو وہ عمر کے جس حصے میں تھا' اس کا بلاوا کسی وقت بھی آسکتا تھا لیکن میں پھر اپنی بات کو دہراؤں گا کہ کڑیاں والا کی فضا ان دنوں نارمل نہیں تھی لہٰذا بابا رجو کی موت کو بھی نارمل انداز میں نہیں لیا جاسکتا تھا۔

میں کانسٹیبل عارف کے ساتھ رجو کے گھر میں داخل ہوا تو چند افراد بھی اندر آ گئے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ لوگ رجو کے.... پڑوسی تھے۔ میں گاؤں والوں کی موجودگی میں رجو کی لاش کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔

وہ موسم سرما کا آغاز تھا۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ ابھی تک باقاعدہ سردی تو نہیں آئی تھی تاہم رات میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہوجاتی تھی۔ لوگوں نے صحن کو خیرباد کہہ کر کمروں کے اندر یا برآمدے میں سونا شروع کردیا تھا۔ رجو کی لاش بھی اس کے کمرے کے اندر چارپائی کے اوپر پڑی تھی۔ میں چارپائی کے نزدیک پہنچ گیا اور جائے وقوعہ کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

مذکورہ چارپائی پر بستر بچھا ہوا تھا اور اس بستر کے اوپر بابا رجو بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس نے ایک گرم چادر اوڑھ رکھی تھی تاہم اس چادر نے محض اس کے جسم کے زیریں حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چادر کی بے ترتیبی سے پتا چلتا تھا کہ موت سے قبل رجو نے چادر کے ساتھ دھینگا مشتی کی تھی۔ چادر کی ایسی حالت نے مجھے چونکا دیا اور میں اکڑوں بیٹھ کر رجو کے بدن کے کھلے حصوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس معائنے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔

رجو کو ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس کا شمار زندوں میں نہیں کیا جاسکتا اور اب جو میں نے اس کی گردن کی حالت دیکھی تو مجھے بابے کی غیر طبعی موت کا بھی سراغ مل گیا۔ رجو کی گردن پر ایسے نشانات موجود تھے جیسے اس کی شہ رگ کو دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی گردن کی دونوں سائیڈز پر کانوں کے نیچے مجھے کھرونچوں کے نشانات بھی دکھائی دیے جس نے اسے فنا کے گھاٹ اتارا تھا یہ کھرونچے اس کے ناخنوں کا کارنامہ تھا۔ بابے کا منہ بھی کسی حد تک کھلا ہوا تھا اور آنکھوں کی حالت سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی اذیت ناک موت مرا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ بابے رجو کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا قاتل کون تھا......؟ اس وقت میرے ذہن میں یہی سوال سر اٹھائے کھڑا تھا اور مجھے بہت دور تک سوچنے کے لیے مجبور کررہا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اس کمرے میں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک عام سا کمرا تھا اور اس کے اندر ویسا ہی عام سا استعمال کا سامان بھرا ہوا تھا جو ایک اکیلے بوڑھے شخص کی ضروریات کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ دس پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد بھی کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ نہ چڑھی جو کسی بھی حوالے سے قاتل تک راہ نمائی کرتی ہو۔ میں نے کمرے میں موجود افراد کو باری باری دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"بابا رجو طبعی موت نہیں مرا۔ اسے کسی نے قتل کیا ہے۔"

"کس نے...... اس کا دشمن کون ہوسکتا ہے؟" ایک بندے نے پوچھا۔

"میں بہت جلد بابے کے قاتل کو گرفتار کرلوں گا۔" میں نے پُرعزم انداز میں کہا۔ "لیکن پہلے کسی کو بھیج کر ان لوگوں کو یہاں بلاؤ جو رجو کے رشتے دار ہیں۔ میرا مطلب ہے، خورشید بیگم، سگی، برکت بی بی اور طافو وغیرہ۔ میری

معلومات کے مطابق طافو، سگی اور برکت بی بی خورشید بیگم کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

میرے حکم کی تعمیل میں ایک بندہ فی الفور خورشید بیگم کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ ایک بات پر مجھے حیرت ہورہی تھی کہ میں تھانے سے کڑیاں والا پہنچ گیا تھا اور یہاں میری آمد کا سبب بابے رجو کی موت تھی لیکن خورشید بیگم اینڈ کمپنی میں سے کوئی ایک شخص بھی جائے وقوعہ پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ کیا خورشید بیگم کو بابے کی موت کی خبر ہے بھی یا نہیں؟

یہی سوال جب میں نے وہاں موجود لوگوں سے کیا تو پتا چلا کہ بابے کی موت کی اطلاع خورشید بیگم کے گھر پہنچ چکی ہے اور خورشید بیگم برکت بی بی کے ساتھ ادھر کا ایک چکر بھی لگا کر گئی ہے تاہم سگی یا طافو نے اس طرف آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

مجھے اس شخص کی تلاش تھی جس نے بابے رجو کی لاش کو دریافت کیا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا۔ "سب سے پہلے رجو کی لاش کو کس نے دیکھا تھا؟"

"ماسی حنیفاں نے۔" ایک شخص نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "میں ماسی حنیفاں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ اپنے تنور پر ہوگی۔" ایک شخص نے بتایا۔ "ماسی حنیفاں کا گھر گلی کے کونے پر ہے۔ اس نے اپنے گھر کے باہر ایک تنور لگا رکھا ہے جہاں گاؤں کی عورتیں روٹیاں لگاتی ہیں۔"

مجھے بتایا گیا کہ کل جب برکت بی بی، سگی اور طافو بابے رجو کو اس گھر میں اکیلا چھوڑ کر خورشید بیگم کے ساتھ چلے گئے تھے تو اس کے بعد سے حنیفاں نے رجو کے کھانے پینے کا خیال رکھا تھا۔ ماسی ایک بیوہ عورت تھی۔ آج صبح جب وہ رجو کے لیے ناشتے کا سامان لے کر آئی تو رجو اسے مردہ حالت میں پڑا ہوا ملا۔ اس نے گھر سے باہر آکر لوگوں کو اس بارے میں بتایا۔ تھوڑی ہی دیر میں بابے رجو کی موت کی خبر پورے کڑیاں والا میں پھیل گئی اور پھر چپکے سے یہ اطلاع تھانے بھی پہنچ گئی تھی۔ میری خواہش پر تھوڑی ہی دیر میں ماسی حنیفاں کو میرے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا۔

حنیفاں کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک مسکین سی صورت والی موٹی تازی دیہاتی عورت تھی۔ میں نے گھما پھرا کر حنیفاں سے متعدد سوالات کیے لیکن کوئی بھی ایسی اہم بات سامنے نہ آسکی جو قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں میری مدد کرسکتی سوائے اس نکتے کے کہ جب آج صبح حنیفاں بابے رجو کے لیے ناشتا لے کر آئی تو گھر کے بیرونی دروازے کو کھلا دیکھ کر وہ چونک اٹھی تھی۔

"کیا مطلب......" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہیں رجو کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا؟"

"جی تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ "میں اس وقت یہی سمجھی تھی کہ رجو نے میرے لیے دروازہ کھول دیا ہوگا۔"

"پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے رجو کو آواز دی تھی؟"

"میں گھر کے اندر داخل ہوگئی اور کافی بلند آواز میں رجو کو پکارا۔" حنیفاں نے بتایا۔ "لیکن میری پکار کے جواب میں رجو کی آواز سنائی نہیں دی اور نہ ہی وہ مجھے گھر میں نظر آیا۔ میں دبے قدموں صحن سے برآمدے میں اور برآمدے سے بابے کے کمرے میں پہنچ گئی۔"

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ "کمرے کے اندر تم نے کیا دیکھا؟"

"بابا رجو اپنی چارپائی پر بےسدھ پڑا تھا۔" حنیفاں تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اب تک بےخبری کی نیند کیوں سو رہا ہے۔ میں نے اسے آوازیں دیں...... اٹھو رجو! میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آئی ہوں...... لیکن میری بار بار کی پکار بھی اس کے بدن میں ذرا سی جنبش پیدا نہ کرسکی۔ اتنی آوازیں تو قبرستان میں جا کر دو تو کئی مردے اٹھ کر بیٹھ جاتے مگر بابا تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ رجو کے اس انداز نے مجھے تشویش میں ڈال دیا اور میں اسے دیکھنے کے لیے کمرے کے اندر چلی گئی اور تبھی مجھے احساس ہوا کہ اس کی سانسیں نہیں چل رہی تھیں۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے استفسار کیا۔

"میں بابے رجو کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رجو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ بس پھر میں گھر سے باہر نکل آئی اور لوگوں کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔"

"اس کے علاوہ اور کچھ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی ایسی انوکھی یا غیرمعمولی بات جو تم نے بابے کے گھر کے اندر یا باہر دیکھی ہو؟"

"جی کوئی نہیں۔" وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔ "سوائے اس کے کہ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں ابھی تک یہی سوچ رہی ہوں کہ جب رجو اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا تو پھر گھر کا داخلی دروازہ کس نے کھولا؟"

"ماسی حنیفاں! تم ایک ذہین عورت ہو۔" میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم اسی طرح اپنے دماغ کو سوچنے پر لگائے رکھو۔ ہوسکتا ہے، تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے۔ میں بس اتنا اشارہ دے سکتا ہوں کہ بابے رجو کا قاتل دروازے کو کھلا چھوڑ گیا تھا یا تم یوں سمجھ لو کہ قاتل جلدی میں دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔"

"قاتل......" وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا رجو...... اپنی موت نہیں مرا......؟"

"نہیں!" میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ "بابے رجو کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

"اوہ......" اس کی سراسیمگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا، بےحد خوفزدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "رجو کو کس نے قتل کیا ہے......؟"

"میں یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم بھی اپنے ذہن کو سوچنے میں مصروف رکھو۔ اگر کوئی بھی ایسی بات تمہیں یاد آجائے جو مجھے قاتل تک پہنچا سکتی ہو تو تم فوراً مجھے بتانا۔"

"جی...... جی میں سمجھ گئی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

حنیفاں کو میں نے فارغ کر دیا کہ برکت بی بی اور خورشید بیگم وہاں آگئی تھیں۔ میں نے حنیفاں کو رخصت کرنے کے بعد جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور بابے رجو کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔ ہم جس تانگے میں بیٹھ کر کڑیاں والا پہنچے تھے، کانسٹیبل عارف بابے رجو کی لاش کو اسی تانگے میں ڈال کر وہاں سے روانہ ہوگیا تو میں نے برکت بی بی اور خورشید بیگم کو سوال و جواب کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ تمام غیرمتعلقہ افراد کو گھر سے باہر کر کے ہم لوگ برآمدے میں بیٹھ گئے تھے لیکن قبل اس کے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا، خورشید بیگم نے مجھ سے پوچھ لیا۔

"تھانے دار صاحب! یہ کیا چکر ہے۔ ابھی میں نے باہر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ بابے رجو کو کسی نے قتل کر دیا ہے جبکہ ہم تو یہی سوچ رہے تھے کہ شاید اس کی غیرت جاگ گئی ہے اور ضمیر نے اس کا گلا دبا دیا ہے۔"

"خورشید بیگم!" میں نے برکت بی بی کی پھوپی زاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ کوئی چکر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ کسی شقی القلب شخص نے بڑی بےدردی سے گلا دبا کر رجو کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"اسے کون قتل کرسکتا ہے۔" برکت بی بی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "وہ منحوس تو قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا......"

میں برکت بی بی کے غم و غصے کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ سگی والے واقعے کی وجہ سے رجو سے شدید نفرت کرتی تھی۔ ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا تھا کہ اس افسوسناک واقعے میں قصوروار کون تھا...... سگی...... یا رجو۔ اس سے پہلے کہ میں سچ جھوٹ کا فیصلہ کرتا، رجو کو کسی نے قتل کر کے اس کیس میں بہت زیادہ پیچیدگی بھر دی تھی۔

"میں بہت جلد رجو کے قاتل کا پتا چلا لوں گا۔" میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اسی مقصد کے لیے میں نے رجو کی لاش کو اسپتال بھجوایا تاکہ پوسٹ مارٹم کے بعد رجو کی موت کے معمے کو حل کیا جاسکے۔ ابھی میں کسی بندے کو گوجرانوالہ بھیج کر جمیل کو بھی بلوانے والا ہوں تاکہ جلد از جلد قاتل کو گرفت میں لیا جاسکے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ رجو کو کسی نے قتل ہی کیا ہے اور وہ طبعی موت نہیں مرا؟" خورشید بیگم نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں، مجھے پکا یقین ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے رجو کی گردن پر ایسے نشانات اور آثار بڑے واضح دیکھے ہیں جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بابے رجو کو گلا گھونٹ کر ہی موت کی وادی کی جانب روانہ کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اس یقین کی تحریری تصدیق کر دے گی......" لمحاتی توقف کر کے میں نے باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکا پھر جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"اگر آپ لوگوں کو رجو کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا ہو یا کچھ اندازہ ہو تو مجھے بتا دیں۔ قانون سے تعاون کرنے میں آپ ہی کا بھلا ہے!"

"تھانے دار صاحب! ہم تو پہلے ہی سگی کی وجہ سے پریشان بیٹھے ہیں۔" برکت بی بی نے بیزاری سے کہا۔ "اوپر سے اس بڈھے کی موت نے اور مسئلے کھڑے کر دیے ہیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے رجو کی موت کا ذرا سا بھی دکھ نہیں ہے۔"

برکت بی بی نے بڑی زہریلی بات کی تھی لیکن یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں تمہارے دکھ اور سکھ کا حساب کرنے یہاں نہیں بیٹھا ہوا۔ بس، تم مجھے یہ بتاؤ کہ رجو کے قاتل کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے لٹا سا جواب دیا۔
"اور تم......؟" میں نے سوالیہ نظر سے خورشید بیگم کی طرف دیکھا۔
"مجھے بھی اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے تھانے دار صاحب۔" وہ سادگی سے بولی۔ "یہ بات تو ابھی ابھی ہم نے آپ کے منہ سے سنی ہے۔"
میرا سالہا سال کا تجربہ یہ بتاتا تھا کہ برکت بی بی اور خورشید بیگم مجھ سے غلط بیانی نہیں کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ واقعتاً رجو کے قتل کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھیں تاہم اس کیس میں مجھے ان کی گمسائی منجھائی کے فرض سے غفلت نہیں برتنا تھی لہٰذا میں نے تفتیش کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے، رجو کے قتل اور کسی نامعلوم قاتل والی بات میرے یہاں آنے اور لاش کا معائنہ کرنے کے بعد سامنے آئی ہے لیکن رجو کی موت کی خبر تو صبح ہی صبح تم لوگوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ ہیں نا؟"
"جی بالکل۔" وہ یک زبان بول اٹھیں۔ "اس بات کا ہمیں پتا چل گیا تھا اور ہم آپ سے پہلے یہاں کا ایک چکر لگا کر بھی گئے ہیں۔"
"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم دونوں کے چکر لگانے کی خبر مل گئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم دونوں ہی کیوں؟"
"میں کچھ بھی نہیں تھانے دار صاحب!" برکت بی بی ...کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔
خورشید بیگم نے کہا۔ "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جناب؟"
میں نے کہا۔ "جتنا تم دونوں پر لازم تھا کہ رجو کی موت کی اطلاع پر یہاں پہنچو اتنا ہی سگی اور طافو کا بھی فرض بنتا تھا کہ وہ بھی اس گھر میں آتے لیکن ان دونوں بھائی بہن نے یہ زحمت گوارا نہیں کی۔ کیا میں اس کا سبب جان سکتا ہوں؟"
"سگی کی طبیعت بہت خراب ہے تھانے دار صاحب۔" خورشید بیگم وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور آپ جانتے ہیں، تین دن پہلے اس کے ساتھ جو ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے اس نے سگی کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اور منفی اثر ڈالا ہے۔ آپ اس کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"
خورشید بیگم کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس کی پیش کردہ دلیل کو مان لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
"اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ طافو کے ساتھ ایسے کون سے جذباتی معاملات تھے جو وہ ادھر نہیں آیا۔ کیا اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے......؟"
"ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب۔" خورشید بیگم جلدی سے بولی۔
"پھر کیسی بات ہے؟" میں نے فوراً سوال داغ دیا۔
"دراصل طافو یہاں ہے نہیں۔" اس نے بتایا۔ "ورنہ وہ صبح بھی ادھر کا چکر ضرور لگاتا اور ابھی بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتا۔"
"طافو یہاں نہیں ہے کا کیا مطلب ہوا۔" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ "وہ کہاں چلا گیا؟"
"وہ تو کل ہی دھوڑاں والا چلا گیا تھا جی۔" برکت بی بی ...وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "جب ہم آپ کے پاس سے واپس آئے تھے۔"
"اسے اچانک دھوڑاں والا جانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔
"وہ بات دراصل یہ ہے تھانے دار صاحب۔" برکت بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "آپ نے اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے دو دن کا ٹائم لے لیا تھا۔ طافو نے کہا، میرا یہاں کوئی کام نہیں۔ میں ادھر بیٹھ کر کیا کروں گا۔ میں دھوڑاں والا ہی چلا جاتا ہوں۔ ایک دن وہاں گزار کر کل کسی وقت واپس آ جاؤں گا۔ میرے خیال کے مطابق بھی طافو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اس لیے میں نے اسے دھوڑاں والا جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی تو میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔
"اور کون سی بات ہے برکت بی بی؟"
"آپ نے طافو کو ہدایت کی تھی کہ کسی بھی صورت میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا۔"
"تو......" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ "میری اس ہدایت کا طافو کے دھوڑاں والا جانے سے کیا تعلق؟"
"بہت گہرا تعلق ہے تھانے دار صاحب۔" برکت بی بی کے بجائے اس کی پھوپی زاد خورشید بیگم نے کہا۔ "طافو کا کہنا یہ تھا کہ بابے رجو کے بارے میں سوچ کر اور اسے دیکھ کر طافو کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ بابے نے سگی کے

ساتھ جو نازیبا حرکت کی ہے اس نے طافو کے دل و دماغ میں ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ اسے ڈر تھا کہ... اگر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تو یہاں کڑیاں والا میں کوئی نیا تماشا ہو جائے گا۔"
"اسی لیے میں نے بھی طافو کے دھوڑاں والا جانے کی حمایت کر دی تھی۔" برکت بی بی ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "جوان خون ہے تھانے دار صاحب اور معاملہ ہے بہن کے رشتے کا۔ آپ سمجھ دار انسان ہیں۔ آپ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ طافو نے بروقت بالکل درست فیصلہ کیا ہے اور میں نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔"
"ہوں......" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
ان دونوں کی وضاحت میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ میں چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے برکت بی بی اور خورشید بیگم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر کہا۔
"آپ لوگ کل دوپہر کے وقت میرے پاس سے رخصت ہوئے تھے اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد طافو دھوڑاں والا روانہ ہو گیا تھا اور اس نے اگلے دن واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ آج شام سے پہلے اسے کڑیاں والا پہنچ جانا چاہیے۔"
"جی تھانے دار صاحب۔" خورشید بیگم نے کہا۔
برکت بی بی نے پوچھا۔ "آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟"
ظاہر ہے، برکت بی بی نے یہ سوال مجھ سے کیا تھا لہٰذا میں نے اسے بتایا۔ "یوں سمجھو کہ میری تفتیش آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ کل دوپہر تک میں تم لوگوں کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لوں گا۔"
"بابا رجو تو گیا اس دنیا سے۔" خورشید بیگم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "وہ اپنی موت مرا ہے یا کسی نے اسے قتل کیا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ رجو کی موت کے بعد سگی کی عزت کو اس گھر کے اندر کوئی خطرہ نہیں ہے۔"
"میں سگی کو کسی بھی قیمت پر کڑیاں والا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" برکت بی بی نے قطعی لہجے میں کہا۔ "جمیل تو مہینا مہینا بھر ادھر گوجرانوالہ میں رہتا ہے۔ سگی ادھر پڑی کیا کرے گی۔ میں اسے اپنے ساتھ دھوڑاں والا لے کر ہی جاؤں گی۔"
"جب آپ لوگوں نے مجھے فیصلے کے لیے اس معاملے میں شامل کیا ہے تو پھر کوئی بھی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں بتا چکا ہوں کہ ابھی میرا ایک بندہ گوجرانوالہ جائے گا اور شام سے پہلے جمیل کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے گا۔ جب تک جمیل یہاں نہیں پہنچ جاتا، اس کیس کو منطقی انجام تک نہیں پہنچایا جا سکتا اور جہاں تک سگی کے یہاں رہنے یا دھوڑاں والا جانے کی بات ہے تو اس حوالے سے بھی جو فیصلہ ہونا ہے وہ بابے رجو کی تدفین کے بعد ہی ہونا ہے۔ میری بات تم لوگوں کی سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں؟"
"جی، جی......" خورشید بیگم جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھ گئی تھانے دار صاحب۔"
"رجو نے زندگی میں بھی لوگوں کی جان عذاب میں ڈال رکھی تھی اور مرنے کے بعد بھی وہ ہمارے لیے نت نئی مصیبتیں کھڑی کر گیا ہے۔" برکت بی بی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، آپ جیسا کہیں گے، ہمیں منظور ہے۔"
میں ان دونوں کو ہدایات دے کر مقتول رجو کے گھر سے باہر نکل آیا۔ رجو کے قتل کے حوالے سے میں نے جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کر لی تھی اور سردست میں ایسی کوئی بھی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جو رجو کے قاتل تک میری راہ نمائی کر سکتی۔
اس بات میں تو کسی شک وشبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ رجو کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس امر کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے تقویت دینا تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ستر سے متجاوز بڈھے بابے رجو کی کسی سے ایسی کون سی دشمنی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی؟
اس سوال کو ذہن میں رکھ کر جب میں قرب وجوار میں نگاہ دوڑاتا تھا تو گھوم پھر کر میری نظر طافو کے اوپر پڑتی تھی۔ میں نے اس کے انداز و اطوار میں رجو کے لیے جس غم و غصے کی لہر دیکھی تھی اس کے پیش نظر وہ اس نوعیت کا سنگین قدم اٹھا سکتا تھا۔ جب رجو کی لاش کا جائزہ لیتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بابے کو قتل کیا گیا ہے تو اس وقت بھی میرا دھیان سب سے پہلے طافو ہی کی طرف گیا تھا لیکن ابھی برکت بی بی اور خورشید بیگم کی زبانی جو تازہ ترین صورت حال سامنے آئی تھی اس کی روشنی میں طافو کا رجو کے قتل سے کوئی تعلق نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ ان دونوں عورتوں کے بیان کے مطابق، کل بعد از دوپہر طافو دھوڑاں والا روانہ ہو گیا تھا جبکہ رجو کی موت گزشتہ شب کسی وقت واقع ہوئی تھی یعنی

اسے پچھلی رات کے درمیانی حصے میں فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا کیونکہ ماسی حنیفاں کے بیان کے مطابق، گزشتہ رات اس نے رجو کے گھر کھانا پہنچایا تھا تو اس وقت بابا رجو زندہ تھا لیکن جب آج صبح وہ اسے ناشتا دینے آئی تو وہ دارِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ ہر صورت اور ہر حساب سے بابے رجو کی موت گزشتہ شب کے درمیانی حصے ہی میں ہوئی تھی۔

میں نے تھانے میں پہنچتے ہی ایک ہوشیار قسم کے اہل کار کو گوجرانوالہ روانہ کر دیا۔ میں نے یہ پتا لگا لیا تھا کہ جمیل گوجرانوالہ کے انڈسٹریل ایریا میں واقع کراؤن ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ رہائش کے لیے اس نے ایک نزدیکی محلے شریف پورہ میں خاصا معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ شریف پورہ کی ایک بیوہ عورت نے اپنے مکان کی بیٹھک جمیل کو کرائے پر دے رکھی تھی۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا بھی وہی عورت جمیل کو مہیا کر دیا کرتی تھی۔ کرائے کی رقم میں قیام و طعام کی سہولیات شامل تھیں تاہم دوپہر کا کھانا جمیل فیکٹری ہی میں کھا لیا کرتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، جمیل کو ہر ماہ کی سات تاریخ کو فیکٹری سے تنخواہ ملتی تھی لہٰذا سات تاریخ کے بعد جو بھی ہفتے کا دن آتا اس کی صبح وہ گوجرانوالہ سے کڑیاں والا چلا آتا تھا۔ اتوار کی تو اس کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہی تھی، مہینے میں وہ ایک مرتبہ ہفتے کے روز کی بھی چھٹی کر لیا کرتا تھا۔ اس طرح ہر ماہ اسے دو دن کڑیاں والا میں گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔

سکی والا واقعہ چوبیس اکتوبر کی دوپہر میں پیش آیا تھا اور رجو کا قتل گزشتہ شب یعنی چھبیس اور ستائیس اکتوبر کی درمیانی رات ہوا تھا۔ جمیل کو سکی والے واقعے کی کوئی خبر تھی اور نہ ہی باپ کی موت کی کوئی اطلاع۔ اپنے معمول کے مطابق، اس کی کڑیاں والا آمد میں ابھی آٹھ دس دن باقی تھے۔ حالات کی سنگینی کے باعث میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر آٹھ دس دن اس کا انتظار نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے اسے فی الفور یہاں لانے کے لیے اپنا ایک مستعد بندہ گوجرانوالہ روانہ کر دیا تھا۔ یعقوب نامی اس کانسٹیبل کو میں نے تاکید کر دی تھی کہ آج کی تاریخ میں مجھے جمیل تھانے میں چاہیے اور یعقوب نے میرے حکم کی تعمیل کا یقین دلایا تھا۔ میں یعقوب کی کارکردگی سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ چاہے رات کے دس بھی بج جاتے، مجھے اطمینان تھا کہ وہ جب بھی لوٹے گا، جمیل اس کے ہمراہ ہوگا!

☆☆☆

بعض اوقات انسان کے اندازے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس نے جو سوچا ہوتا ہے، اس کے برعکس ہو جاتا ہے اور اس غیر متوقع صورتِ حال پر وہ گڑبڑا کر رہ جاتا ہے۔ اس روز میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا۔

مجھے تھانے پہنچے ابھی گھنٹا، ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر بتایا۔ ”ملک صاحب! جمیل نامی ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کون جمیل؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”بابے رجو کا بیٹا ملک صاحب۔“ کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جو گوجرانوالہ میں ہوتا ہے۔“

”ابھی تو یعقوب شاید گوجرانوالہ پہنچا بھی نہ ہو.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”پھر جمیل یہاں..... اور وہ بھی اکیلا..... بلاؤ اسے اندر۔“

میرے آخری جملے میں سنسنی خیز الجھن کی آمیزش تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ جمیل، یعقوب کے بلاوے پر یہاں پہنچا ہو۔ کڑیاں والا سے گجرات اور پھر گجرات سے گوجرانوالہ پہنچنے میں اچھا خاصا وقت لگتا تھا اور جیسا کہ میں نے اوپر بتایا، گوجرانوالہ پہنچنے کے لیے ابھی یعقوب کو کچھ اور وقت لگنا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جمیل میرے سامنے موجود تھا۔

جمیل کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے اریب قریب لگایا۔ وہ درمیانے قد کا مالک گندمی رنگت والا ایک عام سا شخص تھا۔ جمیل کی آنکھوں اور چہرے سے بے پناہ غم جھلک رہا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! یہ سب کیا ہو گیا......؟“

”میں تمہیں ہر بات سے آگاہ کروں گا۔“ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”مجھے تمہارے باپ کی موت کا بہت افسوس ہے اور تم اس بات کی تسلی رکھو کہ میں بہت جلد رجو کے قاتل کو جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچا دوں گا لیکن سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کیسے؟ ....“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ”میں نے تمہیں بلانے کے لیے جو بندہ گوجرانوالہ روانہ کیا ہے وہ تو ابھی کراؤن ٹیکسٹائل ملز پہنچا بھی نہیں ہوگا!“

”میں آج ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا۔“ وہ مغموم لہجے میں بولا۔ ”مجھے کل رات ہی ابا کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ رات کے وقت یہاں پہنچنا ممکن نہیں تھا، اس لیے میں صبح گوجرانوالہ سے روانہ ہوا تھا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمیل؟“ اس کے جواب نے میرے ذہن کو جھٹکا لگایا تھا۔ ”تمہیں کل رات کس نے کتنے بجے اطلاع دی تھی؟“

”کل جب میں فیکٹری سے چھٹی کر کے اپنے کوارٹر میں پہنچا تو اللہ رکھی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے کڑیاں والا سے ایک بندہ یہ خبر لے کر آیا تھا کہ میرے ابا کا انتقال ہو گیا ہے لہٰذا مجھے جلد از جلد کڑیاں والا پہنچ جانا چاہیے۔“ جمیل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

جمیل کے جواب نے میرے دماغ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کل تم فیکٹری سے کتنے بجے اپنے کوارٹر پہنچے تھے؟“

”اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔“ اس نے بتایا۔

میں نے دریافت کیا۔ ”اور رجو کی موت کی اطلاع کتنے بجے گوجرانوالہ پہنچائی گئی؟“

”اللہ رکھی نے مجھے بتایا تھا کہ کڑیاں والا سے بندہ عصر کے قریب اس کے کوارٹر پر پہنچا تھا۔“ وہ بولا۔ ”اس بندے نے اللہ رکھی کو یہ اطلاع دی اور واپس چلا گیا۔“

اللہ رکھی اس بیوہ عورت کا نام تھا جس کے گھر کی بیٹھک میں جمیل نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ ناقابلِ یقین، حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔ جمیل کو کل عصر کے وقت بابے رجو کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی جبکہ رجو کو پچھلی رات کے درمیانی حصے میں قتل کیا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اطلاع بہم پہنچانے والے بندے اور قاتل کے بیچ کوئی گہرا تعلق موجود تھا۔

”کیا تم مجھے اطلاع کنندہ، اس بندے کا نام بتا سکتے ہو؟“ میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جناب۔“ وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میری اس بندے سے ملاقات نہیں ہوئی اور اللہ رکھی نے نہ تو اس کا نام پوچھا اور نہ ہی اس بندے نے خود اللہ رکھی کو اپنا نام بتایا۔ میں دل پر ابا کی موت کا صدمہ لے کر جب کڑیاں والا پہنچا تو وہاں پچھلے چند روز میں پیش آنے والے حالات نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔ مجھے پتا چلا کہ آپ صبح سے ادھر کڑیاں والا ہی میں تھے اس لیے میں اب آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ مجھے بتائیں حقیقت کیا ہے؟“

جمیل کو سکی والے معاملے کی خبر ہو چکی تھی اور میرے پاس آنے سے پہلے وہ خورشید بیگم کے گھر میں سکی سے ملاقات بھی کر آیا تھا لیکن وہاں پر جس قسم کے حالات تھے، جمیل انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ اپنے باپ کی موت کا سن کر بھاگتا دوڑتا گوجرانوالہ سے کڑیاں والا پہنچا تھا اور یہاں پر اس کے لیے مسائل کی زنبیل کھل گئی تھی۔

”میری بات کو اگر تم توجہ سے سنو گے تو حقیقت کو سمجھنے میں تمہیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”سکی اور تمہارے باپ کے بیچ جو ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا اس کی خبر تمہیں ہو چکی ہے۔ مجھے اگر براہِ راست سکی اور رجو سے فرداً فرداً ملاقات کا موقع میسر آ جاتا تو میں یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتا کہ ان میں سے جھوٹا کون تھا اور سچا کون؟ لیکن اب اس نتیجے کو اخذ کرنے کی ضرورت باقی رہی ہے اور نہ ہی اہمیت کیونکہ ان دونوں میں

بچے ہمارے دور کے

ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ”ٹیپو سلطان کون ہے؟“

”پتا نہیں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔ ماں غصے سے بولی۔

”پڑھائی پر دھیان دو۔“

پھر بیٹے نے پوچھا۔ ”ماما یہ نوشین آنٹی کون ہے؟“ ”پتا نہیں۔“ ماں نے جواب دیا۔

بیٹے نے کہا۔ ”ماما پاپا پر دھیان دیں۔“

سنہری کرنیں

☆ محبت جنہیں یاد کرتی ہے انہیں سدا سفر میں دوڑائے رکھتی ہے۔

☆ وہ سچائی جسے ثبوت کی ضرورت ہو صرف آدھا سچ ہے۔

☆ طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کا چہرہ دیکھتا ہے۔

☆ استاد بادشاہ نہیں ہوتا لیکن بادشاہ بناتا ہے۔

☆ خود پسندی سب سے بڑی تنہائی ہے۔

☆ جو شخص ہوش میں ہو وہ غرور نہیں کرتا۔

☆ جو چیز خواہش بھی ہو اور ضرورت بھی، وہ محبت ہوتی ہے۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

سے ایک فریق دارِ فانی سے اٹھ چکا ہے۔ اس معاملے کو بعد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا باپ اس دنیا میں باقی نہیں رہا اور مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ رجو کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میری پہلی کوشش اور اولین ترجیح یہ ہے کہ میں جلد از جلد تمہارے باپ کے قاتل تک پہنچ جاؤں اور اس سلسلے کی ابتدا اس بندے کی تلاش سے ہوگی جس نے گزشتہ روز اللہ رکھی کو تمہارے باپ کی موت کی اطلاع دی...... موت سے کئی گھنٹے پہلے! اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطلاع کنندہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پچھلی رات تمہارے باپ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔ تمہارے باپ کا قاتل مذکورہ اطلاع کنندہ بھی ہوسکتا ہے یا پھر اطلاع کنندہ قاتل کو جانتا ہے۔ یہ اطلاع کنندہ میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کے بعد کیس کو چٹکی بجاتے میں حل کرلوں گا۔''

''لیکن آپ اس بندے تک پہنچیں گے کیسے؟'' میرے خاموش ہونے پر جمیل نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔

''تمہارے ذریعے......!'' میں نے کہا۔

''میرے ذریعے......'' اس کی الجھن سوا ہوگئی۔ ''میں تو اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں!''

''تمہاری مالکِ مکان اللہ رکھی نے اس بندے کو دیکھ رکھا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ رکھی اس پر نگاہ پڑتے ہی پہچان لے گی۔''

''آپ کی بات تو میری سمجھ میں آرہی ہے......'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن آپ اللہ رکھی کو دکھانے کے لیے اس بندے کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گے؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، کیا تم اللہ رکھی کو یہاں لا سکتے ہو؟''

''یہ تو کل ہی ممکن ہوسکے گا جناب۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''اگر میں ابھی گوجرانوالہ روانہ ہوجاؤں تو کل دوپہر تک میں اللہ رکھی کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آسکتا ہوں۔''

''کل شام تک بھی لے آؤ تو کام چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''کل دوپہر تک اسپتال سے تمہارے باپ کی لاش بھی آجائے گی۔ رجو کی تجہیز و تکفین کے لیے تمہارا یہاں کڑیاں والا میں موجود رہنا ضروری ہے۔ یہ اتنا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ تم ہفتہ دس دن سے پہلے فیکٹری کا رخ کرسکو۔''

''میں ابھی گوجرانوالہ جارہا ہوں۔'' وہ بڑے عزم کے ساتھ بولا۔ ''ویسے بھی میں آج یہاں رک کر کیا کروں گا۔ آپ نے بتایا ہے کہ ابا کی لاش کل دوپہر تک ہی آئے گی۔''

''اور اس بارے میں تم کسی سے بھی ذکر نہیں کرو گے کہ اللہ رکھی کو کس مقصد کے لیے یہاں لایا جارہا ہے......!''

''جی۔ میں سمجھ گیا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا۔ ''اللہ رکھی کو سیدھا یہاں تھانے لانا ہے۔ ادھر کڑیاں والا میں کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی بالکل...... میں آپ کی بات کو ذہن میں رکھوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو اخلاقی اور جذباتی سہارے کے لیے جمیل کے ہمراہ گوجرانوالہ روانہ کردیا۔ یہ کام جمیل کے بغیر بھی ہوسکتا تھا لیکن میں نے ایک خاص مقصد کے تحت جمیل کو کل دوپہر تک کے لیے کڑیاں والا کی فضا سے دور کردیا تھا۔ رجو کی لاش آنے سے پہلے اگر وہ کڑیاں والا میں ٹھہرتا تو ظاہری بات ہے کہ وہ یہ تمام وقت سگی کے ساتھ ہی گزارتا اور اس کے لیے یا تو جمیل کو خورشید بیگم کے گھر میں قیام کرنا پڑتا اور یا پھر سگی کو واپس رجو والے گھر میں جانا پڑتا۔ مجھے اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ سگی کی واپسی کے لیے برکت بی بی آسانی سے تیار نہ ہوتی لہٰذا کڑیاں والا میں کسی بڑی بدمزگی کا روشن امکان تھا۔ میں ایسی کسی بدامنی سے اپنے پروگرام کو متاثر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اللہ رکھی کی مدد سے جس شناخت پریڈ کے بارے میں سوچ لیا تھا اس کے لیے سب سے اہم موقع وہی ہوتا جب تدفین کے وقت گاؤں کے تمام مرد قبرستان میں موجود ہوتے۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ اطلاع کنندہ کا تعلق کڑیاں والا ہی سے تھا۔ میں اللہ رکھی کو پوشیدہ رکھ کر اس فتنہ پرور شخص تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا جسے اس بات کا قبل از وقت علم تھا کہ اس کے گوجرانوالہ اطلاع پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بابا رجو لقمۂ اجل بن جائے گا...... یہ تو کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بندہ تھا!

جمیل کے جانے کے تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل عارف تھانے پہنچ گیا۔ عارف کو میں نے بابے رجو کی لاش کے ساتھ اسپتال بھیجا تھا۔ عارف کے چہرے پر مجھے دبا دبا جوش نظر آیا تو میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''عارف! خیریت تو ہے۔ تم کافی تروتازہ دکھائی دے رہے ہو۔ اسپتال سے کیا خبر لائے ہو۔ پوسٹ مارٹم کی

ابتدائی رپورٹ کب تک مل جائے گی؟''

''جناب! بابے کی لاش کل کسی وقت بھی اسپتال سے تھانے پہنچا دی جائے گی۔'' اس نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''لیکن ابتدائی رپورٹ میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عارف۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کھل کر بتاؤ، تمہارے ذہن میں کیا کہانی ہے؟''

''کہانی ذہن میں نہیں میری جیب میں ہے ملک صاحب۔'' وہ اپنا ہاتھ جیب کی جانب بڑھاتے ہوئے ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''آپ اسے پری مارٹم رپورٹ سمجھ لیں۔''

''پری مارٹم......!'' میں چونک اٹھا۔ ''یعنی بابے رجو کی لاش کی چیر پھاڑ سے پہلے کی رپورٹ......؟''

میری حیرت بھری الجھن کے جواب میں عارف نے اپنی جیب میں سے ایک انگوٹھی نکال کر میری سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں جی پری مارٹم رپورٹ آف بابا رجو۔''

مذکورہ انگوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے حال ہی میں کسی کے ہاتھ کی انگلی میں دیکھا ہو۔ میں نے عارف سے پوچھا۔

''یہ کس کی انگوٹھی ہے اور اس کا بابے رجو کی موت سے کیا تعلق ہے؟''

''ملک صاحب! لگتا ہے، آپ نے اس انگوٹھی کو پہچانا نہیں۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ''کل بابے رجو کی شکایت لے کر جو لوگ تھانے آئے تھے ان میں سے ایک بندے کے ہاتھ میں یہ انگوٹھی موجود تھی۔''

مجھے فوراً یاد آگیا کہ میں نے مذکورہ انگوٹھی کو طافو کے ہاتھ کی ایک انگلی میں دیکھا تھا۔ میں نے عارف سے پوچھا ''تمہیں یہ کہاں سے ملی؟''

''بابے رجو کی لاش والی چادر کے اندر سے جناب۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

آج جب میں مقتول رجو کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا رہا تھا تو میں نے لاش کو رجو کے بستر پر بچھی چادر ہی میں لپٹوا دیا تھا یعنی بابے رجو کی لاش اپنے بستر کی چادر میں لپٹ کر اسپتال پہنچی تھی۔ یہ چادر بابے کا ابتدائی کفن بھی ثابت ہوئی تھی۔

''جب بابے کی لاش کو اس چادر میں لپیٹا گیا اس وقت تو یہ انگوٹھی ہم میں سے کسی کو نظر نہیں آئی تھی!'' میں نے مذکورہ انگوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! یہ انگوٹھی اس چادر کے ایک کونے میں پھنسی ہوئی تھی۔'' عارف نے بتایا۔ ''اس چادر کا ایک کونا پھٹا ہوا تھا جس میں سے دھاگے نکلے ہوئے تھے اور یہ انگوٹھی ان دھاگوں کے اندر الجھی ہوئی تھی۔ جب اسپتال میں بابے کی لاش کو چادر میں سے نکالا گیا تو میری اس انگوٹھی پر نظر پڑی اور میں نے سب کی نگاہ بچا کر انگوٹھی کو پار کرلیا اور اب یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔''

''یہ انگوٹھی اگر بابے رجو کے بستر کی چادر میں الجھی ہوئی ملی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ طافو وہاں گیا تھا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اور پھر یہ بات بھی طے ہے کہ طافو کا بابے کی موت سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ ہوسکتا ہے، بابے رجو کا گلا دباتے ہوئے انگوٹھی طافو کی انگلی سے نکل گئی ہو لیکن طافو کو اس بات کا احساس نہ ہوا ہو۔ اس نے اپنا کام نمٹایا اور گھر سے نکل گیا۔''

''ملک صاحب! ہمیں فوراً کڑیاں والا جا کر طافو کو گرفتار کرلینا چاہیے۔'' عارف نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔ ''چار جوتے اس کی تشریف پر لگیں گے تو سب کچھ اگل دے گا اپنی زبان سے۔''

عارف جب لاش کے ساتھ اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا تھا تو اس کے بعد یہ بات میرے علم میں آئی تھی کہ طافو تو کل ہی دھوڑاں والا چلا گیا تھا۔ طافو کی روانگی کے بارے میں عارف کو علم نہیں تھا اسی لیے اس نے اسے کڑیاں والا جا کر گرفتار کرنے کی بات کی تھی۔

میں نے عارف کو صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر حوالدار نبی بخش اور عارف کو کڑیاں والا روانہ کردیا کہ جیسے ہی طافو گاؤں میں داخل ہو، وہ اسے گرفتار کر کے سیدھا میرے پاس لے آئیں۔ برکت بی بی نے بتایا تھا کہ آج طافو دھوڑاں والا سے واپس آجائے گا۔

اس کیس کی کڑیاں ایک ایک کر کے کڑیاں والا میں جمع ہورہی تھیں، وہ چھوٹا سا گاؤں اب صحیح معنوں میں کڑیاں والا بن گیا تھا۔

اس دن ستائیس اکتوبر تھی۔ میرے پاس یہ کیس کل یعنی چھبیس اکتوبر کو آیا تھا اور میں نے اس کیس کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے فریادی افراد سے جو مہلت لی تھی اس میں سے ایک دن گزر چکا تھا اور ایک دن باقی تھا۔ مجھے کسی بھی حال میں اس کیس کو معینہ مدت کے اندر حل کرنا تھا اور

حالات اس رخ پر آگئے تھے کہ اپنی کامیابی مجھے یقینی دکھائی دے رہی تھی۔

ستائیس اکتوبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے طافو میری کسٹڈی میں آچکا تھا۔ وہ جیسے ہی کڑیاں والا میں داخل ہوا، میرے بھیجے ہوئے اہلکاروں نے اسے فوراً گرفتار کرکے تھانے پہنچا دیا تھا۔

طافو اپنی گرفتاری پر خاصا برہم تھا۔ اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔ مصیبت ہم پر ٹوٹی ہے اور آپ بھی الٹا ہمیں ہی پریشان کررہے ہیں۔“

”تمہیں اندازہ نہیں کہ زیادتی، پریشانی اور مصیبت کیا ہوتی ہے۔“ میں نے خوفناک انداز میں کہا۔ ”فکر نہیں کرو۔ اگر تم نے شرافت سے زبان نہیں کھولی تو میں ان تینوں چیزوں سے تمہیں اچھی طرح آگاہ کردوں گا۔“

”جناب! یہ آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں۔“ وہ اپنی خفگی کو بھول کر قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تو تمہارے خیال میں تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟“

”نن...... نہیں۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”میں نے تمہیں تاکید کی تھی۔۔ تاکہ کسی بھی صورت میں تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”پھر تم نے ایسا... کیوں کیا؟“

”میں نے کیا کیا ہے تھانے دار صاحب......؟“ اس کی الجھن میں حیرت اور بے بسی بھی شامل ہوگئی۔ ”کچھ مجھے بھی تو بتائیں!“

یا تو وہ بڑے کمال کی اداکاری کررہا تھا یا پھر وہ بابے رجو کی موت سے قطعی لاتعلق تھا۔ میں نے طافو کی اصلیت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے طافو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

”تم نے بابے رجو کو قتل کیا ہے......!“

”مم...... میں نے......“ وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔ ”کیا...... رجو مر گیا...... مجھے یقین نہیں آرہا...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب......“

”تو تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ پچھلی رات بابے رجو کو قتل کیا جاچکا ہے؟“ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جناب! میں تو کل دن ہی میں دھوڑاں والا چلا گیا تھا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”اور ابھی واپس آیا ہوں لیکن کڑیاں والا میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپ کے بندے مجھے پکڑ کر تھانے لے آئے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ کل دوپہر سے اب تک ادھر کڑیاں والا میں کیا واقعات پیش آچکے ہیں!“

”تم کل میرے پاس سے رخصت ہونے کے بعد دھوڑاں والا روانہ ہوگئے تھے۔“ میں نے اسے گھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

طافو اس وقت میری نظر میں ایک ایسا دیسی بادام تھا کہ میں انگوٹھی کا ہتھوڑا استعمال کرکے ایک ہی ضرب میں اسے توڑ کر اندر سے اپنی مرضی کا مغز حاصل کرسکتا تھا مگر میں فی الحال اسے اپنے سوالات کی سان پر گھس کر اس کے خول کو کمزور کررہا تھا۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“

”لیکن تم کڑیاں والا سے نکل کر دھوڑاں والا جانے کے بجائے پہنچ گئے گوجرانوالہ۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”گوجرانوالہ میں میرا کیا کام تھانے دار صاحب!“ وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ ”میں تو یہاں سے سیدھا دھوڑاں والا ہی گیا تھا۔ آپ پتا نہیں، کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟“

”گوجرانوالہ میں تمہارا کام یہ تھا کہ جمیل کی مالک مکان کو جاکر بتاؤ کہ بابے رجو کا انتقال ہوگیا ہے۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تاکہ وہ پہلی فرصت میں کڑیاں والا پہنچ جائے......“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا کیوں کروں گا؟“

”پھر تم گوجرانوالہ سے واپس کڑیاں والا آئے اور رات کی تاریکی میں تم نے بابے رجو کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“ میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا۔ ”اپنا کام نمٹانے کے بعد تم چپ چاپ دھوڑاں والا روانہ ہوگئے اور اب دودھ سے دھل کر یہاں آگئے ہو......!“

”جناب! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں کل گوجرانوالہ نہیں گیا تھا۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”پتا نہیں، آپ کیوں مجھے اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟“

”تمہارے قسم کھانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا طافو۔“ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم خود گوجرانوالہ نہیں گئے تو پھر تم نے اس مقصد

کے لیے کسی اور بندے کو وہاں بھیجا ہوگا؟“

”میں خود گیا اور نہ ہی میں نے کسی اور کو وہاں بھیجا۔“ وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے خوامخواہ اس چکر میں پھانسنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

”کل کسی وقت بھی جمیل اور اللہ رکھی یہاں پہنچ جائیں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔“

”ہوجائے الگ......“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”جب میرا ان معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہیں تو پھر کیوں پریشان ہوں۔“

طافو کا اعتماد مجھے الجھن میں ڈال رہا تھا۔ ابھی تک اس کی کسی بھی ادا سے مجھے یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہو۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”تم خود گوجرانوالہ گئے یا نہیں گئے، تم نے کسی اور بندے کو گوجرانوالہ بھیجا یا نہیں بھیجا اس کا فیصلہ تو اللہ رکھی کے آنے کے بعد ہوجائے گا لیکن تم ایک حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے!“

”کون سی حقیقت؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہ حقیقت کہ تم نے بابے رجو کو قتل کیا ہے!“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ”آپ خوامخواہ مجھ پر الزام لگارہے ہیں۔“

”میں خوامخواہ کچھ بھی نہیں کرتا طافو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ تم نے گلا دبا کر بابے رجو کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

”کون سا ٹھوس ثبوت ہے آپ کے پاس۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”لائیں دکھائیں مجھے......!“

”پہلے تم دکھاؤ۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں دکھاؤں......“ وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”میں کیا دکھاؤں آپ کو؟“

”وہ ثبوت کہ تم گزشتہ رات بابے رجو کے گھر نہیں گئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم نے رجو کو قتل نہیں کیا۔“

”میرے پاس تو ایسا کوئی بھی ثبوت موجود نہیں ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں تو کل دوپہر سے اب تک دھوڑاں والا میں تھا۔ جب میں پچھلی رات کڑیاں والا میں تھا ہی نہیں تو پھر میں رجو کو قتل کیسے کرسکتا ہوں؟“

”میں تم سے وہ ثبوت مانگ رہا ہوں جو کل تمہارے پاس تھا لیکن آج نہیں ہے۔“ میں نے چوہے بلی کے اس کھیل کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ثبوت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کہیں گر گیا ہے......“

وہ بے ساختہ اپنے ہاتھوں کو تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”وہ ثبوت تمہارے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد بابے رجو کے بستر پر پہنچ گیا تھا۔ تم اسے جائے وقوعہ سے اٹھانا بھول گئے لیکن میں نے اٹھالیا...... کیا سمجھے؟“

”کہیں آپ...... اس انگوٹھی کی بات تو نہیں کررہے ہیں؟“ ...... وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

”اب تم بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئے ہو۔“ میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ”کل جب تم دوسرے لوگوں کے ساتھ میرے پاس آئے تھے تو میں نے تمہارے ہاتھ کی ایک انگلی میں ہرے نگینے والی چاندی کی ایک انگوٹھی دیکھی تھی جو اس وقت مجھے نظر نہیں آرہی......“

”وہ ہرا نگینہ پنا ہے تھانے دار صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے بڑے شوق سے وہ انگوٹھی بنوائی تھی۔ کسی اللہ والے نے مجھے بتایا تھا کہ میں پنا پہنوں۔ یہ مجھے بہت فائدہ دے گا۔“

”تم نے اس اللہ والے کی بات پر عمل نہیں کیا اور مصیبت میں پھنس گئے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں طافو پر چوٹ کی پھر مذکورہ انگوٹھی کو اپنی میز کی دراز میں سے نکال کر اسے دکھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اب زمرد جڑی چاندی کی یہ انگوٹھی میرے پاس آگئی ہے لہٰذا یہ پنا مجھے بہت فائدہ پہنچائے گا......!“

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ انگوٹھی آپ کو کہاں سے ملی ہے؟“

”بتایا تو ہے جائے واردات سے۔“ میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ”میں نے یہ انگوٹھی مقتول رجو کے بستر سے اٹھائی ہے۔ جب تم گلا دبا کر بابے رجو کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے تو یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ سے نکل کر وہاں گر گئی تھی۔“

”یہ نہیں ہوسکتا......“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا...... کیا نہیں ہوسکتا؟“

”میں نے بابے رجو کو قتل نہیں کیا۔“ وہ بہ دستور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو وہاں گیا ہی نہیں......“

”جب تم وقوعہ پر گئے ہی نہیں اور تم نے بابے رجو کو قتل نہیں کیا تو پھر تمہاری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی وہاں کیسے

پہنچ گئی......'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔'' کیا اس اللہ والے نے تمہیں انگوٹھی کی کوئی ایسی خصوصیت بھی بتائی تھی کہ زمرد کی تاثیر سے یہ انگوٹھی اڑن طشتری بن جائے گی......؟''

''نہیں جناب......'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔'' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ پنے (زمرد) کی وجہ سے بھلا انگوٹھی پرواز کیسے کرسکتی ہے!''

''انگوٹھی نے خفیہ اڑان بھر کے دکھائی تو ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔'' یہ تمہارے ہاتھ کی انگلی میں تھی۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ گزشتہ رات تم بابے رجو کے گھر نہیں گئے لیکن یہ بابرکت انگوٹھی وہاں پہنچ گئی۔ یہ اس انگوٹھی کا کوئی کمال ہے یا اس اللہ والے کی کرامت...... اس کا جواب تو تمہیں ہی دینا ہوگا!''

''آپ کے سوال کا جواب کاکا دے گا تھانے دار صاحب۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''کاکا......!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔'' تم عدیل کی بات کررہے ہو نا جو کڑیاں والا میں کریانے کی دکان چلاتا ہے۔ وہ تمہارا دوست ہے اور کل وہ بھی تمہارے ساتھ میرے پاس آیا تھا؟''

''جی...... میں اسی عدیل عرف کاکا کا ذکر کررہا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

''لیکن کاکا کا اس انگوٹھی سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔'' میں نے تو اس انگوٹھی کو کل تمہارے ہاتھ میں دیکھا تھا۔''

''کل دیکھا تھا نا......'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔'' لیکن کل ہی دھوڑاں والا جانے سے پہلے میں نے یہ انگوٹھی کاکا کو دے دی تھی۔''

''تم نے یہ انگوٹھی کاکا کو کیوں دی تھی؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔'' اس کا کوئی خاص سبب......!''

''یہ انگوٹھی کاکا کو بہت پسند آگئی تھی تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' اس نے کہا، طافو یہ انگوٹھی مجھے دے دو۔ میں نے انگوٹھی بڑے چاؤ سے بنوائی تھی لیکن اپنے دوست کی خواہش کو رد نہ کرسکا اور میں نے یہ انگوٹھی نکال کر اس کے حوالے کردی۔ کاکا کی انگلی میں یہ انگوٹھی تھوڑی ڈھیلی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ انگوٹھی کے رنگ پر دھاگا لپیٹ کر اسے اپنی انگلی کے سائز کا بنالے گا۔ میں مطمئن ہوکر دھوڑاں والا چلا گیا۔''

''لیکن اس انگوٹھی کے چھلے میں تو دھاگا لپٹا نظر نہیں آرہا!'' میں نے زمرد جڑی انگوٹھی کو غور سے دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

وہ بڑی سادگی سے بولا۔'' اسی لیے یہ انگوٹھی کاکا کی انگلی سے نکل گئی ہوگی۔''

''یعنی تم اس بات کا اعتراف کررہے ہو کہ کاکا پچھلی رات بابے رجو کے گھر گیا تھا۔'' میں نے بڑے سنگین لہجے میں استفسار کیا۔'' اور کاکا ہی نے رجو کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اس عمل کے دوران میں اس کی انگلی میں ڈھیلی یہ انگوٹھی نکل کر بابے رجو کے بستر پر جاگری تھی۔''

''میں اس حوالے سے کوئی اعتراف یا اختلاف نہیں کرسکتا۔'' وہ بے بسی سے گردن جھکا کر بولا۔'' جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی۔ میری بات پر آپ یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔''

''میں کاکا سے تصدیق کرنے کے بعد تمہاری بات پر یقین کروں گا۔'' میں نے کہا۔'' اگر کاکا نے تمہاری سنائی ہوئی کہانی کی تردید کردی تو پھر تمہیں میں کڑی سزا دلواؤں گا۔''

''منظور ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''منظور ہے...... تو تم اتنی آسانی سے کہہ رہے ہو جیسے میں نے دو چار تھپڑ دوں، آٹھ دس لاتوں کی سزا کا ذکر کیا ہو......!''

''اگر میں غلط ہوا تو آپ مجھے پھانسی کی سزا دلوادینا۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔

میں نے طافو کو حوالات میں بند کیا اور کاکا کو لانے کے لیے ایک بندہ کڑیاں والا روانہ کردیا۔ طافو نے حوالات کی طرف جاتے ہوئے کوئی احتجاج کیا اور نہ ہی کسی قسم کا واویلا مچایا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا اطمینان پایا جاتا تھا جیسے کسی بے گناہ کے دل میں سکون ہوتا ہے کہ جب اس نے کچھ نہیں کیا تو پھر اللہ اس کی مدد کرے گا۔

☆☆☆

اٹھائیس اکتوبر میرے لیے ایک مصروف ترین دن تھا لیکن پہلے میں گزشتہ رات کی دلچسپ کارروائی بھی آپ کی نذر کردوں۔ میرے بھیجے ہوئے بندے نے کاکا کو لاکر تھانے میں حاضر کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کڑیاں والا میں یہ خبر بھی پھیل گئی تھی کہ میں نے طافو کو بابا رجو کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند کررکھا ہے چنانچہ برکت بی بی اور خورشید بیگم بھی ایک تانگا پکڑ کر وہاں چلی آئی تھیں۔

میں نے سب سے پہلے کاکا کا انٹرویو کیا۔ اس نے

طافو کی باتوں کی تردید کردی، یعنی اس نے طافو سے وہ انگوٹھی نہیں لی تھی۔ میں نے کاکا پر واجبی سی زبردستی بھی کی مگر وہ اپنے بیان پر ڈٹا رہا۔ دوسری جانب طافو کو اس بات پر حیرت اور غصہ بھی تھا کہ کاکا جھوٹ کیوں بول رہا ہے!

میں نے ان دونوں کو حوالدار نبی بخش کی تحویل میں دیتے ہوئے کہا تھا۔'' کل صبح جب میں تھانے آؤں تو ان دونوں کی زبانوں کے قفل کھل جانا چاہئیں۔''

''آپ بے فکر ہوکر اپنے کوارٹر میں جائیں ملک صاحب۔'' حوالدار نے تسلی بھرے انداز میں کہا تھا۔'' صرف زبان کے ہی نہیں بلکہ میں ان کے سارے جندرے (تالے) کھول ڈالوں گا۔''

برکت بی بی اور خورشید بیگم کو میں نے واپس کڑیاں والا جانے پر راضی کرلیا تھا۔ وہ طافو کو لیے بغیر واپس جانے کو تیار نہیں تھیں۔ میں نے کہا۔

''طافو میری تحویل میں ہے۔ یہ آپ لوگوں کو کل بھی صحیح سلامت ہی ملے گا۔ آپ کل دونوں میرے پاس آجانا۔''

''لیکن تھانے دار صاحب، طافو کا قصور کیا ہے؟'' برکت بی بی نے پوچھا تھا۔

الٹا میں نے اس سے سوال کرڈالا تھا۔'' تمہیں طافو بے گناہ لگتا ہے نا؟''

''جی بالکل!'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

''تمہیں پھر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تشفی بھرے لہجے میں کہا تھا۔'' اگر طافو نے کچھ نہیں کیا تو پھر اسے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

اٹھائیس اکتوبر کا دن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، میرے لیے بے پناہ مصروفیت کا حامل تھا۔ جس بندے کو میں نے گزشتہ روز گوجرانوالہ روانہ کیا تھا وہ تو پچھلی رات ہی واپس آگیا تھا۔ اب مجھے انتظار تھا جمیل اور اللہ رکھی کا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا تو حوالدار میرے پاس آگیا۔ میں نے پوچھا۔'' کیا رپورٹ ہے نبی بخش؟''

''بندے خاصے سخت جان ہیں۔'' اس نے بتایا۔'' ان کی زبانیں کھلوانے کے لیے اسپیشل فارمولے استعمال کرنا پڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے، یہ فارمولے ہم آنے والی رات میں آزمائیں گے۔'' میں نے کہا۔'' ویسے تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے نبی بخش؟''

''مجھے طافو بے قصور اور کاکا مکار لگتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔'' چلیں دیکھتے ہیں......''

دوپہر کے بعد جمیل اور اللہ رکھی تھانے پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی اسپتال سے بابے رجو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش بھی آگئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے میرے اندازے کی تصدیق کردی تھی۔ بابے رجو کی موت چھبیس اور ستائیس اکتوبر کی درمیانی رات واقع ہوئی تھی اور یہ کہ اسے گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

میں نے ضروری کارروائی کے بعد رجو کی لاش جمیل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔'' تم اطمینان سے اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرو۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہارے باپ کے قاتل کو بہت جلد بے نقاب کردوں گا۔''

''جناب! میں نے سنا ہے، آپ نے میرے سالے طافو کو بھی حوالات میں بند کررکھا ہے۔'' اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔'' یہ کیا چکر ہے؟''

''صرف طافو ہی نہیں، اس کا جگری یار کاکا بھی میری تحویل میں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اور ان دونوں ہی میں سے کسی ایک نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا......'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

''میں شام سے پہلے تمہیں یقین دلادوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' اس کا کیا کرنا ہے؟''

''اللہ رکھی آج کے دن میری مہمان ہے۔'' میں نے کہا۔'' اس کا کام ختم ہوتے ہی میں اسے گوجرانوالہ پہنچانے کا بندوبست کردوں گا۔''

وہ مطمئن ہوکر چلا گیا۔

جب میں نے جمیل کو گوجرانوالہ بھیجا تو اس وقت تک زمرد والی انگوٹھی سامنے نہیں آئی تھی۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں تدفین کے موقع پر اللہ رکھی کو کڑیاں والا کے تمام مردوں کے چہرے دکھا کر پوچھوں گا کہ ان میں سے کس نے تمہیں جمیل کے باپ کی موت کی اطلاع دی تھی لیکن انگوٹھی کی بازیابی کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہوگئی تھی۔ اب مجھے حوالات میں موجود دو بندوں میں سے پہلے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ہوسکتا ہے، اس کے بعد

شناخت پریڈ کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔

میں اللہ رکھی کو اپنے ساتھ لے کر حوالات میں پہنچ گیا اور دونوں حوالاتیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟“

اللہ رکھی کی نگاہ کاکا پر جم کر رہ گئی۔ وہ چند لمحات تک ساکت نظر سے اسے دیکھتی رہی پھر بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ...... یہ بندہ آیا تھا...... پرسوں میرے پاس اور...... اس نے مجھے بتایا تھا کہ...... کڑیاں والا میں جمیل کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے۔“

میں نے اللہ رکھی کو واپس اپنے کمرے میں بھیج دیا اور حوالات کے اندر داخل ہوکر... مدیل عرف کاکا پر پل پڑا۔ اس وقت مجھ پر ایک جنون سا سوار ہوگیا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لاتوں گھونسوں کی ضربات سے میں نے کاکا کی حالت غیر کردی۔ دس منٹ کی اس مارا ماری کے بعد کاکا کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ اس کی پسلیوں، پیٹ اور کمر کے مختلف حصوں پر جو اندرونی چوٹیں آئیں ان کا حساب سردست نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

کاکا نے ہانپتے اور کانپتے ہوئے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور منت ریز لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے اور نہ ماریں...... میں سچ بولنے کے لیے تیار ہوں۔“

حوالدار نبی بخش نے بھی کاکا کی اچھی خاصی... ”خاطر داری“ کی تھی لیکن وہ اس کی ڈھٹائی کے خول کو توڑ نہیں سکا تھا تاہم اللہ رکھی کی شناخت کے بعد کاکا اپنے جھوٹ کے قدموں پر جم کر کھڑا نہیں رہ سکا تھا اور اسے اقبالِ جرم کرتے ہی بنی تھی۔

کاکا کے اعترافی بیان نے مقتول بابا رجو کو بھی سرخرو... کردیا تھا یعنی بابے نے حسنہ کو نگی کی غیر نصابی سرگرمیوں کا جو قصہ سنایا تھا وہ مبنی بر حقیقت تھا۔ کاکا اور نگی کے بیچ قابلِ اعتراض معاملات کا سلسلہ جاری تھا۔ کاکا نے بتایا کہ اس نے نگی کے ایما پر ہی بابے رجو کو قتل کیا تھا لیکن بعدازاں جب میں نے نگی کو شاملِ تفتیش کیا تو اس نے کاکا کے الزام کی تردید کردی۔

نگی اور کاکا کے درمیان جمیل کی عدم موجودگی میں کیا کھچڑی پکتی رہتی تھی، مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہ ان دونوں کا اور اللہ کا معاملہ تھا۔ میرے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ میرے تھانے کی حدود میں ایک ستر سالہ بڈھے کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور میں نے اس بڈھے کے قاتل سے اقبالِ جرم کروا لیا تھا۔

میں نے اسی روز اللہ رکھی کو واپس گوجرانوالہ پہنچانے کا انتظام کردیا اور کاکا سے پوچھا۔

”تم نے اپنے دوست طافو کو اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

”میں نے جان بوجھ کر ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب انگوٹھی منحوس بابے کے بستر پر جا گری تھی اور وہ تو جب بعد میں، میں پھنس گیا تو میں نے پینترا بدلا اور طافو کے بیان کی تردید کردی۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے بابے رجو کو نگی کی فرمائش پر قتل کیا یا تمہارا ذاتی منصوبہ تھا۔ بابا تو گیا جان سے۔ جب رجو کو مارنے کا فیصلہ ہو ہی چکا تھا تو پھر گوجرانوالہ جا کر اللہ رکھی کو بابے کی موت کی پیشگی اطلاع دینے سے تمہارا کیا مقصد تھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”جناب! پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ جمیل کو گوجرانوالہ سے فوراً یہاں بلوانے کے لیے یہ چال چلی جائے تاکہ آٹھ دس دن اس کا انتظار نہ کرنا پڑے لیکن جب میں گوجرانوالہ سے واپس آیا تو نگی نے ضد کی کہ بابے کی موت والا جھوٹ بول ہی دیا ہے تو پھر اسے ٹھکانے بھی لگا دیتے ہیں۔ میں نگی کی باتوں میں آگیا اور...... میں نے بابے رجو کا قصہ تمام کردیا۔“

”تم نے اپنی ماں کی کوکھ سے نہیں، بلکہ جرائم کے پیٹ سے جنم لیا ہے کاکا۔“ میں نے اسے نفرت بھری نظر سے گھورا۔ ”تم جرم زادے ہو۔ اگر تم یہاں نہیں پھنستے تو کسی اور جگہ پھنس جاتے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ یہ کسی جرم زادے کو زیادہ دن تک ڈھیل نہیں دیتی...... ہر جرم زادہ اس لاٹھی کا مزہ ضرور چکھتا ہے۔“

اس کے بعد میں نے زمرد جڑی انگوٹھی طافو کے حوالے کردی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

”طافو! میرا نہیں، بلکہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرو جس نے اپنی رحمت سے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلائی ہے۔ اس انگوٹھی کو اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ضرور پہنو مگر اس عقیدے کے ساتھ نہیں کہ یہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے گی۔ فائدہ دینے والی ذات صرف خدا کی ہے!“

اس نے اپنے خیالات پر ندامت سے گردن جھکا دی۔

(تحریر: حُسام بٹ)

جمہوریت

محمد الیاس

ملک چاہے جو بھی ہو... عوام کی عید تو الیکشن کے زمانے میں ہی ہوتی ہے... عوامی مسائل کا انبار... سیاستدانوں کی چالوں کو کامیاب کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے... چلو یہ بھی غنیمت ہے کہ انتخابات کا زمانہ کسی حد تک قوم کے بوجھ کو تو ہلکا کردیتا ہے۔

الیکشن کا دھمال اور سیاستدانوں کے کمال کا ماجرا

تمام دوستوں نے کئی روز تک باہمی مشاورت کی لیکن پوری نیک نیتی سے غور و فکر اور بحث و مباحثہ کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ ان کا مخلص دوست، محمد امین صادق موجودہ دور کی سیاست میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مظفر کہنے لگا۔ ”یہ وہ دور نہیں، جب سیاست کو عبادت سمجھا جاتا رہا۔ مفاد پرستی کی سیاست تب بھی ہوتی رہی اور استحصالی طبقے ہی غالب رہے۔ اسی لیے جب کوئی مخلص سیاستدان میدان میں آیا، سارے مفاد پرست گروہ متحد ہوکر اس کو راستے سے ہٹانے میں

کامیاب ہوگئے۔ اب تو اس ملک کو ایسی بری نظر لگی ہے کہ تبدیلی آنے کی امید بھی نہیں رہی......"

سجاد نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اب کوئی خونی انقلاب ہی ان طاغوتی طاقتوں کے چنگل سے اقتدار چھین کر حقیقی عوامی نمائندوں کے سپرد کر پائے گا۔ ظالموں نے ملکی معیشت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ چند خاندان ہیں جو گھوم پھر کے ہر بار اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ہی تمام تر قومی وسائل لوٹ کر غیر ملکی بینکوں میں جمع کیے۔ اسی لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر بار بار برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ عوام کو بھکاری بنا دیا۔ قومی وقار اور عزتِ نفس کا جنازہ نکل گیا۔ جہاں عام آدمی، گھی کا ڈبا اور آٹے کا تھیلا لے کر ووٹ دے ڈالے، وہاں تبدیلی کے خواب دیکھنا، احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔"

امین بول پڑا۔ "میں آپ دوستوں کی محبت اور خلوص کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن ایک بار کوشش ضرور کروں گا۔ گراس روٹ لیول سے سیاست شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے جلدی نہیں۔ بلدیاتی الیکشن لڑ کر مرحلہ وار آگے بڑھنا ہے۔ موجودہ سیٹ اَپ میں راستہ بنانا ایک لحاظ سے ناممکن ہی سہی لیکن کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ لوٹی ہوئی قومی دولت کو بے دریغ خرچ کر کے الیکشن خرید لیے جاتے ہیں اور جہاں خریدنے مشکل ہوں، وہاں ڈاکا ڈالنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ قومی ادارے کرپٹ کر دیے گئے ہیں۔ یوں دوبارہ برسرِ اقتدار آ کر خرچ کی گئی دولت مع دس گنا منافع کے دوبارہ لوٹ لی جاتی ہے۔"

محمد امین نے اپنی رہائشی عمارت کے اگواڑے ذاتی مارکیٹ کی درمیان والی دو دکانیں خالی کروالیں اور ان میں آرام وہ دفتر قائم کرلیا تاکہ حلقے کے عوام کو رابطہ کرنے کے سلسلے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لوگ آ کر بیٹھنے لگے۔ مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔ متعلقہ سرکاری اہلکاروں کی بے لگام بدعنوانیوں کے نتیجے میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے آباد ہونے والی بستیوں میں نسلِ انسانی، کیڑوں مکوڑوں سے بھی بری حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ بنیادی شہری سہولتوں کا فقدان ہونا درکنار، لوگ غلاظت کے ڈھیروں میں کلبلا رہے ہیں اور ان سے نجات کا راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

مظفر کہنے لگا۔ "میرے یار امین! تمہاری مثال اس معصوم چڑیا جیسی ہے جو جنگل میں لگی آگ کو بجھانے کے لیے چونچ میں پانی بھر کر لا رہی ہو۔ خاص طور پر ان بستیوں کا جو نکاس کے قدرتی راستوں پر آباد ہو چکی ہیں، ایک ہی حل ہے کہ انہیں بلڈوز کر کے نئے شہر آباد کیے جائیں۔ جعلی قائدین نے ملک و قوم کو گروی رکھ دیا ہے اور خود اربوں میں غبن کر کے باہر لے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے بیرونِ ملک اپنی بزنس ایمپائرز کھڑی کرلی ہیں...... تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

جہاں حلقے کے لوگ سنجیدہ معاملات پر گفتگو کرتے وہاں وہ بھی آجاتے، جن کے پیشِ نظر صرف ذاتی اغراض ہوا کرتیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا، ان کی مدد کی جاتی۔ لالچی اور شاطر لوگوں نے بھی راستہ دیکھ لیا، موقع بے موقع آ کر گھر میں بیماری ناداری اور فاقہ کشی کا عذر گھڑ کر کچھ نہ کچھ نقدی کی صورت میں ہتھیا لے جاتے۔

بھوری آنکھوں والی گوری پیلی زرد رو کمزور عورت بھی بچہ گود میں لیے آگئی۔ باتوں باتوں میں بتا دیا کہ لیڈر ہر مرتبہ ووٹ لے جاتے رہے لیکن وعدے کر کے بھی کوئی خاص مدد نہ کی۔ خاوند اندھا ہے۔ ساس سسر اور ماں باپ بوڑھے اور کمزور ہیں۔ جوان بیٹیوں کو عزت کے مارے گھر سے نہیں نکالتے۔ غریبی کی وجہ سے ان کی شادیاں نہیں ہوسکیں۔ لڑکے چھوٹی چھوٹی مزدوریاں کرتے ہیں۔ ابھی ان کی عمر ہی کم ہے۔ آپ کی مشہوری سنی کہ بڑے رحم دل ہیں۔ گھر کے راشن کا سوال کرنے آئی ہوں۔

نوجوان ساتھیوں کے علاوہ محمد امین خود بھی عورت کی حالتِ زار دیکھ کر متاثر ہوا لیکن مرحوم باپ کے وقتوں کا معمر تجربہ کار ملازم محمد حسین ساری صورتِ حال کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ عورت سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اس کے کتنے بچے ہیں۔

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔ "اللہ کی دولت ہے جی! نو ہیں۔ چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے......" گود میں لیے ہوئے بچے کے رخسار کو پیار سے چھو کر مزید بولی۔ "اس سمیت سارے بیٹے چھوٹے ہیں۔" محمد حسین نے اس کے پیٹ پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ "تو نہیں دس کہو۔ دسواں بچہ لڑکی ہوئی یا لڑکا، اللہ کی اور دولت سنبھالنے کی تیاری پکڑو۔"

عورت پہاڑی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ بزرگ ملازم کی بات سن کر ذرا خفیف نہ ہوئی۔ کہنے لگی۔ "اَنکل (uncle) جی! یہ دولت قسمت والوں کو ملتی ہے، جسے اللہ دے۔ غریبی بھی وہی دیتا ہے۔ آج نہیں تو کل کٹ جائے گی۔"

محمد حسین بول پڑا۔ "میں بھی ساری زندگی یہی سمجھتا رہا کہ اللہ میاں، بچوں کی دولت زبردستی دیتا ہے لیکن جب میری بہو دو بچے پیدا کر کے اپنے خاوند کے سامنے ڈٹ گئی کہ اور بچے اس آمدنی میں نہیں پالے جائیں گے، ساس بہو میں صلاح مشورے ہوتے رہے اور دونوں نے سرکاری ڈسپنسری

کے چکر لگانے شروع کر دیے...... دس سال ہوگئے، بچے کی شکل میں دولت دوبارہ ہمارے گھر میں نہیں آئی۔ بلکہ اب تو میرا بیٹا بھی اپنی بیوی کی عقل مندی پر خوش ہے۔"

"توبہ استغفار! اللہ کے کام کو روکتی ہے آپ کی بہو اَنکل جی!" عورت نے محمد حسین کو ٹوک دیا۔ بزرگ کھلے دار حاجی محمد انور نے شاید شروع میں ہونے والی باتیں غور سے سننے کے بجائے، اخبار دیکھنے میں دلچسپی لے رکھی تھی، اب عورت کی طرف متوجہ ہو کر سوال کر دیا کہ تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟

محمد حسین نے جھٹ بول دیا۔ "بتا رہی ہے نا کہ دس بچے ہیں......"

عورت ترت بولی۔ "شکر ہے اللہ پاک کا......" وہ براہِ راست محمد حسین کو مخاطب کر کے بول پڑی۔ "آپ کیوں جل جل کے کوئلہ ہو رہے ہو اَنکل جی!"

حاضرینِ محفل اس دلچسپ مکالمے پر ہنسنے لگے، جبکہ امین ایک کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف نظر آیا۔ ایک نگاہ محمد حسین پر ڈال کر بولا۔ "چاچا جی! یہ چِٹ ساتھ والے اسٹور پر لے جائیں اور اس کے مطابق ان کو راشن دلوا دیں۔" وہ عورت فوراً امین کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ "چِٹ مجھے دیں۔ سودا میں خود لے لوں گی۔ اَنکل بڑے سڑیل ہیں...... ایک مہربانی اور کریں۔ یہ میرے پاس ڈاکٹر کی پرچی ہے، اس بچے کے دودھ اور کچھ دواؤں کی۔ ساتھ والی دکان سے مل جائیں گی۔ اللہ آپ کو کامیابی دے......"

سب لوگ ہنس پڑے۔ محمد حسین کہنے لگا۔ "یہ امین صاحب بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔ ان لوگوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ بخشے، ان کے والد صاحب اور آپ کے دوست، حاجی محمد صادق بھی بڑے سخی تھے لیکن ایک نظر میں بندہ پہچان جاتے کہ کون پیشہ ور منگتا ہے اور کون سفید پوش عزت دار ضرورت مند......"

عورت کی بھوری آنکھیں چند لمحوں کے لیے مادہ چیتا کی آنکھوں کا سا روپ دھار گئیں۔ اس کے زرد چہرے پر خون کی سرخی دوڑنے کے بجائے، سیاہی مائل لہری جھلکتی دکھائی دی۔ امین کے ہاتھ سے پرچی اچک کر براہِ راست اس سے مخاطب ہوئی۔ "یہ بوڑھا آپ کی نیکیوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ دوائیوں والے اسٹور کا بھی رقعہ لکھ دیں۔ میں سودا خود لے لوں گی۔ اللہ آپ کو وزیرِاعظم بنائے۔ سو روپیہ نقد دے دیں۔ سامان خود اٹھا نہیں سکتی۔ گھر میں جوان بچیاں یا بوڑھے اور بچے ہیں۔ ٹیکسی والے بڑے بے ایمان ہیں۔ تھوڑا سا فاصلہ ہے مگر منہ پھاڑ کر سو روپیہ مانگ لیں گے......"

دفتر میں بیٹھے سارے لوگ ہنسے جا رہے تھے۔ امین حیرانی سے اس عورت کو دیکھنے لگا۔ سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ "میں میڈیکل اسٹور پر فون کر دیتا ہوں۔ وہ پرچی کے مطابق دودھ کا ڈبا اور دوائیں دے دے گا۔ آپ جائیں......"

وہ نوٹ پکڑ کر دعائیں دیتے ہوئے بولی۔ "دودھ کے دو ڈبے لوں گی اور ڈاکٹر کی پرچیاں بھی دو ہیں۔ دوسری میری اپنی پرچی ہے۔"

عورت نے جاتے جاتے اس کو کینہ توز نظروں سے دیکھا اور بول گئی۔ "آپ اب گھر میں ریسٹ (rest) کیا کرو اَنکل! مفت کی تنخواہ لو اور رب کے چوپا کرو...... اور کوئی نیکی بدی اب کر بھی نہیں سکتے۔" وہ دفتر سے نکلتی چلی گئی اور وہاں بیٹھے سارے لوگ ہنسنے لگے۔

محمد حسین بول پڑا۔ "میں کیا کروں، کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ مجھ پر بڑے احسانات ہیں مرحوم صادق صاحب کے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بڑے بھائی کا پیار دیا اور اعتبار کیا، کبھی نوکر نہ سمجھا......"

محمد حسین کو دل گرفتہ ہوتا دیکھ کر امین بول پڑا۔ "چاچا جی! ہم نے آپ کو ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا ہے۔ کوئی شکایت ہے تو بتائیں...... اب یہ کہ غربت کو اسی لیے بڑی لعنت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں انسان کا کریکٹر ہی نہیں رہتا۔ چالاکی، چاپلوسی، مکر و فریب، جھوٹ، فراڈ، ظلم، چوری چکاری، ڈاکا زنی، ہیرا پھیری، نوسربازی اور بے حیائی، بدکاری وغیرہ، ساری کی ساری برائیاں اسی نامراد مفلسی کی اولادیں ہیں اور مفلسی اس غیر منصفانہ ظالمانہ سیاسی معاشی نظام کی پیداوار ہے۔ ایسے غیر انسانی نظامِ حکومت میں آخرکار دو ہی طبقے باقی رہ جاتے ہیں...... ایک جو لوٹ مار کے ذریعے اپنے خزانے بھرتا ہے، قومی خزانہ غبن کر کے اور دوسرا جو بالکل ہی محروم رہ جاتا ہے۔"

حاجی انور نے ایک نظر محمد حسین پر ڈالی اور امین سے کہا۔ "محمد حسین نے ساری زندگی تیرے مرحوم باپ کے ساتھ وفاداری نباہی ہے۔ وہ اس لیے فکرمند ہو رہا ہے کہ جس طرح تم کر رہے ہو، یوں بہت جلد خود بھی دوسرے طبقے میں شمار ہونے لگو گے۔ محمد حسین نوجوانی میں تیرے باپ کے پاس ملازم ہوا اور میری اس کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی جو اللہ کے کرم سے عمر بھر قائم رہی۔ ہم نے اپنی بیویوں کے ہمراہ حج بھی اکٹھے کیا۔ تمہارا دادا اس زمانے میں بھی امیر تھا جب سارے ہندوستان کے ہزار میں سے نوسو ننانوے مسلمان غریب ہوتے تھے۔ تمہارے باپ نے بڑی دانائی سے

دولت جائداد کو سنبھالا۔ ایک روپیہ ناجائز طریقے سے نہ کمایا لیکن تمہاری طرح بغیر سوچے سمجھے خرچ بھی نہ کیا۔ جس طرح کی سیاست ملک میں ہو رہی ہے، تم اس میں فِٹ نہیں بیٹھ رہے۔ ان لوگوں کا مقابلہ شیطان بھی نہیں کر سکتا۔ جو قومی خزانے کے امانت دار اور محافظ بن کے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی دولت اور بیرونِ ملک اثاثوں کی مالیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں رہا۔ جو امیر کبیر بن گئے، ان میں وہ بھی ہیں جو کبھی پرانی موٹر سائیکل پر دن بھر دھکے کھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اسی ملک سے لوٹی ہوئی دولت کا معمولی سا حصہ خرچ کر کے الیکشن جیت لیں گے۔ تم مہربانی کر کے اپنے کام کی طرف دھیان دو...... یا کوئی فلاحی کام کر لو، اس دفتر میں فری ڈسپنسری وغیرہ کھول کر خود کو مصروف رکھو۔ اس طرح غریبوں میں راشن بانٹ کر غریبی ختم نہیں ہو گی۔ ہاں، غریبوں کی عادتیں مزید خراب کر دو گے...... الیکشن جیتنا تمہارے بس کا کام نہیں۔“

قریبی دوستوں اور بزرگوں کی نصیحتیں رائگاں گئیں۔ امین اپنی دھن میں لگا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنے حصے کا کام ضرور کرنا چاہیے۔ نتائج جو بھی ہوں، یوں وہ اپنی ذات کی حد تک سرخرو ہو جاتا ہے۔ امین کی نیت جو بھی رہی ہو، موقع شناس لوگ فائدہ اٹھاتے رہے۔ اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر کچھ نہ کچھ اینٹھ، بٹور کر لے جاتے اور وہ بیوقوف بنتا رہا۔

ایک دس بارہ سال کی خوش شکل لڑکی کڑھائی اور دستکاری کے نمونے اٹھائے آنے لگ گئی۔ امین کو یوں گمان گزرا گویا اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔ اس نے اپنے گھر کا صحیح اتا پتا بتانے سے گریز کیا۔ باپ کی بے روزگاری، بیماری اور گھر کی زبوں حالی کا واسطہ دے کر التجا کرتی کہ وہ بھکارن نہیں، صرف اپنی دستکاری کی اشیا بیچنے میں تعاون کی طلب گار ہے۔ امین نے ہر مرتبہ اس کی مالی مدد کر دی۔ سمجھایا بجھایا کہ وہ خود یوں بازار میں نہ آیا کرے۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ تسلی دلاسا دینے پر اپنا سامان اور امداد میں ملی رقم لے کر چل دیتی لیکن دو تین ہفتوں کا وقفہ دے کر پھر آ جاتی اور اپنے گھر پر نازل ہونے والی کسی نئی مصیبت کا ذکر کر کے مال کھینچ لیتی۔

اسی طرح نو دس سال کا ایک لڑکا آنے لگا۔ وہ بھی کچھ جانا پہچانا سا لگتا۔ حلقے کی کچی آبادی کے آخری حصے میں اپنی رہائشی جھگی کا پتا بتایا۔ بقول اس کے، ماں باپ دونوں بیمار اور چار چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ امین اس کی بھی مالی مدد کرتا رہا لیکن شک گزرتا کہ لڑکا ہر مرتبہ جھوٹ بولتا ہے۔ امین نے اس کو ٹالنے کی کوشش بھی کر دیکھی لیکن وہ لڑکا اڑ جاتا اور کہتا کہ گزشتہ رات سے گھر میں فاقہ ہے۔ چند ایک بار امین نے اس کو نقد رقم دینے کے بجائے ہوٹل سے ڈھیروں روٹیاں اور سالن منگوا دیا۔ لڑکے میں جارحانہ پن عود کر آتا۔ روٹیاں سالن لے کر بھی اڑ جاتا اور کہتا کہ سو نہیں تو پچاس روپے ہی نقد دے دو تاکہ کل ہم لوگ ناشتا تو کر سکیں۔

ایک روز محمد حسین نے دفتر میں آ کر ایسی کہانی سنائی کہ سب کو حیران کر دیا۔ کہنے لگا۔ ”روٹیاں سالن لینے والا لڑکا، دستکاری کا سامان بیچنے والی لڑکی آپس میں سگے بہن بھائی ہیں اور دونوں اسی عورت کی اولاد ہیں، جو ہر مہینے راشن کے ساتھ دودھ کے دو ڈبے اور دوائیں لے کر جاتی ہے۔ عورت کا نام صفیرہ ہے، لڑکے کا سفیر اور لڑکی کا سفینہ۔ گھر میں تین جوان لڑکیاں، سلائی کڑھائی کا اچھا خاصا کام کرتی ہیں......“

مقامی حکومتوں کے چناؤ کا اعلان ہو گیا اور امین نے بطور امیدوار کاغذات جمع کرا دیے۔ سردیوں کی پہلی بارش کو سرِ شام ہی دفتر کی رونق کم ہو گئی۔ محمد حسین عشا کی نماز ادا کر کے مسجد سے واپس آیا ہی تھا کہ سفیر نے اندر جانے کی کوشش کی لیکن محمد حسین نے اس کو روک دیا۔ لڑکا الجھ پڑا اور اس پر گویا دیوانگی طاری ہو گئی۔ زبردستی اندر گھسنے کی خاطر ہڑبڑی مچا دی اور بوڑھے شخص کو گالیاں بکنے لگا۔ دفتر میں صرف امین اور مظفر بیٹھے تھے۔ محمد حسین نے لڑکے کو دھکیل دیا اور شیشے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ باہر سے شیشے کی شیٹ کے ساتھ چھپکلی کی طرح چپک گیا۔ دونوں ہتھیلیوں سے شیشہ تھپتھپا کر اونچی آواز میں بولنے لگا۔ ”اوئے! اللہ کے واسطے مجھے ہوٹل سے روٹیاں سالن لے دو۔ میرے گھر والے بھوکے بیٹھے ہیں......“

لڑکا زیادہ زور زور سے شیشہ تھپتھپانے لگ گیا۔ تینوں کو فکر لگ گئی کہ شیشہ کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ محمد حسین نے غصے میں آ کر کونے میں پڑی چھتری اٹھا لی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ امین کی آواز سنائی دی۔

”چاچا جی! مارنا نہیں صرف ڈرانا ہے۔“ محمد حسین نے کوئی جواب نہ دیا اور سیدھے ہاتھ میں پکڑی چھتری کو تولتے ہوئے الٹا ہاتھ لاک کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ زوردار چھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا اور اینٹ کا روڑا بائیں آنکھ سے ذرا اوپر پیشانی پر آن لگا۔

امین کے منع کرنے کے باوجود محمد حسین نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی اور پولیس لڑکے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ تیسرے روز ہی حکومتی پارٹی کے امیدوار نے لڑکے کو رہا کرا دیا۔ سیاسی سرگرمیاں زور پکڑ چکی تھیں۔ لالچ، تحریص اور جوڑ توڑ، گویا ہر طرح کا جائز و ناجائز ہتھکنڈا آزمایا جانے لگا۔ دھڑے بندیاں بھی عروج کو پہنچ گئیں۔

حکومتی پارٹی کے امیدوار میاں کمال اکبر نے امین کو فون کال کر کے کہیں علیحدگی میں آمنے سامنے بیٹھ کر باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کرنے کی پیشکش کی، جو اس نے قبول کر لی اور بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ کمال نے کہا۔ ”بغیر لگی لپٹی کے صاف اور کھری بات کروں گا، وہ یہ کہ آپ میرے مقابلے میں الیکشن ہار رہے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کچھ خرچہ پانی لے کر میرے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ آپ شریف باپ کی اولاد ہو، سیاست نہیں کر سکتے۔ میں نے میٹرک، ایف اے، بی اے، سارے امتحان بغیر پڑھے پاس کر لیے...... وہ اس طرح کہ سینٹر میں نقل لگائی، پرچے حل کروائے، پھر بھی فیل لیکن بورڈ اور یونیورسٹی سے سندیں اور ڈگری لے کے رہا۔ بے شک دونوں اداروں کا ریکارڈ چیک کروا لیں، باقاعدہ اندراج موجود ہو گا۔ میں کچا کام نہیں کیا کرتا۔ اب تو حکومت میرے ساتھ ہے۔ کہیں تو فالتو بیلٹ پیپر اور مہر وغیرہ ابھی دکھا دوں۔ مختصر بات یہ ہے کہ آپ نے پڑھ کے دو دو ایم اے کر لیے، وہ اور بات ہے اور یہ الیکشن والا معاملہ ہی اور ہوتا ہے......“

”کمال صاحب! آپ کو کامیابی کا پکا یقین ہے، پھر کیوں مجھے دست بردار کرواتے ہیں؟“ امین نے ٹوکتے ہوئے پوچھ لیا۔

کمال کہنے لگا۔ ”اس لیے کہ حلقے میں آپ کی شرافت کا فوبیا ہو گیا ہے اور کوئی مقابلے میں ایسا ہے ہی نہیں، جس سے خطرہ ہو۔ آپ دست بردار ہو کر مالی نقصان سے بچ جائیں گے اور میری عزت رہ جائے گی...... عزت تو خیر، میں ویسے بھی بنا ہی لوں گا۔ وہ یوں کہ کچھ ہماری پارٹی کے اصلی ووٹ ہیں۔ کافی سارے ووٹوں کا سودا ہو چکا ہے۔ باقی جو کمی رہ گئی، وہ اسی طرح پوری ہو گی، جیسے سندیں ڈگری لی جاتی ہے۔ آپ سمجھ جائیں۔ جس کے پیچھے حکومت کی طاقت ہو، وہ نہیں ہار سکتا۔ پولنگ شروع ہوتے ہی خریدے ہوئے ووٹرز بھگتائیں گے۔ انہوں نے پولنگ بوتھ میں جا کر پرچی بیلٹ بکس میں ڈالنے کے بجائے ہمیں لا کے دینی ہے۔ نقد و نقد ادائیگی۔ کھرا سودا...... اور شہر بھر میں آپ کو ہر کوئی کہتا پھرے گا... امین! تو بھون دانے......“

امین نے اٹھتے ہوئے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے کمال صاحب! آپ اپنی عزت رکھنے کے لیے وہی کمال دکھائیں، آزمودہ طریقوں والا...... میں دانے ضرور بھونوں گا۔“

پولنگ سے تین دن پہلے، صفیرہ ایک عمر رسیدہ اور دو ادھیڑ عمر مردوں کے ہمراہ امین سے ملنے آ گئی۔ محمد حسین کو گھور کر دیکھا اور امین سے کہا۔ ”آپ سے گفیہ (خفیہ) بات کرنی ہے۔ سب کو باہر بھیجیں۔“ سارے لوگوں بشمول محمد حسین کو دفتر سے باہر جانے کو کہا تو عورت بے دھڑک بول پڑی۔ ”آپ نے جو صدقہ خیرات دیا، اس کا بہت زیادہ ثواب ہوا ہے، وہ ہم پر احسان نہیں......“

پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ اپنے ساتھی مردوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر امین سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ بزرگ ہماری برادری کے بڑے ہیں...... اور دوسرے دونوں میرے سگے بھائی......“ لحظہ بھر کو رک کر حکومتی سیاسی جماعت کے امیدوار کا نام لے کر کہنے لگی۔ ”اس نے ہمیں ایک ہزار روپے فی ووٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے برادری سے کہا، مجھے محمد امین سے بات کرنے دو۔ وہ اچھے رحم دل انسان ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہمارا لڑکا تھانے میں بند کروایا، اس نے چھڑا دیا۔ برادری کی تین استانیوں کی تبدیلی دور دور شہروں میں ہو گئی، وہ بھی واپس کرا دی۔ ہمارے چار بندے، تھانے والے ناحق پکڑ کر لے گئے، وہ بھی رہا کرائے۔ کئی غریبوں کے گھروں کا پانی اور بجلی محکمے نے بند کر دی تھی، اس اللہ کے بندے نے خود سر پر کھڑے ہو کر سب کی بجلی لگوائی اور پانی بھی کھلوا دیا۔ بل خود دیا ہے یا معافی دلوا دی، ہمیں نہیں پتا۔ بلدیہ نے ساری آبادی کو سرکاری جگہ خالی کرنے کا نوٹس دیا تھا، اس اللہ کے بندے نے میرے بھائیوں کو ساتھ لے جا کر معاملہ دبا دیا۔ افسر نے تسلی دی اور کہا کہ آرام سے رہو، کچھ نہیں ہو گا۔ میرے سمیت ہماری بیس عورتوں کا وظیفہ بھی لگا دیا۔ پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ ووٹ آپ کو دیں۔ اب آپ بتائیں کہ ہمیں کیا دیں گے؟“

محمد امین نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔ اسی کو جوش دلاؤ کہ ریٹ اور بڑھائے۔ میں بولی میں حصہ ہی نہیں لے رہا۔“ تیسرے روز انتخابات ہو گئے۔ محمد امین کا انتخابی نشان گھوڑا تھا۔ حلقے کی بعض گلیوں کے ووٹرز نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ گھوڑے پر مہر لگائیں گے۔ کمال کے کارندوں کی اوباش منڈلی ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ جہاں بھی امین کی ووٹر خواتین آتی دکھائی دے جاتیں، اوباش لڑکے بازو ہلا کر فحش اشارے کرتے اور بے ہودہ کلمات ادا کرتے۔ بیشتر خواتین شرمسار ہو کر واپس لوٹ گئیں۔ جو نتائج آئے، ان کے مطابق امین اٹھاسی ووٹوں کے فرق سے ہار گیا۔

حاجی انور نے تبصرہ کیا۔ ”میرے عزیز! یہ ہے الیکشن جیتنے کا اصل طریقہ اور جمہوریت کا حسن۔“

***

محفلِ شعروسخن

❋ علیزہ خان ......کوئٹہ
وہ جب بھی ملتے ہیں بارش کا مزہ دیتے ہیں
اور مجھ سے کہتے ہیں کہ برسات سے ڈر لگتا ہے

❋ محمد صفدر معاویہ ......خانیوال
پہلے خوشبو کے مزاج کو سمجھ لو دوست
پھر گلستان میں کسی گل سے محبت کرنا

❋ انیلا رشید سیال ......خیرپور میرس، سندھ
کسی کے قرب کا احساس بھی عجب شے ہے
جو ہر گھڑی میری سانسیں بحال رکھتا ہے

❋ حسنین عباس۔ کمیل عباس......کھاریاں
بھیگی ہوئی آنکھوں کا یہ منظر نہ ملے گا
گھر چھوڑ کے مت جاؤ کہیں گھر نہ ملے گا
پھر یاد بہت آئے گی زلفوں کی گھنی شام
جب دھوپ میں سایہ کوئی سر پہ نہ ملے گا

❋ بابر عباس، مسز بابر عباس......کھاریاں
کہاں آنسوؤں کی یہ سوغات ہوگی
نئے لوگ ہوں گے نئی بات ہوگی
میں ہر حال میں مسکراتا رہوں گا
تمہاری محبت اگر ساتھ ہوگی

❋ ادریس احمد خان ......ناظم آباد کراچی
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

❋ طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
پہلے تو اس کو حال سے بے حال کیجیے
پھر انتہائے شوق میں وصال کیجیے
جھولی میں ڈال دیجیے رخسار و لب کی بھیک
چلیے کسی غریب کو خوش حال کیجیے

❋ مہوش نورین خان ......تھولہ بائی پاس
میرے یوسف تیری بھرپور زیارت کے لیے
مانگ لائی ہوں زلیخا سے ادھوری آنکھیں

❋ کاشف خان ......ماڈل ٹاؤن، پریم نگر
اے کاش خاک بن کے بکھر جاؤں وفا کی راہوں میں
قدموں میں تیرے جیون گزرے موت آئے تیری باہوں میں

❋ ناہید یوسف ......اسلام آباد
تجلیِ طرب میں رنگِ سلیمانی چاہیے
دل کو ہر ایک حال میں سلطانی چاہیے

❋ ناظر حسین......کراچی
مجھ کو مایوس نگاہوں سے نہ دیکھو کہ چراغ
بجھتے بجھتے بھی اندھیروں میں ضیاء دیتے ہیں

❋ شمائلہ سلمان......کورنگی، کراچی
پلکوں پہ بن رہے ہیں کئی رات کے نقوش
چہرہ دکھا رہا ہے ترا آب سے بھی وہ

❋ لبنیٰ وکیل......کوئٹہ
انفاس میں کچھ ایسی تھی حدت کہ کل کی شب
اک دوسرے کے جسم کو شعلہ بنالیا
کردی شبِ وصال میں روشن بدن کی لو
گل ہوگئے چراغ تو خود کو جلالیا

❋ عظیم احمد......جھنگ سٹی
میں کیسے اپنی سطح سے اتر کے بات کروں
وہاں ہے تو کہ جہاں روشنی نہیں جاتی

❋ راحیلہ شفیق......سندھی ہوٹل
دوا کی تلاش میں رہا دعا کو چھوڑ کر
میں چل نہ سکا دنیا میں خطاؤں کو چھوڑ کر
حیران ہوں میں اپنی حسرتوں پہ
ہر چیز خدا سے مانگی مگر خدا کو چھوڑ کر

❋ منیر شگفتہ......وہاڑی
کاش تجھ کو دکھائی دے جائے
تیری چوکھٹ پہ آ پڑا ہے کوئی
اس قدر ٹوٹ پھوٹ تھی مجھ میں
چار دن بھی نہ رہ سکا ہے کوئی

❋ عبدالجبار رومی انصاری......قصور
ہونٹوں پہ ساحلوں کی طرح تشنگی رہی
میں چپ ہوا تو میری انا چیختی رہی
سڑکوں پہ سرد رات رہی میری ہمسفر
آنکھوں میں میرے ساتھ تھکن جاگتی رہی

❋ سائرہ نواب......پشاور
چھپ کے دیوار سونگھتی ہے مجھے
مدتوں بعد گھر گیا ہوں میں

❋ نادیہ ریاض......نواب شاہ
آگ تھی انگلیوں کو چاٹ گئی
اور دھواں داستان میں تھا کہیں

❋ عمران شیروانی......لاہور
میں کب تک درد میں بہتا رہوں گا
کوئی کہہ دے کنارہ آ گیا ہے

❋ طارق خان......اسلام آباد
ایک سورج جو دن کا ضامن تھا
کھڑکیوں سے اتر گیا ہوگا

❋ عاصم خان......کراچی
اس کے معنی محبتوں کے نہیں
اس نے سوکھا گلاب بھیجا ہے

❋ صبا حمید......ٹنڈوالہیار
یہ جنگل میں جو سادھو ڈھونڈتے ہیں
تری آنکھوں کا جادو ڈھونڈتے ہیں
ہمیں بھی ماتمی دستے میں رکھ لو
کہ ہم بھی دست و بازو ڈھونڈتے ہیں

❋ جنید ملک......کراچی
چاند چمکا نہ مرے ساتھ سویرا نکلا
رات کی لوٹ سے بیمار اندھیرا نکلا
پھر مرے دل پہ اداسی نے کیا ہے قبضہ
پھر تری آس کے ہاتھوں سے بسیرا نکلا

❋ مہتاب احمد......حیدرآباد
تمہارے دائرے میں قید ہوں میں
مکمل دائرہ ہوتے ہوئے بھی
نہیں کوئی یہاں آغاز و آخر
اگرچہ راستہ ہوتے ہوئے بھی

❋ عرفان احمد، جمیل انور......چوآسیدن شاہ
محبت سمیٹ لیتی ہے زمانے بھر کے رنج و غم
سنا ہے دوست اچھے ہوں تو کانٹے بھی نہیں چبھتے

❋ منشی محمد عزیز......وہاڑی
ہمیں ہی جرأتِ اظہار کا سلیقہ ہے
صدا کا قحط پڑے گا تو ہم ہی بولیں گے

❋ شاہد علی......فیصل آباد
ساحل سے ٹکرانے والی وحشی موجیں بھی
زندہ رہنے کی خواہش میں مرنے لگتی ہیں

❋ سلیم قادر......میانوال رانجھا
آیا ہے ترا وصل ہمیں راس کچھ ایسا
پھرتے ہیں ترے ہجر کو لوگوں سے چھپا کر

❋ ثمینہ ثاقب......ملتان
دیکھ لے نامراد دل تیرا گواہ بن گیا
ورنہ مرے خلاف تو میرے ہی فیصلے رہے

⊛ صبا سحر......کراچی
اس نے اپنی آنکھ سے باندھے، موسم زندہ رنگوں کے
اور ہماری آنکھ میں تنہا، ایک ستارہ روشن تھا

⊛ زوہیب ملک......گلستانِ جوہر، کراچی
تمہارا نام لب پر تھا بلندی سے گرا تھا جب
ہمارے دل کے ہونٹوں سے کوئی سسکی نہیں نکلی

⊛ انعم کمال......حیدر آباد
مجھ میں رہے وہ اپنے اندر رہ نہ پائے
اس لڑکی کو اتنا ٹوٹ کے چاہا جائے

⊛ امتیاز احمد......پھالیہ
یہاں باہر ہیں جب پنجرے ہی پنجرے
تو پنچھی کیوں بغاوت کررہا ہے

⊛ شاہد خان......شاہ فیصل کالونی، کراچی
ہجرت کرگئے سارے شور مچاتے بچے
گونج رہی ہے ریل کی سیٹی خالی گھر میں

⊛ خان سعید ......لاڑکانہ
تیرے پیر کی مٹی ہم نے رکھ لی اپنی مٹھی میں
تیری آنکھیں، ہونٹ اور چہرہ لوگ اٹھا کر لے آئے ہیں

⊛ نعیم احمد......بہاولپور
ٹھیک ہے عشق کر لیا صاحب
یہ خطا بار بار مت کرنا

⊛ آذین رضوان......کراچی
ایک آنسو ہوں آنکھ میں اس کی
اس کا رخسار میرا ساحل ہے

⊛ عاصمہ سعید......سرگودھا
ہجر میں جاگتے لمحو تم یاد ہو تو اتنا بتلاؤ
کتنے چاند نکل کر ڈوبے اور کتنے تہوار گئے

⊛ عاطف علی......میرپور خاص
دشتِ تنہائی میں گونجی جب صدائے بازگشت
دور تک بکھرا ہوا ہستی کا شیرازہ لگا

⊛ وسیم خان......چنیوٹ
قحط آب بڑھا تو بوڑھی دھرتی کے لب سوکھ گئے
اور ہوائیں ڈھونڈ رہی ہیں بستی بستی بادل لوگ

⊛ یسریٰ یوسف ......کراچی
اتنی وحشت ہے کہ اپنے آپ سے ڈرنے لگے
لوگ گھروں کی بات اب بازاروں میں کرنے لگے

⊛ عدیل احمد......سکھر
بستی میں جتنے پیڑ تھے سایوں سے لد گئے
لیکن میں سر پہ دھوپ لیے بے گھروں میں تھا

⊛ عادل خان......کوئٹہ
موسم کا زہر اب کے فضاؤں میں یوں گھلا
تتلی کی سرد لاش پڑی ہے گلاب پر

⊛ اسامہ جنید......کراچی
وہ نام اور تھا سرِ محضر لکھا ہوا
یہ کون آ گیا ہے سرِ دار دیکھنا
یہ دل ہے اور یہ زخم یہ آنکھیں ہیں اور یہ تم
یہ شہر دیکھ لو تو یہ بازار دیکھنا

⊛ نوید تمیسن......کراچی
جو لوگ ہجر کی مسافتوں میں تھک کے سو گئے
خیالِ موسمِ وصال ہی انہیں جگائے گا

⊛ اسما جنید......ٹوبہ ٹیک سنگھ
بچھڑتی اور ملتی ساعتوں کے درمیاں اک پل
یہی اک پل بچانے کے لیے سب کچھ گنوایا ہے

⊛ عمر خان......پشاور
دل میں اک سمندر ہے اور دل ہے قبلہ رو
چار سمت سناٹا اک صدائے اللہ ہو

⊛ نبیلہ ثاقب......فیصل آباد
زمیں سے آسماں تک ایک سی ویرانیاں ہیں
کہیں جگنو نہیں ہے اور کہیں تارا نہیں ہے

کوپن
برائے
شمارہ
مارچ
2018

محفلِ شعروسخن

نام : ....

پتا : ....

مجرم کون

اعتزاز سلیم وصلی

گھر کی چار دیواری اور محبتوں کے حصار سے فرار کبھی کسی کو راس نہ آیا اور جس نے یہ کوشش کی اس نے یقینا بے شمار ٹھوکریں کھائیں... اور بالآخر لوٹ کے بدھو گھر کو آنے کے مترادف انہیں اپنے مرکز کی طرف پلٹنا پڑا... ان کا حال بھی کچھ انہی جیسا تھا جو بڑے زعم میں گردن اکڑا اکڑا کر گھر سے نکلتے ہیں اور سر جھکا کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

گردشِ زمانہ میں خود کو تلاش کرنے اور سمجھنے کی خواہش کا بھرم

صبح بازار میں رش کم تھا۔ بازار کے اختتام پر شروع ہونے والی گلی سے وہ دونوں سرپٹ دوڑتے ہوئے برآمد ہوئے۔ ان لمبے تڑنگے نوجوانوں کو دیکھ کر دکاندار باہر نکلے۔ بازار کے اختتام پر سڑک شروع ہوئی تو ایک تھک کر رک گیا۔ دوسرے نے بھی بریک مارا اور ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”کک... کیا ہوا؟“

”ہم بھاگ کیوں رہے ہیں؟“ رکنے والی ناہموار سانسوں کے درمیان جواب دیا۔

”یہ تو تمہیں پتا ہوگا۔ میں تو سو رہا تھا اور تم پولیس پولیس کا نعرہ لگا کر بھاگنے لگے۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں پولیس کی گاڑی وہاں رکی تھی، میں سمجھا ہمیں پکڑنے آئی ہے۔“ پہلے والے نے معصومیت سے جواب دیا پھر وہ مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا واپس لوٹا۔

”او مِن، واپس تو جارہا ہے یہ بتا، بیٹا لاش کا کیا کریں

گے؟'' پہلے والے کی بات سن کر وہ تیزی سے مڑا۔

''یہاں اعلان کردا کہ ہمارے کمرے میں ایک لاش موجود ہے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

☆☆☆

گاؤں میں رہنے والے اکثر نوجوانوں کی طرح اس کا خواب بھی شہر جاکر بڑا افسر بننا تھا۔ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کا تین بہنوں کے بعد پیدا ہونے والا اکلوتا شہزادہ جس کا نام بھی ماں باپ نے شہزادہ حسنین رکھا تھا۔ شہزادہ حسنین ولد چودھری حسنین، سو ایکڑ زمین کا مستقبل کا وارث مگر اس کا شوق شہر میں زندگی گزارنا تھا۔ سولہویں سال تک میٹرک کرلیا۔ چودھری حسنین نے اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود شہزادے پر کوئی نرمی نہ رکھی جس کے سبب وہ استانی کے عشق میں گرفتار ہوگیا اور اسکول فیس کو گھر میں دوگنا بتا کر کلفس کی تعداد میں اضافہ کیا۔ پرائیویٹ اسکول میں میٹرک کرکے شہزادے نے آگے پڑھنے کی اجازت مانگی۔ چودھری صاحب کو یقین تھا، میٹرک میں تھرڈ ڈویژن حاصل کرکے شہزادہ انٹر میں ٹاپ نہیں کرسکتا، اس لیے انہوں نے وقت اور پیسا ضائع کرنے کے بجائے شہزادے کو کالج بھیجنے سے انکار کردیا۔ ویسے بھی اسکول پرنسپل نے استانی صاحبہ سے عشق کی ساری داستان چودھری کے گوش گزار دی تھی۔ لیکن اس وقت چودھرائن اکلوتے بیٹے کی دو آنکھوں میں آنسو برداشت نہ کرسکی اور چودھری صاحب کو قسمیں وعدے دے کر جناب شہزادہ حسنین کو شہر بھجوا دیا۔ انٹر میں پرائیویٹ کالج نے شہزادے کو ایف اے میں داخلہ دے دیا۔ شہزادے کی زندگی خوشگوار ہوگئی کیونکہ مخلوط نظام تعلیم نے ویسے بھی عشق نامی سہولت کو مزید آسان کردیا تھا۔ پہلا سال صرف دور دور سے دیکھنے کے بعد آخرکار شہزادے نے کالج کے دوسرے سال میں کالج کا پہلا عشق اور مجموعی زندگی کا تیسرا عشق فرمایا۔ نشانہ نوشین شہزادو بنی جسے سب پیار سے نوشی کہتے تھے۔ نوشین احمد ایس پی احمد شہزاد کی بیٹی تھی جسے بس دو شوق تھے۔ نمبر ون میک اپ اور نمبر دو شاعری کرنا۔ شہزادے نے کامیابی کی طرف پہلا قدم بڑھایا اور نوشین کی سہیلی سے دو برگر اور ایک کوک کے بدلے نوشین کا نمبر حاصل کیا۔ دوسرے قدم میں روڈ کے کنارے لگے اسٹال سے جدید شاعری کی کتابیں حاصل کیں اور پہلا میسج لکھ کر کامیابی کی ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ نوشین کے نمبر پر پھینکا۔ نوشی کے نمبر پر بھیجے گئے چار پانچ زبردست قسم کے اشعار میں اس کے میک اپ کی بدولت ملنے والے حسن کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کا جواب رات کو آیا جس میں اس نے سادہ انداز میں پوچھا۔

''آپ کون؟'' شہزادے نے پہلی کامیابی کی خوشی میں چورا اگلا قدم اٹھایا۔ ''میں جو کوئی بھی ہوں صدیوں سے تمہارا عاشق ہوں....'' نوشی سے پہلے فون کال، پھر کالج کے بعد مکمل ملاقات ہوئی۔ یوں شہزادہ حسنین نے اپنی زندگی کا تیسرا کامیاب عشق کیا۔ کالج سے نکلنے کے بعد اس کے عشاق کی تعداد پانچ تھی مگر ان میں صرف نوشی تھی جس سے اس کا اب تک رابطہ تھا۔ تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے ایم اے کے دوسرے سال میں پہنچتے ہی شہزادے کے ساتھ کمرے میں ایک نوجوان کا اضافہ ہوگیا۔ چوبیس سال کا نعمان عرف نومی۔

☆☆☆

''امی ہم اس گھر میں رہتے ہیں، کرتے کچھ بھی نہیں پھر بھی پیسے مل جاتے ہیں۔'' سولہ سال کا نعمان تب سے یہ سوال پوچھ رہا تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اب اس کے سوالوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ ''امی میرے اسکول کی فیس آپ کیسے ادا کرتی ہیں...... امی ہمارے کپڑے اور جوتے کون لاتا ہے؟'' ایسے کئی سوال تھے جن کا جواب نجمہ کے پاس نہیں تھا۔ باقی سب سوالوں پر وہ چپ رہتی مگر جیسے ہی نعمان کے منہ سے نکلتا۔ ''امی میرے بابا کیسے تھے۔'' اس کے ساتھ ہی نجمہ کی چپل حرکت میں آتی اور ہفتے میں ایک یا دو بار نعمان کی کمر لال کردیتی۔ رفتہ رفتہ نعمان بھی تھک گیا اور خاموشی اختیار کرکے پڑھنے لگا مگر انٹر میں شہر کے ایک پرائیویٹ کالج میں بی ایس سی کے بعد وہ گھر چھوڑ کر اس کمرے میں آگیا جہاں شہزادہ حسنین رہتا تھا۔ طبیعت کے خراب ہونے کے باوجود نجمہ نے اسے نہ روکا۔ شہزادہ حسنین ایم اے کے دوسرے سال جبکہ نعمان ایم ایس سی کے پہلے سال میں تھا۔ دونوں کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ حسنین کو لڑکیاں پھنسانے میں دلچسپی تھی جبکہ نعمان ہر وقت اپنی شناخت کی کھوج میں رہتا تھا۔ جمعے کی اس رات کو دونوں تفریح کے موڈ میں تھے۔

''یار میں تو سوچ رہا ہوں نوشی کو بلالوں، کافی دن ہوگئے ہیں اس سے ملے۔'' شہزادے نے اس کی طرف دیکھا۔

''تو میں کیا کروں بلالے۔'' نومی نے منہ بنایا۔

''بیٹا تو پہلے تلاش کر تیرا ابا محترم کون ہے۔'' وہ ہنسا۔

''شہزادے! میرے باپ کے بارے میں بکواس مت کیا کر۔'' نومی ہمیشہ اس ذکر سے چڑ جاتا تھا۔ تپ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ شہزادہ جانتا تھا اب وہ نہیں رکے گا۔ کل صبح ہی واپس آئے گا۔ نومی کے جانے کے بعد اس نے نمبر ملایا۔

''کیسی ہو... جانِ من؟'' دوسری طرف سے آواز سنتے ہی اس نے خالص لوفرانہ انداز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، آج کیسے یاد کیا اس غریب کو..... کہاں ہو ویسے..... آج مام ڈیڈ گھر پر نہیں، آجاؤ کچھ دیر انجوائے کرتے ہیں۔'' نوشی کی آفر سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

''تم آجاؤ، میں بھی اکیلا ہوں آج۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں آرہی ہوں۔'' رات نو بجے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے والے گھر میں رہنے والی قاتل حسینہ کھیر لیے کھڑی تھی۔ اس کا نام بھی حسینہ تھا اور نومی اسے شہزادے کی محبوبہ نمبر سات کہتا تھا۔

''میں آپ کے لیے کھیر لائی تھی۔'' وہ قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔ شہزادے نے جلدی سے کھیر پکڑی اور شکریہ بول کر اسے رخصت کردیا۔ وہ جانتا تھا اگر نوشی اسے دیکھ لیتی تو ہنگامہ کھڑا کردیتی۔ اس کے رخصت ہونے کے دو منٹ بعد ہی نوشی کی آمد ہوئی۔

''واؤ..... میرے آنے کی خوشی میں کھیر کھائی جارہی ہے۔'' میک اپ سے بھرپور چہرہ لیے وہ مسکرائی۔ شہزادہ جلدی سے پلیٹ فریج میں رکھ کے مڑا اور اسے گلے لگالیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں دونوں شراب کے ساتھ شغل کرتے گپیں لڑاتے رہے۔ شراب کی عادت شہزادے کو شہر میں آکر لگی تھی۔ نوشی البتہ میٹرک سے اس کی شوقین تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں بستر پر چلے گئے۔ آنے والی صبح سے بے خبر وہ رات ایک بجے سوئے تھے۔ دوسری صبح شہزادے کی آنکھ نو بجے کھلی۔ اس کی نظر نوشی پر پڑی جس کے دل میں ایک عدد خنجر پیوست تھا۔ منہ پر تکیہ پڑا تھا اور آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ شہزادے کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

☆☆☆

دس بجے کے قریب نومی کی آمد ہوئی۔ ''شہزادے! بڑی بھوک لگی ہے چل آناشتا کریں۔'' سیٹی بجاتا نعمان اندر داخل ہوا۔ سامنے بیڈ پر پڑی لاش دیکھ کر چلایا۔ ''قتل قتل..... او میرے خدا قتل!'' ساتھ ہی باہر کو بھاگا۔ شہزادہ لپک کر اس کے پاس آیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر گرالیا۔

''بس کر، مروائے گا کیا۔'' وہ اس کے کان میں بولا۔ دو منٹ میں کانپتا نومی چپ ہوگیا۔

''کیوں مارا اسے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے نہیں مارا، رات میرے ساتھ سوئی تھی۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو اگلے جہان منتقل ہوچکی تھی۔'' شہزادے نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

''میں نے منع کیا تھا نا ان کاموں سے، اب بھگت، چڑھ جا پھانسی۔'' وہ رونے کے قریب تھا۔

''یار جب میں نے اس جاہل کو قتل ہی نہیں کیا تو میں کیوں پھانسی پہ لٹکوں گا۔'' وہ جھنجلایا۔

''کون مانے گا تیری بات اور جناب نے ضرور شراب کے پیگ لگائے ہوں گے جو ساتھ سوئی لڑکی قتل ہوگئی اور تمہیں احساس نہ ہوا۔'' دونوں اندر آکر لاش کا معاینہ کرنے لگے۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد شہزادہ بولا۔

''نومی، کوئی ایسی جگہ ہے جہاں لاش چند دنوں کے لیے رکھی جاسکے؟''

''مگر کتنے دن چھپائیں گے۔ یہ ڈی ایس پی کی بیٹی ہے، پولیس جگہ جگہ چھاپے مارے گی اور بیٹا تیری تو بوٹی بوٹی کردیں گے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ پھر ہمت کرکے نوشی کی لاش کے گرد ایک چادر لپیٹی اور خنجر نکال کر پھینک دیا۔ دونوں نے مل کر فریزر خالی کیا اور نوشی کو اس میں ایڈجسٹ کرکے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''کل اتوار ہے بازار میں رش ہوگا، پرسوں میں اسے کہیں پھینک آؤں گا۔'' شہزادے نے تھکے ہوئے لہجے میں پلان بتایا۔

''جو مرضی کر بس مجھے یہ پتا ہے تیرے ساتھ بے قصور میں بھی مارا جاؤں گا۔'' نومی کی آواز میں ڈر تھا۔

''کبھی تو اچھا بول لیا کر۔'' وہ غصے سے اسے دیکھنے لگا۔ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے ناشتا کرنے چلے گئے۔ ویک اینڈ کی وہ رات لاش اور پولیس کی آمد کے خواب میں گزری۔ دوسری صبح شہزادے کی آنکھ نعمان کے ''پولیس پولیس'' کے نعروں سے کھلی اور دونوں سرپٹ دوڑتے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔

☆☆☆

''تم نے ہی بگاڑ رکھا ہے اسے، دو دن سے غائب ہے وہ...... پتا نہیں کہاں دفع ہوگئی ہے۔'' احمد شہزاد کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ نوشی کی ماں سکینہ بیگم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اکلوتی بیٹی کی پچھلے دو دن سے کچھ خبر نہ تھی۔ نوشی پہلے کبھی ایک دن سے زیادہ گھر سے دور نہیں رہی تھی۔ انہوں اس کی تمام سہیلیوں سے پوچھا مگر کچھ پتا نہ چلا۔ احمد شہزاد رپورٹ درج کروائے بغیر کچھ پولیس اہلکاروں کو اس کی تلاش میں بھیج چکے تھے۔ اب ان کا غصہ بیوی پر نکل رہا تھا۔ اسی وقت ایک نوکر اندر داخل ہوا۔

''سر! یہ گیٹ کے ساتھ کوئی لفافہ پھینک گیا ہے۔'' اس نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے جلدی سے تمام

کر اسے کھولا۔ اندر ایک پیکٹ میں پانچ تصویریں تھیں جس میں نوشی برہنہ بیڈ پر ہوش وحواس سے بیگانہ سو رہی تھی۔ احمد شہزاد کا خون کھول گیا۔

"دیکھو اپنی لاڈلی کے کرتوت۔" اس نے تصویریں سکینہ کی طرف پھینک دیں۔ لفافے میں ایک ٹائپ شدہ خط بھی برآمد ہوا۔

"بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر یقیناً خوشی ہو رہی ہوگی آپ کو...... کچھ اور تحفوں کے لیے اس پولیس اسٹیشن کے سامنے چلے جاؤ جہاں کبھی تم ایس ایچ او تعینات تھے۔" خط پڑھ کر وہ بیگم کو کچھ بتائے بغیر شہر کے پوش علاقے میں واقع اس پولیس اسٹیشن میں چلے آئے۔ پولیس اسٹیشن کے باہر ان کی گاڑی رکتے ہی سامنے والے جنرل اسٹور پر کام کرنے والا ایک لڑکا بالکل پہلے لفافے جیسا لفافہ لے آیا۔

"سر! کل رات کوئی ہماری دکان میں پھینک گیا تھا، اوپر آپ کی گاڑی کا نمبر لکھا ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ تک پہنچا دیا جائے۔" احمد شہزاد نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ پہلے کی طرح یہاں بھی ایک پیکٹ میں پانچ تصویریں تھیں۔ نوشی کے سینے میں خنجر پیوست تھا اور وہ مر چکی تھی۔ وہ چکرا گئے۔ اسٹور کے ملازم نے سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

☆☆☆

کمرے میں واپس پہنچتے ہی شہزادہ نعمان پر برس پڑا۔

"بیوقوف، گدھا کہیں کا۔ وہ سامنے والے پولیس اسٹیشن کی گاڑی ہے اور روز صبح یہاں سے گزرتی ہے۔"

"تو مجھے کیا پتا تھا...... میں تو سمجھا ایک عدد لاش کے ساتھ ہماری تصویریں شام کے اخبار میں لگیں گی۔" وہ معصومیت سے بولا۔ شہزادے کی نگاہ سامنے کمرے کے دروازے کے نیچے ایک عدد لفافے پر پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ اس میں ایک پیکٹ موجود تھا جس میں چند تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر میں نوشی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ باقی تصویروں میں وہ اور نوشی مدہوش بستر پر پڑے تھے جبکہ آخری تصویر میں نوشی کی لاش دکھائی گئی تھی جس کے ساتھ شہزادہ مزے سے سو رہا تھا۔

"نوی......" تصویریں دیکھنے کے بعد شہزادے نے آواز لگائی۔ اس کی آواز سن کر نعمان باہر آیا۔ اس دوران شہزادہ اندر سے ٹائپ شدہ خط نکال چکا تھا۔ اس پر درج عبارت کچھ یوں تھی۔

"امید ہے دونوں جاہل اور بیوقوف میرا تحفہ دیکھ چکے ہوں گے...... اس سے پہلے کہ میرا ایجنٹ مکمل ثبوت کے ساتھ احمد شہزاد تک پہنچے، اگلے اتوار کو شام چھ بجے بیس لاکھ روپے لے کر درج ذیل ایڈریس پر پہنچ جاؤ۔ باقی کی ہدایات وہیں پہنچ کر ملیں گی۔" نیچے پوش علاقے میں واقع پولیس اسٹیشن کے سامنے ایک جنرل اسٹور کا ایڈریس موجود تھا۔

"آج رات نکلتے ہیں مل کر۔" شہزادہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں جانے والا تیرے ساتھ۔ خود جا، تب تک میں کمرے کی صفائی کرتا ہوں۔" نوی کمرے کی جانب بڑھا۔

رات اندھیری تھی۔ شہزادہ شام کو ہی یونیورسٹی کے ایک دوست سے بہانہ بنا کر گاڑی لے آیا تھا۔ دروازے پر گاڑی روک کر اندر داخل ہوا۔ دونوں فریزر کی جانب بڑھے۔ فریزر کھول کر دونوں نے اندر غور سے دیکھا۔ "کہاں گئی؟" سر باہر نکال کر شہزادے نے نوی کی طرف دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے خالی پڑے فریزر کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

احمد شہزاد کو اسپتال میں ہوش آیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ چلایا۔ "نوشین...... نوشی میری بچی...... مار ڈالا اس ظالم نے۔" ساتھ ہی انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ سکینہ بھی رو رہی تھی۔ اکلوتی اولاد کی موت کا دکھ کتنا ہوتا ہے صرف وہی بتا سکتے ہیں جنہوں نے جھیلا ہو۔ شہزاد کی طبیعت اگلے تین دن تک سنبھل نہ سکی۔ نوشین کی لاش اور اس کے قاتل کی کھوج میں علاقے کا بہترین انسپکٹر شکیل حرکت میں آیا۔ نوشی کی لاش والی تصویر کے ساتھ ایک اور پیغام بھی تھا۔

"امید ہے اپنی بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہوگی، اپنی بیٹی کی لاش ڈھونڈنی ہے تو کچھ عقل استعمال کرو...... ایک اشارہ بتا رہا ہوں۔" ساتھ ہی اشارہ درج تھا جسے سمجھنے میں شکیل صبح سے اپنا ذہن لڑا رہا تھا۔ اشارہ کچھ یوں تھا...... 14+1+10+13+1=26۔

"سر! ایک بات تو پکی ہے۔" شکیل کے ساتھ اس کیس میں مدد دینے والا سب انسپکٹر اعجاز بولا۔

"کیا؟" اس نے اعجاز کی طرف دیکھا۔

"یہ جو بھی ہے اس کی ریاضی بہت کمزور ہے، جمع کرنا بھی نہیں آتا اسے۔" اعجاز کی بات سن کر اس نے منہ بنایا۔

"مجھے تو یہ کوئی نفسیاتی مریض لگتا ہے، نوشی کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔"

"سر! احمد شہزاد پولیس والے ہیں ان کے ضرور دشمن ہوں گے۔"

"مگر اس طرح بیٹی کی لاش کی تصویر دکھا کر اور یہ

اشارے بتا کر آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں سر! جنرل اسٹور والے بھی بے خبر ہیں کہ یہ پیغام ان کی دکان میں کون رکھ گیا ہے۔" اعجاز نے توجہ دلائی۔

"اور نوشی کے کال ریکارڈ کا کیا بنا؟" اس نے پوچھا۔

"جی سر! آج حاصل کیا ہے۔ لاسٹ کال کسی شہزادہ حسنین کو کی گئی تھی۔ وہ بھی اسی رات جب نوشی غائب ہوئی تھی۔" وہ کال ریکارڈ سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"چلو پھر اس شہزادے کی خیر خبر لیتے ہیں۔" دونوں اٹھ کر گاڑی کی جانب بڑھے۔

☆☆☆

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی آخر ایسا کون سا جادوگر پیدا ہو گیا ہے جو آرام سے آتا ہے، ہمارے کمرے میں ایک لڑکی کو قتل کر کے تصویریں بناتا ہے پھر دوسرے دن اس کی لاش بھی لے جاتا ہے۔" نوی کے منہ سے پہلی بار عقل مندی کی بات سن کر شہزادہ حیران ہوا۔

"اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ جس دن ہم نے لاش فریزر میں رکھی تھی اس کے بعد ہم نے دیکھی نہیں اور پورا دن ہم صرف ایک گھنٹے کے لیے کمرے میں نہیں تھے یا پھر رات میں سوتے رہے ہیں۔" شہزادے کی سوئی لاش کے غیاب پر اٹک گئی۔

"میں تو اتنی بے ہوشی کی نیند سوتا نہیں، ویسے کیا کھایا تھا ہم نے اس رات؟" نوی نے سوچا۔ اچانک وہ اچھل پڑا۔

"ارے جس رات نوشی قتل ہوئی اس رات تم نے بھی کھیر کھائی تھی۔ دوسرے دن میں نے بھی بچی ہوئی کھیر کھائی تھی، یہ مس حسینہ کی کھیر ہے یا نشے کی گولیاں؟"

"مطلب حسینہ مشکوک ہے؟" اس نے خلا میں نظر جمائی۔

دروازے پر دستک سن کر نوی باہر گیا اور ایک سیکنڈ بعد واپس آیا۔

"پپ پولیس...... باہر کھڑی ہے۔"

"ہاں مجھے پتا تھا انہوں نے آنا ہے، تم گھبراؤ نہیں، میں بات کر لوں گا ان سے۔" وہ نوی کو سمجھانے لگا۔

"اچھا ایک کام کرو، جیسے ہی مجھ سے سوال مکمل ہو جائیں......" شہزادہ اسے ترکیب سمجھانے لگا۔

"اوکے ڈن!" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر انسپکٹر شکیل اور اعجاز داخل ہوئے۔

"اتنی دیر کیوں لگائی دروازہ کھولنے میں؟" نوی خاموش رہا۔ "شہزادہ حسنین کہاں ہے؟"

"سر! وہ سامنے بیڈروم میں۔" اس نے اشارہ کیا۔ اتنے میں شہزادہ باہر آ گیا۔

"تو جناب ہیں شہزادہ حسنین......" اعجاز اس کی شخصیت کا جائزہ لے کر بولا۔

"نوشین کو جانتے ہو؟" شکیل نے پہلا سوال پوچھا۔

"جی جانتا ہوں۔ کلاس فیلو تھی کالج میں میری۔" وہ سادگی سے بولا۔

"وہ غائب ہے اور اس کی لاش کی تصویریں مل چکی ہیں مگر لاش کہاں ہے کچھ معلوم نہیں۔" انسپکٹر شکیل نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہاری آخری بار اس سے کب اور کیا بات ہوئی تھی؟"

"سر! اس نے ہفتے کی شام کو کال کر کے کہا تھا کہ اسے اسٹڈی میں کچھ ہیلپ کی ضرورت ہے اور اتوار کی شام مجھ سے ملنے آئے گی مگر وہ آئی نہیں البتہ اس کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی تھی، افسوس ہوا۔" شہزادے نے جھوٹ اور سچ کا مکسچر بنا کر پیش کیا۔

"ہمیں خط میں ایک اشارہ ملا ہے، اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے شہزادے کو کاغذ پر لکھا ہوا "14+1+10+13+1=26" دکھایا۔

"نو سر! میں نہیں جانتا۔" شہزادہ ذہن میں اسے حل کرنے لگا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ باقی ادھر ادھر کے سوال پوچھنے کے بعد شکیل نے نوی کی طرف منہ کیا۔

"ہاں بیٹا، آپ کہاں سے ہیں اور شہزادے کے کیا لگتے ہیں۔" ابھی ان کا سوال زبان پہ آیا تھا کہ اچانک نوی نے ابکائی لی اور سب کچھ کھایا پیا اعجاز کے پیر پر نکال دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوا۔ اتنے میں نوی دوڑ کر واش روم میں چلا گیا۔ اس کی اداکاری میں اتنی بے ساختگی تھی کہ شہزادہ بھی حیران رہ گیا۔

"سوری سر! اس کا معدہ آج کل خراب ہے۔ میں بتاتا ہوں اس کے متعلق۔" اور ساتھ ہی اس نے نوی کی ہسٹری بتائی۔

"ہوں...... اگلے ایک ہفتے تک تم دونوں شہر سے باہر نہیں جا سکتے۔" شکیل سر ہلا کر کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر آ کر بولا۔ "ان دونوں پر نظر رکھو، مشکوک لگتے ہیں مجھے۔" اعجاز جو ابھی تک اپنے جوتے صاف کر رہا تھا، اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☆☆☆

جمعے کی اس شام کو خلاف معمول سردی زیادہ تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے موسم خوشگوار بنا رکھا تھا۔ احمد شہزاد کے دل کے موسم پر تو ویرانی چھائی ہوئی تھی اور وہ صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھا نامعلوم شخص کے دیے گئے اشارے پہ غور کر رہا تھا۔ سکینہ چائے لے کر آئی۔ "آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں اور ساتھ میں آپ یہ فضول قسم کی مساوات لے کر بیٹھ گئے۔"

"یہ فضول نہیں۔ اس اشارے میں میری اکلوتی بیٹی کی

موت کا راز چھپا ہے۔'' ان کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ بار بار اس اشارے کو جمع تفریق کر رہے تھے مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر سکینہ بیگم جھنجلا گئیں۔

''رکھ دو اب اسے...... اے بی سی پڑھنے والے بچے لگ رہے ہو۔'' انہوں نے کاغذ اٹھالیا۔ احمد شہزاد کچھ سوچتے ہوئے چونک گئے۔ ''اے بی سی...... انگلش الفابیٹ...... ان کے الفاظ پورے چھبیس ہوتے ہیں۔'' انہوں نے کاغذ دوبارہ سکینہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پنسل اٹھا کر کاغذ پر لکھنے لگے۔ جو جواب سامنے آیا اسے دیکھ کر وہ حیرت کے گہرے سمندر میں ڈوب گئے۔

☆☆☆

جمعے کی اس رات دونوں گہری سوچ میں گم تھے۔ ''میں تو اپنے دونوں گردے بھی بیچوں تو دس لاکھ نہیں لاسکتا، وہ بھی ایسے بلیک میلر کے لیے جو مجھے اس کام پر بلیک میل کر رہا ہے جو میں نے کیا ہی نہیں۔'' نومی، شہزادے کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہاں، میں نے قتل کیا ہے۔ اس حرافہ کو، سارا گناہ میرا ہے جو میں لاکھ دوں گا۔'' وہ جھنجلا گیا۔

''کچھ سوچ شہزادے، کیا کریں مجھے پولیس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''ایک آئیڈیا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور سانس لے کر بولا۔ ''میرے گاؤں کی طرف بھاگ چلتے ہیں۔''

''ہاں جی، یہ پولیس والے اور وہ جادوگر بلیک میلر بے وقوف ہیں جو ہمیں یوں بھاگنے دیں گے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جناب کی حرکتوں کی نگرانی ایک پولیس والا کر رہا ہے۔ سامنے بازار میں بجلی والے کھمبے کے ساتھ صبح سے سادہ لباس میں ملبوس ہو کر ہمیں تاڑ رہا ہے۔'' نومی نے نئی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''اب ایک ہی راستہ ہے بچاؤ کا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''وہ کیا......؟''

''بلیک میلر کو تلاش کیا جائے۔'' میز پر ایک کاپی اور پنسل رکھ کر وہ اشارہ سمجھنے لگا جو انسپکٹر شکیل بتا گیا تھا۔

''یار نومی...... اگر پہلے سب کو جمع کیا جائے تو وہ ٹوٹل بنتے ہیں اکتالیس، اب اکتالیس چھبیس کے برابر کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ الجھن سے بولا۔

''غلطی سے ہوسکتا ہے، ویسے تو ناممکن ہے۔'' اس نے سر کھجایا۔ شہزادہ کافی دیر تک الجھتا رہا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔

''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے اگر تم مان جاؤ تو پیسوں کا انتظام ہوسکتا ہے کل تک۔'' نومی اچانک بولا۔

پھر وہ اس کے کان میں پلاننگ بتانے لگا۔ سارا پلان سننے کے بعد شہزادہ بولا۔ ''ناممکن...... ایک روپیہ بھی نہیں ملے گا۔''

''کوشش تو کر کے دیکھتے ہیں بلکہ اتوار کو اسی جنرل اسٹور کے سامنے بلالیں گے انہیں۔'' اس نے اصرار کیا۔

''ہوں...... چلو ٹھیک ہے، آج زندگی میں پہلی بار تیری بات بھی مان کے دیکھ لیتے ہیں۔'' شہزادہ گہری سانس لے کر بولا اور بستر کی جانب بڑھا۔

''کوئی سم ہے تیرے پاس۔'' نومی نے پوچھا۔

''ہاں ایک پڑی ہے پرانی، میرے نام نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''چل ادھر لا ابھی سے پلان پر عمل کرتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''الماری میں پڑی ہے اٹھا دیتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حالات کی دلدل اسے نگل رہی تھی۔ بچپن سے غربت کی چکی میں پس کر جینے والی اس لڑکی کی ماں آج اسپتال کے بیڈ پر پڑی تھی۔ باپ کی شکل اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک ماں کا سہارا تھا، وہ بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔ سرکاری اسپتال کے بیڈ پر پڑی اس کی ماں ٹی بی کی بیماری سے لڑ رہی تھی۔ وہیں اس نے اپنے پاس موجود ٹوٹل رقم جمع کی۔ یہ ٹوٹل ڈیڑھ سو روپے تھے جبکہ سرکاری اسپتال کا ڈاکٹر بار بار ہمدردی کی نظروں سے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ''بیٹا اسے کسی پرائیویٹ اسپتال میں لے جاؤ، لاسٹ اسٹیج ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔'' چوبیس سال کی عمر اس کا حسن ایک بار دیکھنے والے کو بار بار دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس رات کافی دیر سوچنے کے بعد آخر وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ جسم وہ بیچ نہیں سکتی تھی ہاں مگر ہاتھ سلامت تھے کہیں سے کچھ چوری کیا جاسکتا تھا۔ ماں کو تنہا چھوڑ کر وہ کچھ کرنے کی سوچ لیے اسپتال سے نکل آئی۔ رات سیاہ تھی۔ اسپتال سے کچھ ہی دور جنرل اسٹور کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ بلا ارادہ اندر داخل ہو کر چیزیں دیکھنے لگی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا لڑکا اونگھ رہا تھا۔ وہ کچھ سامان اٹھا کر کاؤنٹر کی جانب آئی۔ لڑکے کو سوتا دیکھ کر پھر دبے پاؤں گھوم کر کاؤنٹر کی دوسری جانب آگئی۔ پیسے رکھنے والی تجوری میں چابی ویسے ہی لگی ہوئی تھی۔ ویسے بھی پولیس اسٹیشن بالکل سامنے تھا، اس لیے شاید دکان کا مالک بے پروا تھا۔ اس نے بلا آواز تجوری کھولی۔ مٹھی بھر کر پیسے اٹھائے اور پیچھے ہٹنے ہی لگی تھی کہ لڑکے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑایا۔

''کک کون ہے...... کیا ہے؟'' اسے دیکھ کر وہ چلایا

''چور چور'' اور اس کی جانب لپکا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر زور سے اسے دھکا دیا اور باہر کی جانب بھاگی۔ بدقسمتی اپنے عروج پر تھی۔ سامنے سے دکان کا مالک اندر آیا۔ اس نے باہر نکلنے سے پہلے اسے جکڑ لیا۔ دونوں قابو کر کے اسے اندر لائے۔

''یہ چوری کر رہی تھی سر۔'' ملازم لڑکے نے جواب دیا۔

''ہاں...... اور تم مزے سے سو رہے ہوگے۔'' دکان کا مالک غرایا۔ لڑکی رونے لگی۔

''مجھے چھوڑ دو، میری ماں بیمار ہے۔''

''بہت دیکھی ہیں تم جیسی...... ابھی ٹھیک کرتا ہوں تیری ماں کو اور تجھے بھی۔'' وہ اسے گھسیٹ کر اسٹور کے پیچھے واقع کمرے میں لے آیا۔ اس نے پیسے لڑکی کے ہاتھ سے چھین لیے۔ ''اب بتاؤ پولیس کے پاس جاؤ گی یا؟'' وہ معنی خیز انداز میں اس کے جسم کو دیکھنے لگا۔

''نن...... نہیں، آپ کو خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ زور زور سے رونے لگی۔ دکان کا مالک اس کے قریب ہوگیا۔

''ایسے کیسے معاف کر دوں...... تھوڑی بہت سزا تو ملنی چاہیے۔'' اس کے ہاتھ لڑکی کے جسم کو چھیڑنے لگے۔ لڑکی نے پیچھے ہٹایا مگر اس پر شیطان سوار تھا۔

☆☆☆

اکلوتے بیٹے کے اغوا کی خبر نے چودھری حسنین کے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر تینوں شادی شدہ بیٹیاں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ حاضر ہوگئیں۔ حسنین کی ماں کا صدمے سے برا حال تھا۔ بار بار ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ''جو مانگتا ہے دے دو، پر میرے شہزادے کو واپس لے آؤ۔'' سب سے بڑا داماد جو قریبی ہی گاؤں کا نمبردار تھا، بولا۔

''اماں جی! کیا پتا پیسے لے کر بھی نہ چھوڑیں پھر کہاں جائیں گے۔'' درمیانی بیٹی کا شوہر کچھ زیادہ عقل مند تھا۔

''نہیں بھائی، ایسے نہیں ہوگا۔ ہم شہزادے کو دیکھ کر ہی پیسے دیں گے۔''

اب تیسرے نمبر والے کی باری آئی۔ ''پولیس کو بلا لیتے ہیں میرا خیال ہے۔'' چودھری حسنین جو اب تک خاموش تھا، بول پڑا۔

''ایسا ممکن نہیں، اس نے کہا ہے جیسے ہی پولیس کی اطلاع دی وہ شہزادے کو مار ڈالے گا۔'' ان کے لہجے میں خوف تھا۔

''کسی نے شہر سے پتا کیا ہے شہزادہ اپنے کمرے میں ہے؟ یہ نہ ہو کسی نے مذاق کیا ہو ہمارے ساتھ۔'' تیسرے نمبر والے نے سوال اٹھایا۔

''ہاں کیا ہے پتا، اس کے کمرے میں اس کا دوست نعمان ہے جس نے جواب دیا ہے کہ شہزادہ تین دن سے غائب ہے، بیس لاکھ کا مسئلہ نہیں، چالیس لاکھ نفع تو میں نے مکئی کی فصل سے کمایا ہے دو سال میں۔ یہ سب شہزادے کا ہی تو ہے، بس مجھے میرا بیٹا چاہیے۔'' آخر چودھری صاحب فیصلے پر پہنچ گئے۔

''میں خود جاؤں گا پیسے لے کر تم فکر نہ کرو۔''

☆☆☆

''پانچ منٹ میں میرے گھر پہنچو۔'' احمد شہزاد نے کال ملا کر انسپکٹر شکیل کو حکم دیا۔ گاڑی گیٹ کے باہر ہی روک کر وہ اندر داخل ہوا۔ احمد شہزاد ہاتھ میں کاپی لیے پریشانی میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ شکیل کو دیکھ کر جلدی سے اس کی طرف مڑے۔ ''تمہیں ایک ایڈریس دے رہا ہوں، اشارے کے مطابق نوشی یہاں ہوگی۔'' اس نے کاپی سے کاغذ کا ٹکڑا پھاڑ کر الگ کیا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں گے سر؟'' شکیل نے جلدی سے کاغذ پکڑ کر پوچھا۔

''نہیں، وہاں کوئی ایسا موجود ہے جس کا سامنا شاید میں ساری زندگی نہ کرسکوں۔ اور ہاں سنو، میرا نہیں خیال وہاں اصلی مجرم ہوگا، کسی کو گرفتار مت کرنا۔'' ان کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ شکیل الجھ کر رہ گیا۔ باہر نکل کر اس نے پولیس پارٹی کو کال کی اور خود منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ مڈل کلاس لوگوں کا علاقہ تھا۔ درمیانے درجے کے ملازم پیشہ لوگ دن بھر کی تھکاوٹ سے چور اپنی منزلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ شکیل کو جس گھر کا پتا بتایا گیا تھا، یہ دو کمروں کا مکان آبادی سے ہٹ کر تھا۔ اس نے پولیس پارٹی کا انتظار کیا۔ آدھے گھنٹے بعد پولیس موبائل بھی آگئی۔ انہیں لے کر وہ مکان کی جانب بڑھا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ گھر خالی لگ رہا تھا۔ سپاہی نے دیوار پھلانگ کر گیٹ کھولا، سب اندر داخل ہوئے۔ ارد گرد کمروں میں تلاشی لینا شروع کی۔ پورا ایک گھنٹا تلاشی لینے کے بعد انہیں کچھ نہ ملا۔ شکیل کچن کی طرف آیا۔ ایک سائیڈ پر فریزر پڑا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فریزر کا سوئچ لگا ہوا ہے اور یہ بدستور چل رہا ہے حالانکہ لگتا نہیں تھا کہ خالی گھر میں اسے کوئی استعمال کرے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر فریزر کھولا۔ چادر میں لپٹی نوشی مردہ پڑی تھی۔ شکیل نے گہری سانس لے کر اعجاز کو ایمبولینس بلانے کا اشارہ کیا۔ چالیس منٹ بعد وہ مردہ نوشی کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اس دوران انسپکٹر شکیل نے کوڑے دان سے ایک کام کی چیز دریافت کرلی تھی۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال

کامل تھا۔

☆☆☆

جنرل اسٹور کا مالک جس کا نام راحیل تھا، لڑکی کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا مگر اپنی عزت بچانے کے لیے لڑکی بار بار اسے دھکا دے رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر لڑکی کو نیچے گرادیا۔ لڑکی چلائی۔ ٹھیک اسی وقت دکان میں کوئی داخل ہوا۔ راحیل چونک کر لڑکی سے الگ ہوا۔

”کون ہے وہاں؟“ اس نے ملازم سے پوچھا۔

”ایس ایچ او صاحب ہیں سر!“ اس کی بات سن کر وہ بھاگا بھاگا باہر نکلا۔ سامنے علاقے کا سخت گیر ایس ایچ او کھڑا تھا۔

”اوئے! یہ کون چیخ رہا ہے؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”چچ..... چور ہے سر! ہمارے پیسے چوری کررہی تھی، میں نے پکڑلیا۔“ راحیل ہکلایا۔

”ہمیں کچھ سامان لینا ہے وہ پیک کرواور اس چور کو میرے حوالے کرو۔“ اس نے اشارہ کیا۔ راحیل اندر سے لڑکی کو لے آیا جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پولیس کو دیکھ کر اس نے دوبارہ رونا شروع کردیا۔ لڑکی کا حسن دیکھ کر ایس ایچ او کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ مکمل حسن کی تصویر تھی۔ اس کا جسم کسی بھی مرد کو دیوانہ بنا سکتا تھا۔ ایس ایچ او نے سامان لیا اور لڑکی کو کار میں بٹھا کر اپنے فلیٹ پر لے آیا۔ لڑکی کو پانی پلا کر اس نے نرمی سے پوچھا۔

”بتاؤ کیا مسئلہ ہے، کیوں چوری کی تھی؟“ لڑکی نے روتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔ اس کی بات سن کر ایس ایچ او بولا۔

”جتنے مرضی پیسے لے لو پر اس جوانی کی ایک رات میرے نام کردو۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ لڑکی نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا مگر وہ اسے حاصل کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ رات اس غریب پر بہت بھاری تھی۔ دوسری صبح اجڑی ہوئی اس لڑکی نے جب اسپتال کا ایڈریس بتایا تو ایس ایچ او نے رحمدلی کا ثبوت دیا اور اسے وہاں لے آیا مگر دیر ہوچکی تھی۔ اس کی ماں کی لاش اس کے سامنے پڑی اپنی غربت پر شرمندہ تھی۔ ماں سے لپٹ کر وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

اگلے کچھ دن میں وہ سنبھل گئی مگر وہ اندر سے مرچکی تھی۔ پولیس والے نے اسے مکان لے کر دیا مگر اس سے شادی نہ کی۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ رات گزارنے آجاتا تھا۔ احساس مردہ ہوجائیں تو گناہ ثواب کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ وہ بھی چپ چاپ سب جھیل رہی تھی۔

☆☆☆

اتوار کی اس شام نعمان اور شہزادہ جنرل اسٹور کے پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ نگرانی کرنے والے سپاہی کو چکما دے کر یہاں آئے تھے۔

”کب آئے گا تیرا ابا محترم؟“ نوی بے چینی سے بولا۔

”اس کا تو نہیں پتا مگر کل تیرے نامعلوم والد کی جانب سے یہ خط آیا ہے۔“ شہزادے نے جیب سے ایک ٹائپ شدہ خط نکالا۔

”پیسے جنرل اسٹور کے ساتھ واقع پبلک واش روم میں پورے چھ بجے رکھ کر جنرل اسٹور میں داخل ہوجانا۔ شہزادے تمہارے ذمے ایک کام ہے۔ اور ہاں جنرل اسٹور کے مالک کے چہرے پر دو تھپڑ رسید کرنا، پانچ منٹ بعد تمہیں تمام تصویریں مل جائیں گی۔“

”باقی باتیں تو سب ٹھیک ہیں مگر یہ جنرل اسٹور کے مالک کو مار کر بھاگوں گا کیسے؟“ وہ پریشانی سے بولا۔

”یار یہ تو ہے ہی کوئی نفسیاتی مریض، سوال یہ ہے کہ تصویریں کیسے واپس ملیں گی؟“ نوی پرسوچ انداز میں بولا۔

”ارے وہ دیکھ ابا آگیا۔“ شہزادہ جلدی سے سائڈ پر ہوا۔ نوی نے چودھری حسنین کو کال ملائی۔

”میں دیکھ رہا ہوں چودھری صاحب، آپ پہنچ چکے ہیں۔ یہ پیسے سامنے بینچ پر رکھیں۔ پانچ منٹ بعد شہزادہ آپ تک پہنچ جائے گا۔“ چودھری حسنین نے ادھر ادھر دیکھ کر پیسے وہاں رکھ دیے۔ ”اب واپس مڑیں اور پیچھے دیکھے بغیر سامنے پارکنگ میں چلے جائیں۔“ چودھری حسنین نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ نوی چپکے سے چلتا ہوا آیا اور پیسوں سے بھرا بیگ اٹھا کر واپس پلٹا۔ سائڈ پر شہزادہ موجود تھا۔

”میں پیسے پبلک واش روم میں رکھ آتا ہوں، تم جنرل اسٹور کے مالک کو تھپڑ مار کر باپ کے پاس پہنچو۔“ نوی نے جلدی جلدی اسے سمجھایا۔ چھ بجنے میں بس تین منٹ باقی تھے۔ شہزادہ ست قدموں سے چلتا ہوا جنرل اسٹور میں داخل ہوا۔ اسے شاید یہ معلوم نہیں تھا، کوئی جنرل اسٹور کے مالک راحیل کی بیوی کو اطلاع دے چکا ہے کہ راحیل کا کسی عورت سے چکر ہے جس کا شوہر آج اسے دکان میں آکر تھپڑ مارے گا۔ راحیل کی بیوی بھی وہیں موجود تھی۔ شہزادہ اندر داخل ہوا۔ راحیل اپنی بیوی سے الجھ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

”راحیل صاحب آپ ہیں؟“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”جی میں ہوں فرمائیں؟“ شہزادے نے دو تھپڑ زور سے اس کے منہ پر مارے اور جلدی سے باہر کی جانب لپکا۔ راحیل کی بیوی سلمٰی کو ملنے والی اطلاع درست ثابت ہوئی تھی۔

اگلے ہی لمحے دو مزید کرارے تھپڑ راحیل کے چہرے پر پڑے۔ وہ شہزادے کے پیچھے لپکا جو باپ کے پاس جارہا تھا۔ پارکنگ میں موجود چودھری حسنین کی گاڑی میں چودھری سمیت تینوں داماد موجود تھے۔ شہزادے کے پیچھے آنے والے راحیل کا ستارہ گردش میں تھا۔ انہوں نے اسے بلیک میلر سمجھا اور سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔

☆☆☆

دو کمروں کا مکان آج آباد تھا۔ وہ پیسے لے کر اندر داخل ہوا۔ کمرے میں موجود بیڈ کے نیچے ایک اٹیچی کیس پڑا تھا۔ پولیس نے اگرچہ اس کی تلاشی لی تھی مگر اس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے جلدی سے وہی اٹیچی کیس کھولا اور اندر سے ایک اور بیگ نکال کر پیسے اس میں ڈالے۔ وہ باہر نکلا اور علاقے کے ایک مہنگے اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوکر وہ جلدی سے ایک روم کی جانب لپکا۔ ابھی وہ کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے سے انسپکٹر شکیل کی آمد ہوئی۔ ”آجاؤ بیٹا، بہت لمبا انتظار کروایا تم نے۔“

”کک..... کیا مطلب؟“ وہ ہکلایا۔

”آج صبح آپ کی ماں کی ڈیتھ ہوگئی ہے، بہت بچانے کی کوشش کی مگر جگر کے کینسر کا علاج تقریباً ناممکن تھا۔“ انہوں نے افسردگی سے کہا۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ وہ چلایا اور اندر کی جانب لپکا۔ سامنے بیڈ پر ایک سفید چادر نجمہ کا سر ڈھانپ چکی تھی۔ وہ چیختا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔ شکیل نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسپتال کے بل اور بلیک میلر کے اشارے نے اسے اصلی مجرم تک پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

جیل میں موجود نعمان عرف نوی سے احمد شہزاد اور شہزادہ حسنین ملنے آئے تھے۔ ”کیوں کیا تم نے یہ سب؟ میں تمہارا باپ تھا، تم دونوں کا سارا خرچ اٹھا رہا تھا، اپنے گناہ کی تلافی کررہا تھا مگر پھر یہ سارا کھیل کیوں رچایا؟“ احمد شہزاد کے لہجے میں دکھ تھا۔

”تو..... تو میرا یار تھا، اگر تو کہتا تو میں ویسے ہی تجھے بیس لاکھ کا بندوبست کرکے دے دیتا مگر کیوں کیا یہ سب؟“ شہزادے کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ نوی دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

”میں اور میری ماں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ بہت مجبور کیا اسے میں نے مگر اس نے میرے باپ کا پتا مجھے نہ بتایا۔ جب میں نے بی ایس سی کیا تو ایک دن امی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ میں انہیں اسپتال لے گیا تو پتا چلا وہ اس جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں۔ تب انہوں نے مجھے اپنی ماں یعنی میری نانی کی موت سے لے کر ایس ایچ او احمد شہزاد کی زیادتی تک سب بتادیا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اپنی ماں کو بھی بچاؤں گا اور بدلہ بھی لوں گا۔ احمد شہزاد کے متعلق تمام معلومات اکٹھی کیں اور نوشی تک پہنچ گیا۔ اب یہ اتفاق یا میری خوش قسمتی تھی کہ شہزادہ اس کا بوائے فرینڈ تھا۔ میرے کام میں آسانی ہوگئی۔ میں نے شہزادے کے ساتھ روم شیئر کیا۔ امی نے مجھے اس بینک کا اکاؤنٹ نمبر بتادیا جہاں احمد شہزاد میرے پیدا ہونے سے لے کر اب تک پیسے جمع کروا رہا تھا مگر اسے شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ پیسے سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، اولاد کے سہارے کی، ماں باپ کے سہارے کی، وہ ٹوٹل پچیس لاکھ بنے، میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ایک ماہ میں مزید بیس لاکھ کا بندوبست کرنے کا کہا۔ مجھے یہی راستہ درست لگا اور میں نے اپنالیا۔ اگر کامیاب ہو جاتا تو کسی نہ کسی طرح شہزادے کے پیسے بھی لوٹا دیتا، البتہ نوشی کو مار کر مجھے سکون ملا..... احمد شہزاد کو بھی پتا چلا ہوگا کہ رشتوں سے محروم ہونا کتنا بڑا عذاب ہوتا ہے۔ البتہ اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا جو کہ اشارہ تھا، مجھے یقین تھا احمد شہزاد اس تک پہنچ جائے گا مگر اتنی جلدی، یہ پتا نہ تھا۔ قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا اور میں بدلہ پورا کرنے کے باوجود ماں کو نہ بچاسکا۔“ نوی رونے لگا۔ دونوں کو سمجھ نہ آئی اس سے نفرت کریں یا ہمدردی۔ وہ دونوں چپ چاپ واپس لوٹ گئے۔

”سر آپ کو اشارہ کیسے سمجھ آیا؟“ شہزادے نے باہر آکر پوچھا۔

”اس کی ماں کا نام نجمہ تھا، اشارے میں انگلش الفابیٹ کی تعداد اور ان کے نمبر درج تھے..... مطلب چودہ نمبر پر N نمبر ایک پر A..... اس طرح وہ ایک مکمل نام بن گیا..... ”Najma“ احمد شہزاد نے تفصیل بتائی۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بس سر! گاؤں چلا جاؤں گا۔ اپنی زمینیں سنبھالوں گا، جہاں برے لوگ ضرور ہیں مگر ہوس کے مارے ہوئے لالچی اور دوسروں کی زندگی سے کھیلنے والے نہیں ہیں..... بہت بھٹک لیا اس شہر میں، بہت گناہ کرلیے..... اب نہیں۔“ اس کے بعد وہ رکا نہیں، چلا گیا۔ احمد شہزاد چپ کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

قسط نمبر: 11

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن . . . اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود بھی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن . . . اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑائے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا . . . جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج . . . ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریتا سینڈ الیمن سے علیحدگی ہو چکی تھی۔وقتِ رخصت ریتا اپنی اکلوتی بیٹی نتھنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد والا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سینکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا...... ”میرے بچے! انتظار کرو۔وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے ست سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ہنگلن میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود ڈیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو ٹی مس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے ٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔”ونی لاؤنج“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے دردِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی...... ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔“ اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈبھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو نارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو اسپیئلے اسٹور سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر چیلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو ادھ موا کر دیا۔آئندہ روز چیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کہانی سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں پہلی بار علی پر حیرتوں کا ایک نیا دروا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو چیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔پرسلنی ہالوڈانے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات رلی آرٹرک بارورخ لاؤ اور ریتا ایجل پام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔جب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بونز“ سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بونز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے ٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی

پرورش کی تھی۔اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے ویزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔اس نے...دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔علی ماں کو انٹرویو کے لیے امریکی ایمبیسی لے گیا۔سلمٰی نے انٹرویو کلیئر کر لیا تھا۔جب علی ماں کو لے کر وہاں سے نکلا تو ایک موٹر سائیکل تیزی سے گاڑی کے پہلو میں آ گئی۔اس پر دو افراد سوار تھے جنہوں نے منہ پر نقاب...رکھے تھے۔پیچھے بیٹھے ہوئے موٹر سائیکل سوار نے جب گن نکالی تو علی نے چیخ کر ماں کو نیچے جھکنے کے لیے کہا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے!

کہتے ہیں، مالک کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں لیکن وہ تو مالک ہے، تمام جہانوں کا پالنہار۔کائنات کا ہر معاملہ اس کا قبضۂ قدرت میں ہے۔انسان مالک کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے انسان کے ہاں جب دیر ہو جائے تو پھر اندھیر اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا......!

میں نے حلق کے بل چلّا کر ماں سے کہا تھا کہ وہ نیچے جھک جائیں۔میں خطرے کو بھانپ چکا تھا اس لیے اضطراری انداز میں، میں نے ماں کو بچاؤ کی ہدایت کی تھی لیکن وہ گاڑی سے باہر والی صورتِ حال سے بے خبر تھیں چنانچہ انہیں دیر ہو گئی اور اس لمحاتی تاخیر نے ماں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔گن بردار نے چشم زدن میں پورا میگزین ماں کے بدن میں خالی کیا اور یہ جا، وہ جا۔جب تک میں گاڑی کو بریک لگاتا، وہ موٹر بائیک کٹ مارتے ہوئے تیز رفتاری سے میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ ماں کو ٹارگٹ کر کے ہلاک کیا گیا تھا......

یکبارگی جو کچھ پیش آیا تھا، اس نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔مجھے ماں کے بچنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی مگر گاڑی رکنے کے بعد میں نے بجلی کی سی سرعت سے ماں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر میرا دل چھناکے سے ٹوٹ گیا کہ میری سب سے قیمتی متاعِ حیات مجھے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم سے روح کو کھینچ لیا ہو!

ان نازک لمحات میں حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے عظیم کو فون کیا۔رابطہ ہونے پر اس نے پوچھا۔

”برو! کیا رہا...... کیا سلمٰی آنٹی کا پاسپورٹ جمع ہو گیا؟“

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔”عظیم! ماں مجھ سے روٹھ گئی ہیں......!“

”کیا مطلب ہے؟“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”وہ مجھ سے اتنی دور چلی گئی ہیں کہ میں اگر چاہوں بھی تو انہیں واپس نہیں بلا سکتا۔“ بولتے بولتے میری آواز رندھ گئی۔

”کیا بک رہے ہو یار......؟“ وہ بے ساختہ چلّا اٹھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا......!“

”میرا دماغ ٹھیک نہیں۔“ میں نے خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔”ماں کو ٹارگٹ کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔تم فوراً میرے پاس پہنچو۔“

”اپنی لوکیشن بتاؤ۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

”تم اس وقت کہاں ہو...... یہ سانحہ کس جگہ پیش آیا ہے؟“

میں نے جیسے تیسے کر کے اسے اپنی لوکیشن سے آگاہ کیا۔

”اوکے...... میں صرف دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔”پاپا کو میں نے آفس پہنچا دیا ہے۔تمہاری لوکیشن ہمارے آفس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔“

اس واقعے کی وجہ سے روڈ پر افراتفری سی پھیل گئی تھی۔میں نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے لگا دیا۔گاڑی کی عقبی نشست پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑی ماں کی لاش کو دیکھ کر میرا کلیجا کٹ رہا تھا۔اگر مجھے ایک فیصد

بھی یقین ہوتا کہ ماں کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے تو میں یہاں سڑک پر کھڑے ہو کر عظیم کا انتظار کرنے کے بجائے اس وقت ماں کو کسی اسپتال میں پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہوتا مگر ..... ظالم وقت بڑی سفاکی سے اپنی چال چل گیا تھا۔

میں ٹارگٹ کلرز کے طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ لوگ بلا کے شوٹر ہوتے ہیں۔ ان کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اپنے ٹارگٹ کے سینے یا کھوپڑی میں دو گولیاں اتارتے ہیں اور اپنا کام نمٹانے کے بعد جائے وقوعہ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک جنبش میں برق رفتاری بھری ہوتی ہے۔ جب تک کسی کا دماغ سچویشن کو سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا، ٹارگٹ کلر موقعۂ واردات سے بہت دور پہنچ چکا ہوتا ہے۔

عموماً ٹارگٹ کلر اپنے شکار کے دل یا دماغ میں صرف دو گولیاں اتارنا بہت کافی سمجھتا ہے اور یہاں تو اس بدبخت ہیلمٹ پوش موٹر سائیکل سوار شوٹر نے بلاتعطل اپنی گن کا پورا میگزین ماں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کر ڈالا تھا۔ اپنے بچاؤ میں نیچے جھکنا تو درکنار، ماں کو تو سانس لینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھیں۔

میری گاڑی کے قریب ایک درجن سے زیادہ افراد جمع تھے۔ سب کے چہروں پر میرے لیے ہمدردی کے تاثرات تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، کراچی کے شہری اس قسم کے واقعات کے عادی ہو چکے تھے۔ اس شہر میں روزانہ پندرہ سے بیس افراد کو ٹارگٹ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور ان واقعات کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ کبھی کوئی شوٹر یا اسنائپر قانون کی گرفت میں نہیں آیا تھا......!

دس سے بارہ منٹ میں عظیم میرے پاس تھا۔ میں بڑے دل گرفتہ انداز میں اس کے گلے لگ گیا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ان معاملات پر ہم بعد میں بات کریں گے کہ سلمیٰ آنٹی کو پیش آنے والے اس جان لیوا واقعے میں کس کا ہاتھ ہے۔ فی الحال ہمیں موجودہ صورتِ حال سے نمٹنا ہے۔ میں نے ارباب کو فون کر کے یہیں بلا لیا ہے تاکہ جائے وقوعہ پر ہونے والی قانونی کارروائی میں ہمیں پولیس کی کڑی تفتیش کا نشانہ نہ بننا پڑے۔"

"یہ تم بڑی عجیب بات کر رہے ہو۔" میں نے اس کے سینے سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ "نقصان بھی ہمارا ہوا اور وہ کڑی تفتیش کا نشانہ بھی ہمیں بنایا جائے گا؟"

"برو! یہ امریکا نہیں، پاکستان ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "اس لیے تم ان چھوٹے چھوٹے معاملات سے اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔ ہم اس ملک کے باشندے ہیں جہاں بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے افسران اور نچلے طبقے کے اسٹاف میں سے اکثر افراد کوئی کام نہ کرنے کی تنخواہ اور کوئی کام کرنے کی رشوت لیتے ہیں۔ پولیس ڈپارٹمنٹ بھی ایک ایسا ہی محکمہ ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ارباب کی وجہ سے ہمیں ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا۔"

عظیم نے بالکل درست کہا تھا۔ ارباب کی آمد کے بعد وہاں کی صورتِ حال ہمارے فیور میں ہو گئی تھی۔ گھنٹوں بلکہ دنوں کا کام محض ایک گھنٹے میں نمٹ گیا تھا۔ ارباب نے اپنی نگرانی میں وقوعہ کی کارروائی کو مکمل کروا کے ہمیں گھر جانے کی اجازت دلوا دی تھی۔ عظیم میرے ساتھ ہی ماں کے گھر آ گیا تھا۔ ضروری امور کی انجام دہی و دیگر لیبارٹری ٹیسٹ وغیرہ کے لیے پولیس نے ماں کی لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ آج رات کسی وقت یا پھر اگلی صبح ماں کی لاش کو میرے حوالے کر دیا جاتا۔

اس اندوہناک واقعے نے میرے دل و دماغ کو جس بری طرح متاثر کیا تھا، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میں ان لمحات میں اذیت اور کرب کی جن منزلوں سے گزر رہا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ میں ایک مشتِ خاک تھا جو ہوا میں بکھر گیا تھا۔ اس سوہانِ روح جذباتی کیفیت کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو کبھی اس دل دوز تجربے سے گزرا ہو......!

عظیم میرے ساتھ آیا تھا۔ ماں کے گھر میں اس وقت ہم دونوں ہی تھے یا پھر سیکیورٹی گارڈ جمشید اور خانساماں محمد حسین عرف بنگالی بابو بھی موجود تھے۔ میں نے عظیم سے مشورہ کیا۔

"کیا جمشید اور محمد حسین کو بتا دیا جائے کہ ان کی میڈم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟"

"بتا دینا ہی مناسب ہوگا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ دونوں گھریلو ملازم ہیں۔ ان سے کچھ چھپایا نہیں جا سکتا۔ آنٹی سلمیٰ کی لاش اسی گھر میں ..... آئے گی اور یہیں سے تدفین کے لیے قبرستان لے جائی جائے گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اثبات میں گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ان لوگوں کو میرے اور ماں کے اصل رشتے کا علم نہیں۔ یہاں سب کو یہی بتایا گیا ہے کہ میں ماں کا ایک قریبی عزیز رفیق علی ہوں جو جدہ میں اپنا ریسٹورنٹ چلاتا ہے اور سلمیٰ صاحبہ میرے ساتھ ہی عمرہ کرنے جا رہی ہیں..... جا رہی تھیں۔"

"کیا سب کو یہی اسٹوری سنائی گئی ہے؟" عظیم نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

"ہاں...... سوائے ایک شخص کے۔"

"کون ایک شخص؟"

"اس کا نام نادر شاہ ہے۔" میں نے بتایا۔

عظیم نے دریافت کیا۔ "نادر شاہ کو کیا اسٹوری سنائی گئی ہے؟"

"ماں نادر شاہ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "لیکن ماں نے شاہ جی کو آدھی حقیقت بتائی ہے۔ نادر شاہ یہ جانتا ہے کہ میں ماں کا گمشدہ بیٹا اسد علی ہوں اور آج کل جدہ میں سیٹل ہوں۔ ماں یہاں سے اپنا سب کچھ وائنڈ اپ کر کے دبئی میں سیٹ ہونے جا رہی تھیں۔ ماں کی نادر شاہ سے بہت پرانی شناسائی ہے اور شاہ جی نے مختلف مواقع پر ماں کی بہت مدد کی ہے لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر ماں نے شاہ جی کو اپنے امریکا والے پلان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"یہ تو انہوں نے بہت اچھا کیا تھا۔" عظیم گمبھیر انداز میں بولا۔ "بائی دی وے، یہ شاہ جی کرتے کیا ہیں؟"

"نادر شاہ رئیل اسٹیٹ کا کام کرتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "شاہ اسٹیٹ کے نام سے اس کی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔ ماں نے ایک کثیر رقم سے کراچی میں والد صاحب مرحوم کے نام سے "حیدر علی ٹرسٹ" قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس پروجیکٹ کے تمام ڈاکیومنٹس تیار ہو چکے ہیں اور ماں کی غیر موجودگی میں مذکورہ ٹرسٹ کا انتظام و انصرام نادر شاہ ہی کو دیکھنا تھا مگر ......" بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی۔

ان نازک لمحات میں عظیم نے بڑے بھرپور انداز میں میری دل جوئی کی۔ جب میں قدرے سنبھلا تو میں نے عظیم کو تفصیل سے بتا دیا کہ ماں کا اصل پروگرام کیا تھا۔ انہوں نے شاہ جی کے تعاون سے یہ بنگلا فروخت کر دیا تھا جس کی آدھی پے منٹ ہو گئی تھی، باقی آدھی دو ماہ کے بعد ہونا تھی۔ ماں نے پانچ لڑکیوں کی مدد کے لیے ایک کروڑ روپے رکھ کر باقی تمام رقم حیدر علی ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی اور اس رقم کو خرچ کرنے کا کلی اختیار شاہ جی کو دے دیا تھا۔

"تم نے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں تو یہی نظر آتا ہے کہ سلمیٰ آنٹی شاہ جی پر واقعی اندھا اعتماد کرتی تھیں۔" عظیم نے کہا۔ "کیا تم اس شخص سے ملے ہو؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "تین چار مرتبہ ماں کی موجودگی میں، اسی بنگلے پر شاہ جی سے میری ملاقات ہو چکی ہے مگر تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"برو! تمہیں پتا ہے، میں کھلی بات کرنے کا عادی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "پراپرٹی کا کام کرنے والے لوگوں پر میں زیادہ بھروسا نہیں کرتا۔ تمہیں یہ بندہ کیسا لگا؟"

"نادر شاہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

"کیا تم نے اپنی ماں کو اپنے محسوسات سے آگاہ کر دیا تھا؟" عظیم نے استفسار کیا۔

"بالکل۔ میں نے انہیں نادر شاہ کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"اوہ ....." وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ "پھر ماں نے کیا کہا؟"

"وہ مسکرا کر کہنے لگیں، جو میں جانتی ہوں وہ تم نہیں جانتے۔" میں نے عظیم کو بتایا۔ "ان کا کہنا تھا کہ انہیں نادر شاہ پر مکمل اعتماد ہے لہٰذا اس سلسلے میں مجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ماں کے دوٹوک انداز کو دیکھتے ہوئے میں بے فکر ہو گیا تھا۔"

"اوکے۔ نادر شاہ کو بعد میں دیکھ لیں گے۔" عظیم نے سرسری لہجے میں کہا۔ "ابھی پہلی فرصت میں تم دونوں گھریلو ملازمین کو صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔"

ادھر عظیم کی بات ختم ہوئی، ادھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ میرا نہیں، ماں کا سیل فون تھا۔ جائے وقوعہ سے میں ماں کا ہینڈ بیگ اپنے ساتھ لے آیا تھا جس کے اندر یہ سیل فون اور دیگر ضروری اشیا تھیں۔ امریکی قونصلیٹ میں پاسپورٹ جمع ہونے کی رسید بھی اسی بیگ میں تھی۔ ارباب کے بروقت جائے حادثہ پر پہنچ جانے سے میرے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں ورنہ عین ممکن تھا کہ ماں کے سامان کے ساتھ پولیس والے مجھے بھی تھانے لے جاتے اور پھر سوال و جواب میں دن کیا، پوری رات بھی گزر سکتی تھی۔

میں نے ماں کا سیل فون اٹھا کر دیکھا تو اس کے

اسکرین پر ''شاہ جی'' چمکتا نظر آیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ یہ نادر شاہ کی کال ہوگی۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو......!''

''سلمٰی بہن!'' وہ میری مردانہ ''ہیلو'' پر توجہ دیے بغیر بولا۔ ''آپ کیسی ہیں۔ میں آنا چاہ رہا تھا۔ چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ کیا آپ اس وقت فری ہیں؟''

''شاہ جی! یہ میں ہوں...... اسد علی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ جہاں بھی ہیں فوراً یہاں آجائیں۔''

''سلمٰی بہن کہاں ہیں؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ماں کو حادثہ پیش آگیا ہے۔'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا۔ ''وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں۔''

''اوہ...... یہ کیسے ہوگیا؟'' اس نے بے حد پریشانی سے پوچھا۔

''آپ یہاں آجائیں پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں پندرہ سے بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''بیٹا! آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

''اوکے انکل!'' میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

سیل فون کو ایک طرف رکھنے کے بعد میں نے عظیم سے کہا۔ ''نادر شاہ کا فون تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ یہاں پہنچ رہا ہے۔''

''آنے دو۔ اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تم نے آنٹی سلمٰی کی چیزیں تو احتیاط سے رکھ دی ہیں نا؟''

''میں نے سب کچھ سنبھال کر ان کے بیڈ روم میں رکھ دیا ہے اور بیڈ روم کو لاک کر دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بس، یہ سیل فون میرے پاس ہے۔ یہ میں نے اس خیال سے رکھ لیا تھا کہ کسی کا اہم فون آسکتا ہے اور دیکھ لو، نادر شاہ نے اسی نمبر پر کانٹیکٹ کیا ہے۔''

''تم جب سے اس بنگلے پر ٹھہرے ہوئے ہو، اس دوران میں تمہاری والدہ نے کسی سے اپنے لین دین کا بھی کوئی ذکر کیا؟'' اس نے ایک اہم سوال کیا۔ ''مطلب یہ کہ سلمٰی صاحبہ نے کسی کا کوئی پیسا دینا ہو یا کسی سے کوئی رقم لینا ہو؟''

''جب ماں گھر کو فروخت کر رہی تھیں تو میں نے اس سلسلے میں ان سے پوچھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کسی کا ایک روپیہ بھی نہیں دینا اور انہوں نے اگر کسی سے کچھ لینا ہے تو وہ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد یہ سارا قرض، قرض داروں کو معاف کر دیں گی حتیٰ کہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ بینک میں جمع ساری رقم کو بھی نکلوالیں گی اور زادِ راہ رکھ کر باقی پیسے ''حیدر علی ٹرسٹ'' کے اکاؤنٹ میں ڈال دیں گی۔''

''بس، تو پھر تم ایک کام کرو۔'' عظیم نے کہا۔ ''نادر شاہ کا نمبر اپنے سیل فون میں فیڈ کرنے کے بعد سلمٰی آنٹی والا فون آف کر کے انہی کے کمرے میں حفاظت سے رکھ دو۔ ٹرسٹ والے ایشو پر ہم مناسب موقع دیکھ کر نادر شاہ سے بات کر لیں گے۔''

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

وہ بولا۔ ''اب پہلی فرصت میں تم جا کر جشید اور محمد حسین کو صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔''

''اوکے!'' میں اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اور ہاں......'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جشید تو اس گھر کا سیکیورٹی گارڈ ہے اور اس کی رہائش بھی اسی بنگلے میں ہے لہٰذا اسے چھٹی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اگر تم چاہو تو باورچی کی چھٹی کر دو۔ میرے خیال میں فی الحال اس بنگلے کو محمد حسین کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔''

''تم کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہو لیکن میں ان دونوں کو یا کم از کم محمد حسین کو چند روز بعد فارغ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان دونوں افراد نے ماں کی بہت خدمت کی ہے۔ میں انہیں یہاں سے خالی ہاتھ رخصت نہیں کروں گا۔ نادر شاہ سے ملاقات پر میں ان دونوں کے لیے تگڑی رقوم کا بندوبست کراؤں گا۔''

''گڈ جاب!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ستائشی لہجے میں بولا۔

میں گھر کے بیرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

ماں کے پورے سیٹ اپ میں صرف نادر شاہ ایک ایسا آدمی تھا جو اس حقیقت سے واقف تھا کہ میرا نام اسد علی ہے اور میں حیدر علی و سلمٰی کا سگا اکلوتا بیٹا ہوں۔ شاہ جی کے سوا باقی تمام افراد کو یہی پتا تھا کہ میں ان کی میڈم کا کوئی قریبی عزیز ہوں جو جدہ سے یہاں آیا ہوں۔ جب میں عظیم کے ساتھ پہلی مرتبہ اس بنگلے پر آیا تھا تو میں نے سیکیورٹی

گارڈ جمشید کو اپنا اصلی نام اسد علی بتایا تھا لیکن اس کے بعد پھر کبھی ذکر نہیں ہوا تھا۔ جمشید مجھے "سر" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میرا نام اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ وہ بھی مجھے میڈم سلمٰی کا کوئی قریبی رشتے دار ہی سمجھتا تھا۔ جمشید، بنگالی بابو محمد حسین اور ماں کے زیرِ سایہ کام کرنے والی پانچوں لڑکیوں اور نگینہ آنٹی سمیت تمام لوگ میری بہت عزت کرتے تھے حتیٰ کہ پینا بھی مجھے اپنی میڈم کا کوئی رشتے دار ہی سمجھتی تھی۔

سرِدست میں نے بنگالی بابو اور جمشید کو ماں کی ناگہانی موت سے آگاہ کیا۔ یہ اندوہناک خبر سن کر گویا ان پر آسمانی بجلی گر گئی تھی۔ وہ دونوں ماں کے نمک خوار تھے۔ ماں نے ان پر اَن گنت احسانات کر رکھے تھے۔ اپنی محسن مالکن کی موت کے بارے میں جان کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ ان کی حالت کو دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئے ہوں۔ آپ میری ذہنی و قلبی کیفیت کو محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ جب ماں کے ملازمین کا یہ حال تھا تو مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ آج صحیح معنوں میں، میں یتیم ہو گیا تھا۔ جس ماں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں نے انیس سال تک انتظار کیا تھا، وہ عظیم ہستی انیس دن تک بھی میرے ساتھ نہیں رہی تھی۔ ایک ایک کر کے میرے سر کے سائے اٹھ رہے تھے۔ ماں سے ملاقات ہوئی تو اس سے پہلے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میری پیدائش سے قبل ہی دشمنوں نے میرے والد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ماں سے ملاقات کی خوشی کو میں پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ انکل علی سلطان اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ میں ابھی تک انکل سلطان کی جدائی کے صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ ماں.....!

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا دل پتھر کا ہو گیا ہو۔ اب میرے اندر کوئی رنج و الم نہیں تھا، کسی صدمے اور غم کا مجھے مطلق احساس نہیں رہا تھا۔ میں سود و زیاں کے حساب سے باہر آ گیا تھا۔ وقت نے میرے ساتھ جو بھی کیا تھا وہ مجھ پر اس کا قرض تھا اور وقت کا یہ قرض مجھے سود در سود لوٹانا تھا۔

میں نے ماں کی خواہش پر، اپنے تمام دشمنوں کو فراموش کر کے ماں کے ساتھ یہاں سے ہزاروں میل دور امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر میرا یہ شریفانہ فیصلہ وقت کو پسند نہیں آیا تھا۔ وقت نے میری موجودگی میں، میری نگاہ کے سامنے ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ وقت مجھ سے کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ وہ ایک بدمعاش کے مانند سینہ تان کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اب میرے پاس دو ہی راستے بچے تھے۔ نمبر ایک، میں کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح وقت کے سامنے سپر ڈال دیتا۔ نمبر دو، اپنی آخری سانس تک اس غنڈے کا مقابلہ کرتا...... یا تو وقت کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا اور یا پھر اس ظالم اور سفاک کے ہاتھوں فنا ہو جاتا۔

میں کوئی بزدل انسان نہیں تھا، نہ ہی میرے ہاتھ پاؤں فالج زدہ تھے۔ دشمنوں کی جانب بڑھنے والے میرے ہاتھوں کو روکنے والی ماں اب اس دنیا میں موجود نہیں رہی تھی۔ ماں کے اٹھ جانے سے میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ میں تہی دست و تہی داماں ہو گیا تھا۔ ایک لٹا پٹا انسان بہت طاقتور ہوتا ہے۔ جب آپ کو یہ احساس ہو جائے کہ آپ کے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تو پھر آپ جان پر کھیل جاتے ہیں اور..... جیت اپنے نام کرنے کے لیے جان پر تو کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

میں نے اس کائنات کے سب سے بڑے بازی گر "وقت" کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گرگِ باراں دیدہ اپنے دشمنوں کی برسوں پرورش کرتا ہے اور ان کے ساتھ روز و شب چوہے بلی کا کھیل جاری رکھتا ہے مگر اب مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ یہ موت کے کنوئیں میں زندگی کے کرتب دکھانے کے مترادف تھا اور میں پُرعزم تھا کہ یہ بازی میں ہی جیتوں گا..... ہر حال میں اور..... ہر قیمت پر!

میں جب واپس عظیم کے پاس آیا تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ بات مکمل کرنے کے بعد اس نے سیل فون ایک طرف رکھا اور مجھ سے کہا۔

"میں نے اپنے ایک دوست کے توسط سے یہاں قریبی قبرستان کے گورکن سے بات کر لی ہے۔ دو گھنٹے کے بعد قبر تیار ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں، میں نے تمام امور طے کر لیے ہیں۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج کی تاریخ میں آنٹی سلمٰی کی تدفین ہو جائے گی۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے!" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "ماں کی باڈی تو ابھی تک پولیس کی تحویل میں ہے.....؟"

"میرے پاس ارباب کا فون آیا تھا۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اس نے اپنے محکمہ جاتی تعلقات کو استعمال کر کے تمام مراحل آسان کر دیے ہیں۔ شام سات آٹھ بجے کے درمیان یعنی افطار کے فوراً بعد آنٹی

کی باڈی یہاں پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد ہی میں نے تجہیز و تکفین کے انتظامات کو لائن اپ کیا ہے۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔ ارباب اگر تعاون نہ کرتا تو یہ مرحلہ اتنا آسان ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔"

"وہ بھلا کیسے تعاون نہ کرتا۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "تھوڑی دیر میں مصطفیٰ اور تین چار دیگر کزن بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان شاء اللہ! تمام معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں گے۔ تراویح سے پہلے آنٹی کی تدفین کا کام مکمل ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ......!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ نادر شاہ آ گیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بلوا لیا۔ اس نے بڑی محبت سے مجھے گلے لگایا اور کافی دیر تک میری پیٹھ تھپکتے ہوئے مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھ پر ایک قیامت سی گزر گئی تھی لیکن حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد مجھے قرار آ گیا تھا اور میں اندر سے بے پناہ مضبوط ہو گیا تھا۔ ماں کی موت کا صدمہ اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت تھا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا مگر میرا دماغ کسی اور ہی پٹری پر چڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے میرے اعصاب کو آہنی قوت مل گئی تھی اور میں اپنے ارادوں میں فولاد جیسی سختی اور مضبوطی محسوس کر رہا تھا۔ آہیں بھرنے اور آنسو بہانے سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ میں اس قسم کی جذباتی کیفیات سے بہت دور نکل آیا تھا۔

نادر شاہ کے استفسار پر میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ماں نے امریکا جانے والی بات نادر شاہ سے چھپا رکھی تھی۔ اس کے علم کے مطابق، ہم ماں بیٹا دبئی میں سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتے تھے لہٰذا میں نے بھی امریکن ایمبیسی یاترا کا ذکر گول کر دیا تھا مگر میرے خاموش ہونے پر اس نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم لوگ اس روڈ پر کیا کرنے گئے تھے؟"

"ہمارا اس طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں نے سچویشن کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اصل میں ماں کو اس علاقے میں کوئی کام تھا۔"

"بیٹا! تم نے جو حالات بتائے ہیں اس سے ایک بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تمہاری ماں کو ٹارگٹ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔" نادر شاہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "اور اس نوعیت کی کارروائی کوئی دشمن ہی کر سکتا ہے۔ یہ ٹارگٹ کلر یقیناً سلمٰی بہن کے کسی دشمن کا بھیجا ہوا تھا اور اس کمینے انسان نے تمہاری ماں کو فالو بھی کیا ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ صرف سلمٰی بہن ہی کو مارنے آیا تھا۔ اس کم بخت نے تم پر ایک بھی گولی نہیں چلائی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔"

"بیٹا! میں جانتا ہوں، سلمٰی بہن کی بعض طاقتور لوگوں سے دیرینہ دشمنی تھی اور یقیناً یہ بات سلمٰی نے تمہیں بھی بتائی ہوگی۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "ہو سکتا ہے، سلمٰی کی موت میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہو جنہوں نے ماضی میں تمہارے باپ حیدر علی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا!"

"ہاں..... ایسا ہو سکتا ہے۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "ماں نے اپنے دشمنوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ میں..... ان درندوں سے بھیانک انتقام لینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ماں نے مجھے کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی سے روک دیا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے مجھے پایا تھا۔ وہ مجھے خون اور بارود کے کھیل سے دور رکھنا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مستقل طور پر دبئی شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماں کا یہ پروگرام آپ کے علم میں ہے۔"

"سلمٰی بہن نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا مگر اللہ کی مرضی کے سامنے انسان کی پیش نہیں چلتی بیٹا۔" وہ دل گرفتہ آواز میں بولا۔ "اب تمہیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔ جب تک تم پاکستان میں ہو، تمہیں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ میں تو کہتا ہوں، اس بنگلے سے باہر نکلنے یا کہیں دور جانے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ گھر تمہارے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔ جب تک تم واپس جدہ نہیں چلے جاتے، ادھر ہی قیام کرنا مناسب ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ یہاں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ تم سلمٰی بہن کے سگے بیٹے ہو۔ سب کو یہی بتایا گیا ہے کہ تم ان کے کوئی عزیز ہو۔"

"ماں کی تدفین ہو جائے تو اس کے بعد میں پہلی فرصت میں جدہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ آپ کل کسی وقت یہاں آ جائیں۔ مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں اور ہاں......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کل جب آپ میرے پاس آئیں تو اپنے ساتھ بیس لاکھ کیش لے آئیے گا۔"

''خیریت!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''بیس لاکھ کا آپ کیا کریں گے؟''

''کیا ایسا کرنے میں آپ کو کوئی مشکل یا پریشانی ہے۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

''کوئی پریشانی ہے اور نہ ہی کوئی مشکل۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''سلمٰی مجھے سگی بہن سے زیادہ عزیز تھیں اور تم ان کے صاحبزادے ہو۔ تمہارا حکم ماننا میرے لیے ضروری ہے۔ سلمٰی بہن مجھ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں اور میں بھی آپ پر اندھا بھروسا کرتا ہوں۔ ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم موجود ہے۔ میں اس رقم میں سے بیس لاکھ نکال لاؤں گا۔ میں نے تو بس، اپنی معلومات کے لیے پوچھ لیا تھا......''

''ماں آپ پر جتنا اعتماد کرتی تھیں، میں بھی اتنا ہی کرتا ہوں شاہ جی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے آپ کو بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ مجھے اس بنگلے میں مزید کتنے دن قیام کرنا ہوگا لیکن میری خواہش ہے کہ یہاں سے جانے سے پہلے ماں کے دو خدمت گاروں یعنی خانساماں محمد حسین اور سیکیورٹی گارڈ جمشید کو فارغ کر دوں۔ ان لوگوں نے ماں کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں انہیں گولڈن شیک ہینڈ کے طور پر دس دس لاکھ روپے دے کر یہاں سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔''

''ویل ڈن!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی اپنی ماں کی طرح ایک سخی، نرم دل اور انسان دوست شخص ہو۔ سلمٰی بہن نے اپنی پانچوں لڑکیوں کو بیس بیس لاکھ کا گفٹ دیا تھا۔ یہ بات تمہارے بھی علم میں ہوگی۔''

''ہاں۔ میں جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''انکل! ماں کی پراپرٹی اور ٹرسٹ کے حوالے سے مختلف امور پر کل آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔ آج آپ صرف ایک پوائنٹ ذہن میں رکھ لیں......'' میں لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ماں ''حیدر علی ٹرسٹ'' کے نام سے جو فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتی تھیں اب اس ادارے کا نام ہوگا... ''سلمٰی حیدر ٹرسٹ۔''

''میں سمجھ گیا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ یہ ہو جائے گا۔''

''ماں کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ آپ کو مل جائے گا۔'' میں نے کہا...... ''اس کی مدد سے آپ ٹرسٹ کے تمام ڈاکیومنٹس کو درست کرائیں گے اور ماں کی خواہش کے عین کے مطابق اب اس ٹرسٹ یعنی ''سلمٰی حیدر ٹرسٹ'' کو آپ ہی رن کریں گے۔''

''بیٹا! جو تمہارا حکم......!'' وہ نرمی سے بولا۔

''انکل! آپ بڑے ہیں۔ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں بھلا آپ کو کیسے حکم دے سکتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بس میرا فوکس تو اس بات پر ہے کہ ماں کی خواہش پر عمل ہونا چاہیے اور اب تو وہ اس دنیا میں باقی بھی نہیں رہیں لہٰذا اس پروجیکٹ کو ان کی زندگی کی آخری خواہش کہا جاسکتا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''انکل! آپ کو میرا یہ آئیڈیا کیسا لگا؟ میرا مطلب ہے ''سلمٰی حیدر ٹرسٹ'' والا......؟''

''بہت عمدہ۔'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس ٹرسٹ کی شکل میں تمہارے والدین ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اس نیک فلاحی کام کا اجر و ثواب ان کے کھاتے میں درج ہوتا رہے گا۔''

''ان شاء اللہ......!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔

پھر ہمارے بیچ ماں کی تدفین کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔ عظیم نے نادر شاہ کو بتایا کہ اس سلسلے میں وہ تمام انتظامات کر چکا ہے۔ نادر شاہ نے عظیم کی کوششوں کو سراہا اور کہا۔

''سلمٰی بہن کے غسل کے معاملات سے نمٹنے کے لیے گھر میں دو تین خواتین کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر تم کہو تو میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔''

''آپ کہاں سے بندوبست کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دو عورتیں تو میں اپنے گھر سے لا سکتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''باقی اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ان پانچ لڑکیوں کو یہاں بلایا جاسکتا ہے جو سلمٰی بہن کے زیرِ سایہ کام کر رہی تھیں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پانچوں اور آنٹی نگینہ ماں سے بہت قریب تھیں۔ ان سے بہتر کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔''

ماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری آمد سے پہلے جس

انداز کی زندگی گزار رہی تھیں، وہ نادر شاہ سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور یہ بھی کہ انہوں نے نادر شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ اس زندگی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر دبئی میں مستقل رہائش اختیار کرنا چاہتی ہیں۔ نادر شاہ، ماں کے لیے بھروسے کا آدمی تھا اس لیے وہ اپنے اکثر دکھ سکھ شاہ جی سے شیئر کر لیا کرتی تھیں۔

''کیا ان پانچ لڑکیوں کو سلمٰی بہن کی موت کی خبر دے دی گئی ہے؟'' نادر شاہ نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ماں کے تعلق داروں میں ابھی تک یہ بات صرف جمشید اور محمد حسین ہی کو پتا ہے۔''

''زیادہ لوگوں کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ وقت جتنی آسانی اور خاموشی سے گزر جائے اتنا ہی اچھا ہے لیکن جہاں تک نگینہ اور ان پانچ لڑکیوں کا معاملہ ہے تو انہیں لازمی اطلاع دینا ہوگی اور یہ کام میں کر دوں گا۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں اور ادھر سے گزرتے ہوئے انہیں حالات سے آگاہ کر دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔''

نادر شاہ کے جانے کے بعد میں اور عظیم موجودہ صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ ماں کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے دو اہم پوائنٹس ہمارے سامنے تھے۔ ماں کو ٹارگٹ کر کے مارا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا شاخسانہ تھا۔

عظیم نے کہا۔ ''ہمیں اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ سلمٰی آنٹی کی موت سے کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ جو بھی اس معاملے کا بینفشری ہوگا، وہی اس قتل کی واردات کا ذمے دار ہے۔''

''تم بالکل درست سمت میں سوچ رہے ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یا تو یہ مذموم کام ماں کے کسی دیرینہ دشمن نے کرایا ہے اور یا پھر کسی ایسے شخص نے جسے ماں کی موت سے کوئی بہت بڑا فائدہ پہنچنے والا ہو۔''

''میرا ذہن آنٹی کے کسی دیرینہ دشمن کی طرف بالکل نہیں جا رہا۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ دیرینہ دشمن تو کسی وقت بھی آنٹی سلمٰی کو ختم کر سکتا تھا یا ختم کروا سکتا تھا پھر یہ واقعہ ایسے وقت پر پیش کیوں آیا جب آنٹی نے ہمیشہ کے لیے پاکستان کو نہ صرف چھوڑنے کا فیصلہ کیا بلکہ اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی کو ایک ٹرسٹ کی شکل میں اپنے ایک قابلِ بھروسا شخص کے سپرد کر دیا۔''

''تمہارا اشارہ نادر شاہ کی جانب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایگزیکٹلی!'' وہ زور دے کر بولا۔ ''آنٹی سلمٰی کی موت سب سے زیادہ فائدہ مند نادر شاہ کے لیے ثابت ہوگی۔ ٹرسٹ کے معاملات میں اب وہ اپنی مرضی کا مالک بن گیا ہے۔ بنگلے کی فروخت کے سلسلے میں دو ماہ کے بعد جو دس کروڑ کی پے منٹ آنا ہے اس پر بھی اسی شخص کو کلی اختیار حاصل ہے اور یہ اختیار آنٹی ہی نے اسے دیا ہے۔ وہ آنٹی کے مالی معاملات میں اس وقت سیاہ و سفید کا مالک ہے۔''

''عظیم! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ شخص میری بھی سمجھ میں نہیں آیا مگر چونکہ ماں اس پر بہت بھروسا کرتی تھیں، اس لیے میں بھی خاموش ہو گیا۔''

''اس بندے کے بارے میں اب تم بے فکر ہو جاؤ۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''مجھے اس کا سیل نمبر دے دو۔ میں اس پر گہری نظر رکھوں گا۔ یہ تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہیں کر سکے گا۔''

''میرے ساتھ اس نے کیا اونچ نیچ کرنا ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''برو! میں نے یہ بات حالات و واقعات کی روشنی میں کہی ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ ہم تھوڑی دیر پہلے آنٹی کی موت کے اسباب کے حوالے سے مختلف آپشنز پر ڈسکس کر چکے ہیں۔ ایک آپشن یہ بھی تھا کہ نادر شاہ نے آنٹی کے کروڑوں ہڑپ کرنے کے لیے انہیں کسی پیشہ ور ٹارگٹ کلر کے توسط سے ختم کروا دیا ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر تمہارے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یہاں پر صرف نادر شاہ اس راز سے واقف ہے کہ تم سلمٰی آنٹی کے سگے بیٹے ہو۔ یہاں سے میری مراد یہ سیٹ اپ ہے جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ نادر شاہ کے ذہن میں یہ بات یقیناً ہوگی کہ آنٹی کی موت کے بعد ان کی تمام دولت و جائداد کے تم ہی اکلوتے وارث ہو لہٰذا وہ تمہیں بھی راستے سے ہٹانے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔''

''تمہارا تجزیہ حالات و واقعات کے عین مطابق ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میں ذرا

مختلف زاویے سے سوچنے کا عادی ہوں۔"

"اور وہ زاویہ کیا ہے؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تین چار پوائنٹس ہیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ نادرشاہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "نمبر ایک، میں اسے یقین دلا چکا ہوں کہ چند روز میں واپس چلا جاؤں گا لہٰذا اسے میری طرف سے فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ نمبر دو، ٹرسٹ کے حوالے سے ماں کے ساتھ اس کی جو بھی ڈیل ہوئی، میں نے کسی بھی مرحلے پر اس میں کوئی مداخلت یا کسی قسم کی مخالفت نہیں کی چنانچہ اسے مجھے اپنا دشمن نہیں سمجھنا چاہیے۔ نمبر تین، میں نے اسے کل جو بلایا ہے تو ٹرسٹ کے حوالے سے اسے بریف کردوں گا کہ یہ پروجیکٹ ہر صورت میں اسی کے ہاتھوں چلنا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے میری ذات سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ میں ماں کی آخری خواہش کو ضرور پورا کروں گا اور یہ کام نادرشاہ کے ہاتھ ہی سے ہوگا۔ نمبر چار، میں یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکا کی پراپرٹی ہوں۔ وہ لوگ اپنے ہر شہری کو "اسٹیٹ پراپرٹی" کہتے ہیں۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں۔"

"میں تمہارے تین نکات سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "مگر "اسٹیٹ پراپرٹی" والی لوجک مجھے ہضم نہیں ہوسکتی۔"

"کیوں؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب میں بھی نمبر وار گنواؤں گا۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "نمبر ایک، نادرشاہ یہ نہیں جانتا کہ تم امریکا کے شہری ہو۔ وہ تمہیں "فرام جدہ" سمجھتا ہے۔ نمبر دو، اس وقت تم امریکا میں نہیں، پاکستان میں ہو۔ یہ بڑی عجیب و غریب دھرتی ہے پیارے صاحب۔ یہاں کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"ارے یار..... اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مالک کے کرم سے اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس شخص سے میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے بھی میں زیادہ دن یہاں نہیں رکوں گا۔ ٹرسٹ کے ڈاکیومنٹس کا معاملہ نمٹ جائے تو میں واپس امریکا چلا جاؤں گا۔"

"اللہ ہر جگہ تمہاری حفاظت فرمائے۔" وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ "ویسے اگر نادرشاہ نے ٹرسٹ والے پروجیکٹ میں بھی کوئی ہیرا پھیری کرنے کی کوشش کی تو میں اسے گردن سے دبوچ لوں گا۔"

"ایسا سب کچھ تم اس لیے سوچ رہے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت اور گہری ہمدردی ہے۔" میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ "تم مجھے کسی بھی نوعیت کا نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتے۔ ہے نا یہی بات.....؟"

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"بالکل..... ایسا ہی ہے۔"

"عظیم! میری بات غور سے سنو۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "جہاں تک "سلمیٰ حیدر ٹرسٹ" کا معاملہ ہے نا تو اس سلسلے میں ماں کی آخری خواہش میرے لیے ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ وہ نادرشاہ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ میں بھی آنکھیں بند کر کے شاہ جی پر بھروسا کروں گا..... ڈیٹس آل..... اس کام میں فائدہ ہو یا نقصان، مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں!"

"ٹھیک ہے برو!" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "جیسی تمہاری مرضی....."

☆☆☆

افطار پر جمشید اور محمد حسین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد عظیم کے تین کزنز بھی آگئے۔ نادرشاہ نے ماں کے زیرِ سایہ کام کرنے والی پانچوں لڑکیوں کو اس سانحے سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ سب بھی ماں کے بنگلے پر پہنچ گئی تھیں۔ ان کے علاوہ آنٹی نگینہ نے بھی آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ قریبی بنگلے پر جہاں وہ پانچوں لڑکیاں رہتی تھیں وہاں کے اسٹاف میں سے بھی دو تین افراد نے ماں کے آخری مراحل میں شرکت کی تھی۔ تدفین کے تمام تر معاملات کو نمٹانے کے بعد جب ہم واپس گھر آئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

آنٹی نگینہ اور نادرشاہ کل دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہوگئے تو عظیم نے اپنے کزنز کو بھی روانہ کردیا۔ پانچوں لڑکیوں کی رہائش چونکہ واکنگ ڈسٹینس پر تھی اس لیے وہ ماں کے گھر پر رکی ہوئی تھیں۔ وہ سب ماں کی وفادار تھیں اس لیے ماں کی ناگہانی موت نے انہیں گہرے صدمے سے دوچار کردیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات تھے، خاص طور پر مینا تو ایک طرح سے میرے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ چند ملاقاتوں نے مینا کو میرے بہت قریب کردیا تھا۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کی جدہ میں مستقل

رہائش کا بندوبست کردوں گا۔

میں نے مینا سے کہا۔ "تم اپنی ساتھیوں کو بھیج دو اور اگر تمہیں ان کے ساتھ ہی واپس جانا ہے تو چند منٹ کے لیے ان سے الگ ہوجاؤ۔ میں تمہارے بارے میں اپنے دوست سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بات کے اختتام پر میں نے عظیم کی جانب اشارہ بھی کردیا۔ اس نے سوالیہ نظر سے پہلے عظیم کو اور پھر مجھے دیکھا اور بولی۔

"کون سی اہم باتیں؟"

"تمہارے جدہ جانے کا معاملہ۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے بھی مدھم لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ کے دوست کوئی ٹریول ایجنٹ ہیں؟"

"یہ عظیم کپور ہیں۔" میں نے عظیم کو مینا سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ ٹریول ایجنٹ نہیں بلکہ ٹریول کنگ ہیں۔" پھر میں نے مینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم سے کہا۔

"یہ میری دوست مینا ہیں۔ یہ مستقل طور پر جدہ میں رہائش اختیار کرنا چاہتی ہیں۔"

"اچھا..... تو تم نے انہی کا ذکر کیا تھا؟" عظیم نے پوچھا۔

"بالکل!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب اس کی ذات کے حوالے سے کوئی اہم بات ہو رہی ہو تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ مینا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے باقی چار لڑکیوں کو روانہ کیا پھر ہمارے ساتھ آبیٹھی۔ لڑکیوں کو اس نے یہی کہا تھا کہ پندرہ بیس منٹ میں وہ بھی آرہی ہے۔

"اوکے.....!" مینا نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی پھر مجھ سے پوچھا۔ "کپور صاحب میرا کام کس طرح کرائیں گے، کچھ اس بارے میں مجھے بتاؤ؟"

میں نے بتایا۔ "عظیم کے والد صاحب کی ایک بہت بڑی ٹریڈنگ کمپنی ہے۔ عظیم اور اس کا چھوٹا بھائی علی بھی اپنے والد کے ساتھ ہی بزنس سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کھانے والے تیل کے امپورٹر ہیں۔ اس کے علاوہ عظیم کے والد حاجی حفیظ کپور کا حج اور عمرہ کا بھی سیٹ اپ بنا ہوا ہے۔ وہ ہر سال درجنوں افراد کو حج اور عمرے کی سعادت سے بہرہ مند کرتے ہیں اور وہ بھی بالکل فی سبیل اللہ۔ یہ ایک طرح کا صدقۂ جاریہ ہے۔"

مینا نے تعریفی نظر سے عظیم کی طرف دیکھا اور ستائشی لہجے میں بولی۔ "آپ لوگ تو بہت نیک کام کر رہے ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" عظیم نے بے پروائی سے کہا۔ "اگر آپ کے پاس سرمایہ کاری کے لیے ہینڈسم اماؤنٹ ہے تو وہاں کے کسی مقامی عربی کو پارٹنر بنا کر کوئی بزنس شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح پہلے عارضی طور پر اور پھر رفتہ رفتہ آپ کی وہاں مستقل رہائش کا راستہ نکل آئے گا۔"

"آپ نے جس سرمایہ کاری کا ذکر کیا ہے اس کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟" مینا نے عظیم سے سوال کیا۔

"اس کا انحصار تو بزنس کی نوعیت پر ہے۔" عظیم نے کہا۔ "چھوٹا موٹا کام تو بیس تیس ہزار ریال سے شروع کیا جاسکتا ہے اور بڑے بزنس کے لیے لاکھوں ریال چاہیے ہوں گے۔"

"میں کسی بھی کام میں پانچ لاکھ ریال تک انویسٹ کرسکتی ہوں۔" مینا نے کہا۔

"پھر تو ٹھیک ٹھاک کام بن جائے گا۔" عظیم نے کہا۔ "آپ کے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔"

"جی بتائیں.....؟" وہ قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

مینا نے پانچ لاکھ ریال کی سرمایہ کاری کی جو بات کی تھی اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس نے ساحلِ سمندر والا اپنا اپارٹمنٹ فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس اپارٹمنٹ کی فروخت، ماں کے دیے ہوئے بیس لاکھ اور دیگر بینک بیلنس کو ملا کر اس کے پاس آٹھ سے دس لاکھ ریال کی رقم بنتی تھی اور چند روز پہلے وہ کیفے یونوریا میں مجھے بتا بھی چکی تھی کہ وہ اپنا سب کچھ بیچ باچ کر جدہ میں مستقل رہائش کا ارادہ کرچکی ہے۔

"آپ مجھے اپنا پاسپورٹ اور سی این آئی سی کی کاپی دے دیں۔" عظیم نے کہا۔ "میں آپ کا پندرہ دن کا عمرے کا ویزا لگوا دیتا ہوں۔ آپ جائیں، عمرہ کریں اور دو تین روز جدہ میں بھی قیام کریں۔ آپ وہاں رک کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ آپ کے لیے کون سا بزنس مناسب رہے گا۔ اس سلسلے میں میرا دوست آپ کی راہنمائی کرے گا۔ پھر واپس آکر مجھے بتائیں کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اسی حساب سے میں جدہ میں آپ کے لیے کسی بزنس اور مستقل رہائش کا انتظام کروا دوں گا۔"

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں کل آپ کو اپنا پاسپورٹ وغیرہ دے دوں گی۔"

پھر وہ ہم دونوں کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔

بینا کے جانے کے بعد عظیم نے مجھ سے کہا۔ ''برادا مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر میرا تجربہ مجھے مس گائیڈ نہیں کررہا تو بینا تم پر مرمٹی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''جدہ میں مستقل رہائش کا فیصلہ اس نے تمہاری وجہ ہی سے کیا ہے۔ کیا میں صحیح سمجھ رہا ہوں؟''

''یس! تم بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہو۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میری ایک بات یاد رکھنا کہ انسان کا تجربہ کبھی اسے مس گائیڈ نہیں کرتا بلکہ یہ تو سچا راہ نما ہوتا ہے۔ باقی جہاں تک بینا کا معاملہ ہے تو......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ ساری دال ہی کالی ہے۔ وہ جدہ میں سیٹل ہونا ہی اسی لیے چاہتی ہے کہ میں وہاں ہوں۔''

''اوہ......!'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر یہ گھما پھرا کر بات کیوں کررہی ہے؟ سیدھا سیدھا تم سے کیوں نہیں کہتی کہ تم اسے جدہ میں سیٹل کرادو......؟''

''خواہش تو اس کی یہی ہے مگر وہ چاہتی ہے کہ میں اپنے منہ سے اسے یہ پیشکش کروں۔'' میں نے کہا۔

''اور تم اس سلسلے میں بہت محتاط ہو۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ تم جدہ میں رہتے ہو اور نہ ہی وہاں کوئی ریسٹورنٹ چلاتے ہو......!''

''بالکل...... حقیقت یہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم تو چند روز میں واپس امریکا جانے والے ہو۔'' وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس برونیٹ حسینہ کو جدہ والی اسٹوری میں الجھا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟''

''یہ برونیٹ نہیں بلونڈ ہے۔'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''برونیٹ خواتین کے سر کے بال ڈارک براؤن ہوتے ہیں جبکہ بلونڈ خواتین کے بال ہنی براؤن یعنی لائٹ براؤن ہوتے ہیں جیسا کہ بینا کے شہد رنگ بال ہیں۔ باقی جہاں تک جدہ والی اسٹوری کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جانے سے پہلے میں بینا کو حقائق سے آگاہ کردوں گا۔''

''مکمل یا جزوی؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مکمل!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں بڑے واضح الفاظ میں اسے بتادوں گا کہ اس کی میڈم سلمٰی صاحبہ میری ماں تھیں اور یہ کہ میں جدہ میں نہیں بلکہ امریکا سے آیا ہوں اور واپس امریکا ہی جارہا ہوں۔''

''گویا تم اس پر بھروسا کرنے لگے ہو......!'' اس نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... میری نگاہ میں وہ اعتبار کے لائق ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو شخص برائی کی راہ کو ترک کرکے نیکی کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرچکا ہو، اس کے عزم کو سلام کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی غلط بیانی بھی نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیا بینا نے واقعی اس لائن کو چھوڑنے کا ارادہ کرلیا ہے؟'' عظیم کے لہجے سے بے یقینی جھلکتی تھی۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

اس کے بعد میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں عظیم کو اس انقلابی تبدیلی کے بارے میں بتایا جو بینا کے دل و دماغ میں پیدا ہوچکی تھی۔

''واقعی، یہ تو بہت بڑا فیصلہ ہے۔'' وہ سراہنے والے لہجے میں بولا پھر سرسراتے ہوئے انداز میں مجھ سے سوال کیا۔ ''تمہاری حقیقت جان لینے کے بعد اگر بینا نے تم سے کسی قسم کی مدد مانگنا چاہی تو تم کیا کروگے؟''

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ظاہر ہے، میں اس کی مدد کروں گا۔''

''اگر اس نے تمہارے ساتھ جانے کی ضد کی تو......؟''

''میرا خیال ہے، وہ ایسی ضد نہیں کرے گی۔'' میں نے کہا۔

وہ تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اور اگر تمہارا خیال غلط نکلا تو......؟''

''اس بات کا تو کوئی امکان نہیں کہ میں اسے اپنے ساتھ امریکا لے جاؤں یا اسے امریکا بلانے کے لیے کسی قسم کی تگ و دو کروں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''البتہ، میں اسے مشورہ دوں گا کہ وہ واپس جرمنی چلی جائے۔''

''کک...... کیا......؟'' وہ اچھل پڑا۔ ''کیا بینا جرمنی سے پاکستان آئی تھی؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے اسے بتایا کہ بینا کا باپ پاکستانی اور ماں

جرمن تھی اور بینا جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوئی تھی۔ جب بینا دو سال کی ننھی بچی تھی تو اس کے والدین ایلس اور مظفر جرمنی سے پاکستان آگئے تھے پھر دو سال بعد مظفر اور ایلس میں خطرناک اختلاف نے جنم لیا اور ایلس چار سال کی بینا کو مظفر کے پاس چھوڑ کر واپس اپنے ملک جرمنی چلی گئی تھی۔ اب بینا چوبیس پچیس سال کی ہے اور تن تنہا ہے۔

''اوہ...... ویری انٹرسٹنگ!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''بینا کا باپ کہاں ہے؟''

''کافی عرصے پہلے مظفر کا انتقال ہوگیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''باپ کی وفات کے بعد وہ اس دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی پھر ناساعد حالات نے اسے جسم فروشی کے پیشے سے وابستہ کردیا اور اب وہ اس دلدل سے نکل کر صاف شفاف زندگی گزارنا چاہتی ہے۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بینا آسانی سے جرمنی یا کسی بھی شینگن ملک جاسکتی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یورپ میں 'یورپی یونین' میں شامل ممالک میں سے چھبیس ممالک شینگن ممالک کہلاتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس ان چھبیس ممالک میں سے کسی ایک ملک کا ویزا بھی ہے تو آپ باقی کے پچیس ممالک میں بہ آسانی بلا روک ٹوک آجاسکتے ہیں اور جرمنی بھی شینگن ممالک میں شامل ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''انگلینڈ، آئرلینڈ، سائپرس، رومانیا، بوزنیا، کروشیا، سربیا، کوسوو اور بلغاریا کو چھوڑ کر باقی پورا یورپ شینگن ایریا میں شمار ہوتا ہے۔ شینگن ایریا انیس سو پچانوے میں قائم کیا گیا تھا یعنی جب میں صرف ایک سال کا تھا اور مجھے کراچی سے نیویارک پہنچادیا گیا تھا۔ اینی ہاؤ......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک مضمحل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب بینا سے اس ٹاپک پر بات ہوگی تو اس وقت کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے کس سمت کا رخ کرنا چاہیے۔''

رات ایک بجے عظیم اگلے روز آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا تو میں اپنے بیڈروم میں آگیا۔

میں بستر پر دراز ہوا تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی لہٰذا میں نے کوسوں دور کے سفر کا فیصلہ کیا اور کراچی میں رہتے ہوئے گیارہ ہزار سات سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع امریکی ریاست نیویارک کے شہر بروکلین پہنچ گیا۔ کراچی میں اس وقت نو جولائی رات کا ایک بجا تھا جبکہ بروکلین میں آٹھ جولائی کی سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں

آج جتنے بڑے سانحے سے گزرا تھا، بیگ صاحب کو اس کی اطلاع دینا بہت ضروری تھا۔

دوسری گھنٹی پر ادھر کال ریسیو کرلی گئی۔ پھر مرزا عامر بیگ کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ انہوں نے مخصوص لہجے میں کہا۔

''ہیلو بیٹا جی...... کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک نہیں ہوں انکل۔'' میں نے شکستہ آواز میں جواب دیا۔

وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوئے۔ ''کیا ہوا بیٹا جی۔ تمہاری والدہ کا انٹرویو کیسا رہا؟''

یہ بات میں پہلے ہی بیگ صاحب کو بتاچکا تھا کہ آٹھ جولائی کو ماں کا امریکن ایمبیسی میں انٹرویو ہے۔

''وہ انٹرویو میں پاس ہوگئیں......'' میں نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''پاس اوے......''

''پاس اوے......!'' انہوں نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھونے کے بعد انہیں شدید نوعیت کا جھٹکا لگا ہو۔ ''یہ...... تم...... کیا کہہ رہے ہو بیٹا جی......؟''

''ماں مجھ سے روٹھ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملی ہیں۔'' میں نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' ان کی تشویش سوا ہوگئی۔

''کیسے؟'' کے جواب، میں نے بیگ صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد انہوں نے کہا۔

''مجھے تو یہ اسی پرانی دشمن کا شاخسانہ لگتا ہے جس کی بھینٹ تمہارے والد صاحب بھی چڑھ گئے تھے۔ میں تمہارے خاندانی پس منظر کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن جاوید واسطی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں پاکستان میں تمہارے والد کی کسی شخص سے بڑی خطرناک دشمنی تھی اور اسی دشمن نے تمہارے والد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اسی لیے تمہاری حفاظت اور سلامتی کی خاطر سلمٰی نے ایک سال کی عمر میں جاوید واسطی کے ہاتھ تمہیں میرے پاس نیویارک پہنچادیا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔'' میں نے پژمردہ آواز میں کہا۔ ''میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں کہ ماں کو پیش آنے والے واقعے کے پیچھے کسی 'ریٹائیڈ' دشمن کا ہاتھ ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔''

''بیٹا جی! ان حالات میں تو آپ کے لیے بھی وہاں

خطرہ ہی خطرہ ہے۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''تم نے واپسی کے لیے کیا پلان بنایا ہے؟''

''میں دو تین روز بعد واپس آپ کے پاس آرہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''دو تین دن تک میرا کراچی میں رکنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ماں یہاں جو ٹرسٹ قائم کرنا چاہتی تھیں اس کے مالی اور انتظامی معاملات کو نمٹانا ہے۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے پچھلی بار کی گفتگو میں مذکورہ ٹرسٹ کا ذکر کیا تھا۔'' وہ سرسری انداز میں بولے۔ ''میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہاں کے کام نمٹاؤ اور پھر پہلی فرصت میں میرے پاس آجاؤ۔''

''جی انکل..... میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''جیتے رہو بیٹا جی۔'' وہ مشفقانہ انداز میں بولے۔ ''اللہ پاک تمہاری والدہ کی اگلی منازل آسان فرمائے۔ انسان کی زندگی مختصر اور عارضی ہے۔ جلد یا بدیر، سب کو ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ اللہ تمہیں صبر اور ہمت عطا فرمائے!''

''آمین... ..!'' میں نے تہ دل سے کہا۔

چند اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔ ادھر میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا، ادھر اس کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ وہ بینا کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو.....!''

''ابھی تک جاگ رہے ہو؟'' اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''بس، سونے جارہا ہوں۔''

''کافی دیر سے تمہارا نمبر بزی جارہا تھا.....!'' اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں..... امریکا میں بات ہورہی تھی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''نیویارک میں ہمارے ایک عزیز رہتے ہیں۔ میں انہیں سلمٰی صاحبہ کو پیش آنے والے سانحے سے آگاہ کررہا تھا۔''

''آنٹی کی ناگہانی موت کا مجھے بہت دکھ ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں تمہارے اس صدمے کو ختم تو نہیں کرسکتی لیکن اگر تم کہو تو میں آجاتی ہوں، تمہارا دل بہل جائے گا.....!''

''نہیں بینا۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''تم کل دن میں آنا۔ ابھی میں کچھ وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ اپنائیت سے بولی۔ ''علی! سونے کی کوشش کرو۔ میں محسوس کررہی ہوں کہ آنٹی کی موت نے تمہارے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ تم ایک بھرپور نیند لے لو گے تو تمہارے ذہن سے دباؤ کم ہوجائے گا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''میں یہی کرنے جارہا ہوں۔''

''اوکے..... گڈ نائٹ۔'' اس نے کہا۔

میں نے بھی جواباً اسے ''گڈ نائٹ'' کہہ دیا۔

میں نے سیل فون کو سائلنٹ موڈ پر سیٹ کرکے چارجنگ پر لگا دیا اور خود بستر پر دراز ہوکر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

آج دن میں، میں جس سانحے سے گزرا تھا، اس نے میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہورہی تھی۔ میں اپنی اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس، اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وقت نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کتنا جابر ہے۔ وہ اپنی طاقت کے بل پر کس طرح انسان کو بے بس کردیتا ہے۔ وقت کی چال بڑی نرالی اور ہفت رنگ ہوتی ہے، اس کا جال بڑا پیچیدہ اور ہم رنگ زمیں ہوتا ہے۔ وہ اچانک ایسا کاری وار کرتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ماں کی ابدی جدائی نے مجھے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا تھا لیکن میں کسی بھی طور وقت کے سامنے سرنگوں ہونے کو تیار نہیں تھا۔ میری ماں کو مجھ سے چھین کر وقت نے میرے دل و دماغ پر جو چرکہ لگایا تھا اس نے میرے دل کو پتھر اور دماغ کو فولاد بنا دیا تھا۔ میں وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے قابل ہوگیا تھا۔ میرا ذہن ایک دم صاف تھا کہ مجھے کس طرح اپنی ماں کے قتل کا ادھار چکانا ہے۔ میری ماں کا دشمن جو کوئی بھی تھا، وہ میرا بھی دشمن تھا اور میں..... اس کا دشمن تھا، چاہے اسے خبر ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ماں کو باقاعدہ ٹارگٹ کرکے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ٹارگٹ کلر نے یہ کام کرنے سے پہلے ان کے معمولات کا اچھی طرح جائزہ لیا ہوگا۔ وہ ماں کو فالو کرتے ہوئے جائے وقوعہ تک پہنچا تھا اور اپنا کام کرکے چشم زدن

میں منظر سے غائب ہوگیا تھا۔

مجھے ٹارگٹ کلر سے زیادہ اس شخص کی تلاش تھی جس کے ایما پر ٹارگٹ کلر نے یہ مذموم کارروائی کی تھی۔ وہ شخص میری ماں کا اصل دشمن تھا اور وہی شخص اب میرا ٹارگٹ تھا۔ مجھ پر لازم ہوگیا تھا کہ اس بدذات کو باور کراؤں کہ ٹارگٹ کلنگ کیا ہوتی ہے..... مجھے ہر حال میں یہ نیک کام کرنا تھا۔

اپنے نادیدہ و نامعلوم دشمن کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دماغ دکھنے لگا۔ میں نے اپنے دماغ کو ان الفاظ کا چین کلر کھلا دیا..... ''کوئی بھی چیز ہمیشہ کے لیے نادیدہ اور نامعلوم نہیں ہوتی۔ یہ سب ہماری رینج کا کھیل ہے۔ ہمارے ذہن کی جتنی رینج ہوتی ہے، بس اتنی ہی چیزوں تک ہماری رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اس رینج کے باہر پائی جانے والی تمام اشیا ہمارے لیے نادیدہ ہی ہوتی ہیں۔ اپنے نادیدہ اور نامعلوم دشمن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنی ذہنی اور بصری استعداد کو بڑھانا تھا تاکہ وہ کمینہ میرے لیے نادیدہ اور نامعلوم نہ رہے.....!'' میں نے آنکھیں بند کرکے اپنے دماغ کو یہ ہدایت دی۔ ''میں پورے آٹھ گھنٹے تک نہایت ہی پُرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک آٹھ گھنٹے کے بعد میری آنکھ خود بہ خود ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن..... اس دوران میں اگر اس گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی توقع بھی ہوئی تو میری آنکھ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی فوراً کھل جائے گی۔''

☆☆☆

اگلی صبح کم و بیش دس بجے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میری نیند کے دوران میں اس بنگلے کی چار دیواری کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اسی لیے میں دماغ کو دی گئی ہدایت کے مطابق، پورے آٹھ گھنٹے پُرسکون نیند سویا تھا۔

ماں کی ناگہانی موت کا صدمہ اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھا اور یہ بھی ایک کھلی سچائی تھی کہ میں ایک جیتا جاگتا انسان تھا لہٰذا مجھے معمولاتِ زندگی میں حصہ لینا تھا۔ میں زمینی حقائق سے نظر نہیں چرا سکتا تھا۔ میں نے فریش ہونے کے بعد ناشتا کیا تو نادر شاہ آگیا۔

نادر شاہ میری فرمائش نما ہدایت کے مطابق، بیس لاکھ کیش رقم اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے اس فرماں برداری پر اس کا شکریہ ادا کیا پھر ماں کے حوالے سے ہمارے بیچ گفتگو ہونے لگی۔

''انکل! ماں کا یہ بنگلا آپ نے سامان کے ساتھ فروخت کیا ہے یا بغیر سامان کے؟'' میں نے پوچھا۔

''سامان کے ساتھ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اس کا سبب یہ تھا کہ دو ماہ کے لیے مجھے یہ بنگلا کرائے پر اٹھانا تھا کیونکہ بنگلے کی آدھی پے منٹ پارٹی دو ماہ کے بعد دے گی۔ اس طرح کرائے سے جو رقم آئے گی وہ بھی ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں جائے گی پھر ایک اور بھی وجہ تھی.....'' وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر ہم بنگلے کے سامان کو الگ سے فروخت کرنے کی کوشش کرتے تو یہ فرنیچر اور تمام قیمتی اشیا اونے پونے داموں ہی جاتیں۔ میں جس پارٹی کو کرائے پر دو ماہ کے لیے یہ بنگلا دوں گا انہیں فرنشڈ بنگلا ہی چاہیے تھا۔ یورپ سے کسی کے ہاں ایک فیملی آئی ہوئی ہے۔ یہ لوگ اس فیملی کو اس بنگلے میں ٹھہرائیں گے۔ یہاں کوئی شادی وغیرہ ہورہی ہے۔ ان لوگوں کو ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے کرائے پر سجا سجایا بنگلا چاہیے تھا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھالیا۔''

''آپ نے جو بھی کیا، بہت اچھا کیا۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''میں دو تین دن مزید یہاں رکوں گا۔ اس کے بعد یہ بنگلا آپ کے ڈسپوزل پر ہوگا۔''

''آپ بالکل بے فکر ہوکر جدہ جائیں۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں سلمٰی بہن سے کیا ہوا ہر وعدہ نبھاؤں گا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدومد سے اپنے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا کہ سلمٰی بہن اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں.....'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا پھر بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

''میں نے مختلف مواقع پر تمہاری ماں کا ساتھ دیا ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر خود کو ان کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں کروں گا۔''

''یہ آپ کا بڑا پن ہے انکل۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ بیٹا۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں جب بھی یہاں سے رخصت ہونا ہو، ایک دن پہلے مجھے بتادینا۔''

''جی ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دو تین دن کے بعد..... جب میں واپسی کا ٹکٹ کنفرم کراؤں گا تو آپ کو ایک دن پہلے اپنی

روانگی کے بارے میں آگاہ کردوں گا۔"

پھر ہمارے درمیان "سلمٰی حیدر ٹرسٹ" کے حوالے سے مختلف تکنیکی اور قانونی امور پر بات چیت ہونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سیکیورٹی گارڈ جمشید اور خانساماں محمد حسین عرف بنگالی بابو کو اپنے پاس بلالیا۔ یہ دونوں مجھے ماں کے ایک عزیز کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میں نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سلمٰی صاحبہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں۔ دو تین دن کے بعد میں بھی جدہ واپس چلا جاؤں گا۔ آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"جب میڈم زندہ نہیں رہیں تو پھر میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔" بنگالی بابو دکھی لہجے میں بولا۔ "ظاہر ہے، میں اپنے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کروں گا۔"

جمشید نے کہا۔ "مجھے میڈم کی موت کا بہت افسوس ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری حقیقی والدہ فوت ہوگئی ہوں۔ میں کراچی میں کسی اور شخص کی ملازمت نہیں کرسکوں گا۔ میں واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔"

"ویسے تو تم دونوں اپنے اپنے فیصلے کے لیے آزاد ہو، میں تمہیں روکوں گا نہیں۔" میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم دو ماہ تک مزید اس بنگلے پر ملازمت کرنا چاہو تو میں اس سلسلے میں نادر شاہ سے بات کرلوں گا۔"

"نادر شاہ سے کیوں؟" جمشید نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"سلمٰی صاحبہ نے نادر شاہ کے توسط سے یہ بنگلا فروخت کردیا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جو میرے ساتھ جدہ جارہی تھیں تو ان کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ وہیں پر مستقل سیٹل ہونا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے یہ بنگلا فروخت کرکے اپنے شوہر کے نام پر کراچی میں ایک فلاحی ٹرسٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مذکورہ ٹرسٹ کا نظم ونسق نادر شاہ ہی نے سنبھالنا ہے۔ اس بنگلے کی آدھی پے منٹ ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوچکی ہے۔ باقی آدھی رقم دو ماہ کے بعد ملے گی اور ان دو ماہ میں یہ بنگلا نادر شاہ کے کنٹرول میں رہے گا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ دو ماہ کے لیے یہ بنگلا کرائے پر اٹھا رہا ہے۔ جو فیملی یہاں دو ماہ گزارنے آرہی ہے انہیں باورچی اور سیکیورٹی گارڈ کی ضرورت تو ہوگی اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا کہ اگر تم مزید دو ماہ اس بنگلے پر ملازمت کی خواہش رکھتے ہو تو میں تمہارے لیے نادر شاہ سے بات کرلیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے صاحب! آپ شاہ جی سے بات کرلو۔" محمد حسین نے کہا۔ "میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔ ان دو ماہ میں مجھے موقع مل جائے گا کہ میں اپنے لیے کسی دوسرے بنگلے میں کوئی کام تلاش کرسکوں۔"

"میرا جواب "نہ" میں ہے جناب۔" جمشید نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میڈم کے ساتھ میری جو ذہنی اور جذباتی وابستگی تھی، وہ کسی دوسرے تیسرے کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ جب تک آپ اس بنگلے پر موجود ہیں، میں ڈیوٹی دوں گا۔ اس کے بعد میں اپنے گاؤں گوجرہ روانہ ہوجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اب میں تم دونوں سے بہت ہی اہم بات کرنے والا ہوں۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سلمٰی آنٹی نے مستقل طور پر پاکستان کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس فیصلے میں وہ آپ دونوں کے دیرینہ جذبات کو نہیں بھولی تھیں۔ جمشید! تم پچھلے آٹھ سال سے اور محمد حسین! تم پچھلے پانچ سال سے سلمٰی صاحبہ کی خدمت پر مامور تھے اور اس دوران میں تم دونوں نے نہایت ہی ایمان داری اور وفا شعاری سے اپنے فرائض کو نبھایا ہے لہٰذا سلمٰی صاحبہ نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے وہ تم دونوں کو کیش گفٹ دیں گی۔ سلمٰی آنٹی اپنے ہاتھوں سے یہ کام نہیں کرسکیں لیکن ان کے اس نیک ارادے کو میں عملی شکل دوں گا۔" وہ کیش گفٹ "میں آپ کے حوالے کردوں گا لیکن تم دونوں مجھ سے وعدہ کرو کہ کسی کو اس رقم کے بارے میں ہوا نہیں لگنے دو گے۔ اس راز کو اپنے سینے میں دفن کردو گے۔"

دونوں نے باری باری میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ محمد حسین نے پوچھا۔ "صاحب! اس رقم کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتائیں گے؟"

"یہ اماؤنٹ تمہاری ایک سال کی تنخواہ سے متجاوز ہے۔" میں نے بتایا۔ "تم دونوں کو انفرادی طور پر میں دس، دس لاکھ کیش دوں گا۔ سلمٰی آنٹی کا خیال تھا کہ اس رقم سے تم لوگ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکو گے۔"

"میڈم بہت عظیم انسان تھیں....." بنگالی بابو نے احسان بھرے لہجے میں مختصراً کہا۔

جمشید اتنا بھی نہ کہہ سکا۔ میری بات نے اس کی زبان

پر قفل ڈال دیا تھا۔ جذبات کو اظہار کے لیے راستہ چاہیے ہوتا ہے۔ جب یہ منہ زور ندی باڑھ پر آتی ہے تو آنکھوں کے در وا ہوجاتے ہیں پھر اشکوں، آہوں، رسائی نارسائی، چاہت، محبت اور احساسات کا سیلِ رواں اشکوں کی صورت آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ انسان خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ بے زبان آنسو انسان کی داخلی کیفیات کی کہانی سنا دیتے ہیں۔

جمشید بھی ان لمحات میں اسی نوعیت کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ہمارے بیچ چند منٹ تک سلمٰی صاحبہ کی ذات کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے دس، دس لاکھ کا "کیش گفٹ" ان کے حوالے کردیا۔ ماں کے اس احسان عظیم کے بوجھ سے دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی اور آنکھیں اشک بار تھیں۔ میں ان کی اندرونی اور بیرونی حالت کو دیکھ رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ مجھ پر کون سی قیامت گزر گئی ہے۔ ان کی دانست میں میری آنٹی سلمٰی اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ماں کی دائمی جدائی کا صدمہ میرا مقدر ٹھہرا تھا۔ میں صحیح معنوں میں یتیم ہوگیا تھا۔

لگ بھگ بارہ بجے دوپہر آنٹی نگینہ پانچوں لڑکیوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آگئیں۔ میں نے نگینہ، روبی، سحرش، شیلا، آرزو اور حینا کو آنٹی سلمٰی (ماں) کے مستقل طور پر میرے پاس جدہ میں سیٹل ہونے کے حوالے سے وہی کہانی سنائی جو اس سے پہلے جمشید اور بنگالی بابو کے گوش گزار کرچکا تھا۔ اسی طرح بنگلے کی فروخت اور ٹرسٹ کے قیام کے بارے میں بھی ان خواتین کو سب کچھ بتادیا۔ آخر میں، میں نے کہا۔

"تم پانچوں آج سے آزادانہ طور پر کام کرنے کی پوزیشن میں ہو۔" میری مخاطب ماں کے زیرِ سایہ کام کرنے والی پانچ طرح دار حسینائیں تھیں۔ "اس سلسلے میں تم لوگ نگینہ آنٹی سے مشورہ کرسکتی ہو۔ یہ تمہاری بہترین راہ نمائی کرسکتی ہیں۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ تمہاری میڈم نے اپنے غیاب میں تمہیں نگینہ آنٹی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بات چیت چند روز پہلے میرے سامنے اسی ڈرائنگ روم میں ہوئی تھی۔ ویسے تم لوگ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد و خودمختار ہو۔"

ہمارے درمیان چند منٹ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر جب وہ اٹھ کر جانے لگیں تو میں نے ماں کے تمام ملبوسات نکال کر آنٹی نگینہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور اس بات کا فیصلہ آپ خود کریں گی کہ ان لباس کا بہترین مصرف کیا ہوسکتا ہے۔"

نگینہ آنٹی نے مذکورہ ملبوسات اپنی گاڑی میں رکھوادیے۔ بہ وقتِ رخصت مناسب موقع دیکھ کر حینا نے مجھ سے کہا۔

"علی! میں محسوس کرسکتی ہوں کہ تم اندر سے کافی ٹوٹ چکے ہو۔ کیا تمہیں میری ضرورت محسوس نہیں ہو رہی؟ اگر تم کہو تو میں تمہارے پاس رک جاتی ہوں.....!"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے کہ اس وقت مجھے تمہاری اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن فی الحال تمہارا اس بنگلے پر رکنا مناسب نہیں۔ یہ ایسا موقع ہے کہ گھر میں لوگ آجارہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں عظیم بھی آنے والا ہے۔ پتا نہیں، اس کے ساتھ اور کون کون ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم شام میں یا پھر رات میں ملیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو علی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایسا کرتے ہیں کہ آج رات کو ہم کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر پر چلتے ہیں۔ اس طرح تھوڑا تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔"

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

پھر وہ رخصت ہوگئی۔

دوپہر ایک بجے عظیم، شیخ صاحب اور مقبول صاحب میرے پاس پہنچ گئے۔ کل حفیظ کپور نے فون پر مجھ سے تعزیت کردی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ماں کی تدفین کے موقع پر موجود نہیں تھے۔

شیخ صاحب نے بڑی محبت سے مجھے گلے لگایا پھر میری پشت تھپکتے ہوئے میرے اندر حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھرنے لگے۔ ان کا لہجہ شفقت بھرا اور انداز سمجھانے والا تھا۔

"سائیں! یہ زندگی غم اور خوشی کا مرقع ہے، دھوپ اور چھاؤں کا ملاپ ہے۔ اس دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کی زندگی میں دکھ اور رنج کا گزر نہ ہو۔ موت اور زندگی کا اختیار ربِ کائنات کے ہاتھ میں ہے۔ سب کو اپنے اپنے وقت پر جانا ہے۔"

مقبول صاحب نے میری ہمت بندھانے کے لیے صرف ایک جملہ کہا۔ "زندگی، موت کی امانت ہے اور موت

زندگی کی منزل۔ انسان تو پیدائش سے وفات تک اس امانت کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اسے موت کے سپرد کردیتا ہے۔“

وہ تینوں کافی دیر تک میری دل جوئی کرتے رہے۔ عظیم نے مجھے بتایا۔ ”آئی پی نے جی ایم صاحب سے کل شام کا ٹائم فکس کرلیا ہے۔ شام کو سات سے نو بجے کے درمیان اس ریجنل چینل کا کوئی لائیو شو نہیں ہوتا لہٰذا یہ دو گھنٹے جی ایم صاحب بالکل فری ہوتے ہیں۔ آئی پی تمہیں جی ایم صاحب سے ملوانے کے لیے جتنا بے چین نظر آرہا ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ جی ایم صاحب کوئی توپ قسم کی چیز ہیں۔“

”آئی پی“ سے عظیم کی مراد ”الہامی بابا“ تھی۔ وہ مقبول صاحب کی روحانی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں الہامی بابا یعنی آئی پی کہا کرتا تھا۔

”ملاقات کے بعد ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی۔ یہ اچھا ہوا کہ ”جی ایم“ صاحب سے ملنے کا وقت رات میں رکھا گیا ہے ورنہ کل دن میں تو مجھے ماں کا پاسپورٹ اٹھانے جانا ہوگا۔“

”امریکن ایکسپریس میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ عظیم نے کہا۔ ”تم نے امریکی ایمبیسی سے ملنے والا ٹوکن تو سنبھال کر رکھا ہوا ہے نا؟“

”ہاں، وہ ٹوکن میرے پاس محفوظ ہے۔“ میں نے بتایا۔

عظیم کپور نے کہا۔ ”اب تمہیں اس ٹوکن کے علاوہ ایک پولیس رپورٹ کی بھی ضرورت ہوگی۔ جب اپنی والدہ کی جگہ تم ان کا پاسپورٹ اٹھانے جاؤ گے اور انہیں بتاؤ گے کہ تمہاری والدہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آگیا ہے تو وہ تمہاری بات کے لیے ثبوت بھی مانگیں گے اور اس واقعے کی پولیس رپورٹ سے زیادہ جاندار اور کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......“ اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں ارباب سے کہہ کر مذکورہ مخصوص رپورٹ تیار کروادوں گا۔ کل دن میں جب میں تمہارے پاس آؤں گا تو یہ رپورٹ بھی ساتھ لے آؤں گا۔“

”انکل! آپ کو میرا ایک اور کام بھی کرنا ہے۔“ میں نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بتاؤ سائیں؟“ وہ میری جانب متوجہ ہوگئے۔

”ایک منٹ......!“ میں یہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم سے اٹھ گیا۔

میں ماں کے بیڈ روم میں پہنچا پھر ان کے تمام زیورات کے ڈبے اٹھا کر واپس ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں نے ان ڈبوں کو سینٹر ٹیبل پر رکھنے کے بعد شیخ صاحب سے کہا۔

”انکل! یہ ماں کی جیولری ہے۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور ایک آدھ دن میں اپنے کسی بھروسے والے جیولر کے پاس ان زیورات کو فروخت کرکے ان سے حاصل ہونے والی رقم کو یو ایس ڈی (امریکن ڈالرز) میں تبدیل کرواکے مجھے دے دیں۔ اس کام کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

”آپ بے فکر ہوجاؤ۔“ وہ تسلی بھرے لہجے میں بولے۔ ”میں آپ کا یہ کام کروادوں گا۔ آپ ابھی کتنے دن یہاں پر ہو؟“

”دو سے تین دن۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یا اگر آپ کہیں تو مزید ایک دو دن بھی رک جاؤں گا۔“

”آپ کو اگر اپنا ذاتی کوئی کام ہے تو چاہے رک جاؤ۔“ وہ معتدل انداز میں بولے۔ ”لیکن اگر ان زیورات کی وجہ سے کہہ رہے ہو تو اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کا یہ کام کل شام سے پہلے ہوجائے گا۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان ماں کے بنگلے کی فروخت اور ”سلمٰی حیدر ٹرسٹ“ کے قیام کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں.... کم و بیش تین بجے سہ پہر وہ لوگ رخصت ہوگئے۔

میرا آج کا اب تک کا دن ملاقاتوں ہی میں گزر گیا تھا۔ پے در پے کوئی نہ کوئی آتا رہا تھا اور سب کے ساتھ کم و بیش ایک جیسی ہی باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے تھکن کا احساس ہوا تو میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور آنکھیں بند کرلیں پھر اپنے موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔

ماں کو پیش آنے والا واقعہ میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میں اپنے ذہن کو اس سانحے کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے جی ایم صاحب کے بارے میں سوچنے لگا۔ عظیم نے مجھے بتایا تھا کہ مقبول صاحب مجھے جی ایم صاحب سے ملوانے کے لیے بہت بے تاب تھے۔ عظیم اگرچہ مقبول صاحب کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کرتا تھا

لیکن میں نے اس شخص کی باطنی صلاحیتوں کا مظاہرہ پہلی ملاقات پر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

میں جی ایم صاحب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ عظیم کی زبانی مجھے صرف اتنا پتا چلا تھا کہ جی ایم صاحب کا پورا نام غلام مصطفیٰ تھا مگر وہ ”جی ایم سر“ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مقبول صاحب نے عظیم کو صرف اتنا بتایا تھا کہ میں امریکا سے جس عورت کو اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک پہنچا ہوں، اس سے جی ایم سر ہی مجھے نجات دلا سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ میں امریکا سے کسی عورت کو اپنے پیچھے لگا کر پاکستان نہیں پہنچا تھا۔ ہاں، یہ درست ہے کہ امریکا میں ڈیلفینا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اس پیچھے پڑنے میں اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی تھی اور ڈیلفینا کے اس مشن میں ربی آئزک، ہاروخ لاؤ اور ایما ایپل بام جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ڈیلفینا نے مجھے اخلاقی دباؤ میں لاکر بہتر گھنٹے کے لیے پرسٹن ہالو والے بنگلے میں مقیم رکھا تھا۔ اس نے کمال مہارت سے مجھے قتل کے ایک کیس میں سے ایسے نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے بال کو کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ میری عزیز ترین دوست شارو کی گمشدگی کا معما بھی ڈیلفینا ہی نے حل کیا تھا۔ اگر میں ڈیلفینا کی بات مان لیتا تو اس نے شارو کو مجھ تک پہنچانے کی ذمے داری اٹھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن میں اس کی پرکشش پیشکش کو لات مار کر ڈیلس سے ٹیکساس چلا آیا تھا اور آفت کی پرکالہ ہسپانوی دوشیزہ ڈیلفینا اپنی ناکامی پر کف افسوس ملتی رہ گئی تھی۔

اگر جی ایم سر کی مراد بھی عورت ڈیلفینا تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈیلفینا میرے تعاقب میں امریکا سے پاکستان پہنچ گئی تھی ورنہ اگر ڈیلفینا ابھی تک امریکا ہی میں بیٹھی ہوتی تو پھر جی ایم سر کس طرح اور کیوں اس سے میرا پیچھا چھڑانے کی بات کرسکتے تھے؟ یہ سوال اور اس سے جڑے ہوئے دیگر سوالات کے جواب مجھے اسی وقت مل سکتے تھے جب میں جی ایم سر کے سامنے پہنچ جاتا......اور یہ کل شام ہی کو ممکن تھا۔

سیل فون کی گھنٹی نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔ میں نے فون اٹھا کر دیکھا تو ڈسپلے پر بینا کا نام چمک رہا تھا۔ میں نے ”ہیلو“ کہہ کر اس کی کال ریسیو کرلی۔

”علی! میں تم سے ایک بات پوچھنا تو بھول ہی گئی۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

”تمہارے دوست عظیم نے عمرہ کا ویزا لگوانے کے لیے میرا پاسپورٹ مانگا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”کیا میں اپنا پاسپورٹ بھی ساتھ لے کر آؤں؟“

وہ اپنی دانست میں جدہ جانے کے لیے تلی بیٹھی تھی اور میرا ارادہ اسے جرمنی بھیجنے کا تھا۔ اس کی جدہ جانے کی خواہش کا سبب یہ تھا کہ اس کے خیال میں، میں وہاں پر ایک ریسٹورنٹ چلاتا تھا اور وہ میرے قریب رہنا چاہتی تھی جبکہ میں اسے جرمنی بھیجنے کا خواہاں اس لیے تھا کہ وہاں پہنچ کر اس کی زندگی بن جاتی۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا پاسپورٹ بھی لے آؤ، پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”تم کب تک آسکتی ہو؟“

”تم بولو تو ابھی آجاتی ہوں۔“ وہ چہک کر بولی۔ ”صرف دس منٹ میں۔“

”اوکے......آجاؤ۔“ میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

اور وہ واقعی دس منٹ میں میرے پاس پہنچ گئی۔

ان دس منٹ کے دوران میں، میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ابھی میں بینا کو اپنی حقیقت سے آگاہ کردوں گا۔ وہ کم عرصے میں میرے بہت قریب آگئی تھی۔ اس پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ بدی کی راہ کو ترک کرکے نیکی کے راستے پر قدم رکھنے کا ارادہ کرچکی تھی۔ نیکی اور سچائی کی راہ بڑی پتھریلی اور پُرخار ہوتی ہے۔ اس ڈگر کے مسافروں کے پاؤں زخم زخم اور خون خون ہوجاتے ہیں۔ بینا مجھ پر اندھا بھروسا کرنے لگی تھی لہٰذا میں کسی قسم کی دروغ گوئی سے اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا تبھی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ بتادوں گا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے اپنا پاسپورٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”علی! یہ تم اپنے دوست عظیم کپور کو دے دینا تاکہ وہ اس پر عمرے کا ویزا لگوادے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کا پاسپورٹ لے کر سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس نے پوچھا۔ ”تم کب تک واپس جدہ چلے جاؤ گے؟“

”دو تین دن کے بعد۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس حساب سے تو تمہارے جانے کے بعد میرا

عمرے کا ویزا لگے گا۔'' اس نے کہا۔ '' جانے سے پہلے تم مجھے اپنا جدہ کا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر وغیرہ دے جانا تاکہ جب میں سعودی عرب جاؤں تو ایک آدھ دن تمہارے ساتھ جدہ میں گزار سکوں۔''

'' تمہارے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں تمہاری جو تاریخِ پیدائش لکھی ہوئی ہے، وہ بالکل درست ہے یا اندازے سے درج کی گئی ہے؟'' میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

'' میری ڈیٹ آف برتھ بالکل درست ہے۔'' اس نے بتایا۔ '' مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ '' مگر تمہارے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں پلیس آف برتھ کراچی پاکستان بتایا گیا ہے جبکہ تم جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوئی تھیں......!''

'' ہاں، حقیقت یہی ہے کہ میں فرینکفرٹ میں پیدا ہوئی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی رسان سے بولی۔ '' جب میں دو سال کی تھی تو میرے والدین پاکستان آ گئے۔ پھر دو سال بعد جب میں لگ بھگ چار سال کی تھی تو میرے والدین میں ناچاقی ہو گئی اور میری ماں ایلس ہمیں پاکستان میں چھوڑ کر واپس جرمنی چلی گئی تھی۔ ابو نے جیسے تیسے میری پرورش کی۔ جب میں اسکول جانے لگی تو ابو نے دستاویزات میں میری تاریخِ پیدائش تو اوریجنل درج کرائی مگر پیدائش کا مقام کراچی، پاکستان لکھوا دیا۔ اس کے بعد سے اسکول کی اسناد، کالج کے سرٹیفکیٹس، شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور دیگر تمام ڈاکیومنٹس پر میرا یہی ڈیٹا درج ہے۔''

'' اوکے......!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ '' کیا تمہارے پاس کوئی ایسا کاغذ موجود ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ تم جرمنی میں پیدا ہوئی تھیں؟''

'' نن...... نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

'' تمہارے ابو اور امی کی کوئی ایسی تصویر جس میں وہ ایک ساتھ نظر آتے ہوں......؟''

'' بالکل نہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر گردن کو نفی میں جنبش دی۔ '' جب امی اور ابو میں شدید نوعیت کے اختلافات ہوئے اس وقت میں بہت چھوٹی تھی پھر امی کے واپس چلے جانے کے بعد ابو نے وہ تمام چیزیں ضائع کر دی تھیں جو کسی نہ کسی حوالے سے امی کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہی میں چند فوٹو البم بھی تھے۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ابو، امی سے سخت ناراض تھے بلکہ اس ناراضی کو اگر نفرت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ابو نے امی اور ان سے وابستہ ہر یاد کا دروازہ بند کر دیا تھا لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

'' لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

'' اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں تمہیں جرمنی میں سیٹل ہونے کا مشورہ دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ '' یہ ایک حقیقت ہے کہ تم جرمنی میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس بنیاد پر تم جرمن ہو۔ میں تمہیں ایک لیٹر لکھ کر دوں گا جس میں یہ تفصیل ہوگی کہ کس طرح تمہارے پاکستانی ابو نے تمہاری جرمن امی سے فرینکفرٹ میں شادی کی پھر جب تم دو سال کی تھیں تو تم لوگ پاکستان آ گئے۔ اس کے بعد تمہارے والدین کی چپقلش کا بیان ہوگا اور تمہاری امی کی جرمنی واپسی کا ذکر کر کے '' کونسلیٹ جنرل آف جرمنی'' سے یہ درخواست کی جائے گی کہ پاکستان کے موجودہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کے پیشِ نظر تم پاکستان کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر جرمنی میں سیٹل ہونا چاہتی ہو لہٰذا تمہیں امیگرینٹ ویزا دیا جائے۔ تم اس لیٹر کو خوب صورت انداز میں ٹائپ کروا لینا پھر دیگر ضروری ڈاکیومنٹس کے ساتھ جرمنی کے امیگرینٹ ویزا کے لیے اپلائی کر دینا۔ ضروری ڈاکیومنٹس کے بارے میں، میں تمہیں گائیڈ کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری موجودہ مالی حیثیت اور جرمنی میں پیدائش کے پس منظر کی بنا پر تمہیں جرمنی کا امیگرینٹ ویزا جاری کر دیا جائے گا یا کم از کم تمہیں وزٹ ویزا تو مل ہی جائے گا۔ جرمنی شینگن ایریا میں شامل ملک ہے۔ اگر تمہیں نان امیگرینٹ یعنی وزٹ ویزا بھی مل گیا تو تم شینگن ایریا میں شامل چھبیس ممالک میں بہ آسانی آ جا سکو گی۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ شینگن یورپی ممالک میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے تمہیں کون سا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ انسان کی جیب میں پیسا ہو اور اسے قانونی راستوں کا علم ہو تو دنیا کے ہر خطے میں ناممکن کام کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔''

اس نے بڑے تحمل اور توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولی۔ '' تم نے جو تفصیل بیان کی اس میں سے بہت سی باتیں مجھے معلوم ہیں لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ جب میں مستقل طور پر جدہ میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں تو تم خوامخواہ مجھے

جرمنی میں سیٹل کرنے کے بارے میں کیوں سوچ رہے ہو؟''

''تم جدہ ہی میں کیوں سیٹل ہونا چاہتی ہو؟'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ ''اس دنیا میں دو سو سے زیادہ ممالک ہیں۔ کوئی اور ملک کیوں نہیں؟''

''سچ سننا چاہتے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''ایک دم سچ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ تم جدہ میں ہو......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''پھر تو تمہیں جدہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''اس لیے کہ میں کبھی جدہ میں نہیں تھا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور آئندہ بھی میرا وہاں سیٹل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اگر تم جدہ سے نہیں تو پھر کہاں سے آئے ہو؟''

''امریکا سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور یہ جھوٹ صرف تم سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں سے بولا گیا ہے۔''

''مگر کیوں......؟'' وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولی۔

''احتیاط کے پیشِ نظر۔'' میں نے کہا۔

''کیسی احتیاط؟'' اس نے پوچھا۔

''ماں کی زندگی کو خطرہ تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''اور میری زندگی کو بھی......''

''علی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کس کی ماں کی زندگی کو خطرہ تھا......؟''

''میری ماں کی زندگی کو۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں جواب دیا۔

''تمہاری ماں......کون ہے؟'' اس نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری میڈم......!''

''میڈم سلمٰی!'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ''علی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، جمشید ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

''سر! آپ کی افطاری ڈائننگ ٹیبل پر لگادوں یا ادھر ہی پہنچادوں؟'' جمشید نے بڑے مؤدب انداز میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ڈائننگ ٹیبل پر۔''

''اوکے سر......!'' وہ یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں روزے سے نہیں تھا لیکن افطاری کی ایک اپنی فضیلت اور اجر و ثواب ہے۔ جمشید کے جانے کے بعد پنا نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا واقعی تم میڈم سلمٰی کے بیٹے ہو؟''

''ہاں، یہی حقیقت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا نام اسد علی ہے۔ میں ایک سال کی عمر میں ماں سے جدا ہوگیا تھا۔ ماں نے مجھے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے امریکا بھجوادیا تھا، وہ دشمن جنہوں نے میری پیدائش سے چھ ماہ پہلے میرے باپ حیدر علی کو قتل کردیا تھا اور مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ انہی خطرناک لوگوں نے میری ماں کی ٹارگٹ کلنگ کرائی ہے۔''

''اوہ......!'' اس کی آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی۔ ''پھر تو تمہاری جان کو بھی شدید خطرہ ہے۔'' اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہاں اور کس کس کو یہ بات معلوم ہے کہ تم میڈم سلمٰی کے بیٹے ہو؟''

''تمہیں میں نے اس راز میں یوں شریک کیا ہے کہ تم میرے لیے مکمل طور پر قابلِ بھروسا ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم میرے راز کو اپنا راز سمجھ کر اس کی حفاظت کروگی۔ باقی دوسرے لوگوں کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''عظیم اور اس کی فیملی کے تمام افراد میرے اپنے ہیں لہٰذا وہ میری حقیقت سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ نادر شاہ ماں کا دیرینہ خیر خواہ ہے۔ نادر شاہ جانتا ہے کہ میں سلمٰی صاحبہ کا اکلوتا بیٹا اسد علی ہوں تاہم ماں نے اسے بھی یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے ایک سال کی عمر میں نہایت رازداری کے ساتھ اپنے ایک محسن جاوید واسطی کے توسط سے مجھے امریکا بھجوادیا تھا اور پچھلے انیس سال سے وہ میری پرورش اور تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھا رہی تھیں۔ نادر شاہ کو یہی بتایا گیا ہے کہ ایک سال کی عمر میں مجھے اغوا

کرلیا گیا تھا پھر مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے میں جدہ پہنچ گیا اور آج کل وہاں ایک ریسٹورنٹ چلا رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ میں سلمٰی صاحبہ کا کوئی عزیز ہوں اور وہ میرے ساتھ عمرہ کرنے جارہی ہیں، وغیرہ وغیرہ......میں نے صحیح معنوں میں امریکا میں آنکھ کھولی تھی اور وہیں کا شہری ہوں۔ ماں کے محسن جاوید واسطی، جاوید واسطی کے نیویارک میں مقیم دوست مرزا عامر بیگ اور بیگ صاحب کے ٹیکساس میں رہائش پذیر دوست علی سلطان کی مہربانیوں کے طفیل میں ایک سال کی عمر سے بیس سال کا ہوگیا ہوں۔ جاوید واسطی، علی سلطان اور ماں اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ مرزا عامر بیگ نیویارک میں موجود ہیں۔ میں پچھلی رات فون پر انہی سے بات کررہا تھا جب تمہیں میرا نمبر بزی مل رہا تھا۔''

''مجھ پر بھروسا کرنے کا شکریہ۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس بات کی مجھے خبر تھی کہ میڈم ہر ماہ کبھی کسی اور کبھی کسی ذریعے سے ایک مخصوص رقم کہیں بھجوایا کرتی تھیں لیکن یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارے اخراجات کے سلسلے کی کوئی کڑی تھی۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''نادر شاہ سے یہ بات کیوں چھپائی گئی کہ تم پچھلے انیس سال سے امریکا میں تھے؟'' اس نے کہا۔ ''جبکہ میڈم سلمٰی شاہ جی پر اتنا بھروسا کرتی ہیں کہ ''ٹرسٹ'' کے سلسلے میں لاکھوں کروڑوں کے انتظامات کے لیے انہوں نے ایک لمحہ نہیں سوچا اور یہاں سے جاتے وقت سب کچھ شاہ جی کے حوالے کرکے جارہی ہیں؟''

''ماں نادر شاہ پر جو اعتماد کرتی تھیں، یہ ماں جی کا اور شاہ جی کا معاملہ ہے اور میں ''سلمٰی حیدر ٹرسٹ'' کے سلسلے میں ماں کی خواہش کے عین مطابق نادر شاہ پر پورا بھروسا کروں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''باقی جہاں تک شاہ جی کو میری امریکا میں موجودگی سے بے خبر رکھنے کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں، یہ ماں کی احتیاط پسندی تھی۔ وہ میرے حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے جو بھی کیا، صحیح کیا۔ شاہ جی کو ماں نے یہی بتا رکھا تھا کہ وہ اپنی لائن کو ترک کرکے ہمیشہ کے لیے دبئی سیٹل ہونے جارہی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں ماں کو اپنے ساتھ امریکا لے کر جارہا تھا۔ میں نے وہاں ماں کی مستقل رہائش کا بندوبست بھی کرلیا تھا لیکن......''

میں نے جذبات کے بوجھ تلے دب کر جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تو گزشتہ روز جانا اسی سلسلے کی کڑی تھی؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کل ماں کا ایمبیسی میں انٹرویو تھا۔ ماں نے انٹرویو کلیئر کرلیا تھا۔ ایمبیسی والوں نے ان کا پاسپورٹ جمع کرکے کل یعنی دس جولائی کی ڈیلیوری کا ٹوکن دے دیا تھا لیکن مالک کو کچھ اور ہی منظور تھا......'' میری آواز بوجھل ہوگئی۔ ''قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں!''

''میڈم سلمٰی کی ناگہانی موت کا مجھے بہت صدمہ تھا لیکن جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ میڈم تمہاری ماں تھیں تو اس صدمے میں کئی......گنا اضافہ ہوگیا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں بولی۔ ''علی! میں نہیں جانتی، ہمارے بیچ کون سا رشتہ قائم ہوچکا ہے لیکن میں تمہاری پریشانی محسوس کررہی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی شقی القلب انسان نے میری سگی ماں کو ٹارگٹ کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو......!''

بولتے بولتے اس کی آواز بھیگ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ہمارے بیچ دوستی، خلوص، اپنایت اور اعتبار کا رشتہ استوار ہوچکا ہے۔ میری نگاہ میں تمہارا تن اجلا اور من پاکیزہ ہے۔ تم اندر باہر سے ایک صاف اور شفاف انسان ہو اسی لیے تم نے بدی کے راستے کو ٹھوکر مار کر نیکی کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہارا یہ فیصلہ میری نظر میں لائقِ صد تحسین ہے۔ تمہارے اس صادق جذبے سے متاثر ہوکر ہی میں تمہارے قریب ہوا ہوں اور تم پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہوں۔''

''یہ اعتماد اور قرب ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہیے۔'' وہ امید بھرے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آس کے دیے روشن تھے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ توقعات باندھ بیٹھی تھی۔ میں اسے کوئی جھوٹی امید دلانا چاہتا تھا اور نہ ہی اس کا دل توڑنے کا کوئی ارادہ تھا لہٰذا میں نے مصلحت آمیز صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا وعدہ ہے کہ تم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوگی، میں ہمیشہ تم پر اعتماد کروں گا لیکن دائمی قرب کے سلسلے میں، میں حالات کے سامنے مجبور ہوں۔ وقت نے میرے پاؤں میں طوفانی بگولے باندھ رکھے ہیں۔ جس طرح وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا، اسی طرح وقت کبھی کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں، بعینہٖ میرے پاؤں میں بھی ایسا چکر ہے کہ وقت کی ہر

نئی کروٹ مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے......!''

''تم بہت گہرے انسان ہو۔'' وہ اپنی مقناطیسی آنکھوں کے پیمانے سے میری گہرائی ناپنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے......''

میں نے گول مول جواب دیا۔ ''میں تو بس ایسا ہی ہوں بینا۔''

''جس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا، وہ کسی دوسرے کے بس میں ہوتا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''علی! تم کس کے بس میں ہو؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے جان چھڑانے والا جواب دیا۔

اس نے پوچھا۔ ''کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی؟''

''نہیں......!'' میں نے نفی میں گردن ہلادی۔

''کیوں؟''

''میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''مگر میں اشد ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے سچے دوست اور خیر خواہ ہو۔ میں ہر قیمت پر یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا دوست کس کے بس میں ہے لیکن اس کام کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہوگا۔''

''کیسا تعاون؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں اپنی زندگی کی کہانی تمہیں سنا چکی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اب میں تمہاری زندگی کی کہانی سننا چاہتی ہوں تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ تم کس کے بس میں ہو......!''

''میں اپنے مالک کے بس میں ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہی میری تقدیر کا قلم کار ہے۔''

''ہر انسان کا کاتبِ تقدیر وہی مالک ہے جو ہم سب کا خالق اور پروردگار ہے۔'' وہ بڑی کھوجنے والی نگاہ سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''میرا اشارہ کسی انسان کی طرف تھا...... خصوصاً کسی حسینہ کی طرف!''

''میں ابھی تک زندگی کے کسی ایسے مقام سے نہیں گزرا ہوں کہ محسوس ہو، میں کسی حسینہ کے بس میں ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آگے کی مالک جانتا ہے......!''

''مریض کا کام اپنی تکلیف بیان کرنے تک محدود ہوتا ہے۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''مرض کی تشخیص کرنا اور علاج کے لیے ادویہ تجویز کرنا ڈاکٹر کے فرائض کا حصہ ہے۔ تم صرف مجھے اپنی کہانی سناؤ گے۔ یہ فیصلہ میں کروں گی کہ تم کس کے بس میں ہو اور کون کون تمہارے بس میں ہے......'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال رہی ہوں۔ تم اپنی مرضی کا استعمال کرنے کے لیے آزاد ہو۔ میں ایک مخلص دوست ہونے کے ناتے تمہاری اسٹوری سننا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں یہ پسند نہ ہو تو تم ویٹو بھی کر سکتے ہو۔''

''ویٹو کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش۔'' میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنی زندگی کی داستان ضرور سناؤں گا لیکن افطار کے بعد۔ روزہ کھلنے میں چند منٹ باقی ہیں۔''

''بالکل... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

اسی وقت جمشید نے آکر اطلاع دی۔ ''سر! افطاری لگادی ہے۔''

''شکریہ!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''تم اور بنگالی بابو کہاں افطاری کرو گے؟''

''میرے کوارٹر میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''او کے، ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

میں اور بینا ڈرائنگ روم سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔ افطاری کے نام پر اچھے خاصے ڈنر کا اہتمام کردیا گیا تھا۔ میں نے بھری ہوئی ڈائننگ ٹیبل کو دیکھ کر کہا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ اس افطاری کے بعد ہمیں ڈنر کے لیے باہر کہیں جانے کی ضرورت پیش آئے۔''

''ڈائننگ ٹیبل اگر اتنی رچ نہ بھی ہوتی تو میں باہر جانے کا ارادہ کینسل کرچکی تھی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''اس کینسلیشن کے تین اسباب ہیں۔'' وہ پُراسرار انداز میں بولی۔

میری الجھن میں حیرت بھی شامل ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کون سے تین اسباب؟''

''نمبر ایک...... میڈم سلمیٰ کو جس طرح ٹارگٹ کرکے ہلاک کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں بنگلے سے باہر تمہاری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''نمبر دو...... میں تمہاری زندگی کی کہانی اسی بنگلے کے کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر پوری توجہ سے سننا چاہتی ہوں۔ نمبر تین...... تم نے مجھ پر سدا اعتماد کرنے کی گارنٹی تو دی ہے لیکن دائمی قرب کو انشور نہیں کیا لہٰذا......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ

کر چند لمحات تک بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھتی رہی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''لہٰذا تمہاری قربت میں جو بھی وقت گزر جائے، وہ میری زندگی کا سرمایہ ہوگا۔ وقت کا کیا بھروسا...... آج یہاں، کل کہاں......!''

بینا زندگی کی حقیقت بیان کر رہی تھی لہٰذا میں نے اس کے بیان پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ افطار سے قبل میں نے ماں کے لیے خصوصی دعا کی کہ مالک ان کی جیون بھر کی خطاؤں کو معاف فرمائے اور ان کی اگلی منازل کو آسان کرکے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

افطار کے نام پر ایک بھرپور ڈنر کرنے کے بعد ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ جمشید نے ہمارے لیے چائے کافی کا ادھر ہی بندوبست کردیا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں، میں نے بینا کو اپنی زندگی کی کہانی سنادی۔ وہ میری ایک مخلص دوست تھی اور میں نے بڑے واضح انداز میں یہ محسوس کرلیا تھا کہ وہ مجھ سے دل لگا بیٹھی ہے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں البتہ ڈیلفینا اور سیکرٹ سوسائٹی کے حوالے سے میں نے بہت کم معلومات اس تک پہنچائیں۔ اس نے اس سلسلے میں مجھے زیادہ کریدا بھی نہیں۔ جب میں اپنی کہہ چکا تو وہ گمبھیر انداز میں بولی۔

''اب تک تمہاری زندگی تو بہت صاف ستھری اور سیدھی سادی گزری ہے ورنہ امریکی معاشرے میں پل کر کوئی لڑکا بیس سال کا ہوجائے اور اس کی بیس گرل فرینڈز بھی نہ ہوں تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی!''

''امریکی معاشرے کو سمجھنے میں لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''امریکی معاشرہ ایک آزاد اور خودمختار معاشرہ ہے۔ کوئی آپ کو گن پوائنٹ پر یہ حکم نہیں دیتا کہ آپ کی کم از کم اتنے درجن گرل فرینڈز یا بوائے فرینڈز ہونا چاہئیں، نہ ہی ایسی کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے کہ آپ کو لڑکی یا لڑکے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا۔ آپ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔ بس، ہر لمحے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ آپ کے کسی عمل سے کسی دوسرے انسان کی زندگی ڈسٹرب نہ ہو۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا قانون ہے۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔

دیوار گیر کلاک نے دس بجنے کا اعلان کیا تو میں نے کہا۔ ''بینا! تم کافی دیر سے آئی ہوئی ہو۔ کیا وہاں تمہاری عدم موجودگی کو محسوس نہیں کیا جا رہا ہوگا؟''

''میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ یا مجبوری نہیں ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''میں جب بھی واپس جاؤں، مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا کیونکہ میں بتا کر آئی ہوں کہ میں بعض ضروری معاملات نمٹانے میڈم کے بنگلے پر جا رہی ہوں۔ وہاں سب کو یہی پتا ہے کہ تم نے مجھے بلایا ہے۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو پھر تم آرام کرو۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے چہرے سے تھکاوٹ جھلک رہی ہے۔'' وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھی، شاید تمہیں نیند آرہی ہے......!''

''میں اپنے سر میں درد محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ موجودہ حالات کا پریشر ہے۔''

''تم جن حالات سے گزر رہے ہو اس میں غنیمت ہے کہ تمہیں صرف دردِ سر سے ہی واسطہ ہے۔'' وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔ ''اگر تم کہو تو میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں!''

''تمہاری پیشکش خاصی خطرناک ہے۔'' میں نے معنی خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کوئی اینل جیسک لوں گا تو ٹھیک ہوجاؤں گا۔''

''اینل جیسک یا پین کلر ٹیبلٹ لینے سے یقیناً تمہارے سر کا درد جاتا رہے گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں جان سکتی ہوں کہ میری پیشکش میں تمہیں کون سی خطرناکی نظر آئی ہے؟''

''بھئی! یہ دبانے والی پریکٹس کا کوئی بھروسا نہیں۔'' میں نے مصنوعی سراسیمگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کل کلاں اگر میرے گلے میں درد ہوا تو تم فوراً میرا گلا دبانے کی آفر کردو گی......!''

''ہاہاہا......!'' وہ دل آویز انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اب میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں۔''

''پھر تم کتنی ظالم ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''دوستوں کو گلے لگا کر گلے دور کیے جاتے ہیں۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''ان کا گلا نہیں دبایا جاتا......!''

''مجھے کیا معلوم؟'' میرے لہجے میں شرارت مترشح تھی۔

''تو معلوم کرلو......!''

"کیسے؟"
"ٹیسٹ کیس کے طور پر اپنا سر دبوا کر دیکھ لو۔" وہ خمار بھرے لہجے میں بولی۔ "اگر درد بھاگ گیا تو پھر گلے لگ کر گلے دور کر لینا اور..... ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف دشمنوں کا گلا دباتی ہوں۔"
"اوکے۔ تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "یہاں ڈرائنگ روم میں فزیوتھراپی کلینک کھولنا مناسب نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ آجاؤ.....“
وہ میری تقلید میں بیڈروم کی جانب قدم اٹھانے لگی۔
ٹھیک دو منٹ کے بعد میں اس کے "زیر علاج" تھا۔ میں بیڈ پر دراز تھا اور وہ میرے قریب ایک کرسی پر براجمان تھی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بڑے ماہرانہ انداز میں میری پیشانی پر محوحرکت تھیں۔ اس کی پوروں کی جنبشوں میں بلا کی جادوگری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی انگلیوں کی مدد سے میرے سر میں سے درد کو کشید کر رہی ہو۔ وہ کسی ایکسپرٹ مساجر کے انداز میں میری پیشانی کو ٹریٹ کر کے مجھے درد سے نجات دلانے میں مصروف تھی۔
رفتہ رفتہ میری تکلیف میں کمی واقع ہونے لگی تو میں نے کہا۔ "تم نے یہ فن کہاں سے سیکھا ہے؟"
"کون سا فن؟" وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔
اس کی گرم سانسیں مجھے اپنی پیشانی پر محسوس ہوئیں۔ ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بینا کی سانسوں کی حرارت نے میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے میں نے جواب دیا۔
"درد کو بھگانے کا فن..... کیا تم فزیوتھراپسٹ ہو؟"
اس نے فزیوتھراپی والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا شارو کو یہ فن نہیں آتا؟"
میں نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔ بینا نے بات ہی ایسی کی تھی۔ اس نے بڑے حاسدانہ انداز میں شارو کا تذکرہ کیا تھا۔ میری زندگی کی داستان میں ڈیلفینا، شارو، ایما ایپل بام اور لفی کا ذکر آیا تھا لیکن اس کا فوکس صرف شارو پر تھا، باقی تین کو اس نے توجہ کے قابل نہیں جانا تھا۔ میں نفسیات کا اسٹوڈنٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ ان معاملات میں عورت کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور اس کے محسوسات کبھی غلطی نہیں کرتے۔ بینا نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ میرا دھیان شارو میں اٹکا ہوا ہے.....!
"شارو یہاں کیسے آگئی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
اس نے ہاتھ روک دیے اور بڑی معصومیت سے بولی۔ "کیا شارو کہیں گئی ہوئی تھی؟"
"مم..... میرا مطلب یہ تھا کہ میں تمہارے ماہرانہ فن کی بات کر رہا تھا۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "کہ تم نے درد کو بھگانے کا یہ طریقہ کہاں سے سیکھا اور تم پتا نہیں، بات کو کہاں سے کہاں لے گئی ہو؟"
"بڑی زور کی لگی ہے نا.....!" وہ شاکی لہجے میں بولی۔
"ارے..... ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ شارو سے میری دوستی ہے..... بس!"
"میں نے کب کہا کہ شارو تمہاری دشمن ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "میں نے تمہارا ری ایکشن دیکھنے کے لیے شارو کا نام لیا تھا اور میرا اندازہ درست نکلا.....!"
میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ میرے روبرو تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے میرے بارے میں کون سا اندازہ قائم کر لیا ہے بھئی؟"
"تھوڑی دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ میں پتا چلا لوں گی کہ تم کس کے بس میں ہو۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "اور دیکھو میں نے پتا چلا لیا.....!"
"کیا پتا چلا لیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔
وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ "کہ تم..... شارو کے بس میں ہو۔"
"میں کسی کے بس میں نہیں ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شارو میری دوست ہے جیسا کہ تم میری دوست ہو اور اس وقت تم شارو کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب ہو۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ میری قربت میں گزرنے والا ایک ایک لمحہ تمہاری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے..... تو آؤ، میرے قرب کو سمیٹ لو، اپنے قیمتی سرمائے میں ملٹی پل اضافہ کر لو.....“ بات کے اختتام پر میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔
بینا نے خوش دلی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کمرے کے حیات آفریں ماحول میں کسی پکے ہوئے سیب کے مانند شاخ سے ٹوٹ کر میرے اوپر آن گری۔ میں کوئی آئزک نیوٹن نہیں تھا کہ "سیب کے گرنے" کو لے کر غوروفکر میں لگ جاتا اور کششِ ثقل کو دریافت کر ڈالتا۔ مجھے تو نیوٹن کی تحقیق

کے طفیل کششِ ثقل کا قانون بنا بنایا مل گیا تھا۔ اب تو مجھے صرف اس قانون کا استعمال کرنا تھا اور اس "استعمال" سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔
"تم مجھے قریب بھی کہتے ہو اور مجھے جرمنی دھکیلنے کی کوشش میں بھی لگے ہوئے ہو۔" وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ شکایتی لہجے میں بولی۔
عورت کی یہ فطری خوبی ہے کہ وہ چاہے کتنے بھی ریلیکس ماحول میں ہو، شکوہ کرنا نہیں بھولتی۔ ان نشاط انگیز لمحات میں بینا بھی شکایت کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کے شہد رنگ بالوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔
"میں یہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے سوچ رہا ہوں۔ جرمنی اس وقت بہشت ارضی کی مثال ہے۔ اگر تم وہاں سیٹ ہو گئیں تو تمہاری زندگی بن جائے گی۔"
"عورت کی جنت تو اس کے مرد کی قربت میں ہوتی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ "ملک کوئی بھی ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہ میرے مستقل ساتھ کی خواہاں تھی اور اس حوالے سے اس کی سوچ کافی دور نکل گئی تھی۔ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔
"کون کس کے ساتھ کہاں رہے گا، اس کا فیصلہ تو وقت نے کرنا ہوتا ہے.....!"
میرے اس جملے پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی پراسرار خاموشی پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔
"کیا ہوا..... تم چپ کیوں ہو؟"
"کچھ نہیں۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔
میں نے پوچھا۔ "ناراض ہو؟"
"تم سے ناراض ہونے کا مجھے کیا حق ہے۔"
"حق کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم میری دوست ہو۔ روٹھنے اور مان جانے کا ہر حق تمہیں حاصل ہے۔"
اس کی طرف ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔
میں نے دریافت کیا۔ "اب کیا ہو گیا؟"
"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔
معاشرتی جراح کا ٹائٹل حاصل کرنے والے قلم کار سعادت حسن کے چند الفاظ میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ منٹو لکھتا ہے..... جب عورت کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تو اسے نیند آنے لگتی ہے اور جب مرد کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ عورت کو چومنے لگتا ہے۔ میں بھی اس عظیم قلم کار کے فرمان کو خراج تحسین پیش کرنے میں مصروف ہو گیا۔
وقت سود و زیاں کے مفہوم سے ناآشنا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں بلا روک ٹوک شناسائی کی منزلوں سے گزرنے لگے۔ بینا کسی منہ زور آندھی کے مانند مجھے اڑائے لیے جا رہی تھی اور میں اس کے تلاطم خیز تھپیڑوں کو سہنے کا فریضہ نبھا رہا تھا۔ سانسوں کی حدت اور جذبات کی شدت اس سفر کے ہر موڑ پر ہمیں کیف و سرور کے ایک نئے جہاں کی سیر کرا رہی تھی اور ہم کسی بھی جہاں سے سرسری نہیں گزر رہے تھے ورنہ شاعر کو شکایت ہوتی کہ..... سرسری تم جہان سے گزرے۔ ورنہ ہر جہاں، جہانِ دیگر تھا!

☆☆☆

دس جولائی کی صبح بڑی نشاط انگیز اور فرحت آفریں تھی۔ بینا رخصت ہو گئی تھی لیکن اس کا نشہ ابھی تک میرے اعصاب اور حواس پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اس نشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شاور لیا اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ آج مجھے بہت سے کام نمٹانا تھے اور میں اس تگ و دو کے لیے ایک دم ترو تازہ تھا۔ لوگ اپنے غم کو بھلانے کے لیے مختلف قسم کے نشوں کا سہارا لیتے ہیں لیکن یہ سب سہارے وقتی اور عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ کسی ٹوٹے ہوئے انسان کے لیے عورت کی خودسپردگی والے قرب سے بڑھ کر اور کوئی سہارا ہو نہیں سکتا۔
گیارہ بجے کے قریب عظیم میرے پاس آگیا۔ وہ اپنے ساتھ پولیس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے جاری ایک رپورٹ بھی لایا تھا۔ یہ رپورٹ اس نے اپنے کزن ارباب کی مدد سے حاصل کی تھی جس کو پیش کر کے مجھے امریکن ایکسپریس سے ماں کا پاسپورٹ اٹھانا تھا۔ اس کے علاوہ عظیم نے مجھے ایک پھولا ہوا لفافہ بھی دیا۔
میں نے بھورے رنگ کا وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ مذکورہ لفافے کے اندر امریکی کرنسی یو ایس ڈی بھری ہوئی تھی۔ تمام سو ڈالر والے کرنسی نوٹ تھے۔
"یہ شیخ صاحب نے دیے ہیں۔" عظیم نے بتایا۔ "تم نے کہا تھا نا کہ جیولری کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو اسے یو ایس ڈی کی شکل میں تمہیں دیا جائے۔"
"تھینک یو سو مچ یار۔" میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ "تمہارے انکل نے تو میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔"
وہ خوش دلی سے بولا۔ "ہمارے ساتھ رہو گے تو یونہی

عیش کرو گے۔''

میں نے پوچھا۔''آج شام میں جی ایم سر کی طرف چلنا ہے نا؟''

''بالکل چلنا ہے۔''وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''جی ایم صاحب شام میں سات سے نو بجے تک فری ہوتے ہیں۔ آئی بی (الہامی بابا) نے کہا ہے کہ ہم آٹھ بجے ان کے پاس پہنچیں گے تاکہ وہ افطار کے معاملات سے نمٹ جائیں اور سکون سے ان کے ساتھ بات چیت ہوسکے۔ تم بالکل ریڈی رہنا۔ میں تمہیں پک کرلوں گا۔''

''تم افطار نہیں کرو گے؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''آج میرا روزہ نہیں ہے۔''اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔''میرا بھی نہیں ہے۔''

میں عظیم کی معیت میں تھوڑی دیر کے بعد پاسپورٹ کے لیے روانہ ہوگیا۔ امریکن ایکسپریس والوں کو میں نے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اپنی بات کی تصدیق کے لیے میں نے پولیس کی جاری کردہ رپورٹ بھی پیش کردی۔ میں نے بڑے واضح الفاظ میں انہیں بتایا کہ سلمٰی صاحبہ میرے ساتھ امریکا جارہی تھیں۔

انہوں نے میری بات توجہ سے سنی اور کہا۔''ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ فوری طور پر سلمٰی صاحبہ کا پاسپورٹ آپ کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ میڈم ایکسپائر ہوگئی ہیں لہٰذا ہمیں یہ ویزا کینسل کرنا ہوگا۔ آپ کل کسی وقت بھی تشریف لائیں اور ٹوکن دکھا کر سلمٰی صاحبہ کا پاسپورٹ وصول کرلیں۔''

ہم امریکن ایکسپریس سے باہر آگئے۔ عظیم نے کہا۔

''یہ امریکی بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔''

''انہوں نے اصول کی بات کی ہے۔''میں نے کہا۔''ہوشیاری کہاں سے آگئی؟''

''ہوشیاری یہ ہے کہ وہ پاکستانیوں کے ٹیلنٹ سے خوفزدہ ہیں۔''وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔''انہیں ڈر ہے کہ آنٹی سلمٰی کا ویزا لگا پاسپورٹ کہیں اور استعمال نہ ہوجائے یعنی کوئی اور خاتون سلمٰی بن کر امریکا نہ پہنچ جائے......''

''یہ کیسے ممکن ہے یار۔''میں نے سرسری انداز میں کہا۔''ماں کے فنگر پرنٹس اور ریٹینا اسکیننگ ہوئی ہے۔ کسی اور خاتون کا بایومیٹرک ٹیسٹ اور ریٹینا اسکیننگ آپس میں میچ کیسے کرسکتے ہیں......!''

''میچ نہیں کرسکتے، یہ بات مجھے معلوم ہے۔''وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''مگر امریکی کونسلیٹ پاکستانیوں کو ہلکا نہیں لیتی۔ یہ قوم کسی وقت کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

''مثبت انداز میں سوچنے کی عادت کو اپناؤ۔''میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''میں نے پاکستان میں اکثر لوگوں کو اپنی قوم اور اپنے ملک کا تمسخر اڑاتے دیکھا ہے۔ ہر شخص کو اس ملک اور اس قوم میں کوئی نہ کوئی خرابی نظر آجاتی ہے جبکہ امریکا میں کہیں بھی یہ رجحان دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ امریکا میں لاکھ برائیاں ہوں گی لیکن امریکی شہری اپنے ملک اور قوم کے لیے کبھی کوئی چیپ ریمارکس نہیں دیتے۔ یاد رکھو......''لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی ملک اس کے اندر بسنے والی قوم کا سفیر ہوتا ہے اور قوم انسانوں کے مجموعے سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ تو انسانوں کا فرض ہے کہ وہ نیک اور ایک ہوجائیں تاکہ اس عمل سے ایک صحت مند اور قابلِ فخر قوم وجود میں آسکے جس کے کردار سے دنیا بھر میں ملک کا نام روشن ہو۔''

''برو! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔''وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔''ہمیں اپنی قوم اور اپنے ملک کو تنقید کا نشانہ بنانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے۔''

''میں نے ایک جنرل فارمولا بیان کیا ہے بھائی جان۔''میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انسان خود کو پرفیکٹ سمجھنے لگے اور ساری خرابیاں اسے دوسروں میں دکھائی دیں۔ اس مرض کی علامات مجھے پاکستانی قوم میں بھی نظر آئی ہیں مگر اس رجحان نے ابھی زور نہیں پکڑا۔ یوں سمجھو کہ ابھی وقت ہاتھ سے نکلا نہیں ہے۔ صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار افراد کی جانب دیکھنے کے بجائے ہر پاکستانی کو اپنے اعمال اور اپنے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔''

باقی کے راستے میں وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے اسے سوچنے کے لیے اتنا کچھ دے دیا تھا کہ وہ بولنا بھول گیا تھا۔ اس نے مجھے ماں کے بنگلے پر ڈراپ کیا اور شام میں دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہوگیا۔ میں بنگلے میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بجے تھے اور میں اس وقت جی ایم سر کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے مختلف راہ داریوں سے گزرنا پڑا تھا۔ مذکورہ بلڈنگ کے تین فلور چینل کے تصرف میں تھے۔ لائیو ٹرانسمیشن کے تمام اسٹوڈیوز اور مختلف شوز کے سیٹ فرسٹ فلور پر لگے ہوئے تھے۔ جی ایم سر کا کمرا پی سی آر (پروڈکشن کنٹرول روم) کے ساتھ بنا ہوا

تھا۔ لائیو ٹرانسمیشن کے دوران میں وہ پی سی آر کے اندر موجود رہتے تھے۔ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر ایم سی آر (ماسٹر کنٹرول روم) کا ڈیپارٹمنٹ تھا جہاں سے پروگرام آن ائر کیا جاتا تھا۔ بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر چینل کے اعلیٰ عہدے دار اور دیگر دفتری عملہ بیٹھتا تھا۔ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ بھی اسی فلور پر واقع تھا۔

جی ایم سر بڑے تپاک سے ملے تھے۔ ان کی عمر چالیس پلس تھی۔ وہ متناسب بدن والے ایک درمیانہ قامت انسان تھے۔ ان کا سر بڑا، آنکھیں روشن اور چہرے پر ملکوتی تازگی پائی جاتی تھی۔ وہ سادہ طبیعت کے انسان تھے مگر بات بڑی گہری کرتی تھے۔ مقبول صاحب مجھے جی ایم سر کے پاس چھوڑ کر اوپر کسی سے ملنے چلے گئے تھے اور عظیم باہر گاڑی میں بیٹھا تھا کیونکہ راستے میں مقبول صاحب نے واضح کردیا تھے کہ جی ایم سر مجھ سے ون ٹو ون ملاقات کریں گے۔

جی ایم سر نے چائے بسکٹ سے میری تواضع کی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے بیچ باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوگیا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے تپتے صحرا میں آبلہ پا چلتے چلتے اچانک میں کسی نخلستان میں آگیا ہوں۔ جی ایم سر کی شخصیت میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔

''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔''وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔

میں بول پڑا۔''سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وقت بہت کم ہے اور باتیں بہت زیادہ۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی اہم بات رہ نہ جائے۔''وہ ٹھہرے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولے۔''اس لیے ضروری ہے کہ آپ میری باتوں کو توجہ سے سنیں۔ کچھ پتا نہیں، کس وقت کون کس کام سے آدھمکے۔ میں کسی کو منع نہیں کرسکتا۔''

''جی سر فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔''میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسد صاحب! میں نے آپ کو اگر ایک عظیم انسان کہا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں، قدرت نے آپ کو کسی خاص مقصد کے لیے چن لیا ہے اسی لیے آپ کا ٹکراؤ دنیا کے طاقتور ترین لوگوں سے ہے۔ ایسے افراد خود کو زمینی خدا سمجھتے ہیں۔ اگر مالک نے ان بااثر افراد سے نمٹنے کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ایک عظیم انسان ہیں اس لیے آپ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنا موقوف کردیں۔ جب قدرت آپ کی پشت پر ہے تو پھر آپ کو دوسروں تیسروں کے سہارے کی کیا ضرورت ہے!''

وہ اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہہ گئے تھے۔ ان کا پہلا اشارہ یہودیوں کی سیکریٹ سوسائٹی''اسکل اینڈ بونز''کی جانب تھا۔ اس سوسائٹی کے بینر تلے ربی آئزک، ڈیلفینا، ایپل بام وغیرہ آتے تھے۔ دوسرا اشارہ عظیم اینڈ کمپنی کی طرف تھا۔ میں جب سے پاکستان میں تھا، بلاواسطہ یا بالواسطہ ان لوگوں سے مدد لے رہا تھا۔ جی ایم سر کی باتوں میں بڑی گہرائی تھی۔

''آپ نے میرے بارے میں مقبول صاحب سے کہا تھا کہ میں جس عورت کو امریکا سے اپنے پیچھے لگا کر یہاں آیا ہوں اس عورت سے آپ ہی مجھے نجات دلا سکتے ہیں۔''میں نے ان کی ذہانت بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔''آپ اس عورت کو کس طرح جانتے ہیں؟''

''پہلے آپ یہ بتائیں، کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟''انہوں نے الٹا مجھ ہی سے سوال کرڈالا۔

''میں آپ کو غلط نہیں کہہ رہا سر۔''میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''دراصل بات یہ ہے کہ ادھر امریکا میں ایک بااثر عورت ڈیلفینا میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ میں اس کی سوسائٹی جوائن کرلوں۔ میں نہیں جانتا کہ ڈیلفینا اس وقت کہاں ہے۔ کیا آپ کا اشارہ اسی عورت کی جانب ہے؟''

''ہاں! میں اسی کی بات کررہا ہوں۔''وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔''وہ اس وقت اسلام آباد میں ہے۔ آج رات کسی وقت وہ کراچی پہنچ جائے گی۔ اب یہ اس کے موڈ پر منحصر ہے کہ وہ رات ہی کے کسی پہر تمہاری طرف رخ کرے یا اس کام کو کل کے لیے چھوڑ دے۔''

''لیکن یہ جو آپ نے کہا کہ آپ مجھے ڈیلفینا کے شر سے محفوظ رکھیں گے تو اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟''میں نے پوچھا۔''یہ سب کس طرح ممکن ہوسکے گا؟ کیا اس سلسلے میں مجھے بار بار آپ سے ملنا پڑے گا؟ میں نے تو واپس امریکا جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ایک دو دن میں، میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔''

''شاید تم ایسا نہیں کرسکو گے......''ان کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔''کوئی اپ سیٹ ہوجائے گا۔ کیا؟ یہ میں نہیں جانتا...... آپ کو بار بار مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ باقی جہاں تک آپ کو اس عورت سے بچانے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں

آپ کو چند نصیحتیں ہی کرسکتا ہوں.....'' انہوں نے لمحاتی توقف کرکے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات تو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑ گیا ہے، وہ اس کرۂ ارض کے بااثر اور طاقتور ترین افراد ہیں۔ آپ کو قدرت نے اس مشن کے لیے چنا ہے تو مالک کی مدد بھی آپ کی پشت پر ہوگی لہٰذا گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوسروں پر انحصار کرنا چھوڑ دیں، صرف اپنے بازو کی قوت پر بھروسا کریں۔ مال، دولت اور جائداد والے معاملات سے خود کو دور رکھنے کی کوشش کریں۔ مالک کے کرم سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

جی ایم صاحب نے ایک اور اہم اشارہ دے دیا تھا کہ مجھے ماں کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور مالی امور سے دور رہنا تھا۔ میں ان سے اور ان کی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ میں نے نہایت ہی ادب سے پوچھ لیا۔

''سر! آپ ان طاقتور لوگوں کو کیسے جانتے ہیں؟ کیا کبھی اس سیٹ اپ کے کسی بندے سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟''

''میری کبھی کسی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ اٹلانٹک اوشین یعنی بحرِ اوقیانوس کے گہرے پانیوں میں، ایک آب دوز کے اندر ان لوگوں نے اپنی ریسرچ لیبارٹری قائم کر رکھی ہے جہاں یہ مختلف نوعیت کے خطرناک تجربات کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے آب دوز کے باہر حساس ترین جیمرز کا ایسا انتظام قائم کر رکھا ہے کہ کسی بھی قسم کے سگنلز وہاں پہنچ کر آب دوز کے اندر کا احوال معلوم نہیں کرسکتے۔''

''سر! برمودا ٹرائی اینگل بھی تو اٹلانٹک اوشین ہی میں ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جس کی مسٹری کے بارے میں ابھی تک انسانی ریسرچ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی۔''

''میں نے جس آب دوز کا ذکر کیا ہے، وہ برمودا ٹرائی اینگل کے بہت قریب ہے۔'' وہ بڑی رسان سے بولے۔ ''برمودا ٹرائی اینگل کی پراسراریت میں بھی کافی حد تک انہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کی خفیہ ریسرچ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی لیے انہوں نے تمام تر حفاظتی انتظامات کے ساتھ ساتھ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے بعض خطرناک افواہیں بھی پھیلا رکھی ہیں۔''

''سر! ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟''

''میں نہ تو انٹرنیٹ استعمال کرتا ہوں اور نہ ہی اس نوعیت کا کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''میری معلومات کا واحد ذریعہ ریڈیو انڈیکس ہے۔''

''ریڈیو انڈیکس!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں سر؟''

''اس دنیا میں جتنے بھی انسان موجود ہیں ان میں سے ہر شخص کا ایک مخصوص ریڈیو انڈیکس ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی فریکوئنسی ''آر ڈی'' ہوتی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''جس طرح ریڈیو کی براڈ کاسٹنگ کے پروسس میں بیٹا، الفا، تھیٹا اور ڈیلٹا ویوز شارٹ ویوز، میڈیم ویوز اور لانگ ویوز کی شکل میں سفر کرتے ہوئے مختلف میٹر بینڈز پر کام کرتی ہیں اور آواز کی لہروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دیتی ہیں، بالکل اسی طرح اگر آپ کو کسی شخص کا ریڈیو انڈیکس معلوم ہو تو آپ اس کے بارے میں گہری خبر رکھ سکتے ہیں۔''

''یہ تو بالکل ٹیلی پیتھی جیسا پروسس ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔ یہ ٹیلی پیتھی سے خاصا مختلف ہے۔'' وہ صحیح کرنے والے انداز میں بولے۔ ''ٹیلی پیتھی میں باقاعدہ مینٹل کمیونی کیشن کی جاتی ہے جبکہ ریڈیو انڈیکس کی مدد سے آپ محض معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے جی ایم سر کی جانب دیکھا۔

''اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انسان عموماً سمجھ کے معاملات میں دھوکا کھا جاتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولے۔ ''وہ جس کو بڑا سمجھ رہا ہوتا ہے وہ بعد میں چھوٹا نکلتا ہے اور جس کو وہ چھوٹا سمجھ رہا ہوتا ہے، بعدازاں وہ بڑا ثابت ہوجاتا ہے جیسا کہ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے سر؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''تم جس کو سینئر اور شرف یافتہ سمجھ رہے ہو، وہ اس سے کہیں جونیئر ہے جس پروفیسر کو تم جونیئر سمجھ رہے ہو۔''

انہوں نے بات کافی گھما کر کی تھی لیکن میں ان کے الفاظ کی گہرائی میں پہنچ گیا تھا۔ وہ مجھے یہ بتانا چاہ رہے تھے

کہ فلاسفی کی پروفیسر ایما ایپل بام سیکرٹ سوسائٹی میں ڈیلفینا سے زیادہ بلند مرتبے پر فائز تھی۔

''میں سمجھ گیا سر۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟''

''دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے۔''

''زبردست!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اسد علی!'' وہ مجھے میرے پورے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''زندگی میں جب بھی آپ کو کوئی اہم معاملہ درپیش ہو تو آپ دل سے مشورہ کرنا، دماغ سے نہیں۔ کیونکہ دل کے فیصلے سے زندگی خوش حال ہے اور دماغ کا فیصلہ مکڑی کا جال ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔

اسی لمحے ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بڑی محبت سے پہلے جی ایم سر سے اور پھر مجھ سے مصافحہ کیا پھر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سر! سائرہ کی شادی ہوگئی۔ آپ نے اس کے لیے جو سونا تیار کیا تھا وہ بہت کام آیا۔ اگر اس کے لیے زیورات تیار نہ کیے جاتے تو اس بے چاری کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔''

میرے کان کھڑے ہوگئے اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''سر! کیا آپ کیمیاگری بھی کرتے ہیں؟''

''کسی انتہائی مجبور اور لاچار انسان کی مدد کرنے کے لیے میں کبھی کبھار یہ کام کرلیتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''پیسا کمانے اور امیر بننے کے لیے نہیں۔'' پھر وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا تعارف کراتے ہوئے بولے۔ ''یہ اظہر جوکھیو ہیں۔ اظہر ڈراما سائڈ پر ہوتے ہیں۔ یہ رائٹر بھی ہیں اور اسکرپٹ ایڈیٹر بھی اور..... اس سب سے بڑھ کر اظہر جوکھیو ایک اچھے انسان ہیں۔''

''آپ کی مہربانی ہے سائیں۔'' اظہر جوکھیو تشکرانہ انداز میں جی ایم سر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ورنہ مجھ میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''انسان کی سب سے اچھی بات یہی ہے کہ اسے اپنے اندر کوئی خاص بات نظر نہ آئے۔'' جی ایم سر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''انسانیت کی معراج کو وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو اپنی خوبیوں کو نظرانداز کرکے صرف اور صرف اپنی خامیوں پر نظر رکھے اور انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔''

''سر! آپ تو اللہ والے ہیں۔'' اظہر جوکھیو نے جی ایم سر سے کہا۔ ''ہر کوئی آپ جیسا تو نہیں ہوسکتا۔''

''میں اللہ والا نہیں ہوں۔'' جی ایم صاحب عجیب سے لہجے میں بولے۔ ''کاش! میں اللہ والا ہوتا.....''

''سر! آپ میں ایسی کیا کمی ہے جو کسی اللہ والے میں نہیں ہوتی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے ہاتھوں کو گھورتے رہے پھر براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''اسد علی! میری نظر میں جو شخص سائیکل چلانا جانتا ہے وہ سائیکل والا ہے۔ جو شخص گھوڑا دوڑانا جانتا ہے، وہ گھڑسوار ہے۔ جو شخص کار ڈرائیو کرنا جانتا ہے وہ کار والا ہے اور.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئے۔

میں نے ان کی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جو شخص اللہ سے اپنی ہر بات منگوا سکتا ہو، وہ اللہ والا ہے۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا۔ ''نو بجے والا لائیو شو شروع ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔'' پھر انہوں نے اظہر جوکھیو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اسد! سائیں کا دوست باہر گاڑی میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ انہیں سی آف کردیں۔''

''مقبول صاحب اوپر کسی سے ملنے گئے تھے۔'' میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا ان کو بلوا دیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔''

''مقبول صاحب کافی دیر پہلے یہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔'' جی ایم سر نے بتایا۔ ''آپ ان کی فکر چھوڑیں اور اس کی فکر کریں جو آج کسی وقت بھی اسلام آباد سے کراچی پہنچنے والی ہے۔''

میں نے ڈیلفینا کی آمد کو بہت ایزی لیا اور مقبول صاحب کے حوالے سے پوچھ لیا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ مقبول صاحب روانہ ہوچکے ہیں۔''

''ریڈیو انڈیکس۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

''سر! آپ اپنا کانٹیکٹ نمبر ہی دے دیں۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ ضرورت کے وقت آپ سے رابطہ کیا جاسکے اور..... آپ میرا نمبر بھی لے لیں۔''

''میں موبائل فون استعمال نہیں کرتا۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔ ''اور آپ کو مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ضروری ہوگا تو میں آپ سے

کا ٹھیک کرلوں گا۔"

"کیسے سر......؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔ "ریڈیو انڈیکس......!"

واپسی کے سفر میں راستے بھر میں جی ایم سر کے بارے میں سوچتا رہا۔ مقبول صاحب اپنی روانگی کے بارے میں عظیم کو بتا کر گئے تھے اس لیے عظیم نے ان کے غیاب کا نوٹس نہیں لیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ایم صاحب سے تمہاری میٹنگ کیسی رہی؟"

"زبردست!" میں نے جواب دیا۔

"کیا وہ بھی کوئی آئی بی ٹائپ کی شخصیت ہیں؟"

"وہ تمہارے الہامی بابا سے دس ہاتھ آگے کی چیز ہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے تو میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔"

"کچھ پتا تو چلے، آخر ہوا کیا ہے؟" عظیم نے مجھے کریدا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جی ایم سر سے ملاقات کے بعد میرے اندر ایک الارم سا آن ہو گیا تھا۔ میرے اندر سے آواز آئی کہ جی ایم سر سے ہونے والی گفتگو مجھے عظیم سے شیئر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ میرے اندر رونما ہونے والی ایک نئی تبدیلی تھی۔ گویا میرے اندر ایک ایسا حساس سسٹم ایکٹویٹ ہو گیا تھا جو مجھے بتاتا کہ کون سی بات کرنا ہے اور کون سی بات چھپانا ہے۔ میں نے عظیم کے سوال کے جواب میں ایسا انداز اختیار کیا کہ اسے برا محسوس نہ ہو۔

"یار! میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ اس موضوع پر ہم کل بات کریں گے۔ اس سلسلے میں ایک بھرپور سٹنگ کی ضرورت ہے۔ چلتے پھرتے بات پراپر طریقے سے ہو نہیں سکے گی۔"

"ٹھیک ہے برو۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "کل جب آنٹی سلمٰی کا پاسپورٹ اٹھانے امریکن ایکسپریس جائیں گے تو پھر اس ٹاپک پر تفصیلی بات کریں گے۔"

"ڈن......!" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "رات کو سونے سے پہلے سر کے درد کے لیے کوئی ٹیبلٹ وغیرہ لے لینا اور جلدی سونے کی کوشش بھی کرنا۔"

"بالکل۔ میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے کہا۔

عظیم نے مجھے ماں کے بنگلے کے سامنے ڈراپ کیا اور "اللہ حافظ" کہہ کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں بنگلے کے اندر داخل ہوا تو جمشید نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سر! یہ ابھی چند منٹ پہلے ایک بائیک والا دے کر گیا ہے۔"

مذکورہ لفافہ کسی کوریئر کمپنی کا تھا اور ایڈریس والی جگہ پر میرا نام لکھا ہوا تھا، نیچے ماں کے بنگلے کا پتا درج تھا۔ اس لفافے کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کون شخص ہے جو میرے اصل نام سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ میں اس بنگلے پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ لفافے کے عقبی حصے میں بھیجنے والے شخص کا نام چنگیز خان اور پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی دلی کیفیات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور جمشید سے کہا۔

"یہ کون سا وقت ہے کوریئر سروس کا؟"

"یہ بات میں نے اس بائیک والے سے بھی پوچھی تھی۔" جمشید نے بتایا۔ "وہ کہنے لگا کہ ارجنٹ ڈیلیوری کے لیے ان کی سروس چوبیس گھنٹے جاری رہتی ہے۔ میں نے اس بندے سے یہ بھی کہا کہ یہاں پر اسد علی نامی کوئی شخص نہیں رہتا مگر وہ اصرار کرنے لگا کہ ایڈریس اسی بنگلے کا ہے۔ ہو سکتا ہے، نام لکھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ میں نے اس سے یہ لفافہ لے لیا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں دیکھ لوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"او کے سر......!" وہ مطمئن ہو گیا پھر پوچھا۔ "کیا آپ کے لیے کھانا لگوا دوں؟"

"نہیں۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے بعد کھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" وہ سادگی سے بولا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں پہنچا اور پہلی فرصت میں وہ لفافہ کھول لیا۔ مذکورہ لفافے کے اندر عام سائز کا ایک پیپر تہ کر کے رکھا گیا تھا۔ میں نے اس تہ شدہ کاغذ کو کھول لیا۔

کاغذ کے وسط میں چند سطروں پر مشتمل ایک مختصری تحریر درج تھی۔ میں نے اس تحریر کا پہلا ہی جملہ پڑھا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا......!

اسمگلروں، حریفوں اور دشمنوں کے بیچ ولانی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنانی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

نفسیاتی جنگ

شاکر لطیف

زندگی اور موت کے کھیل میں جب ضد حائل ہو جائے تو دماغ اتنا تیزی سے متحرک ہوتا ہے اور ایسے ایسے منصوبے ترتیب دیتا ہے جو شاید سکون کی فضا میں کبھی سوچ بھی نہ پائے۔ یہاں قانون اور جرم کے درمیان بھی کچھ ایسا ہی کھیل جاری تھا، جب سارے رستے بند ہو گئے تو مجرمانہ نفسیات نے جنگ کا ایسا انوکھا طریقہ اختیار کیا کہ دیکھنے کے باوجود آنکھیں اُس منظر کا پس منظر نہ دیکھ پائیں۔

منشیات کی اسمگلنگ اور نفسیات کی جنگ میں جیتنے والوں کا قصہ

رات کی گہری تاریکی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں ایک چھوٹی سی لانچ خاصی تیز رفتاری سے سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ لانچ کے عرشے پر ایک ہی شخص موجود تھا جو لانچ کو چلا رہا تھا۔ لانچ کے انجن کی آواز خاصی پُرشور تھی اور یہ بات اس شخص کو بھی کھٹک رہی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ ان دنوں حکومت کی جانب سے سمندر میں کوسٹ گارڈز کا گشت بڑھا دیا گیا ہے۔ اور یہ اقدام حال ہی میں سمندری



راستوں سے اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ اس کی تشویش کی وجہ بھی یہی بات تھی کیونکہ اس کی بوٹ میں اس وقت بھاری مقدار میں منشیات موجود تھی۔

مائیکل ایک ڈرگز اسمگلر تھا اور اس بات خواہاں تھا کہ کسی گشتی لانچ سے سامنا ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ ان دنوں سمندر میں سخت چیکنگ کی جارہی تھی جس کی وجہ سے سمندری راستوں سے منشیات اسمگلنگ کرنے والے تمام گروپس نے اپنا کام وقتی طور پر روک دیا تھا۔ شہر میں منشیات کی ترسیل بند ہونے سے اس کی قیمت بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی اور اسی لیے مائیکل نے منشیات کی اس کھیپ کو پہنچانے کی ذمے داری اٹھائی تھی۔ اسے بس اس کھیپ کو سمندر کے کنارے تک پہنچانا تھا جو جنگل سے ملحق تھا اور وہاں اس کے ساتھی اس کے منتظر تھے اور وہ اس منشیات کو لانچ سے نکال کر جنگل کے اندر زمین میں دفن کردیتے اور پھر کسی مناسب وقت اور موقع پر اسے گاڑی کے ذریعے شہر میں موجود ڈرگز ڈیلر تک پہنچا کر قیمت وصول کرلیتے۔

پہلے بھی مائیکل منشیات کی ایک کھیپ اسی لانچ کے ذریعے جنگل سے ملحق کنارے پر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا چکا تھا جسے جنگل میں دفن کردیا گیا تھا۔ تاہم اس بار اپنے باس اور ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود اس نے مال لانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ان حالات میں کھیپ کی بہترین قیمت بھی مل سکتی تھی۔ اس کی منزل ابھی پچاس بحری میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ لانچ کو فل اسپیڈ پر بھگائے چلے جارہا تھا۔ وہ لانچ چلانے کا خاصا تجربہ رکھتا تھا ورنہ اتنی رفتار خطرناک تھی۔

ابھی تک سب کچھ ٹھیک اور معمول کے مطابق تھا' دفعتاً دور کہیں روشنی ابھری تو مائیکل چونک پڑا۔ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ سمندر میں روشنی نظر آنے کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر کوئی چھوٹا بحری جہاز یا لانچ موجود تھی اور اگر یہ جہاز یا لانچ کوسٹ گارڈز کی تھی تو پھر اس کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ مائیکل نے فوراً اپنی لانچ کا انجن بند کردیا کیونکہ اس سناٹے میں جہاں سمندری لہروں کے ہلکے ہلکے شور کے سوا کسی دوسری آواز کو فوراً محسوس کیا جاسکتا تھا تو انجن کی آواز بہ آسانی سنی جاسکتی تھی۔ تاہم فی الحال وہ پرامید تھا کہ اگر وہ روشنی کوسٹ گارڈز کی کسی لانچ سے ہی ابھری تھی تو اپنی بوٹ کے شور میں وہ مائیکل کی لانچ کی آواز سن نہ سکے ہوں گے۔

اب اس کے بچنے کی بہتر صورت یہی تھی کہ کوسٹ گارڈز کی لانچ پر موجود عملہ اس کی لانچ کی موجودگی سے بے خبر رہے اور کسی دوسری طرف نکل جائے اور اگر وہ اس کی موجودگی سے باخبر ہوجاتے تو ان سے بچنا بہت مشکل ہوجاتا۔ وہ لازماً اسے چیک کرتے اور لانچ پر اتنی بھاری مقدار میں ہیروئن کی موجودگی کے بعد وہ..... لانچ کی تلاشی دینے کا تو ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

اور تلاشی کی صورت میں وہ ان کی تیز اور جدید لانچوں کے مقابلے میں اگر... فل اسپیڈ سے بھی اپنی لانچ بھگاتا تو بھی بچنا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی لانچ کا انجن بند کردیا تھا۔ اس کی لانچ انجن بند ہونے کے بعد اب سمندر کی لہروں پر آہستہ آہستہ ہچکولے کھارہی تھی۔ اسے اب سمندر میں کسی بوٹ کے انجن کا مدھم سا شور سنائی دینے لگا تھا جو آہستہ آہستہ تیز ہوتا جارہا تھا۔ گویا کوسٹ گارڈز کی لانچ اسی طرف آرہی تھی۔ شاید وہ دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان سمندری گارڈز کے پاس رات کو دیکھنے والی انتہائی جدید دوربینیں موجود تھیں جن کی مدد سے وہ کافی دور سے بھی اس کی لانچ کو دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی لانچ میں ایسے آلات بھی نصب تھے جن سے وہ میلوں دور تک سمندر میں کسی دوسری لانچ کو مارک کرسکتے تھے لہٰذا اب مائیکل کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ اسے بھی ٹریس کرلیا گیا ہے کیونکہ اسے ایک بار پھر کافی دوری پر روشنی نظر آئی تھی یقیناً کوئی لانچ تیز رفتاری سے اسی طرف آرہی تھی۔ اب فرار کی کوشش کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے یک لخت اپنی لانچ کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے مخالف سمت میں بھگانے لگا۔ لانچ آہستہ آہستہ رفتار پکڑنے لگی مگر جب تک اس کی لانچ نے رفتار پکڑی' اسے دوسری بوٹ بھی دکھائی دینے لگی۔ اس کا شک درست ثابت ہوا تھا وہ کوسٹ گارڈز کی لانچ ہی تھی اور لحہ بہ لحہ قریب آتی جارہی تھی۔ کوسٹ گارڈز نے اپنی لانچ سے اسے روشنی کا مخصوص اشارہ بھی دینا شروع کردیا تھا۔ مائیکل جانتا تھا کہ اب اگر اس نے اپنی لانچ نہ روکی تو وہ اس پر گولی بھی چلاسکتے تھے۔ اس کے چہرے پر اب سراسیمگی کے تاثرات عود آئے تھے۔ وہ پھنس چکا تھا۔ تلاشی دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب آخری حربہ آزمانے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے ایک سائڈ پر رکھی اپنی رائفل پر نگاہ ڈالی۔ اسمگلروں اور کوسٹ گارڈز کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ مائیکل پہلے بھی ایسے حالات سے کئی بار دوچار ہوچکا تھا اور فائرنگ کے تبادلے کے بعد بچ نکلنے میں بھی کامیاب رہا تھا لیکن اس بار اس کی پریشانی کی

وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس رائفل میں لوڈ میگزین کے سوا صرف ایک میگزین تھا۔ اسے مقابلے کی صورت میں اپنی گولیاں بہت احتیاط سے استعمال کرنا تھیں۔

اس نے لانچ کا انجن دوبارہ بند کردیا اور رائفل اٹھالی۔ انجن بند کرنا ضروری تھا کیونکہ اتنی تیز رفتاری میں رائفل جیسا ہتھیار چلانا اور درست نشانہ لگانا ناممکن تھا۔ انجن بند ہوتے ہی اس کی لانچ کی رفتار تھمنے لگی۔ تعاقب میں آنے والی لانچ کی رفتار بھی سست ہوگئی۔ شاید وہ مائیکل کی لانچ کو رکتے دیکھ کر سمجھے تھے کہ یہ کوئی مسافر لانچ ہے اور تعاون کرنے پر آمادہ ہے لیکن اگلے ہی لمحے انہیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔ مائیکل نے رینج میں آتے ہی ان پر تین فائر داغ دیے۔ تاہم اسے یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ گولیاں کوسٹ گارڈز کی لانچ پر لگی ہیں یا نہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوسری لانچ کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسی لمحے فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی اور مائیکل بے اختیار لانچ کے عرشے پر بیٹھ گیا۔ جوابی فائرنگ میں گولیاں اس کے سر کے بالکل پاس سے ہی گزری تھیں۔ چلانے والے سے اندازے کی معمولی سی غلطی ہوئی تھی، ورنہ گولیاں سیدھا مائیکل کے سر میں لگتیں۔

مائیکل نے لیٹے لیٹے ہی بہ غور دوسری لانچ کا جائزہ لیا اور پھر ایک ہیولا سا نظر آتے ہی دوبارہ فائر داغ دیا۔ تاہم اس کا نشانہ خطا گیا۔ لہروں پر ہچکولے کھاتی لانچ پر سے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے نشانہ لگانا خاصا مشکل تھا۔

دوسری طرف سے بھی ایک بار پھر جوابی فائرنگ کی گئی اور اس بار ایک گولی مائیکل کے بازو میں پیوست ہوگئی۔ اس کے حلق سے ایک اضطراری چیخ بلند ہوئی اور اس نے غصے اور جھلاہٹ میں پورا برسٹ سامنے موجود لانچ پر داغ دیا۔ اس بار اس نے بھی واضح طور پر چیخ کی آواز سنی تھی۔ کوئی کوسٹ گارڈ اس کی گولیوں کا نشانہ بنا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری غلطی ثابت ہوئی۔ دوسری طرف سے چلائی ہوئی گولیاں اس کے سر میں آگئیں۔ لحہ بھر کے لیے مائیکل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر میں کئی دہکتی ہوئی سلاخیں گھس گئی ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ موت کی تاریکی جہاں اب قیامت تک روشنی کی کوئی کرن نہیں ابھرنے والی تھی۔

☆☆☆

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کی تزئین و آرائش بھی واجبی سی تھی۔ ہال میں مدھم سی روشنی تھی جس کی وجہ سے وہاں کا ماحول خاصا پراسرار سا لگ رہا تھا۔

ایک طرف چار کرسیاں موجود تھیں۔ تین کرسیوں پر افراد موجود تھے تاہم ایک کرسی خالی تھی۔ وہ تینوں افراد خاموشی سے اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے اور چہروں پر رنج و غم اور تشویش کے تاثرات بھی واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے تھے۔ ان میں ایک نوجوان تھا جبکہ باقی دو افراد کے نقوش سے واضح تھا کہ وہ اپنی زندگی کی چالیس سے زائد بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

اسی لمحے ہال کا دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر وہ تینوں کھڑے ہوگئے۔ ان کے انداز میں احترام کی جھلک نمایاں تھی۔ ”بیٹھ جائیں!“ لمبے تڑنگے شخص نے خالی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا تو وہ تینوں خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ میٹنگ موجودہ حالات کے تناظر میں طلب کی گئی ہے۔“ لمبا تڑنگا شخص بولا۔ ”آپ کے علم میں ہے کہ گزشتہ رات سمندری راستے سے مال لاتے ہوئے ہمارا ساتھی مائیکل کوسٹ گارڈز کی فائرنگ سے مارا گیا۔ اس مقابلے میں ایک کوسٹ گارڈ بھی ہلاک ہوا ہے۔

”مائیکل ہمارا بہت پرانا ساتھی اور دوست تھا۔ یقیناً میری طرح آپ سب کو بھی اس کی موت کا دلی افسوس ہوگا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے مال لانے کی ذمے داری اٹھائی اور پہلی کوشش میں وہ کامیاب بھی رہا مگر دوسری کوشش نے اسے موت سے دوچار کردیا۔ بہرحال ہمارا دیرینہ دوست مائیکل اب اس دنیا میں نہیں رہا اور ہمیں اب آگے کی پلاننگ کرنی ہے کیونکہ کسی کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔

”آپ جانتے ہیں کہ مال پکڑے جانے کے باعث ہمیں بھاری نقصان کا سامنا ہوا ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم مائیکل کی لائی ہوئی ہیروئن کی پہلی کھیپ جسے جنگل میں آپ نے ہی دفن کیا ہے نکال کر شہر میں اپنے ڈیلر تک پہنچائیں۔ مگر کیسے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم سب کو مل کر تلاش کرنا ہے۔ یہ بات بھی مدِنظر رکھی جائے کہ کیا موجودہ حالات میں ہیروئن کی شہر میں ترسیل ممکن ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم اب مزید کسی ساتھی کو کھونے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔“

”مگر باس! آپ جانتے ہیں کہ جنگل کے ساتھ شہر جانے والے روڈ پر حال ہی میں ایک بڑی چیک پوسٹ قائم

کی گئی ہے۔ اس روڈ سے گزرے بغیر ہم مال شہر تک نہیں پہنچا سکتے اور میری معلومات کے مطابق اب تک جس اسمگلر نے بھی مال لے کر وہاں سے گزرنے کی کوشش کی ہے، وہ یا تو پکڑا گیا ہے یا پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔'' ایک طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے کہا۔

''ہاں!'' لمبا تڑنگا شخص جسے باس کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری معلومات بالکل درست ہیں مارٹن' یہ چیک پوسٹ حال ہی میں قائم کی گئی ہے۔ شاید حکومت کو اطلاع مل گئی ہے کہ اس راستے سے شہر میں منشیات کی سپلائی ہو رہی ہے۔ یہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد ہی جانے دیا جاتا ہے۔ اس روڈ کے دونوں اطراف بلند و بالا پہاڑ ہیں اس لیے اس روڈ کو کراس کیے بغیر ہم شہر تک مال لے کر نہیں جا سکتے۔''

''مگر باس ہم منشیات کو گاڑی کے خفیہ خانوں میں چھپا کر لے جائیں گے۔ اس روڈ سے روزانہ ہزاروں گاڑیاں گزرتی ہیں۔ ہر گاڑی کی تفصیلی تلاشی تو ممکن ہی نہیں۔'' باس کے سامنے بیٹھا ہوا قدرے فربہ جسامت کا شخص بولا۔

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے . رابرٹ......'' باس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس چیک پوسٹ پر گاڑیوں میں منشیات کی موجودگی کا پتا چلانے کے لیے تربیت یافتہ کتوں کو بھی رکھا گیا ہے۔ یہ کتے سونگھ کر منشیات کی موجودگی کا پتا چلا لیتے ہیں۔''

''مگر باس' کیا کتوں کو ڈاج دینا کوئی بڑا مسئلہ ہے؟'' مارٹن دوبارہ بولا...... ''یہ کام ہم پہلے بھی تو کر چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم ہیروئن کے پیکٹوں پر ایک مخصوص خوشبو کا اسپرے کرتے ہیں جس کی وجہ سے کتے منشیات کی بو نہیں پا سکتے۔''

''اس بار شاید یہ ترکیب بھی کارآمد نہ ہو۔'' باس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیونکہ یہ کتے آرمی سے خصوصی طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔ یہ اسپرے کے باوجود منشیات کی بو سونگھ لیتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک جس اسمگلر نے بھی اس چیک پوسٹ کو کراس کرنے کی کوشش کی ہے ، وہ پکڑا یا مارا گیا ہے۔ ان اسمگلروں نے بھی کتوں کو ڈاج دینے کے لیے اسپرے کا استعمال کیا ہوگا مگر اس کے باوجود نا کام رہے۔''

''پھر تو واقعی یہ کام مشکل ہے باس۔'' رابرٹ مایوس لہجے میں بولا۔

''رچرڈ! تم نے کوئی تجویز پیش نہیں کی۔'' باس نے اپنے دائیں طرف موجود شخص کو مخاطب کیا جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

''باس' آپ نے حالات کی جو منظر کشی کی ہے اس کے بعد میرے پاس کوئی مناسب تجویز تو نہیں ہے لیکن کیا ہم پہاڑی راستے سے اس چیک پوسٹ کو کراس نہیں کر سکتے؟ میں جانتا ہوں کہ یہ کام خاصا مشکل اور مشقت طلب ہے مگر آپ کو یاد ہوگا کہ تقریباً پانچ برس پہلے میں نے' رابرٹ اور آپ نے ان پہاڑوں پر پیدل چلتے ہوئے منشیات کی کھیپ شہر تک پہنچائی تھی۔ کیا اب یہ حربہ نہیں آزمایا جا سکتا؟''

''پہاڑوں پر منشیات کے بھاری تھیلے اٹھا کر سفر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' باس نے جواب دیا۔ ''اور موجودہ صورت حال میں تو یہ ناممکن ہو چکا ہے کیونکہ ان دنوں پہاڑوں پر فوج نے اپنے اڈے قائم کر لیے ہیں شاید فوجی مشقیں ہو رہی ہیں۔''

''پھر تو مجھے بھی رابرٹ کی بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ فی الحال ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ باس کیا اس چیک پوسٹ کے افراد کو خریدا نہیں جا سکتا؟'' رابرٹ نے ایک خیال کے تحت کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پیسا خرچ کرنے سے بات بن سکتی ہے۔''

''موجودہ حالات میں یہ بھی ممکن نہیں۔'' باس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں تم تینوں کے علم میں لانا چاہوں گا کہ اس چیک پوسٹ کا انچارج سارجنٹ جارڈن ہے۔ اسے حال ہی میں وہاں تعینات کیا گیا ہے۔ سارجنٹ جارڈن کے متعلق مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تم تینوں اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ اسمگلروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پانچ برس پہلے بھی اسی کی وجہ سے ہم منشیات کی ترسیل کے لیے پہاڑی راستہ اپنانے پر مجبور ہوئے تھے۔'' سارجنٹ جارڈن کا نام سامنے آتے ہی ان تینوں کے چہروں پر تشویش کے تاثرات عود آئے۔ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ پانچ سال پہلے بھی وہ اس علاقے میں تعینات ہوا تھا اور جب تک رہا اسمگلروں کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ سارجنٹ جارڈن کا ایک بیٹا ہیروئن کی لت میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جس کے بعد سے وہ منشیات فروشوں کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ وہ ہیروئن فروشوں کو گرفتار کرنے کے بجائے گولی مارنے کو ترجیح دیتا تھا۔ ان تینوں کے علم میں ایسے بہت سے واقعات تھے جب سارجنٹ جارڈن نے منشیات کے اسمگلروں کو شوٹ کیا تھا، حالانکہ وہ اسمگلر گرفتاری دینے کو تیار

تھے اور پھر موجودہ چیک پوسٹ پر حال ہی میں کچھ اسمگلروں کی ہلاکت ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سارجنٹ جارڈن آج بھی اپنی پرانی روش پر قائم تھا۔ گویا اب منشیات سمیت اس چیک پوسٹ سے گزرنے کی کوشش کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

''میرے خیال میں ہمارے پاس کوئی ایسا حربہ نہیں جسے آزما کر ہم اس چیک پوسٹ کو کراس کر سکیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم مناسب وقت اور موقع کا انتظار کریں۔'' باس نے ان تینوں کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''مگر باس اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ چند ماہ بعد ہیروئن کی موجودہ مارکیٹ ویلیو برقرار رہے گی۔''

''کوئی گارنٹی نہیں۔'' باس نے جواب دیا۔ ''اس وقت ہیروئن کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور اس کی وجہ ہم سب جانتے ہیں۔ سپلائی نہ ہونے کی وجہ سے شہر میں عارضی طور پر ہیروئن کی قلت پیدا ہو چکی ہے۔ نشے کے عادی افراد ایک پڑیا کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ طلب اور رسد کا توازن بگڑ جائے تو یہی ہوتا ہے مگر جیسے ہی یہ سپلائی بحال ہوئی قیمتوں میں توازن آ جائے گا۔ یقیناً ہماری طرح دوسرے اسمگلر بھی منشیات کو شہر تک پہنچانے کے لیے پلاننگ کر رہے ہوں گے جو سب سے پہلے کامیاب ہوگا وہی سب سے بھاری منافع کا حقدار ہوگا۔ ہم مائیکل کی موت کے بعد مال کے پکڑے جانے کی وجہ سے پہلے ہی بہت بھاری نقصان سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اگر مائیکل زندہ گرفتار ہو جاتا تو شاید پولیس کے تشدد کے سامنے زیر ہو کر ہماری نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ جنگل میں مدفون مال بھی پکڑوا دیتا۔ ہم سب اس کی موت پر غمزدہ ہیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی زندہ گرفتاری ہمارے حق میں نہیں ہوتی۔ مائیکل اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مائیکل کی موت کے بعد ہم ایک بند گلی میں آ گئے ہیں اور ہمیں سارجنٹ جارڈن جیسی مصیبت کا سامنا ہے۔ ورنہ اگر ہم شہر تک ہیروئن کی کھیپ پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اپنی انویسٹ منٹ سے دس گنا زیادہ کمائیں گے۔''

''باس' کیا ہم مال نکال کر اسے سمندری راستے کے ذریعے شہر پہنچانے کی کوشش نہیں کر سکتے؟'' رچرڈ نے تجویز پیش کی۔

''میں اس پوائنٹ پر پہلے ہی غور کر چکا ہوں۔'' باس نے جواب دیا...... ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک ہی لانچ تھی جو مال کے ساتھ پولیس کے قبضے میں جا چکی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ لانچ مائیکل کے نام پر خریدی گئی تھی۔ اس سے کاغذی سطح پر ہمارا کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ ورنہ پولیس اب تک ہمارے پیچھے بھی پڑ چکی ہوتی اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم کسی لانچ کا بندوبست کر بھی لیتے ہیں تو یہ چیک پوسٹ کو کراس کرنے سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ سمندری راستوں کو زیادہ سختی سے چیک کیا جا رہا ہے۔ مائیکل کی موت آپ سب کے سامنے ہے۔''

''باس' میرا خیال ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔'' مارٹن نے کہا تو باس کے ساتھ ساتھ رچرڈ اور رابرٹ بھی چونک پڑے۔

''تم یہ کام کیسے کرو گے مارٹن؟'' باس نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

''باس' مال اسی چیک پوسٹ سے نکلے گا اور سارجنٹ جارڈن کی موجودگی میں نکلے گا مگر اس سے پہلے میرے اور اس کے درمیان ایک کھیل ہوگا۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک چھوٹی سی نفسیاتی جنگ لڑی جائے گی۔''

''کیسی نفسیاتی جنگ......؟'' باس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ رچرڈ اور رابرٹ اگرچہ خاموش تھے تاہم ان کے چہروں پر بھی حیرت کے تاثرات موجود تھے۔

''باس' میں اس کام کو منطقی انجام تک پہنچانے کی مکمل ذمے داری لینے کو تیار ہوں۔'' مارٹن نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس آپ لوگ فیصلہ کریں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد ہے یا نہیں۔''

''ہمیں تم پر بھروسا نہ ہوتا تو تم ہمارے ساتھ نہ ہوتے۔'' اس بار رچرڈ بولا۔ ''مگر تمہاری باتیں ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔ شاید تم نے جوانی کے جوش میں آ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں متنبہ کر چکا ہوں کہ یہ کام جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ ہم مائیکل کے بعد کسی دوسرے ساتھی کو نہیں کھونا چاہتے۔ ویسے بھی ہمارا یہ گروپ چند افراد پر ہی تو مشتمل ہے۔ کسی بھی نئے آدمی کو گروپ میں شامل کرتے وقت سو دفعہ سوچنا پڑتا ہے کہ مبادا وہ پولیس کا آدمی ہی ہو۔''

''میں نے یہ فیصلہ جوش سے نہیں بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میرے ذہن میں ایک پلان ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔ میری آپ سب سے درخواست ہے کہ آپ مجھے اس کام کو کرنے کی اجازت دے دیں۔'' مارٹن نے سنجیدہ اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''تم بہت بڑا رسک لینے جا رہے ہو۔'' رابرٹ بولا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ سارجنٹ جارڈن ہیروئن فروشوں

کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ تم منشیات سے بھری گاڑی لے کر اس چیک پوسٹ سے گزرو گے؟"

"ہم اسمگلر ہیں رابرٹ۔" مارٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا..... "رسک ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ بزدل آدمیوں کی ہمارے پیشے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اگر اس کام کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہوگا۔ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں مگر لگتا ہے کہ آپ لوگ تذبذب کا شکار ہیں۔ بہرحال کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لیجیے گا کہ اگر منشیات کی یہ کھیپ بروقت ہمارے شہری ڈیلر تک پہنچتی ہے... تبھی ہم اپنا نقصان پورا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔"

"مجھے تمہارا اعتماد پسند آیا ہے۔" باس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "اگرچہ تمہیں ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر تم جانتے ہو کہ تمہارا مقام بھی وہی ہے جو دوسرے ساتھیوں کا ہے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو اور ہم تہ دل سے تمہاری ذہانت کے قائل ہیں۔ میں تمہیں اس کام کی اجازت دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

"اگر مارٹن اپنی ذمے داری پر یہ رسک لینا چاہتا ہے تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔" رابرٹ اور رچرڈ نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ "ویسے ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔"

"آپ کو بس اتنا کرنا ہے کہ جب میں کہوں تو جنگل میں مدفون منشیات کے پیکٹ میری کار میں منتقل کرنے ہیں۔ اس سے آگے میرا کام شروع ہوگا۔" مارٹن نے کہا تو رابرٹ اور رچرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا جبکہ باس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مارٹن اسی علاقے کا رہنے والا تھا اور تقریباً دو سال پہلے اس گروپ میں شامل ہوا تھا۔ باس کا نام تھامسن تھا اور وہ اپنے چھوٹے سے گروپ جس میں مائیکل، رابرٹ، رچرڈ شامل تھے کے ساتھ مل کر کافی عرصے سے شہر میں منشیات کی ترسیل کررہا تھا اور پھر مارٹن بھی ان میں شامل ہوگیا۔ مارٹن نے اپنی کارکردگی سے جلد ہی ان میں برابری کا مقام حاصل کرلیا۔ وہ سب مل کر کام کرتے تھے اور سمندری راستے سے ہیروئن شہر سے ملحق جنگل تک لاتے اور پھر اسے جنگل میں ایک خفیہ مقام پر دفن کردیتے۔ اس کے بعد ڈیلر کی ڈیمانڈ پر وقتاً فوقتاً اسے مال سپلائی کرتے رہتے تھے۔ گاڑی پر شہر تک جانے کا رسک وہ سب باری باری اٹھاتے تھے حتیٰ کہ کبھی کبھی باس تھامسن خود بھی یہ ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا۔ ان سب کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں بھی موجود تھیں۔

اب مائیکل کی ہلاکت اور سارجنٹ جارڈن کی تعیناتی کے بعد مارٹن نے ساری کی ساری ہیروئن کی کھیپ اپنی گاڑی میں چھپا کر اس نئی چیک پوسٹ کو کراس کرنا تھا مگر کیسے یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ مارٹن نے اپنا منصوبہ کسی سے شیئر نہیں کیا تھا اور اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ فی الحال وہ اپنا پلان کسی سے ڈسکس کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، تاہم وہ جانتے تھے کہ مارٹن ایک ذہین آدمی ہے اور اس نے کچھ سوچ کر ہی اس کام کی ذمے داری اٹھائی ہے۔

☆☆☆

اس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔ اگرچہ سردیوں کا موسم تھا۔ تاہم ان دنوں سردی کی شدت خاصی کم تھی اور صبح کے وقت تو اس کی شدت میں مزید کمی آجاتی تھی کیونکہ مطلع صاف ہونے کی وجہ سے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا تھا۔ آج چیک پوسٹ پر رش ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ تاہم اس کے باوجود ہر گاڑی کو کتوں کے ذریعے چیک کیا جارہا تھا۔

سارجنٹ جارڈن ایک طرف کرسی پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے حال ہی میں اس جگہ تعینات کیا گیا تھا اور یہ تعیناتی ..... اسمگلروں کے خلاف اس کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی کیونکہ کافی عرصے سے یہ علاقہ اسمگلروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور اب حکومتی سطح پر منشیات کی روک تھام کے سلسلے میں سخت اقدامات اٹھائے گئے تھے۔ اس کی تعیناتی بھی انہی اقدامات کا ایک حصہ تھی۔

سارجنٹ جارڈن کو یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ اسمگلر سمندری راستے سے اس علاقے کے جنگل تک منشیات لے کر آتے ہیں اور پھر وہاں سے بائی روڈ اس کی شہر تک سپلائی کرتے ہیں۔ اسی علاقے میں آبادی کے ساتھ ایک وسیع و عریض جنگل واقع تھا اور اسمگلروں کے لیے یہ جنگل کسی جنت سے کم نہ تھا۔ وقتی طور پر منشیات محفوظ کرنے کے لیے یہ جنگل بہترین جگہ تھی۔ سارجنٹ جارڈن کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ جنگل سے ملحق آبادی کے بہت سے لوگ ہیروئن اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ مگر وہ بغیر ثبوت کے کسی کو گرفتار نہیں کرسکتا تھا۔ اتنے وسیع و عریض جنگل کو بھی چیک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

تاہم سارجنٹ جارڈن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اسمگلر اپنی منشیات شہر تک سپلائی کرنے کے لیے اس اکلوتی سڑک کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس قصبے سے شہر تک

جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ چیک پوسٹ خصوصی طور پر قائم کرائی تھی اور خود بھی مستقل طور پر چیک پوسٹ کے ایک کیبن میں ڈیرے ڈال رکھے..... تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دیر بہ دیر اسمگلر اپنے مال کی سپلائی کے لیے اس راستے کا استعمال کرنے پر مجبور ہوں گے اور اسے شروعات میں ہی بڑی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں۔ اس چیک پوسٹ کو کراس کرنے کی کوشش میں دو اسمگلر اس کے ہاتھوں مارے جاچکے تھے۔

اس بار اسے حکومت کی جانب سے ملٹری کے تربیت یافتہ کتے دیے گئے تھے۔ اس وقت وہ خود ایک سائڈ پر بیٹھا ساری چیکنگ کی نگرانی کررہا تھا۔ ویسے اس کا حکم تھا کہ اگر کتے کسی گاڑی میں منشیات کی بو سونگھ کر بھونکیں تو وہ اپنے کیبن میں آرام بھی کررہا ہو تو اسے فوراً اطلاع کردی جائے۔ ابھی تک ساری کارروائی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ کتوں کو ہر گزرنے والی کار کے پاس لے کر جایا جاتا مگر وہ صبح سے بدستور خاموش تھے۔

اگرچہ اس چیک پوسٹ پر چار کتے موجود تھے مگر اس وقت دو کتوں کے ذریعے ہی گاڑیوں کو چیک کیا جارہا تھا جبکہ باقی دونوں کتے ایک سائڈ پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک بڑا سا برتن بھی رکھا ہوا تھا جس میں ان کتوں کو خوراک دی جاتی تھی۔ اس نسل کے کتوں کے لیے مخصوص قسم کی خوراک کا بندوبست کیا جاتا تھا اور اس خوراک میں ایک خاص دوا بھی ملائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان کی سونگھنے کی حس دوسرے کتوں کی نسبت زیادہ تیز ہوجاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی کارکردگی بھی بہت بہتر تھی۔

اسی لمحے گاڑیوں کو چیک کرنے والے دونوں کتوں نے ایک پرانے ماڈل کی کار کو سونگھتے ہی بھونکنا شروع کردیا تو سارجنٹ جارڈن بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تربیت یافتہ کتے یونہی نہیں بھونکے یقیناً انہیں منشیات کی بو ملی تھی۔

اس کے ماتحت عملے نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اس کار کو گاڑیوں کی قطار میں سے نکلوا کر ایک سائڈ پر لگوالیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو بھی کار سے باہر آنے کا حکم دیا تھا۔ وہ شخص بلا کسی تعرض کے اپنی کار سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔

اسی لمحے سارجنٹ جارڈن کا ماتحت گیری اس کے پاس آیا۔ "سر! کتوں نے اس کار میں منشیات کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔"

"ہوں۔" سارجنٹ جارڈن نے ہنکارا بھرا۔ "گاڑی کی تفصیلی تلاشی لو۔"

"یس سر!" گیری نے مودبانہ لہجے میں کہا اور پھر کار کی طرف بڑھ گیا۔ اسی نے پولیس کے دیگر عملے کو گاڑی کی تلاشی کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں کار کی تلاشی لی جانے لگی۔

اس دوران سارجنٹ جارڈن بہ غور اس نوجوان کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جو اس کار کو ڈرائیو کررہا تھا۔ سارجنٹ جارڈن کا خیال تھا کہ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ باڈی لینگویج میں وہ ایک معقول اور سلجھا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ اسے دیکھنے پر یہ گمان بالکل نہیں ہوتا تھا کہ اس کا منشیات کی اسمگلنگ جیسے گھناؤنے کام سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ کے تاثرات موجود نہیں تھے۔ گاڑی کی تلاشی لینے پر اس نے کوئی اعتراض یا مزاحمت بھی نہیں کی تھی۔ ان تمام باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا منشیات کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر سارجنٹ جارڈن ان تربیت یافتہ کتوں کی کارکردگی سے بھی بخوبی واقف تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس نوجوان کے پاس چلا گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا......؟" قریب جاتے ہی اس نے سوال کیا۔

"میرا نام مارٹن ہے۔" نوجوان نے بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

"ہمارے کتوں نے تمہاری کار میں منشیات کی موجودگی کا پتا چلایا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کوئی وضاحت پیش کرنا چاہو گے؟" سارجنٹ جارڈن نے دوبارہ سوال کیا۔

"میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ آپ اپنا اور میرا وقت برباد کررہے ہیں۔ میں جنگل سے ملحق رہائشی علاقے میں کئی برسوں سے رہ رہا ہوں۔ میرا منشیات سے بھلا کیا واسطہ۔" مارٹن نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تربیت یافتہ کتے ہیں۔" سارجنٹ جارڈن کا لہجہ کرخت ہوگیا۔ "ان کے ذریعے ہم صبح سے گاڑیوں کو چیک کررہے ہیں لیکن یہ تمہاری گاڑی کے سوا کسی کار پر نہیں بھونکے۔ میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری گاڑی میں منشیات چھپائی گئی ہے۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی اس بارے میں بتادو۔ ویسے اگر تم فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہو تو ایسے کسی بھی احمقانہ خیال کو فوراً اپنے ذہن سے جھٹک دینا۔ میرا نام جارڈن ہے سارجنٹ جارڈن۔ اسمگلر میرا نام سن کر ہی کانپ جاتے ہیں۔"

"مجھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے سارجنٹ۔" مارٹن

نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "میری گاڑی میں کسی قسم کی منشیات موجود نہیں۔ غالباً یہ کتے تم نے لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔"

اسی لمحے سارجنٹ جارڈن کا ماتحت گیری اس کے پاس آیا۔ کار کی تلاشی کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ "سر! گاڑی سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔"

"ہوں۔" سارجنٹ نے اپنی عادت کے مطابق ہنکارا بھرا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا مارٹن کو گھورتا رہا اور پھر گیری سے بولا۔ "کتوں کو ایک بار پھر کار کے پاس لے کر جاؤ اور اس بار چاروں کتوں کے ذریعے گاڑی کو چیک کرو۔" اس کی بات سن کر گیری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر میں کار کو کتوں کے ذریعے دوبارہ چیک کیا جانے لگا۔ سارجنٹ جارڈن کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بندھے ہوئے دونوں کتوں کو بھی مارٹن کی کار کے پاس لایا گیا۔

چاروں کتوں نے گاڑی کو سونگھنا شروع کر دیا اور پھر کچھ ہی دیر میں ان چاروں نے بیک وقت بھونکنا شروع کر دیا۔ کتوں کے ایسا کرنے پر سارجنٹ جارڈن نے معنی خیز نگاہوں سے مارٹن کی جانب دیکھا اور پھر گیری کی جانب متوجہ ہو کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "گاڑی کی سیٹس اور چھت پر لگا کپڑا اپھاڑ ڈالو۔ ڈگی کھول کر ایکسٹرا ٹائر بھی چیک کرو۔ اگر اس کا وزن زیادہ ہو تو چاقو سے اسے بھی پھاڑ ڈالو مبادا اس کے اندر منشیات چھپائی گئی ہو!"

"یہ زیادتی ہے سارجنٹ۔" مارٹن نے غصیلے لہجے میں احتجاج کیا۔ "اس طرح تو میری کار کا ستیاناس ہو جائے گا۔ میں تم پر کیس کروں گا اور شیرف سے تمہاری شکایت بھی کروں گا۔"

"تم ایسا کرنے کا حق رکھتے ہو مگر میں نے جو حکم دیا ہے اس پر بھی عمل ہوگا۔ جب تک میری تسلی نہیں ہوگی تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔" سارجنٹ جارڈن کا لہجہ دوٹوک تھا۔

گیری اور اس کے ساتھی پولیس والوں نے کچھ ہی دیر میں مارٹن کی کار کی سیٹس اور چھت پر لگا موٹا کپڑا اپھاڑ ڈالا۔ کار کے دروازے پر لگا ربڑ کا کور بھی اتار لیا گیا۔ اس بار گاڑی کے ہر ایسے حصے کو چیک کیا گیا۔ جہاں منشیات چھپائے جانے کا امکان تھا مگر انہیں کچھ ڈھونڈنے میں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

"سر! کچھ نہیں ملا۔" آخر کار گیری نے اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

"میں نے کہا تھا کہ ڈگی میں موجود ایکسٹرا ٹائر کو بھی پھاڑ کر چیک کرو۔" سارجنٹ جارڈن نے گیری سے کہا۔

"سر! ٹائر کو چیک کیا ہے۔" گیری نے جواب دیا۔ "تاہم میرا نہیں خیال کہ اس کے اندر کچھ چھپایا گیا ہے کیونکہ اس کا وزن نارمل ہے۔ پھر بھی میں اسے پھاڑ کر چیک کر لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے گیری ایک مرتبہ پھر مارٹن کی کار کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے کار سے ایکسٹرا ٹائر نکالا اور پھر چاقو کی مدد سے اسے بھی پھاڑ ڈالا۔ تاہم اب بھی کچھ برآمد کرنے میں ناکام رہا۔

"کچھ نہیں ہے سر!" اس نے سارجنٹ جارڈن سے کہا جس کے چہرے پر اب الجھن کے تاثرات امڈ آئے تھے۔

"آج تک ایسا نہیں ہوا... کہ یہ تربیت یافتہ کتے کسی غلط گاڑی پر بھونکے ہوں۔ اس بار نہ جانے ایسا کیوں ہوا۔"

"اس کی تلاشی لو۔" اس نے ایک خیال کے تحت گیری کو مارٹن کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ اس کا حکم سن کر گیری مارٹن کے پاس گیا اور اس کی جامہ تلاشی لینی شروع کر دی۔ مارٹن نے تلاشی دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ "نو سر!" گیری نے تلاشی کا عمل مکمل کرنے کے بعد بس اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

"تم جا سکتے ہو۔" سارجنٹ جارڈن نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ اب اس کے پاس مارٹن کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

"تمہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" مارٹن نے اپنی کار کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور پھر کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سارجنٹ جارڈن خاموشی سے کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اگلا دن سارجنٹ جارڈن پر خاصا بھاری ثابت ہوا۔ شیرف نے اسے اپنے آفس طلب کیا تھا۔ مارٹن نے اس کے خلاف باقاعدہ شکایت درج کروائی تھی۔ مارٹن اپنے علاقے کی ایک سماجی تنظیم کا رکن تھا اور اس تنظیم کی جانب سے بھی شریف شہریوں کو چیک پوسٹ پر تنگ کرنے پر شدید احتجاج ریکارڈ کرایا گیا تھا۔ شیرف کے آفس میں سارجنٹ جارڈن کو کافی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تاہم وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کتے مارٹن کی کار پر منشیات کی عدم موجودگی کے باوجود کیوں بھونکے تھے اور پھر چاروں کتے بیک وقت کیسے دھوکا کھا گئے تھے۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اس سے اگلے دن سارجنٹ جارڈن کو مارٹن کی جانب سے ایک قانونی نوٹس بھی وصول ہوا۔ نوٹس میں گاڑی کے نقصان کے ازالے کے ساتھ ساتھ ہرجانے کی ڈیمانڈ بھی کی گئی تھی۔ مارٹن کی گاڑی کی تلاشی ایک طرح سے اسے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ شیرف کے سامنے بے عزتی بھی ہوئی اور اب عدالت میں پیشیاں بھی بھگتنا تھیں اور عدالتی فیصلہ بھی شاید اس کے خلاف ہی جاتا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ اس نے مارٹن کی کار کی سیٹس اور چھت پر لگے کپڑے کو پھاڑنے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ کار کے دروازے پر لگے کور اور ایک ایکسٹرا ٹائر بھی ضائع کر دیا تھا۔ ایک طرح سے دیکھا جاتا تو مارٹن نے اس پر ازالے و ہرجانے کا جو دعویٰ دائر کیا تھا، اس میں وہ سو فیصد حق بجانب تھا۔

یہ اتوار کا دن تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے آج گاڑیوں کا رش بھی خاصا کم تھا۔ رات بارش ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت میں یکلخت اضافہ ہو گیا تھا۔ سارجنٹ جارڈن چیک پوسٹ پر ہی موجود تھا تاہم اس وقت وہ اپنے کیبن میں ایک آرام دہ کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے ایک گیس ہیٹر آن تھا جس کی حرارت اس وقت اسے بہت سکون بخش محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کے تاثرات امڈ آئے۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ بلاضرورت اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ "یس....." اس نے اونچی آواز میں کہا تو گیری دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"سر! کتوں نے ایک گاڑی میں منشیات کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔" گیری نے کہا تو سارجنٹ جارڈن نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر گیس ہیٹر بند کیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ آؤ..... کہتے ہوئے وہ کیبن کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"سر! میں آپ کو مطلع کرنا چاہوں گا کہ یہ کار مارٹن نامی اسی شخص کی ہے جس کی گاڑی کی تفصیلی تلاشی ہم نے پہلے بھی لی تھی مگر کچھ برآمد کرنے میں ناکام رہے تھے۔"

گیری کی بات سن کر سارجنٹ جارڈن لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ گیری بھی کندھے اچکاتا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔

پولیس کے عملے نے مارٹن کی گاڑی ایک سائڈ پر رکوالی تھی اور وہ خود بھی گاڑی سے باہر نکل کر منہ بنائے ایک جانب کھڑا تھا۔

مارٹن یہ کہتے ہوئے کہ صبح سے یہ کتے کسی گاڑی پر نہیں بھونکے۔ آخر تمہاری کار میں ایسی کیا بات ہے کہ کتے بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ منشیات کی بو پائے بغیر یہ ایسا نہیں کرتے۔

"بہتر ہے کہ یہ سوال تم میرے بجائے اپنے کتوں سے کرو۔" مارٹن کا استہزائیہ لہجہ سن کر سارجنٹ جارڈن کا خون کھول اٹھا۔

"گاڑی کی تلاشی لو۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑے گیری کو مخاطب کیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیگر پولیس عملے کی جانب بڑھ گیا۔ ایک دفعہ پھر مارٹن کی کار کی بھرپور طریقے سے تلاشی لی گئی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ گیری اور اس کے ساتھی کار سے کچھ برآمد کرنے میں ناکام رہے۔

"سر! کچھ نہیں ملا۔" اس نے اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

"کیا میں جا سکتا ہوں سارجنٹ؟" مارٹن نے تیز لہجے میں استفسار کیا تاہم اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر محسوس کرتے ہی سارجنٹ جارڈن چونک پڑا۔

وہ ایک منجھا ہوا پولیس آفیسر تھا۔ ایسے میں مارٹن کے چہرے پر چھائی ہوئی گھبراہٹ کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہ غور مارٹن کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے اس طرح گھورنے پر مارٹن کی گھبراہٹ دوچند ہو گئی۔

"گیری! مارٹن کی کار کی سیٹس اور چھت کا کپڑا اپھاڑ ڈالو۔ ایکسٹرا ٹائر اور دروازوں پر لگا کور بھی پھاڑ دو۔" مارٹن کے چہرے کی گھبراہٹ دوچند ہوتے ہی سارجنٹ جارڈن نے تحکمانہ لہجے میں گیری کو حکم دیا۔

"نہیں....." مارٹن نے چلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی کار میں سب کچھ نیا ڈلوایا ہے۔ ایکسٹرا ٹائر بھی نیا خریدا ہے۔ تم نے پہلے بھی میرا نقصان کیا تھا۔ میں تمہیں دوبارہ ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"میں تمہیں متنبہ کرنا چاہوں گا کہ تم مجھے نہیں روک سکتے۔" سارجنٹ جارڈن نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔ "گیری آرڈر کی تعمیل کرو۔"

مارٹن اس بار کچھ نہ بولا۔ بس ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے کھڑا رہا جبکہ گیری اور اس کا ماتحت عملہ ایک بار پھر مارٹن کی کار کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک تیز دھار چاقو کی مدد سے کار کی سیٹس، چھت پر لگا کپڑا اور کار کے دروازوں پر لگے کور پھاڑ ڈالے گئے۔ ایکسٹرا ٹائر کو بھی

باقاعدہ پھاڑ کر چیک کیا گیا۔ ہر اس حصے کو دیکھا گیا جہاں کچھ چھپایا جا سکتا تھا۔ ایک پولیس والے نے مارٹن کی جامہ تلاشی بھی لی مگر کہیں سے بھی کوئی ایسی چیز برآمد نہ ہوسکی جو قانون کی گرفت میں آتی ہو۔

"سر! کچھ نہیں ملا۔" گیری نے مایوسانہ لہجے میں اعلان کیا تو سارجنٹ جارڈن نے اتنی زور سے ہونٹ بھینچے کہ اسے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا۔

آخر تربیت یافتہ کتے مارٹن کی کار میں منشیات کی بو پا کر کیوں بھونکنا شروع کر دیتے تھے اور پھر کار میں سے منشیات کیوں برآمد نہیں ہوتی تھی؟ یہ کتے اس دھوکے کا شکار کیوں ہوتے تھے کہ اس کار میں منشیات موجود ہے؟ یہ ایسے سوالات تھے جو تیزی سے سارجنٹ جارڈن کے ذہن میں گردش کر رہے تھے مگر وہ ان کا جواب تلاش کرنے سے یکسر قاصر تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اس نے کار کا ایکسٹرا ٹائر تو چیک کروایا تھا مگر منشیات کار کے چاروں ٹائروں کے اندر بھی تو چھپائی جا سکتی تھی۔ اس طرف تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کتوں نے یونہی بھونکنا نہیں شروع کر دیا تھا اور پھر مارٹن کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات کیوں موجود تھے؟ جب کار میں کچھ موجود ہی نہیں تھا تو اسے گھبرانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ جیسے جیسے سوچتا گیا اس کے شک کو تقویت ملتی گئی۔

"گیری! کار کے چاروں ٹائر پھاڑ کر چیکنگ کرو۔" نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ کیا میری کار کے ٹائر مفت میں آئے ہیں۔" مارٹن نے غصے سے آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔ تاہم سارجنٹ جارڈن نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی جبکہ اس کے ماتحت گیری نے دیگر پولیس کے عملے کے ساتھ فوراً اس کے حکم کی تعمیل شروع کر دی۔

گاڑی کے چاروں ٹائر بھی پھاڑ ڈالے گئے مگر نتیجہ حسبِ معمول ہی رہا۔ "سر! کچھ نہیں ملا۔" گیری نے سارجنٹ جارڈن سے کہا جو اب بھونچکا کھڑا ہوا تھا۔ وہ متحیر نگاہوں سے مارٹن اور اس کی کار کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کتوں سے واقعی میں غلطی کا ارتکاب ہوا ہے اور پھر کسی جانور پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

"تم جاسکتے ہو۔" اس نے پژمردہ سی آواز میں مارٹن کو مخاطب کیا۔

"اچھا مگر کیسے؟" مارٹن نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا ان پھٹے ہوئے ٹائروں کے ساتھ کار چلے گی؟"

سارجنٹ جارڈن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے واقعی میں اس نوجوان کے ساتھ خاصی زیادتی کر ڈالی ہے۔ منشیات برآمد کرنے کے چکر میں اس نے مارٹن کی کار کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کر ڈالا تھا۔

مارٹن شام کو اپنی گاڑی لے کر گیا۔ وہ ایک ٹیکسی پر نئے ٹائر خرید کر لایا تھا اور کار کے ٹائر تبدیل کرنے کے بعد ہی وہاں سے روانہ ہوا۔

اگلا دن اس کی توقع کے مطابق خاصا بھاری ثابت ہوا۔ شیرف نے اسے اپنے آفس بلایا اور اس کی اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی۔ اس نے سارجنٹ جارڈن سے کہا اگر اس نے خصوصی سفارش سے یہ چیک پوسٹ اسی مقصد کے لیے قائم کروائی تھی کہ شریف شہریوں کو تنگ کرتا رہے تو بہتر ہے اس چیک پوسٹ کو ختم کر دیا جائے۔ مارٹن نے اس تنظیم کے ذریعے سے جس کا وہ رکن تھا ایک بار پھر شدید احتجاج کیا تھا۔ اس بار شیرف کو بھی اس سے معذرت کرنا پڑی تھی۔ سارجنٹ جارڈن کو آج سے پہلے اتنی شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسے منشیات اسمگلروں سے نفرت تھی اور اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نے اپنے دل میں چھپی اس نفرت کی وجہ سے ہی مارٹن کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا تھا۔ منشیات کی لت میں مبتلا ہو کر اس کا اکلوتا بیٹا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

سارجنٹ جارڈن کو اپنے بیٹے کی موت کے بعد سے ہیروئن اسمگلروں سے ذاتی عداوت تھی۔ وہ ہمیشہ اسمگلروں کو گرفتار کرنے کے بجائے گولی مارنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اگر مارٹن کی گاڑی سے ہیروئن کا ایک بھی پیکٹ برآمد ہو جاتا تو شاید وہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتا مگر اب اسے یقین آچکا تھا کہ مارٹن کا منشیات سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک شریف اور سیدھا سادہ سا نوجوان ہے مگر آخر کتے اسی کی کار پر کیوں بھونکتے تھے؟ یہ بات وہ سمجھنے سے بدستور قاصر تھا۔ مارٹن کے معاملے میں ان کتوں نے پہلی بار غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے وہ جس گاڑی پر بھی بھونکے تھے، وہاں سے منشیات برآمد ہوئی تھی۔

اس سے اگلے دن اسے مارٹن کی جانب سے ایک اور قانونی نوٹس بھی مل گیا۔ اس بار ہرجانے کی ڈیمانڈ دوگنا کر دی گئی تھی اور سارجنٹ جارڈن بخوبی جانتا تھا کہ کیس کی شنوائی شروع ہونے کے بعد اسے عدالتی پیشیاں بھی بھگتنا

پڑیں گی اور اس بات کے بھی قوی امکانات تھے کہ کیس کا فیصلہ مارٹن کے حق میں جاتا۔ گویا عنقریب اسے اپنے ذاتی پیسوں سے ہرجانے کی رقم بھی بھرنا تھی۔

☆☆☆

ٹھیک دو دن بعد صبح کے دس بجے جب سارجنٹ جارڈن اپنے کیبن میں آرام کر رہا تھا، اس کے ماتحت گیری نے اسے آکر مطلع کیا کہ کتوں نے ایک کار پر بھونکنا شروع کر دیا ہے تو اس نے کہا کہ کار کو سائڈ پر لگواؤ اور اچھی طرح چیک کرو۔

"سر! یہ کار اسی مارٹن نامی نوجوان کی ہے جس کی کار پر ہمارے کتوں کو پہلے بھی دو دفعہ دھوکا ہوا ہے۔ تلاشی لینے پر کچھ برآمد نہیں ہوا تھا اور اس نے آپ کے خلاف شیرف کو شکایت کے ساتھ ساتھ عدالت میں ہرجانے کا دعویٰ بھی دائر کر دیا تھا۔ ویسے جیسے آپ حکم کریں۔" گیری نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"ہوں......" سارجنٹ جارڈن نے ہنکارا بھرا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر بولا۔ "جانے دو۔ اس کی کار میں کچھ نہیں ہے۔"

"یس سر! میرا بھی یہی خیال تھا۔"

گیری نے کہا اور پھر کیبن سے باہر نکل گیا جبکہ سارجنٹ جارڈن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

یہ وہی جگہ تھی جہاں باس تھامسن، رچرڈ، رابرٹ اور مارٹن کی میٹنگ ہوئی تھی اور مارٹن نے مخدوش حالات کے باوجود ہیروئن، چیک پوسٹ سے لے کر گزرنے کی ذمے داری اٹھائی تھی۔ باس تھامسن رچرڈ اور رابرٹ اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے۔ انہیں مارٹن کی آمد کا انتظار تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر اس وقت گہری مسرت کے تاثرات موجود تھے کیونکہ مارٹن ہیروئن کی کھیپ کامیابی کے ساتھ شہر میں ان کے ڈیلر تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا اور اب انہیں بھاری منافع حاصل ہونے والا تھا مگر مارٹن نے اس چیک پوسٹ کو کیسے کراس کیا تھا اور وہ بھی منشیات کی بھاری کھیپ کے ہمراہ جو اس کی کار کی سیٹس کے نیچے چھپائی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا پرتجسس سوال تھا جو ان کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا۔ تاہم وہ اس کا جواب تلاش کرنے سے قاصر تھے۔ اب مارٹن ہی اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ اس لیے وہ تینوں بے چینی سے مارٹن کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں مارٹن ہال میں داخل ہوا۔ اس نے سب سے گرمجوش انداز میں مصافحہ کیا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وکٹری۔" اس کے بیٹھتے ہی باس تھامسن پرجوش لہجے میں بولا۔ "ڈیلر تک مال پہنچ گیا ہے اور اس نے چند دنوں کے اندر اندر پیمنٹ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ مارٹن نے واقعی میں کارنامہ سرانجام دیا ہے مگر کیسے؟ یہ جاننے کے لیے ہم سب بے چین ہیں۔"

"ہاں مارٹن۔" باس کی بات پوری ہوتے ہی رچرڈ بھی بول پڑا۔ "ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ تم نے ان تربیت یافتہ کتوں کو کیسے ڈاج دیا۔ وہ کون سا حربہ آزمایا کہ تم کامیاب رہے۔ کیا تم نے ان کتوں پر کوئی جادو کر دیا تھا؟" رچرڈ کے آخری الفاظ سن کر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"مارٹن! اب تم تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔" باس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ اس منشیات کی ترسیل کے لیے تمہارے اور سارجنٹ جارڈن کے درمیان ایک چھوٹی سی نفسیاتی جنگ لڑی جائے گی اور تم اس چیک پوسٹ سے ہیروئن لے کر نکلنے میں بھی کامیاب رہو گے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ تم اپنی بات پر پورے اترے ہو اور تمہاری وجہ سے ہمیں بھاری منافع بھی حاصل ہونے والا ہے۔ تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو ہم سب مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ مائیکل کی موت اور مال کے پکڑے جانے کی وجہ سے میں خاصا مایوس ہو چکا تھا۔ بہرحال تمہارا کام قابلِ تحسین ہے۔ مگر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ تم نے ان تربیت یافتہ کتوں کو کیسے ڈاج دیا۔ کیا وہ کتے تمہارے تابع ہو گئے تھے؟"

باس کا متجسس لہجہ سن کر مارٹن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "میرے خیال میں مجھے پوری تفصیل بتانی پڑے گی۔" لمحاتی توقف کے بعد وہ بولا۔ "ظاہر ہے اگر میں نے اس کام کو پورا کرنے کی ذمے داری اٹھائی تھی تو میرے ذہن میں کوئی پلان بھی زیرِ گردش تھا۔ میں نے بس اس منصوبے پر پورے اعتماد کے ساتھ عمل کر ڈالا۔ میرے اور سارجنٹ جارڈن کے درمیان کون سی اور کیسی نفسیاتی جنگ لڑی گئی تھی، میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔ پہلی دفعہ میں خالی کار لے کر اس چیک پوسٹ سے گزرا۔

"تاہم کتوں کے بھونکنے پر وہ لوگ سمجھے کہ میری کار میں منشیات موجود ہے۔ انہوں نے دورانِ تلاشی میری کار کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم بھی کیا۔ کار کی سیٹس پھاڑ ڈالیں، چھت پر اور دروازوں پر لگے کور کے ساتھ ہی کیا ایکسٹرا ٹائر بھی پھاڑ ڈالا مگر

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود وہ کچھ برآمد کرنے میں ناکام رہے اور پھر اگر گاڑی میں کچھ ہوتا تبھی تو وہ کچھ برآمد کرتے۔

”اس کے بعد مجھے جانے کی اجازت دی گئی اور میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ میں اپنے علاقے کی ایک سماجی تنظیم کا رکن ہوں۔ دنیا کے سامنے ہماری حقیقت عیاں نہ ہو اس لیے ہمیں اس طرح کی سماجی تنظیموں سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔

”ہماری طرح کتنے ایسے اسمگلر ہیں جنھوں نے دنیا کے سامنے شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ بہر حال میں نے اس سماجی تنظیم کی وساطت سے شیرف کے آفس میں جا کر اپنی کار کے نقصان پر بھرپور احتجاج ریکارڈ کر دیا اور پھر سارجنٹ جارڈن کو نقصان کے ازالے کے ساتھ ساتھ ہرجانے کا ایک قانونی نوٹس بھی بھجوا دیا۔ اسی دن سے میرے اور اس کے درمیان نفسیاتی جنگ کا آغاز ہو گیا جس میں مجھے شروع سے ہی واضح برتری حاصل ہو گئی تھی۔“

”مگر جب تمہاری کار میں منشیات موجود ہی نہیں تھی تو ان کتوں نے بھونکنا کیوں شروع کر دیا؟ کیا رچرڈ کی بات درست ہے کہ تم نے واقعی میں ان کتوں پر کوئی جادو کر دیا تھا۔“ رابرٹ نے کہا تو وہ سب ایک بار پھر ہنس پڑے۔

”اس سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا۔“ مارٹن نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”چند دن کے بعد میں دوبارہ اس چیک پوسٹ پر گیا۔ حسب توقع کتوں نے دوبارہ میری کار کو سونگھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ سارجنٹ جارڈن شاید اس وقت اپنے کیبن میں موجود تھا۔ تاہم اطلاع سنتے ہی وہ باہر آ گیا۔ اس نے میری کار کی تلاشی لینے کا حکم دیا مگر کچھ نہ ملا۔ تاہم مجھے اس کے چہرے سے اندازہ ہو گیا کہ میری کار کی تفصیلی چیر پھاڑ کرنے کے بارے میں وہ کچھ تذبذب کا شکار ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس بار بھی ایسا کرے۔ اسے مکمل طور پر ذہنی شکست سے دوچار کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اسی لیے میں نے اس سے بات کرتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر غالب کر لیا۔ میری یہ چال کامیاب رہی اور سارجنٹ جارڈن کو یہ شک گزرا کہ اس بار میری کار میں ضرور کچھ موجود ہے۔ اس نے ایک بار پھر میری کار کا پوسٹ مارٹم کروا ڈالا۔ حتیٰ کہ اس بار چاروں ٹائر بھی پھاڑ ڈالے گئے مگر گاڑی میں کچھ ہوتا تو برآمد کرنے میں کامیاب ہوتا۔ اس ناکامی کے بعد سارجنٹ جارڈن کے چہرے پر جس قسم کے تاثرات ابھرے، ان سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر میرے سامنے شکست سے دوچار ہو چکا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگلی بار جب میں سچ مچ منشیات لے کر آؤں گا تو وہ کتوں کے بھونکنے کے باوجود میری گاڑی کی سیٹس وغیرہ پھاڑنے کا حکم دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ معمولی روٹین کی تلاشی لے گا تاہم میں کوئی کچا کھلاڑی نہیں ہوں۔ میں جانتا تھا لوہا گرم ہو چکا ہے مگر اس پر ایک آخری ضرب لگانا باقی تھا۔ میں نے ایک بار پھر شیرف کے آفس میں جا کر شکایت درج کروائی اور اگلے دن سارجنٹ جارڈن کو ایک اور لیگل نوٹس بھی بھجوا دیا۔ مجھے اس بات کی بھی اطلاع مل گئی تھی کہ شیرف نے اسے اپنے آفس بلا کر اس کی اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی تھی اور پھر قانونی نوٹس نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں اس پر بھرپور نفسیاتی برتری حاصل کر چکا ہوں اور توقع کے عین مطابق جب میں تیسری بار سچ مچ اپنی کار میں منشیات لے کر گیا تو اس نے مجھے جانے دیا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ میری کار سے کچھ نہیں ملے گا۔“

”لیکن اگر وہ تیسری بار بھی تمہاری کار کا پوسٹ مارٹم کر ڈالتا تو!“ رابرٹ نے اعتراض کیا۔

”اتنا رسک تو بہر حال لینا ہی پڑتا ہے۔“ مارٹن نے جواب دیا۔ ”ویسے مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ میرے نفسیاتی ڈاج میں آ گیا تھا۔ حقیقت میں یہ سارا کھیل ہی نفسیات کا تھا۔“

”تمہاری ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔“ باس تھامسن پرخیال لہجے میں بولا۔ ”تم نے واقعی میں ایک شاندار کھیل کھیلا ہے مگر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ جب تمہاری کار میں منشیات موجود نہیں ہوتی تھی تو کتے کیوں بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔ انہیں منشیات کی بو کیوں ملتی تھی؟“

”اس کے لیے میں بڑا آسان اور سادہ سا کام کرتا تھا۔“ مارٹن نے جواب دیا۔ ”میں ہیروئن کی کچھ مقدار کو پانی میں گھول لیتا تھا اور جب ہیروئن پانی میں تحلیل ہو کر مائع کی شکل اختیار کر لیتی تھی تو میں اس پانی کا اسپرے کی شکل میں گاڑی کے مختلف حصوں پر چھڑکاؤ کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کتوں کو سونگھنے پر گاڑی سے منشیات کی بو محسوس ہوتی تھی مگر تلاشی لینے پر کچھ نہیں مل پاتا تھا۔ اگر پولیس نے اسمگلروں کو پکڑنے کے لیے نت نئے حربے آزمانے شروع کر دیے ہیں تو ہم اسمگلر بھی ان سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی حربہ ایجاد کر ہی لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔“

نادیدہ زخم

شاذین رضوان

یہ بھی ایک الگ دکھ ہے کہ نادیدہ زخم کبھی کسی کو نظر نہیں آتا مگر تمام عمر ان میں رہ رہ کر ٹیسیں ضرور اٹھتی ہیں... اس کے دل پر بھی کچھ ایسے ہی زخم لگے تھے جن پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی۔ لوٹ مار کرنے والے اس گروپ میں ایک وہ بھی تھی جس نے مال کی طلب میں ایسی چال چلی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔

مغربی معاشرے میں الیکٹرک کمپنی سے ہرجانہ وصول کرنے کا انوکھا طریقہ



داوا کی گن نے مجھے دھوکا دے دیا۔ میں اپنے ساتھ اعشاریہ تین دو کا پستول لے کر آیا تھا کیونکہ یہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے بہ آسانی چھپایا جا سکتا ہے۔ میں نے چند فائر کیے لیکن اعشاریہ تین دو کی گولی ونڈ شیلڈ میں سوراخ کرنے میں ناکام رہی۔ گاڑی کی ٹکر سے میری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ میری جیکٹ پچھلے ایکسل میں پھنس گئی۔ میں آدھے بلاک تک گھسٹتا چلا گیا پھر ایک جھٹکا لگنے سے میری جیکٹ آزاد ہوئی اور لینڈ روور تیزی سے آگے نکل گئی۔ اس وقت تک میرا ذہن تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔

سرجن نے چمٹی کی مدد سے میرے سر کے عقبی حصے

سے کنکر نکالے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ یہ عمل پہلے بھی ایک موٹر سائیکل سوار پر آزما چکا ہے جس نے سر پر ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا تاہم وہ مریض جانبر نہ ہوسکا۔ ڈاکٹروں نے مجھے اس وقت تک اسپتال میں رکھا جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہوگیا کہ سر کے زخم میں انفیکشن تو نہیں ہوجائے گا۔ لہٰذا میرے پاس پولینا کے بارے میں سوچنے کے لیے کافی وقت تھا۔ اس رات میں نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ وہ خود بھی بچنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹورنس پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سراغ رساں نارسن اسپتال میں مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ایک کرخت چہرے والا شخص تھا جس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے دادا کی گن کے بارے میں پوچھا جو انہیں گٹر میں سے ملی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔

''کیا تمہارے پاس اس کا لائسنس ہے؟''

''نہیں اور میں اسے باقاعدگی سے استعمال نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس رات وہ میرے پاس تھی۔'' میں نے اسے رچرڈ بلینٹن کے بارے میں بھی بتایا اور کہا۔ ''میں اس کا تعاقب کررہا تھا۔ ضرور اسی نے مجھے ٹکر ماری ہوگی۔''

''تمہیں ٹکر ماری...... مگر کیوں؟''

''اسے احساس ہوگیا تھا کہ میں اس کا پیچھا کررہا ہوں۔''

''ٹکر مار کر بھاگ جانا ایک سنگین جرم ہے۔''

''اگر میں یہاں نہ آتا تو میری موت واقع ہوجاتی۔'' میں نے کہا۔ میں نے سے بلینٹن کے گھر اور دفتر کا پتا بتا دیا جہاں وہ مل سکتا تھا۔

''پہلے کون پیدا ہوا؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔ ''مرغی یا انڈا؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ اپنا بچاؤ نہیں کررہا تھا؟''

''تم اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟''

''میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔'' نارسن نے کہا۔

میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا مجھے وکیل کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

بہت سے دوسرے کیسوں کی طرح یہ کیس بھی میرے پاس آسکر کی معرفت آیا تھا۔ ایک مہینا پہلے ہماری ملاقات اس کی پسندیدہ جگہ گلیورز میں ہوئی تھی۔ آسکر فراڈ کے معاملات میں بیمہ کمپنیوں کا دفاع کیا کرتا تھا۔

''یہ بہت حساس معاملہ ہے۔'' آسکر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ایک بچہ ملوث ہے جس کے ساتھ صحت کے مسائل ہیں۔ اگر کوئی تصفیہ نہیں ہوا اور معاملہ عدالت میں چلا گیا......'' آسکر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تو یہ بڑی آسانی سے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''تمہارا کلائنٹ کون ہے؟''

''سدرن کیلی فورنیا ایڈیسن۔''

''یہ تو الیکٹرک کمپنی ہے۔''

آسکر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے مجھے اپنا کنسلٹنٹ مقرر کیا ہے۔''

''فراڈ کی نوعیت کیا ہے؟''

''کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ مجھے وضاحت سے پوری بات بتائے۔

''یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ وہ مکان ساٹھ کی دہائی میں بنایا گیا تھا اور سب اسٹیشن سے متصل ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا آئی پیڈ کھولا اور مجھے اس مکان کی تصویر دکھائی۔ وہ ایک عام سا سنگل اسٹوری مکان تھا جس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے عقب میں ٹرانسفارمر کا احاطہ تھا اور یہ سب اسٹیشن اس مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ عقبی صحن میں کچھ زنگ آلود سامان اور بڑھی ہوئی گھاس نظر آرہی تھی۔

آسکر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس مکان میں رہنے والوں کو شکایت ہے کہ دیواروں میں نصب کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے سے بجلی کا جھٹکا لگتا ہے۔ گوکہ یہ جان لیوا نہیں لیکن اس سے جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ فیملی کا دعویٰ ہے کہ مسلسل بجلی کے جھٹکوں کی وجہ سے ان کے لڑکے کا دماغی اور اعصابی نظام متاثر ہورہا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''لڑکے کی عمر کیا ہے؟''

''ایلیکس پندرہ سال کا ہے۔ اسے نقل و حرکت اور سیکھنے میں مسئلہ ہورہا ہے۔'' آسکر نے مجھے اس لڑکے کی تصویر دکھائی جس کی ٹانگوں کو تسمے سے کس کر باندھا گیا تھا۔ یہ تصویر بحالی کے مرکز میں لی گئی تھی۔

''گویا تمہیں یہ شبہ ہے کہ بجلی کے جھٹکوں کا اس لڑکے کی حالت سے کوئی تعلق نہیں۔''

''مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ یہ حقیقی فیملی نہیں ہے۔'' آسکر نے بارٹینڈر کو مزید بیئر لانے کا اشارہ کیا۔ ''لڑکے کی ماں یوکرائن سے یہاں آئی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے

مجھے ایک پُرکشش عورت کی تصویر دکھائی جس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ''پولینا کئی سال پہلے یہ لڑکا بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ لڑکے کا باپ رچرڈ بلینٹن ساؤتھ بے میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کرنے سے پہلے انشورنس کمپنیوں سے قابلِ اعتراض تصفیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں اور وہ جانتا ہے کہ کیسے کھیلنا ہے۔ اس کے پس منظر اور کچھ دوسری باتوں کی وجہ سے مجھے یہ سوچا سمجھا منصوبہ لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا پھر بولا۔

''میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مقدمہ بازی کا شوقین ہے۔ یہ ایک جذباتی کیس ہے جس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کون سے قابلِ سزا نقصانات ہیں جن کی بنا پر اسے یہ مقدمہ جیتنا چاہیے۔''

''انہیں اس مکان میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''تقریباً چار سال۔''

''کیا اس سے پہلے بھی لڑکا بیمار تھا؟''

''یوکرائن سے ملنے والے ریکارڈ کے مطابق وہ بالکل ٹھیک تھا لیکن وہاں کی رپورٹیں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہاں اسکول میں داخل ہونے سے پہلے اس کا طبی معائنہ ہوا لیکن وہ محض خانہ پُری تھی۔ کچھ عرصے بعد اسے اسکول سے اٹھالیا گیا اور گھر پر ہی پڑھائی شروع ہوگئی۔''

''کیا گھر میں کسی اور فرد کو بھی کوئی بیماری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''گویا تمہیں شبہ ہے کہ رچرڈ بلینٹن نے یہ مکان خریدا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ سب اسٹیشن سے متصل ہونے کی وجہ سے اس میں بجلی کے جھٹکے لگتے ہیں پھر اس نے ایک روسی عورت سے آن لائن شادی کی جس کا ایک ذہنی طور پر پسماندہ بچہ بھی تھا اور اس مکان میں منتقل ہوگیا۔''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' آسکر نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ایک قانونی فرم کی خدمات حاصل کیں جو اس قسم کے مقدمات جیتنے میں مشہور ہے۔ اب ان کا ارادہ بجلی کمپنی کے خلاف مقدمہ کرنے کا ہے جس میں وہ اس معذور بچے کا کارڈ استعمال کریں گے۔ ہم اس سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔ ہماری طرف سے فیاضانہ پیشکش ہوئی لیکن معاملہ طے نہ ہوسکا۔ اس کیس میں اتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑرہی ہے کہ دفتر کے ایک ساتھی نے اس کا نام الیکٹرک بوگا لو رکھ دیا۔''

''اس فلم کا نام بریکنگ ٹو تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم اس بارے میں کیسے جانتے ہو؟'' آسکر نے پوچھا۔

اس وقت مجھے مونا کا خیال آیا جس کے ساتھ میں نے اس رات وہ فلم دیکھی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میری ایک گرل فرینڈ کو یہ فلم بہت پسند تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں یہ فلم اس کے ساتھ دیکھوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''مونا؟''

''ہاں۔''

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ وہ میری گزشتہ زندگی کے بارے میں جانتا تھا گوکہ وہ مونا سے کبھی نہیں ملا لیکن میں نے اپنی کتاب میں مونا کے بارے میں جو اعتراف کیا وہ اس نے پڑھ رکھا تھا۔ مونا کی موت میری وجہ سے ہوئی اور وہ حادثہ سراسر میری غلطی تھی۔ اس احساسِ جرم نے میری زندگی بدل کر رکھ دی اور میں نے دھوکا دہی سے توبہ کرلی۔

لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ بجلی کمپنی اس کی ذمے دار ہو۔ میں سائنسداں نہیں ہوں لہٰذا اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ پرائیویٹ سراغ رساں کی حیثیت سے میرا کام صرف سچ تلاش کرنا تھا۔

آسکر نے کہا۔ ''میں تمہیں دیگر تفصیل ای میل کردوں گا۔ تم ان لوگوں پر نظر رکھو تاکہ مجھے حقیقت کا علم ہوسکے۔''

میں اپنے دفتر واپس آیا جہاں میرے کتے سوزی نے میرا استقبال کیا۔ گوکہ وہ ٹائپ نہیں کرسکتا اور نہ ہی فون کا جواب دیتا ہے لیکن میرے لیے اس کا ساتھ ہی کافی ہے۔ میں نے اسے خوراک دی اور اس کا پیالہ پانی سے بھر دیا پھر اپنی میز پر بیٹھ کر آسکر کی بھیجی ہوئی ای میل دیکھی۔

اس میں ایلیکس کی میڈیکل رپورٹیں، نسخے، ممکنہ گواہوں کی فہرست اور کیلی فورنیا پبلک یوٹیلیٹیز کمیشن کے سیفٹی اینڈ انفورسمنٹ ڈویژن کی طویل رپورٹ شامل تھی۔ میں ری ڈونڈو بیچ پر رچرڈ بلینٹن کا دفتر بھی دیکھ سکتا تھا۔

سوزی کی چہل قدمی کا وقت ہورہا تھا لہٰذا میں نے اس مکان کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اگر کوئی اجنبی اس مکان کے اردگرد گھومتا ہوا نظر آتا تو اس پر شبہ ہوسکتا تھا لیکن کتے کے ساتھ وہاں جانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی

زنجیر پکڑی اور کار میں بیٹھ کر ٹورینس کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں نے کار ایک بلاک کے فاصلے پر کھڑی کی اور پیدل مکان کی جانب چل دیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ مکان کافی عرصے سے غیر آباد تھا۔ لان پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور ڈرائیو وے میں فری اخبارات پڑے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں سب اسٹیشن کے گرد زنجیر کی باڑ لگی ہوئی تھی اور وہ مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ مجھے ٹرانسفارمر کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے میل باکس کو چھوا لیکن مجھے کوئی جھٹکا نہیں لگا۔ اس کے علاوہ کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ اس لیے ہم وہاں سے چل دیے۔

ہمارا دوسرا اسٹاپ کرائے کی وہ جگہ تھی جہاں یہ خاندان منتقل ہوا تھا۔ وہ عمارت بہت سے دو منزلہ فلیٹوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر پتا چیک کیا اور گاڑی شیڈ میں کھڑی کردی پھر کار کی ڈکی سے ایک کلپ بورڈ نکالا تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ میں کوئی کاریگر یا ڈلیوری مین ہوں۔ مجھے وہاں صرف چند منٹ ہی رکنا تھا اس لیے سوزی کو کار میں ہی چھوڑ دیا۔ میں مرکزی گیٹ اور ڈاک کے بکسوں کے پاس سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہاں دیوار پر ہاتھ سے لکھے ہوئے گمشدہ بلیوں کے اشتہار چسپاں تھے۔ میں دروازوں کے نمبر پڑھتا ہوا دوسری منزل پر پہنچا تو ایک فلیٹ کی سامنے والی کھڑکی سے گزرتے ہوئے مجھے ایلیکس نظر آگیا جو کاؤچ پر بیٹھا ہوا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ بیساکھیوں کی جوڑی اس کے برابر میں رکھی ہوئی تھی۔

میں اپنی کار پر واپس آیا تو دیکھا کہ پولینا میری گاڑی کے عقب میں اپنی کار پارک کررہی تھی۔ آسکر نے مجھے اس کی تصویر دکھائی تھی اس لیے میں فوراً پہچان گیا۔

وہ اپنی شیوی وولٹ سے باہر آئی۔ اس نے ٹینس کھیلنے کا لباس پہن رکھا تھا اور بال پیچھے کی طرف باندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور عمارت کے اندر چلی گئی۔ اسے دیکھ کر مجھے سوفا یاد آگئی۔ دونوں کا ناک نقشہ بہت ملتا جلتا تھا۔

میرا اگلا اسٹاپ بلیئلن کا دفتر تھا۔ اس علاقے میں اونچے درجے کے بوتیک اور ریستوران تھے۔ میں نے سوزی کی زنجیر تھامی اور اسے لے کر چہل قدمی کے ارادے سے چل دیا۔ اس کا دفتر ایک آرٹ گیلری اور فرنیچر اسٹور کے بیچ میں تھا۔ میں نے وہاں رک کر اس جگہ کا جائزہ لیا اور کھڑکی میں لگی جائداد کی فہرست پڑھنے لگا۔ اندر ایک پرکشش بھورے بالوں والی لڑکی فون پر باتیں کررہی تھی۔ اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں کھڑکی میں لگے ہوئے پوسٹروں سے جان چکا تھا کہ ان جائدادوں کی قیمت ایک ملین ڈالرز سے زیادہ تھی۔ مجھے بڑا عجیب محسوس ہوا کہ ایسی جگہ پر کام کرنے کے باوجود رچرڈ پرانے مکانوں یا دور افتادہ فلیٹ میں رہ رہا تھا۔

رچرڈ دفتر میں موجود نہیں تھا لیکن کھڑکی میں لگے ہوئے ایک پوسٹر سے معلوم ہوگیا کہ اگلے روز ایک اوپن ہاؤس ہورہا تھا۔ میں نے اپنے فون سے اس جگہ کا پتا تصویر کی شکل میں محفوظ کرلیا۔ اگلے روز میں سہ پہر میں سوزی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک جدید دو منزلہ گھر کے باہر سڑک پر کھڑی کی۔ جب میں ڈرائیو وے سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ کے ساتھ سیاہ رنگ کی لینڈ روور کھڑی ہوئی تھی۔

اندر رچرڈ ایک درمیانی عمر کے جوڑے سے باتیں کررہا تھا جو غالباً متوقع خریدار تھے۔ لہٰذا بھورے بالوں والی لڑکی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ اس نے منی اسکرٹ، سفید سلک کا بلاؤز اور بلیزر کوٹ پہن رکھا تھا۔

”خوش آمدید..... میرا نام لورا ہے۔“ اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اپنا فرضی نام بتایا۔ ”میں باب ہوں۔“ اور ہاؤس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے خوب صورت فرنیچر اور تجریدی آرٹ سے سجایا گیا تھا۔ ”میں قریب میں ہی رہتا ہوں، صرف اسے ایک نظر دیکھنے چلا آیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے کبھی مکان بیچنے کے بارے میں سوچا ہے؟“

”میں کرائے پر رہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں مکان خرید لینا چاہیے کیونکہ اس وقت سود کی شرح کم ہے۔“ وہ بناوٹی مسکراہٹ سے بولی۔

رچرڈ کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ چالاک اور مغرور۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ جوڑے کو چھوڑ کر میرے پاس آتے۔ لہٰذا میں نے لورا کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے باہر آگیا۔ چونکہ اوپن ہاؤس کو تین گھنٹے چلنا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ واپس آکر بلیئلن

کا تعاقب کروں گا۔ میں اپنی کار میں ہی بیٹھا رہا۔ تقریباً چار بجے رچرڈ اور لورا باہر آئے اور سیاہ لینڈ روور میں بیٹھ کر چل دیے۔ میں نے بھی کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرنا شروع کردیا۔

اچانک ہی ایک موڑ پر اس نے اپنی گاڑی روکی اور وہاں کھڑی ہوئی ایک ایس یو وی کار کی جانب بڑھے۔ دونوں میں سے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے لگا کہ یہ ان کا معمول ہے اور وہ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ لورا نے کار کی ڈکی کھولی اور رچرڈ نے کچھ سامان اس میں رکھ دیا پھر اس نے لورا کا بوسہ لیا۔ یہ محبت کا اظہار تھا جس سے واضح ہوگیا کہ ان کا تعلق صرف بزنس تک ہی محدود نہیں۔

میں نے ایک بار پھر لینڈ روور کا تعاقب شروع کردیا جو ساؤتھ ری ڈونڈو پر واقع ایک اوشین فرنٹ ٹاور پر ختم ہوا۔ گاڑی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں چلی گئی۔ بلیئلن کے دفتر اور کاروبار کو دیکھتے ہوئے یہ مہنگی رہائش گاہ زیادہ مناسب معلوم ہورہی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے تازہ ترین صورت حال بتانے کے لیے آسکر کو فون کیا تو وہ بولا۔ ”رچرڈ اور پولینا اب بھی قانونی طور پر میاں بیوی ہیں۔ لہٰذا عدالت کی نظر میں موجودہ گھریلو صورت حال کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”لیکن کیا ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کررہے کہ یہ ایک حقیقی فیملی نہیں ہے؟“

”اس وقت ہمارے سامنے دوسرا مسئلہ ہے کہ کیا کمپنی دوسرے لوگوں کی حفاظت کے معاملے میں غفلت کی مرتکب ہوئی ہے۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم رچرڈ اور اس کی روسی بیوی پر نظر رکھو۔ ایسے لوگوں کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے بہتر زندگی کی تلاش میں ہو۔“ میں نے کہا۔

میں نے رچرڈ اور پولینا کی گاڑیوں کے نیچے ٹریکر لگا دیے اور میرا اگلا ہفتہ ان دونوں کے تعاقب میں گزرا۔ رچرڈ اپنا زیادہ وقت دفتر یا پھر لورا اور دوسری عورتوں کے ساتھ سیر و تفریح میں گزارتا۔

اس دوران پولینا اپنے بیٹے کو مغربی لاس اینجلس میں واقع فزیو تھراپی کے مرکز میں لے جانے لگی۔ ایلیکس بیساکھی کے سہارے چل سکتا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں اس کی مدد کرے اور اگر وہ ایسی کوشش کرتی تو اس پر غصہ ہونے لگتا۔

جب رچرڈ تقریباً ہر روز رات کو گھر سے باہر رہنے لگا تو بھی پولینا نے اس کی پروا نہیں کی اور ساؤتھ بے میں واقع ایک ٹینس کلب میں جانے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی مقابلے کی تیاری کررہی ہے۔ اس کلب میں سب تجربہ کار عورتیں تھیں اور میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ یہ عورتیں بہت زور سے گیند کو نشانہ بناتیں اور سنجیدگی سے کھیلتی رہیں۔

اس کلب میں ایک بار بھی تھا اور پولینا میچ ختم ہونے کے بعد کبھی کسی ساتھی اور زیادہ تر اکیلی وہاں بیٹھ کر ایک گلاس مشروب پیتی۔ اس کلب کے ایک حصے کی از سر نو آرائش ہورہی تھی چنانچہ میں نے یہاں بھی اپنا کلپ بورڈ استعمال کیا اور استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ میں بلڈنگ انسپکٹر ہوں۔ پہلے دن اپنی شناخت کروانے کے بعد مجھے اندر جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

ایک روز میں سہ پہر میں پولینا سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے درمیان صرف دو اسٹول تھے اور وہ اپنے آئی فون پر کچھ دیکھ رہی تھی۔

”تم میری کی لیگ میں ہو؟“ میں نے ہوا میں تیر چلایا کہ شاید اس کے گروپ میں میری نام کی کوئی کھلاڑی ہو کیونکہ یہ ایک عام نام ہے۔

”ہاں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہارا کھیل دیکھا ہے۔ اچھا کھیلتی ہو۔“

”جب مجھے پہلے سروس کا موقع ملے۔“ اس نے کہا۔

میں نے یہاں بھی اپنا تعارف باب کے طور پر کروایا اور ہمارے درمیان مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے پہلے سے کچھ سوالات سوچ رکھے تھے۔ مثلاً اس کا تعلق کس جگہ سے ہے اور وہ امریکا میں کب سے رہ رہی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ عام طور پر لوگ کسی اجنبی کے ساتھ اس طرح نہیں کھلتے لیکن پولینا ان سے مختلف تھی۔ اس نے رچرڈ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ بیٹے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

میں نے محتاط انداز میں اس سے کچھ مزید تفصیلات حاصل کیں۔ اس نے ایک اور مشروب کا آرڈر دیا اور پوچھنے لگی کہ میرے چہرے پر یہ زخم کیسے آیا۔ یہ نشان مجھے اس حادثے کی یاد دلاتا تھا جس میں سوفا ماری گئی۔

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”میں دوسروں کی حفاظت کا خیال کیے بغیر بے پروائی سے گاڑی چلا رہا تھا کہ حادثہ پیش آگیا۔“

”اوہ۔ کسی اور کو تو چوٹ نہیں لگی؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ حساس موضوع ہے۔ اس لیے ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم سب سے غلطیاں ہوتی ہیں۔“

”جب بھی آئینہ دیکھتا ہوں تو وہ حادثہ یاد آ جاتا ہے۔“

پولینا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو کبھی نہیں بھرتے۔“

”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

پولینا نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ کافی عرصے بعد اور کسی عورت نے میرا ہاتھ چھوا تھا۔ گو کہ یہ بہت ہلکا سا دباؤ تھا لیکن اسے محسوس کر کے میرا دل اچھلنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

اس نے اپنا مشروب ختم کیا اور بولی۔ ”تم سے یہ ملاقات اچھی رہی۔“

”امید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔“ میں نے کہا اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

گھر جاتے وقت میں اپنے ذہن سے پولینا کو نہیں نکال سکا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ میری خدمات حقائق معلوم کرنے کے لیے حاصل کی گئی ہیں لیکن اگلے روز پھر میں اس کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے کلب پہنچ گیا تاہم میں نے اپنے آپ کو اندر جانے سے روکا اور اپنا کام وہیں سے شروع کیا جہاں سے چھوڑا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ پولینا کے بارے میں حاصل کردہ معلومات سے آسکر کو کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ لہٰذا میں نے اپنا رخ رچرڈ ہلینگٹن کی طرف کر لیا۔ اس کا پس منظر چیک کر کے معلوم ہوا کہ وہ کئی کاروبار کر چکا ہے جن میں اسے ناکامی ہوئی۔ کئی برس پہلے وہ ایک سابق گرل فرینڈ پر گھریلو تشدد کرنے کے الزام میں گرفتار بھی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی گاڑی کی نقل و حرکت جاننے کے لیے اپنا کمپیوٹر آن رکھا اور ایک شام مجھے معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی پولینا کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی ہے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

میں کمپاؤنڈ کے عقبی حصے میں گیا۔ بیڈ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ان کے بحث کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن میں نہ سن سکا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور رچرڈ تیزی سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا لیکن وہ اپنی لینڈ روور کے بجائے پولینا کی شیورلے وولٹ لے کر چلا گیا۔ اگلے دن مجھے اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ پولینا اس کا ٹرک لے کر گئی اور اس میں ایکسرسائز کرنے کی مشین لے کر آئی اور اسے اپارٹمنٹ میں نصب کر دیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ ایلیکس اسے ٹیسٹ کر رہا تھا۔ گویا اس کے لیے گھر پر ہی تھراپی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

اگلے دو ہفتوں تک میں ان دونوں کا محتاط طریقے سے پیچھا کرتا رہا پھر ایک عجیب اتفاق ہوا۔ میں سپر اسٹور میں کچھ خریداری کر رہا تھا کہ پولینا وہاں آ گئی۔ ایلیکس بھی اس کے پیچھے بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا آ رہا تھا۔

”ہائے باب۔“ اس نے خوش مزاجی سے کہا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔“

”میں تمہارے بارے میں ہی سوچتی رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میرے بارے میں؟“

”ہاں۔ تمہارے نظر نہ آنے والے زخموں کے بارے میں۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ٹینس کیسی جا رہی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن مجھے مزید مشق کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ سروس اپنے پاس رکھ سکوں۔“

ایلیکس نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور روسی زبان میں اس سے کچھ کہا پھر بولی۔ ”ایلیکس! یہ باب ہے۔“

ایلیکس نے مجھے مشتبہ انداز میں دیکھا۔ پولینا بولی۔ ”ممکن ہے کہ ہماری ملاقات کلب میں ہو۔“ پھر اس نے ایک کاغذ پر اپنا نمبر لکھ کر دیا اور بولی۔ ”اگر تم کلب آنا چاہو تو مجھے فون کر لینا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے وہ کاغذ لیتے ہوئے کہا حالانکہ کبھی ریکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں ٹینس کھیلتا ہوں۔

دفتر آنے کے بعد میں نے کئی بار اس کاغذ کو دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ چاہنے کے باوجود میں اس کا پیچھا نہیں کر سکتا پھر اس رات میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے اسے فون کر کے معذرت کی کہ چوٹ لگ جانے کی وجہ سے میں ٹینس کھیلنے کے لیے کلب نہیں آ سکا۔ کیوں نہ ہم ڈنر پر ملاقات کریں۔ اس نے مجھے اپنا پتا دیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

اگلے روز میں تیار ہو کر اس سے ملنے چلا گیا۔ ایلیکس ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ میں نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ ”تم کیا کھیل رہے ہو؟“

اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور ماں سے بولا۔ ”تم کب تک واپس آ ؤ گی؟“

”جلدی آ جاؤں گی۔“ اس نے وعدہ کیا۔ ”فریج میں پیزا رکھا ہوا ہے۔ اگر بھوک لگے تو مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھا لینا۔“

ایلیکس نے مجھے زہریلی نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولینا میرے ساتھ باہر جائے۔ کار کی طرف جاتے ہوئے پولینا نے اس کے رویّے پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”اسے لوگوں سے قریب ہونے میں وقت لگتا ہے۔“

”شاید وہ اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ ہم اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔“ میں نے پیشکش کی۔

”نہیں۔ مجھے وقفہ چاہیے۔“

ہم ری ڈونڈو... بیچ پر واقع اولڈ ٹونی کے ریستوران میں گئے جہاں کی سی فوڈ مشہور تھیں۔ اس نے مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ایلیکس کا باپ انتہائی غیر مہذب اور بدزبان تھا پھر وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ رہ کر اپنے بچے کی پرورش کی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور پیسے جمع کیے تاکہ وہ امریکا آ سکے۔

”ویزا ختم ہونے کے بعد کیا کرو گی؟“ میں نے پوچھا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ اس نے شہریت حاصل کرنے کے لیے رچرڈ سے شادی کی تھی۔

”میں یہاں کی شہری ہوں۔“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس نے امریکا آنے کے بعد یہاں شادی کر لی تھی لیکن اس نے رچرڈ ہلینگٹن کا نام نہیں لیا بلکہ اس کے بجائے اس نے سابق شوہر کہا جبکہ میں جانتا تھا کہ قانونی طور پر ان کی شادی اب بھی قائم ہے۔

”لیکن میرے بیٹے کو ابھی یہاں کی شہریت نہیں ملی۔ ایسے کاموں میں وقت لگتا ہے اور اس کی ایک وجہ اس کی صحت کے مسائل بھی ہیں......“

میں اسے اپنے ماضی یا حال کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے یہی ظاہر کیا کہ میں ایک سیلز مین ہوں اور

"اپنے کام کے سلسلے میں مسلسل سفر کرتا رہتا ہوں۔"

واپسی پر میں اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اس نے مجھے سیڑھیوں کی طرف کھینچا اور گلے لگتے ہوئے بولی۔ "اس خوب صورت شام کے لیے شکریہ۔"

اس کے اپارٹمنٹ میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں مجھے کھڑکی سے دور لے گئی تھی تاکہ ایلیکس ہمیں نہ دیکھ سکے۔ میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے سے قریب کیا اور بولا۔ "میں تم سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے ویڈیو کال کرنا تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔" وہ چند لمحے میرے چہرے کے زخم اور بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی پھر میری گرفت سے نکل کر دروازے کی طرف چلی گئی۔

گھر جاتے ہوئے میں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس سلسلے کو جاری رکھ سکوں۔ اگر ہم اسی طرح ملتے رہے تو بالآخر وہ جان جائے گی کہ میں نے اس سے جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو ویڈیو کال کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔ میں نے اس سے اپنے کتے سوزی کا تعارف کروایا اور ہم نے اگلی بار ڈاگ پارک میں ملنے کا پروگرام بنایا۔

اس دوران میں رچرڈ بلیغن کا تعاقب کرتا رہا۔ ایک مرتبہ وہ لورا کے ساتھ ریستوران سے باہر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے لورا کا بازو پکڑا اور اسے کسی بات پر سرزنش کرنے لگا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی جیسے وہ اسے مارنے والا ہو۔ یوں لگا جیسے وہ یہی کرنے والا ہو لیکن سرِعام ایسا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اسے اپنے آپ پر قابو پانا پڑا۔ اس لمحے مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ پولینا کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہوگا۔

پولینا نے ایک دن مجھے فون کر کے ساحل پر ملنے کا پروگرام بنایا۔ ہم کچھ دیر سمندر کے کنارے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے پھر میری نظر ایک ہوٹل پر گئی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ کچھ دیر وہاں قیام کیا جائے۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور ہم نے چند گھنٹوں کے لیے ایک کمرا کرائے پر لے لیا تاکہ تنہائی کے لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے کام پر پوری توجہ نہیں دے رہا جس کی وجہ سے میری آمدنی متاثر ہو رہی تھی۔ میرے دماغ پر ہر وقت پولینا سوار رہتی تھی لیکن میں نے اس سے ملنے کی خواہش کو دبانے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے رابطہ کرنا چھوڑ دیا گو کہ وہ مجھے مسلسل وائس میل اور پیغامات بھیجتی رہی۔ بالآخر میں نے اسے ویڈیو کال کر کے رابطہ نہ کرنے پر معذرت کی اور بہانہ بنایا کہ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اس نے رات میں بھی دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔

"تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ۔" اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک حادثہ پیش آیا تھا۔"

"کیسا حادثہ؟"

جب پولینا نے چشمہ ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ سیاہ ہو رہی تھی۔

"کیا یہ رچرڈ کی حرکت ہے؟" میں نے پوچھا پھر احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ وہ کبھی رچرڈ کا نام نہیں لیتی۔

"میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم مت آنا۔" پھر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔ "مجھے باہر جانا ہے۔" اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے کافی دیر سے لینڈ روور کی نقل و حرکت چیک نہیں کی تھی۔ اس وقت وہ پولینا کے بلاک کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ جب میں نے اپنے دادا کی گن نکالی تو میرا ارادہ اسے استعمال کرنے کا نہیں تھا بلکہ میں صرف بلیغن کو خوفزدہ کرنا چاہ رہا تھا تاکہ وہ پولینا پر مزید تشدد نہ کرے۔ اس کی لینڈ روور سڑک کے دوسری جانب کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ وہ میری طرف ہی آ رہی تھی۔ دونوں طرف کھڑی ہوئی گاڑیوں نے میرے نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے گن نکالی اور فائر کر دیا۔

☆☆☆

اسپتال سے ڈسچارج ہونے پر آسکر مجھے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے آیا۔ اس نے میری غیر موجودگی میں سوزی کا خیال رکھا تھا بلکہ پولیس والوں سے مل کر گن کا معاملہ بھی نمٹا دیا۔ البتہ مجھے شہر کی حدود میں غیر قانونی فائرنگ کرنے پر جرمانہ ادا کرنا تھا۔ اس کے بعد میں ساٹھ دن کے اندر

اپنے دادا کی گن واپس لے سکتا تھا۔

آسکر نے کہا۔ "سراغ رساں نارمن کو کچھ مزید سوالات کرنے ہیں اور اس نے کل دوپہر میٹنگ رکھی ہے۔ ہم اکٹھے ہی جائیں گے۔"

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

"مجھے شبہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر ٹکر مارنے کے امکان پر غور کر رہا ہے۔"

"اسے چاہیے کہ وہ بلیغن کو گرفتار کرے۔"

میں کپڑے بدل کر آیا تو آسکر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اس سلسلے میں کچھ کیا یا نہیں لیکن بلیغن نے تصفیہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے بے اختیار کہا۔ "کتنے پیسوں میں؟"

"ابھی یہ طے ہونا باقی ہے۔ تصفیے کی رقم لاکھوں میں ہو سکتی ہے لیکن کروڑوں میں نہیں۔" پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے تمہیں مارنے کی کوشش کیوں کی؟"

میں سوچنے لگا کہ کیا رچرڈ کو میرے اور پولینا کے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میں پولینا سے مل رہا تھا۔ ہمارے درمیان ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے، یہ سب اچانک ہی ہو گیا۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ میں تمہارے لیے کام کر رہا تھا۔"

"مجھے مزید کچھ مت بتاؤ۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔"

"یہ میری غلطی تھی جس پر مجھے افسوس ہے۔"

"تمہاری اس حرکت کی وجہ سے میرا لائسنس معطل ہو سکتا ہے۔ جب میں نے تمہاری خدمات حاصل کیں تو تم میری قانونی فرم کے نمائندے بن گئے اور تم پر لازم ہو گیا کہ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے سلسلے میں قانون کی پابندی کرو۔"

"وہ میرا اصلی نام نہیں جانتی۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ تم مخالف فریق کے لیے کام کر رہے تھے؟"

"نہیں۔ دراصل ہم دونوں ہی تنہائی کے مارے ہوئے تھے لیکن اب یہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔"

"تم خوش قسمت ہو کہ زندہ بچ گئے۔" اس نے کہا۔

کیونکہ میری کار ابھی تک پولینا کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی ہوئی تھی اس لیے میں اسے لینے کے لیے جائے وقوعہ پر گیا۔ میں نے ٹرنک سے اپنا سیل فون نکالا لیکن اس کی بیٹری جواب دے چکی تھی۔ پولینا کا اپارٹمنٹ خالی تھا۔ برابر والے ہمسائے نے بتایا کہ وہ اور ایلیکس یورپ چلے گئے ہیں۔

دفتر واپس آ کر میں نے ایک بار پھر پولینا سے اس کے سیل فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کنکشن منقطع ہو چکا تھا۔

اگلے روز میں آسکر کے ساتھ سراغ رساں نارمن سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ وہاں بلیغن بھی اپنے وکیل کے ہمراہ موجود تھا۔ نارمن نے ہمارا تعارف کروایا۔ جب رچرڈ کو یہ معلوم ہوا کہ میں ایک پرائیویٹ جاسوس ہوں جسے اس کا پیچھا کرنے پر لگایا گیا تھا تو وہ برہم ہو گیا اور میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم میرا پیچھا کر رہے تھے اور اوپن ہاؤس میں بھی آئے تھے۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے پولینا کو کیوں مارا؟"

"یہ غلط ہے۔ میں نے اسے نہیں مارا؟"

"پھر اس کی آنکھ پر چوٹ کیسے لگی؟"

بلیغن نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

سراغ رساں نارمن نے کہا۔ "ہم نے اس معاملے کو دیکھا تھا۔ اسے کھیل کے دوران چوٹ لگی تھی۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن چوٹ زیادہ شدید نہیں تھی۔ اس کی آنکھ کا پردہ محفوظ رہا۔"

"میں نے کسی کو نہیں مارا۔" بلیغن نے ایک بار پھر کہا۔ "میں صرف معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے لینڈ روور کی تصویر نکالی اور بلیغن کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری گاڑی سے ایک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔" رچرڈ نے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اس وقت شہر سے باہر تھے۔"

"ہاں۔ میں ڈلاس گیا ہوا تھا۔"

"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہاری گاڑی کون چلا رہا تھا؟"

"نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تم نے اپنی گاڑی اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کیوں کھڑی کی؟"

"پولینا مجھے ائرپورٹ چھوڑنے گئی تھی۔"

سراغ رساں نارمن نے مجھ سے کہا۔ ''کیا پولینا تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے؟''

میں نے پولینا کی گرم جوشی اور والہانہ پن کے بارے میں سوچا پھر میرے ذہن میں ایلیکس کا تصور ابھرا جو کاؤچ پر بیٹھا گیم کھیلتے ہوئے مجھے غصے سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''وہ ایلیکس تھا۔ اس کا بیٹا۔''

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' نارمن نے کہا۔

''کیونکہ اسے ڈر تھا کہ میں اس کی ماں کو کہیں دور لے جاؤں گا۔''

آسکر نے مجھے اشارے سے منع کیا کہ میں اس موضوع کو نہ چھیڑوں۔

بلیغن نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تم دونوں......''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ایک لمبا سانس خارج کیا اور پھر بولا۔ ''ہاں۔ وہ ایلیکس ہی ہوگا۔''

''تم نے یہ کیوں کہا؟'' نارمن نے پوچھا۔

''اس کے ساتھ کچھ سنجیدہ مسائل ہیں۔ اسے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے اور اسی وجہ سے میں اور پولینا علیحدہ ہوئے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ وہی پولینا کی آنکھ پر چوٹ لگنے کا بھی ذمے دار ہے اور پولینا نے اسے بچانے کے لیے کھیل کے دوران چوٹ لگنے کا بہانہ گھڑا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسا کر چکی ہے۔ وہ لڑکا نفسیاتی مریض ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ ناقابلِ یقین حد تک پُرتشدد ہے۔ اسے کسی سے ہمدردی نہیں اور نہ ہی وہ اپنے کیے پر پچھتاتا ہے۔ اسی لیے ہمیں اس کو اسکول سے اٹھانا پڑا۔ یہاں تک کہ اس نے سنسنی پھیلانے کے لیے پڑوسیوں کے جانور ہلاک کر دیے۔''

مجھے اپارٹمنٹ کی عمارت میں لگے ہوئے گمشدہ بلیوں کے پوسٹر یاد آگئے۔ یعنی بلیغن سچ کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنا کالر ہٹایا اور گردن پر ایک زخم کا نشان دکھاتے ہوئے کہا۔

''ایک رات اس نے سوتے میں میرا گلا کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکا ایک عفریت ہے۔''

''میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔'' سراغ رساں نارمن نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ پولینا اور ایلیکس پہلے ہی شہر سے جا چکے ہیں لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ اسے خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ سراغ رساں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہم وہاں سے چل دیے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی ٹریکنگ ڈیوائس واپس حاصل کر لینی چاہیے۔ میں نے دفتر واپس آکر شیوی وولٹ کا محلِ وقوع معلوم کیا۔ وہ ائرپورٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں اپنی کار میں وہاں پہنچا۔ شیوی چارجنگ اسٹیشن پر کھڑی ہوئی تھی لیکن اس کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ ایلیکس کی بیساکھیاں گاڑی میں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ ان کے بغیر کیسے گیا ہوگا۔ میری نظر ڈیش بورڈ پر گئی تو وہاں ٹریکنگ ڈیوائس گاڑی کے کاغذات کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ پولینا نے کب اسے تلاش کیا۔ شاید وہ بہت پہلے سے اس کے بارے میں جانتی تھی۔ میں نے اپنا ٹریکر اٹھایا اور گھر چلا آیا۔

میرے زخم بھر گئے تو آسکر نے مجھے دوسرا کام دے دیا۔ تاہم اس واقعے سے میں نے یہ سبق ضرور سیکھا کہ کام کے دوران لوگوں سے مناسب فاصلہ رکھنا چاہیے۔

موسمِ گرما کے اختتام پر میں نے پولینا کو ٹیلی ویژن پر ومبلڈن کے ٹینس کورٹ میں دیکھا۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی جو صرف امراء کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا پھر میں نے ایلیکس کو مشروبات کی ٹرے کے ساتھ آتے دیکھا۔ اس نے وہاں بیٹھی ہوئی خواتین کو دو مشروبات دیے اور خود ایک نوجوان سرخ بالوں والی لڑکی کی گردن میں بازو ڈال کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ یہ وہ ایلیکس نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔ مجھے اس کی کوئی ایسی حرکت نظر نہیں آئی جسے غیر ارادی کہا جا سکے اور نہ ہی کوئی تشنج کی کیفیت تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ وہ اپنی بیساکھیاں کار میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ گویا وہ سب ایک ڈراما تھا بلکہ وہ شروع سے ہی ڈراما کر رہے تھے اور جب یہ ڈراما اپنے کلائمیکس پر پہنچا تو ماں اور بیٹے کی ٹیم نے الیکٹرک کمپنی سے تصفیہ کر کے اپنا حصہ وصول کر لیا۔

مجھے ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ بجلی کمپنی پر دعویٰ، ایلیکس کی نام نہاد بیماری، پولینا کا میری جانب ملتفت ہونا تاکہ میں اس کی حقیقت نہ جان سکوں اور جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ مجھ سے منہ پھیر کر چلی گئی پھر میں نے ان زخموں کے بارے میں سوچا جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ کاش میں اس کے فریب میں نہ آتا۔



حقیقت

ایم زیڈ شیخ

کبھی کبھی انسان تصورات کی دنیا میں بہت آگے نکل جاتا ہے... خاص طور پر جو جتنا کمتر ہوتا ہے اسے اتنا ہی احساس برتری اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے... وہ بھی خود کو بہت زیرک اور باریک بین سمجھتا تھا مگر جب عمل کا وقت آیا تو احساس ہوا کہ ابھی تو بہت سی گرہیں باقی ہیں کھلنے کو۔

خیالات کی بلند پرواز میں گم ایک جاسوس کی لڑکھڑاہٹ کا قصہ

مسز گلزار نے فون اٹھایا تو دوسری طرف وہی بلیک میلر تھا جو انہیں مسلسل تنگ کر رہا تھا جس کے مطالبات تسلیم کرنا مسز گلزار کی مجبوری تھی۔

''تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آتی نوی...... آخر میں تمہاری سگی بھابی ہوں میرا نہ سہی اپنے بڑے بھائی کا ہی خیال کرو۔'' مسز گلزار نے نعمان کو شرم دلانی چاہی۔

''بھابی جی! وہ محاورہ سنا ہے نا آپ نے کہ باپ بھلا نہ بھیا، سب سے بھلا روپیا...... اور میرا ابھی تو حق ہے نا بھائی کے پیسوں پر۔'' نعمان عرف نوی ڈھٹائی سے بولا۔

''نوی پلیز...... میری جان چھوڑ دو، کیوں میری بیس سالہ ازدواجی زندگی کو برباد کرنا چاہتے ہو......'' وہ گڑگڑائی۔

''اچھا چلیں چھوڑ دیتا ہوں جان آپ کی پر ایک شرط

پر...... مجھے اکٹھے ایک لاکھ روپے دے دیں۔" نومی نے کہا تو مسز گلزار غصے سے بولیں۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ اکٹھے ایک لاکھ میں تمہیں دے دوں، آخر کہاں سے لاکر؟"

"ایک کروڑ پتی کی بیوی کے پاس ایک لاکھ تو ہونے ہی چاہئیں نا......؟ اور میں صرف ایک ہفتے انتظار کروں گا۔ اگلے جمعے کی دوپہر دو بجے میں پیسے لینے آؤں گا۔ مجھے پتا ہے اس وقت سب جمعے کی نماز کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ بائے......" نومی نے کہہ کر فون بند کردیا۔

مسز گلزار صوفے پر ڈھیر ہوگئیں۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد باہر کھلی فضا میں آکر بیٹھ گئیں کیونکہ اندر کمرے میں ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔ کھلی فضا میں گھر کے لان پر مالی کام میں مصروف تھا۔

زندگی ہر طرف مسکرا رہی تھی پر انسان جب اندر سے اداس ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایان اور اس سے دس سال چھوٹا ریحان بیڈمنٹن کھیل رہے تھے اور کھلکھلا کر قہقہے لگا رہے تھے مگر مسز گلزار کو آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بچوں کی آوازیں سنائی تو دے رہی تھیں پر دماغ کسی اور طرف لگا ہوا تھا۔

"ایان بھائی! میں نہیں کھیلا، آپ ہر بار جیت جاتے ہو۔" چھوٹے ریحان نے کہا۔

"اچھا چلو تم دو ہاتھوں سے کھیلو، میں ایک انگلی اور ایک انگوٹھے میں ریکٹ پکڑوں گا۔" ایان بولا۔

"نہیں پھر بھی آپ جیت جاؤ گے، اتنے موٹے جو ہو۔"

"تم بھی موٹے ہو جاؤ نا گولو...... چلو میں دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے میں پکڑتا ہوں ریکٹ...... اب خوش؟"

"ہاں، اب ٹھیک ہے آج تو میں جیتوں گا۔" اور واقعی ریحان جیت گیا اور خوشی سے نعرے لگانے لگا اور دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا مگر مسز گلزار کو تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ جب ریحان نے جھنجوڑا تو خیالات سے باہر آئیں اور بچے کو چوم کر کہا کہ دوبارہ کھیلو اور خود گھر کی چھت پر چلی گئیں۔

مسز گلزار ایک سال سے نومی کی بلیک میلنگ کا شکار تھیں۔ ہر ماہ کے پہلے جمعے کو وہ پانچ ہزار روپے لے جاتا۔ بلیک میلنگ کا شکار مسز گلزار تب ہوئیں جب نومی کا ایک دوست اس کے گھر آیا تھا اور نومی کی بھابی کو دیکھ کر گیا اور اس نے نومی کو بتا دیا کہ اس کی بھابی کو وہ بھگا کر لے گیا تھا شادی کرنے کے لیے مگر اس نے فراڈ کر کے ساری نقدی اور زیور چھین کر اس کو واپس بھیج دیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب مسز گلزار کی شادی گلزار عثمانی سے نہیں ہوئی تھی۔

نومی ایک عیاش اور لفنگا قسم کا لڑکا تھا جس کو نشے کے لیے پیسے درکار تھے اور ایک دن جب اس کے نشے کی خبر گلزار عثمانی کو ملی تو اس نے نومی کو گھر سے نکال دیا اور نومی نے مسز گلزار کو تنگ اور بلیک میل کرنا شروع کردیا......

☆☆☆

گلزار عثمانی ایک راشی افسر تھا جس نے دونوں ہاتھوں سے دولت کمائی تھی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد بیرون ملک شفٹ ہونے کا پروگرام تھا۔ اس کام کے لیے دو گھر بھی خریدنے کا ارادہ تھا، کیونکہ خفیہ شادی کر کے اب نئی بیوی کو پرانی کے ساتھ رکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر آج کل گلزار ایک عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کی بیوی کو کوئی شخص تنگ کر رہا تھا۔ کچھ دن پہلے دوسرے فون پر اس نے دونوں کی گفتگو سنی تھی، بڑی عجیب جس میں دوسری طرف کے کسی شخص نے بوڑھے کی آواز بنا کر (شہلا) مسز گلزار کو دھمکی دی تھی کہ اس بار تمہیں خود آنا ہوگا میری طرف اور وہ بھی مال سمیت۔ اسی وقت ریحان کمرے میں آگیا تھا اور گلزار عثمانی نے فون رکھ دیا تھا۔

"کیا میری بیوی کا کسی کے ساتھ کوئی چکر ہے؟" گلزار نے سوچا۔ وہ تو خود بیوی سے تنگ تھا جو ہر بات پر ٹوکتی تھی اور...... تو تو، میں میں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ پھر اس دن کے بعد عثمانی نے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی جو.. اس کی بیوی کی گھر سے باہر آمد و رفت سے آگاہ رہنے لگا۔ پھر اسے ایک عجیب خبر ملی کہ اس کی بیوی نومی سے یعنی گلزار کے بھائی سے چوری چھپے ملتی ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو فون کیا۔

"یار! ایک کام پڑ گیا ہے، وہ جیدا کدھر ہے آج کل۔ اس سے کہنا کہ......" گلزار نے ساری بات دوست سے کہی۔

"یار جیدا پیسے بہت مانگتا ہے گلزار جانی۔" جواب ملا۔

"پیسے کی فکر نہ کرو بس کام ہونا چاہیے دوست......"

☆☆☆

"اس بار چوری کرنے کے لیے جو گھر ہم نے ڈھونڈا ہے وہ ہے گلزار عثمانی کا۔" شیدے نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ "اور اس جمعے کی رات کو چوری کرنی ہے کیونکہ جمعرات کو گلزار عثمانی کام کے سلسلے میں ملک سے باہر جائے گا۔"

"یار شیدے! میں ایک شرط پر اس چوری میں شامل ہوں گا۔" کرمو اس نے کہا۔

"وہ کیا شرط ہے جگر اور تیرے بغیر ان ککوں سے کچھ نہیں ہونا۔"

"یار! وہ عثمانی کی بیوی بہت خوبصورت ہے تو......" کرمو اس نے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری۔

"چل یار! جیسے تو خوش پر یاد رکھ کام پکا ہونا چاہیے۔ میں نے ایک ملازم کو خرید لیا ہے ادھر...... وہ سب کو کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے گا تاکہ تم لوگ آسانی سے کام کرسکو۔"

☆☆☆

"سنا ہے بھائی ملک سے باہر جا رہے ہیں دو دن کے لیے تو پھر میں شام کے وقت آؤں گا۔" نومی نے فون پر شہلا کو بتایا۔

مگر...... ہفتے کی صبح کمرے سے مسز گلزار کی لاش ملی۔ خون کی لکیر دائیں کان کے قریب سے گزر کر بستر کو خون آلود کر چکی تھی۔ جمے ہوئے خون کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے مرے ہوئے کافی گھنٹے گزر گئے تھے...... لاش سب سے پہلے ملازم نے دریافت کی۔

☆☆☆

انسپکٹر اسد کے لیے یہ کیس بہت ہی عجیب ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتے کی محنت سے وہ جتنے شواہد اکٹھے کر چکا تھا، ان سے بیک وقت بات تین چار افراد تک پہنچی تھی۔ ڈکیتی کی واردات...... گلزار عثمانی کا عین وقت پر غائب ہونا...... نعمان کا بطور بلیک میلر سامنے آنا...... کیس بہت الجھا ہوا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ کسی چوتھے فرد نے اس چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گلزار عثمانی سے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ شہلا کی ڈائری سے گلزار کی نئی شادی کا تذکرہ جبکہ نومی کا بطور بلیک میلر سامنے آنا اسی کیس کا حصہ لگتا تھا۔ انسپکٹر اسد کی ذاتی دلچسپی اس کیس میں یہ تھی کہ مسز گلزار ان کی بیگم کی سہیلی تھی۔ اس لیے اب کیس حل کیے بغیر اس کی جان چھوٹنے والی نہیں تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسد کے سسر، ڈی ایس پی تھے۔ عثمانی صاحب ضمانت پر رہا ہوکر گھر پر ہی موجود تھے جب انسپکٹر اسد ان سے ملنے گیا۔

گھر پر ابھی تک سوگ کی کیفیت تھی...... بچے سہمے ہوئے تھے۔ آٹھ سالہ ریحان اور اٹھارہ سالہ ایان دونوں کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ ایان پر تو کبھی کبھی دورہ پڑ جاتا تھا۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا تھا۔ سیالکوٹ سے ان کی ایک پھوپھو نے آکر گھر سنبھال لیا تھا۔ گھر کیا تھا ایک عالی شان حویلی تھی جو کہ اب آسیب زدہ لگتی تھی۔ نعمان ابھی حراست میں تھا اور گلزار عثمانی کا کہنا تھا کہ وہی شہلا کا قاتل ہے۔ جبکہ نعمان نے قسمیں کھا کر بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ خود گلزار بھی مشکوک افراد کی لسٹ میں ٹاپ پر تھا۔

"حوصلہ کریں عثمانی صاحب...... آپ بھی حوصلہ ہار دیں گے تو ان بچوں کا کیا ہوگا؟" انسپکٹر اسد نے اس سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب......! سچ کہتے ہیں کہ کسی بھی شخص کی قدر اس کے جانے کے بعد ہوتی ہے۔ ہم مرد کبھی بھی عورت کو اہمیت نہیں دیتے، مردانگی کا دعویٰ تو کرتے ہیں پر ایک دن بھی عورتوں کی طرح کام نہیں کرسکتے۔ اب یہ بچوں کو ہی دیکھ لیں...... میرے جسم کے ٹکڑے اداس ہیں۔ میں دنیا کی ہر چیز ان کے لیے لاسکتا تھا پر اب کہاں سے لاؤں ان کے لیے ان کی ماں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اللہ پاک سے دعا کریں عثمانی صاحب...... وہی

کارساز ہے۔ البتہ یہ میرا وعدہ ہے کہ مرحومہ کے قاتلوں کو ہر حال میں کیفرکردار تک پہنچاؤں گا، چاہے اس کے لیے آپ ہی کو کیوں نہ دوبارہ ہتھکڑیاں لگانی پڑیں۔"

"قاتل تو آپ کے بالکل سامنے ہے انسپکٹر صاحب! اور آپ کی گرفت میں بھی۔ مجھے کہتے ہوئے شرم تو آتی ہے مگر کیا کروں جب اپنا ہی ہاتھ کینسر پھیلانے کا سبب ہو تو اس ہاتھ کو کاٹنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار لوی کی غلطیاں معاف کیں کہ شاید اب سدھر جائے گا مگر افسوس..... میں غلط تھا۔"

کیس پر مزید باتیں چلتی رہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد اسد وہاں سے چلا آیا۔ واپسی پر وہ مایوسی سے سر جھٹکتا ہوا آیا جس کا مطلب تھا کہ اسے ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

☆☆☆

وحید علی ایک طالب علم تھا جسے جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سولہویں سال میں میٹرک کا امتحان دے کر اس کا رجحان لکھنے کی طرف ہو گیا۔ پھر ایک دن اسے ایک اچھوتا خیال آیا کہ کیوں نہ وہ سچے واقعات کو کہانی کا روپ دے دے۔ یہ آئیڈیا بہت زبردست تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے انکل، اسد کی شاگردی اختیار کر لی۔ وہ فارغ وقت میں تھانے چلا جاتا جو کہ گھر کے قریب ہی تھا۔ نئے اور پرانے کیسز کے بارے میں سنتا اور اپنی ڈائری میں انہیں نوٹ کرتا جاتا۔ ان دنوں ایک عجیب کیس سے وہ آشنا ہوا۔ مسز گلزار کے قتل کے بارے میں اس نے بھی سنا تھا مگر اس کیس نے اتنے عجیب و غریب موڑ لیے تھے کہ وہ خود جان کر حیران رہ گیا.....

اس نے اسد سے اس کیس کی تفصیلات سنیں تو تجسس کے مارے اس کے اندر کا جاسوس بیدار ہو گیا۔ "انکل! یہ جو عثمانی صاحب کے بیٹوں میں عمر کا جو فرق ہے، اس پر آپ نے غور کیا؟" اس نے اسد سے پوچھا۔

"ایان، عثمانی صاحب کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ وہ دراصل عثمانی صاحب کی سالی کا بیٹا یعنی مرحومہ بیوی کا بھانجا ہے۔ بچپن میں اس کے ماں باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تو اس وقت بہن نے ہی بھانجے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ شادی کے کئی سالوں بعد بھی اولاد نہ ہونے پر دونوں اس لیے بھی صابر تھے کہ ان کے پاس کم از کم ایک کھلونا تو تھا۔ پھر ان کے ہاں ریحان پیدا ہوا تو ایک طرف ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جبکہ دوسری طرف ایان پر وہ مزید انحصار کرنے لگے کیونکہ ایان نے چھوٹے بھائی کو سنبھال لیا تھا۔ مسز گلزار کا زیادہ تر وقت تو باہر گزرتا تھا اس لیے ایان ہی ان کی غیر موجودگی میں بھائی کو سنبھالتا تھا۔ مسز گلزار کو ایان اپنے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اگر ریحان کے لیے ایک چیز لی جاتی تو اس کے لیے دو......"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ایان کو مشکوک افراد کی لسٹ سے خارج کر دیا ہے؟"

"کافی حد تک..... کیونکہ بظاہر تو ایسا کوئی جواز نہیں۔ اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی تو ایان ابھی تک گھر سے بھاگ چکا ہوتا جبکہ وہ گھر پر ہی موجود ہے۔"

"آپ کی تفتیش اپنی جگہ پر لیکن مجھے تو مشکوک افراد کی لسٹ میں وہ "ٹاپ تھری" میں نظر آ رہا ہے۔" وحید نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسد نے چونک کر اسے دیکھا.....

وہ وحید کے نقطۂ نظر سے سوچ بچار کر چکا تھا اور اس نے ایان کو بھی چیک کرنے کا فیصلہ کیا مگر ابھی وہ تذبذب میں تھا کیونکہ ایان شاک کی کیفیت میں تھا، ایسی حالت میں وہ کسی قسم کا بیان کیا دیتا۔

اس نے دو دن بعد پھر عثمانی کے گھر کا چکر لگایا۔ اس بار ایان کی حالت کچھ بہتر تھی۔ اس کی آنکھوں میں اسد نے غصے کے تاثرات صاف طور پر دیکھے۔ یوں لگتا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کسی کو قتل کر دیتا۔ یہ غصہ مسز گلزار کے لیے تھا یا کسی اور کے لیے، اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرتا۔ اسد نے الگ کمرے میں اس سے بات چیت کی۔ اس نے جو باتیں بتائیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ رات اسے کھانا کھاتے ہی گہری نیند آ گئی۔ وہ سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے بستر کے پاس پانی کی بوتل ضرور رکھتا تھا تاکہ رات کے وقت پیاس لگنے پر وہ پانی پی سکے۔ وہ پانی لینے کچن میں گیا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے کچن میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ لوی انکل اس کی خالہ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ لوی انکل کو سخت ناپسند کرتا تھا مگر اس کا بس نہیں چلتا تھا، اس لیے خاموش رہتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، اس لیے وہ پانی کی بوتل اور گلاس لے کر ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس لوٹ گیا۔ نیند کی وادیوں میں جانے سے پہلے اس نے سنا تھا کہ مسز گلزار اونچی آواز میں غصے سے لوی کو کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور جب وہ صبح بیدار ہوا تو اس نے واش روم کا رخ کیا۔ ابھی وہ منہ دھو رہا تھا کہ ملازم کی چیخ و پکار سنائی دی......

ایان کے اس بیان کے بعد اسد کی سوچوں کا رخ ایک سمت میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے نقطۂ نظر سے قاتل لوی ہی تھا..... اور اسی نے ڈکیتی بھی کی تھی۔

اسد نے نوکر کا بیان پہلے ہی سے لے لیا تھا جس کے مطابق وہ صبح حسب معمول چائے کی پیالی لے کر بیگم صاحبہ کے

کمرے میں داخل ہوا تو وہ بیڈ پر پڑی تھیں اور خون کی لکیر ان کی کنپٹی سے نکل کر گدے کو سرخ کر چکی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اور وہ الٹے قدموں بھاگا.....

لوی کے ایک دوست وکیل نے اس کا کیس لے لیا تھا مگر باوجود کوشش کے وہ ضمانت نہیں کروا سکا تھا۔ اسد نے لوی سے ملاقات کی مگر کوئی حوصلہ افزا بات سامنے نہ آ سکی۔

☆☆☆

وحید اچانک ہی ایک کہانی پڑھتے پڑھتے چونک پڑا..... یہ ایک وکیل کی آپ بیتی تھی۔ کہانی کے انجام نے اسے اور بھی حیرت زدہ کر دیا۔ انسپکٹر اسد کے پاس موجود مسز گلزار کا کیس بھی اسی سے مماثلت رکھتا تھا۔ اسے اب اسی ڈھنگ سے کیس کو دیکھنا تھا۔ ایک انتہائی اہم نکتہ اس کے ذہن میں آیا تھا۔

اس نے اپنے انکل کو کیس کے متعلق کچھ نہ بتایا بس چند دن بعد ملنے پہنچ جاتا اور ان سے کیس کے حوالے سے سوالات کرتا۔ اس دن بھی اس نے ہنستے ہنستے اسد کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ وہ پولیس سے پہلے مجرم تک پہنچے گا۔ وہ کام کاج سے فارغ ہو کر اسی طرف متوجہ ہو جاتا، اس نے اپنے ساتھ اپنے ایک دوست کو بھی ملا لیا تھا جو کہ وقتاً فوقتاً گلزار عثمانی اور اس کے گھر کے افراد کا پیچھا کرتا یا پھر اس کے گھر کے افراد کے بارے میں معلومات لیتا۔

دوسری جانب اسد کے لیے یہ کیس اس وقت مزید پیچیدہ ہو گیا جب اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی جس کے مطابق قتل رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوا۔ ایان کے بیان کے مطابق جب اس نے چیخ و پکار اور مسز گلزار کے غصے میں بولنے کی آواز سنی تو تب نو بجے کے آس پاس کا وقت تھا اور دس سے گیارہ بجے کے دوران لوی اسنوکر کلب میں پایا گیا تھا جس کے گواہ بے شمار افراد تھے۔ ایسے میں لوی بے قصور محسوس ہوتا تھا۔ ایک اور کردار جس کی طرف اسد کا دھیان گیا تھا، وہ عثمانی صاحب کی نئی بیوی تھی جس سے انہوں نے حال ہی میں بڑے خفیہ انداز میں شادی کی تھی۔ جرم کی رو سے دیکھا جائے تو اس قتل سے سب سے زیادہ فائدہ اسی کو ہوا تھا۔ اسد کے لیے اب اس ٹیڑھی کھیر کو سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اسے ہر حال میں مجرم کو پکڑنا تھا، ورنہ بیوی اور سسر کے سامنے ناک کٹ جاتی۔

☆☆☆

وحید ساری تفصیل اسد کے سامنے رکھ چکا تھا۔ اس کیس کو حل کرنے میں اس نے دن رات ایک کر دیا تھا تب جا کر اصل مجرم تک اس کی رسائی ممکن ہوئی۔ اب مجرم سامنے تھا۔ وحید کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جبکہ انسپکٹر اسد سوچ میں گم

برجستگی

ڈاکٹر (وکیل سے) "آپ کی ذرا سی غلطی انسان کو تین فٹ اوپر لٹکا سکتی ہے۔"

وکیل (ڈاکٹر سے) "اور آپ کی ذرا سی غلطی انسان کو تین فٹ نیچے دفن کر سکتی ہے۔"

☆☆☆

سپاہی (سائیکل سوار سے) "رکو تمہاری سائیکل میں لائٹ نہیں ہے۔"

سائیکل سوار۔ "رک نہیں سکتا جناب، اس کی بریکیں بھی نہیں ہیں۔"

مرسلہ: مریم خالد..... کراچی

تھا۔ اسد نے سامنے رکھے صفحات کا بغور مطالعہ کیا اور پھر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"تو تمہارے خیال میں یہ ہے اصل کہانی؟" اسد نے وحید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی انکل..... اب آپ اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر لیں کہ کہانیاں اور ناولز دماغ خراب کرتے ہیں اور جاسوسی کہانیاں تو ہوتی ہی مجرموں کی نفسیات پر ہیں اس لیے میں نے پولیس سے پہلے یہ کیس حل کر لیا ہے۔"

"تمہارے بتائے گئے طریقہ کار کو سامنے رکھ کر میں یہ کام کر لیتا ہوں۔ حتمی نتیجہ تو ثبوت ملنے پر ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

"چلیں جیسے آپ کی مرضی انکل..... میرے خیال میں تو میں نے نوے فیصد کام کر دیا ہے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

وحید کے جانے کے بعد اسد مسکرانے لگا۔ بلاشبہ کام تو اس نے بہت شاندار کیا تھا۔ کیس کو ایک اور ہی زاویے سے حل کرنے کی کوشش کی تھی اور پورے واقعات ایسے قلم بند کیے تھے جیسے کہانی لکھی جا رہی ہو۔ وہ دوبارہ وحید کی طرف سے دیے گئے صفحات پڑھنے لگا۔

انسان خطا کا پتلا ہے اور مسز گلزار چونکہ انسان تھیں اس لیے انہوں نے بھی اپنی زندگی میں کئی خطائیں کی ہوں گی مگر شادی کے بعد ان کی کوشش رہی کہ کوئی مزید گناہ نہ کریں، اس لیے وہ خود بھی برائی سے نفرت کرنے لگی تھیں اور گھر میں بھی ایسا کچھ نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ ایسے میں ایان کے بارے میں جب انہوں

نے سنا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے تو انہیں انتہائی صدمہ پہنچا۔ ایان ان کی بہن کی اولاد تھا اور مسز گلزار اس کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ وہ سوچتی رہیں کہ آج بات کروں یا کل...... ایسے ہی دن گزرتے گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن انہوں نے موقع دیکھ کر اکیلے میں ایان سے بات کی تو ایان مکر گیا۔ اس نے صاف انکار کردیا مگر کچھ دن بعد جب ایان کی جینز کے اندر سے سگریٹ کا پیکٹ برآمد ہوا تو مسز گلزار کو ایک اور دھچکا لگا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کوئی حل نکالا جائے کہ ایان کے بستے سے انہیں ایک اور چیز ملی۔ ایان سگریٹ نوشی کے ساتھ ساتھ منشیات کا عادی بھی ہوتا جارہا تھا۔ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا اس لیے مسز گلزار نے براہِ راست اس سے بات کی۔ انہوں نے گھر سے نکالے جانے کی دھمکی دی ہوگی جس پر ایان نے اس کا کوئی دیرپا حل سوچنا شروع کردیا۔ اسے موقع تب ملا جب اس نے نوی اور مسز گلزار کی باتیں سنیں، اس نے اپنے ذہن میں ایک پلان ترتیب دیا اور اس پر عمل کردیا۔ اس نے مسز گلزار کے سر پر ضربیں لگائیں اور انہیں مُردہ چھوڑ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اس کی بدبختی کہ وہ اپنے فطری امتیاز کی وجہ سے پکڑا گیا۔

یہاں تک پڑھ کر اسد سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی مجرم کتنا چالاک کیوں نہ ہو آخر کار کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑتا ہے اور وحید نے اسی ثبوت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ سر پر کیے گئے وار اس بات کا ثبوت تھا کہ قاتل لیفٹ ہینڈڈ ہے۔ اس نے سوچا اور یہ بات وحید ہی نے کلیئر کی تھی کہ اس گھر کے تمام افراد سمیت نوکر "رائٹ ہینڈڈ" ہیں یا سوائے ایان کے۔ یوں یہ بات اب صاف کہی جاسکتی تھی کہ قتل ایان نے کیا ہے البتہ اس کے نشہ کرنے کے اور دیگر معمولات کے بارے میں تفصیلات سے آگاہی ضروری تھی۔ اسد نے ساری معلومات حاصل کرکے ایان کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ نوی ضمانت پر رہا کردیا گیا تھا۔ گلزار عثمانی ابھی پہلے جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ اسے دوسرا جھٹکا تب لگا جب اسے یہ پتا چلا کہ ایان نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایان جو اپنی (ماں) خالہ پر جان دیتا تھا اس کا قتل کیسے کرسکتا تھا۔ عدالت کا فیصلہ آنا ابھی باقی تھا۔ ثبوت اور گواہان کو کھنگالا جارہا تھا۔ قانون کے رکھوالے ایک قانون شکن کو سزا دینے کے لیے پُرعزم تھے جبکہ دوسری جانب وحید کو دکھ تو تھا کہ اس نے ایسا کیا مگر خوشی بھی تھی کہ جرم کرنے والے کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ منشیات کے استعمال کی تصدیق، دوسرے ثبوت اور بالخصوص ایان کے بائیں ہاتھ سے وار کرنے کو مدنظر رکھتے ہوئے عدالت نے اسے مجرم قرار دے دیا۔ اب اسے پھانسی کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنا تھی۔ یوں ایک مجرم اپنے انجام کو پہنچ جاتا۔

☆☆☆

وحید، انسپکٹر اسد کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا بھتیجے...... یہ کہانیاں انسان کا دماغ خراب کرتی ہیں۔ بے چارے کو خواہ مخواہ پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔" اسد نے کہا۔ "خیر تمہارا بھی قصور نہیں ہے بھتیجے! جب عدالت نے بھی ایسے ثبوت رد نہیں کیے تو پھر باقی کسی کو کیسے سمجھ آتی اصل بات۔"

نوی کی بائیک کا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو کہانی کا یہ انجام نہ ہوتا۔ اس کی بائیک کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ بری طرح زخمی ہوا۔ اللہ پاک نے کسی بے گناہ کو بچانا تھا، اس لیے چند دن کی مہلت نوی کو مل گئی کہ وہ کفارہ ادا کرسکے۔ بسترِ مرگ پر اس نے انسپکٹر اسد کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروایا کہ اپنی بھابی کا قاتل وہی ہے۔ باتوں باتوں میں ان دونوں کی لڑائی ہوئی اور نادانستہ طور پر اپنے بائیں ہاتھ کے قریب رکھے ہوئے بیلن کو اٹھا کر اس نے بھابی کو مارا۔ اس کے بعد جنونیت کے عالم میں اس نے کیا کیا اسے کچھ یاد نہیں۔ ہاں اس نے وہ بیلن اپنے پاس رکھ لیا تھا اور واپسی پر انگلیوں کے نشانات مٹا کر اسے نالے میں پھینک دیا......

اس بیان میں نوی نے اور بھی بہت سے جرائم کا انکشاف کیا جبکہ دوسری جانب عدالت کے لیے یہ بیان سند کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے ایک بے گناہ کی جان بچ گئی البتہ ابھی تک ایان اسپتال میں داخل ہے کیونکہ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

وحید شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسد نے اسے تسلی دی کہ اس کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ جبکہ وحید کافی دنوں تک یہ سوچتا رہا کہ نہ وہ جرم و سزا کی کہانیاں پڑھتا نہ اس نے اندازے لگائے ہوتے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ خود لکھاری بنے مگر لکھاری بننے سے پہلے اسے ایک اچھا قاری بننا تھا۔ اسے استادوں سے سنی بات اب سمجھ آئی تھی کہ ایک اچھا مقرر بننے کے لیے ایک اچھا سامع بننا ضروری ہوتا ہے......

نیم حکیم خطرۂ جان کا محاورہ جب بھی وحید کے سامنے آتا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بتاکر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کردیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی "اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

دوسرا حصہ

القصہ یہ کہ خدا نے حضرت آسیہ کو سرخرو کیا۔ انہوں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ اب وہ فرعون کو شرمندہ کرسکتی تھیں۔

"میں نہ کہتی تھی کہ بچے نے جو آپ کی ڈاڑھی پکڑی وہ اس کی طفلانہ اور لاشعوری حرکت تھی۔ وہ تو ابھی اتنا نا سمجھ ہے کہ انگارے اور کھجور میں بھی فرق محسوس نہ کرسکا۔ وہ کیا جانے فرعون کون ہے اور گستاخی کسے کہتے ہیں۔"

فرعون کے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا لیکن اکڑ اب بھی باقی تھی۔

"یہ نہ سمجھنا کہ میں اس پر نگرانی نہیں رکھوں گا۔ اگر اس نے اب کوئی گستاخی کی تو میں اسے ضرور سزا دوں گا۔"

حضرت آسیہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت تو جان چھوٹی۔ آئندہ بھی اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔

اب حضرت آسیہ کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ کی پرورش شہزادوں کی طرح ہونے لگی۔ محل میں سب انہیں شہزادہ کہتے اور سمجھتے تھے۔

حضرت آسیہ کوشش کرتی تھیں کہ ان پر فرعون کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اور یہ کوشش تو خاص طور پر کر رہی تھیں کہ اسے دین حنیف کی تعلیم دیں اور مصری دیوتاؤں سے اسے بچا کر رکھیں۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن اللہ کو ان سے یہ کام لینا تھا اور اللہ کے نبی کی پرورش کرنے کے صلے میں انہیں جنت عطا کرنی تھی۔

جب حضرت موسیٰ پڑھنے کی عمر کو پہنچے تو انہیں بہترین اساتذہ کے ہاتھوں بہترین تعلیم دی گئی۔ مصری مذاہب، نجوم، طب اور دوسرے وہ تمام علوم پڑھائے گئے جو اس وقت رائج تھے۔ جب اور بڑے ہوئے تو گھڑ سواری اور سپہ گری کی خاص تعلیم دی گئی۔ وہ بھی جسمانی اعتبار سے ایسے مضبوط اور ذہنی اعتبار سے ایسے تیز تھے کہ سپہ گری اور علوم دونوں میں طاق ہو گئے۔ اب فرعون بھی انہیں دیکھتا تھا تو وہ... فخر کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ انہیں قتل کرا دیتا تو ایسا لائق فرزند کہاں نصیب ہوتا۔

حضرت موسیٰ جیسے جیسے بڑے ہوتے جا رہے تھے انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس گھرانے کے لیے اجنبی ہیں۔ وہ یہاں کے فرد نہیں ہیں۔ ان سب سے مختلف ہیں۔ یہ بھنک بھی کہیں سے کان میں پڑ گئی تھی کہ انہیں دریا سے نکالا گیا تھا اور حضرت آسیہ نے انہیں بیٹا بنا لیا تھا پھر وہ کون ہیں؟ ان کے والدین کہاں ہیں؟ یہ سوال ایسے تھے جو انہیں پریشان کرنے لگتے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے سوچا کہ حضرت آسیہ سے پوچھیں شاید انہیں کچھ معلوم ہو لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ اول تو وہ بتائیں گی نہیں بلکہ میری طرف سے شک میں مبتلا ہو جائیں گی کہ اسے کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ ممکن ہے جو میری جان بچاتی رہی ہیں میری جان لینے پر تل جائیں یا کم از کم یہ تو ہوگا کہ انہیں سخت صدمہ پہنچے گا اور کہیں یہ صدمہ ان کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔

حضرت موسیٰ حضرت آسیہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

یوکابد کے گھر میں حضرت موسیٰ کی باتیں روز ہی ہوتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں سے محل کے اندر کی باتیں بھی ان تک پہنچتی رہتی تھیں۔ یوکابد یہ سن کر خوش ہوتی تھیں کہ ان کا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا ہے لیکن یہ سوچ کر اداس ہو جاتی تھیں کہ دودھ سے اپنا بیٹا کہہ کر نہیں پکار سکتیں۔ ان کے شوہر نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ غلطی سے بھی یہ نہ کہہ سکیں کہ محل میں پلنے والا بچہ ان کا بیٹا ہے۔ اگر یہ بات فرعون تک پہنچ گئی تو موسیٰ کی جان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

"اگر تمہیں اپنے الہام پر یقین ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اللہ انہیں اپنے رسولوں میں شامل کرنے والا ہے جس طرح یعقوبؑ و یوسفؑ کو منتخب کیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دینے والا ہے۔"

"اگر اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ وہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے تو وہ مظلوم بنی اسرائیل کی دادرسی کیسے کرے گا؟"

"خداوند اس کی آگاہی کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کر چکا ہوگا۔ تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میرا دل یہ بھی تو چاہتا ہے کہ اسے دیکھوں۔ جوانی کو پہنچ کر وہ کیسا ہوگا۔ ایک مرتبہ گئی بھی تھی لیکن محل والوں نے مجھے اندر ہی نہیں جانے دیا۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ تم بے قراری میں کوئی نہ کوئی ایسا قدم ضرور اٹھا بیٹھتیں کہ راز کھل جاتا۔ اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن حقیقت کھل ہی جائے گی۔ یہ کب ہوگا؟ جب اللہ چاہے گا۔"

وقت گزرتا رہا۔ یہ باتیں روز ہوتی رہیں پھر ایک روز حضرت عمران گھر آئے تو بہت اداس تھے۔ یوکابد سے ان کی یہ اداسی دیکھی نہیں گئی۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

"آج آپ اتنے اداس کیوں ہیں؟"

"میرے اداس ہونے کی ایک وجہ ہے۔"

"مجھے نہیں بتائیں گے؟"

"مجھے آج ایک خبر ملی ہے جس نے مجھے اداس کر دیا ہے۔"

"کیسی خبر؟"

"شہر میں یہ خبر مشہور ہے کہ بادشاہ کسی جنگی مہم پر ہمارے بیٹے کو بھیج رہا ہے۔"

"کیا پتا یہ خبر غلط ہو اور اگر صحیح ہے تو فرعون اسے پرایا سمجھ کر موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے۔ اس کا اپنا بیٹا منفتاح بھی تو ہے، وہ اسے بھی بھیج سکتا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ اسے کیسے روکا جائے؟"

"اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اسرائیلی ہے تو فرعون کے لیے اپنی جان کبھی خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ آپ ایک مرتبہ مجھے فرعون کے محل میں جانے دیں۔ اگر مجھے اندر نہیں جانے دیا تو پھر میں کوئی اور ترکیب سوچوں گی۔"

حضرت عمران نے انہیں اجازت دے دی۔ وہ محل کے دروازے پر پہنچیں اور اپنا یہ حق جتانے لگیں کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلایا ہے۔ وہ اس کی رضاعی ماں ہیں لہٰذا انہیں اندر جانے دیا جائے تاکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک نظر دیکھ لیں۔ پہلے تو پہرے داروں نے منع کیا لیکن جب وہ نہیں مانیں تو حضرت آسیہ کو اطلاع دی گئی۔ اس وقت خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یوکابد کو اجازت مل گئی اور وہ بے دھڑک اندر چلی گئیں۔

"میں نے یہ سنا ہے کہ بادشاہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی مہم پر بھیج رہا ہے۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔ تم کیا اسے منع کرنے آئی ہو؟"

"میں اسے کیوں منع کرنے لگی تھی۔ میں تو اس لیے آئی ہوں کہ وہ جنگ پر جا رہا ہے، زندہ واپس آتا ہے یا نہیں، میں اسے ایک نظر دیکھ تو لوں۔ میں نے اسے دودھ پلایا ہے۔ اتنا حق تو میرا بھی ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں ایک آدمی کے ساتھ تمہیں شہزادے کے پاس بھیجے دیتی ہوں۔ خوب جی بھر کے دیکھ لو۔ اس سے باتیں کر لو۔ میں اسے پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ تمہیں ایک اسرائیلی عورت نے دودھ پلایا ہے۔ خبردار......! اس سے آگے کچھ نہ بتانا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے۔"

انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا تو انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ وہ عورت آپ سے ملنے آ رہی ہے جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا لہٰذا آپ جیسے ہی ان کے پاس گئیں، وہ استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت ادب سے پیش آئے۔ جہاں یوکابد کو بیٹھنا تھا، اس جگہ کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

"تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"وہ جس نے مجھے اپنا دودھ پلایا۔"

"اور؟"

"اور یہ کہ آپ عبرانی ہیں لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میری نظر میں عبرانی اور مصری سب برابر ہیں۔"

"کیا تمہارے علم میں نہیں کہ عبرانیوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں؟"

"مجھے کچھ اندازہ تو ہے لیکن میں محل سے باہر نہیں جاتا، اس لیے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اپنے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ محل کے پرانے ملازم نے میرے بارے میں کچھ باتیں مجھے بتائی ضرور ہیں لیکن وہ کوئی ایسی خاص نہیں۔"

"کیا باتیں بتائی ہیں۔ میں بھی تو سنوں۔ شاید میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ بتا سکوں۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ میں صندوق میں بند کہیں سے بہتا ہوا آیا تھا۔ میری موجودہ والدہ نے مجھے پانی سے نکلوایا اور اپنا بیٹا بنایا۔ اس دن کے بعد سے آج تک ان کا احسان ہے کہ وہ میری جان کی حفاظت کرتی رہی ہیں۔"

"انہیں تمہاری جان کی حفاظت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"اس لیے کہ بادشاہ مجھ سے ذرا محبت نہیں کرتا تھا اور میری جان لینے کے درپے رہتا تھا۔"

"وہ تمہاری جان کے درپے کیوں تھا...... کیا صرف اس لیے کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا تھا؟"

"شاید اسی لیے۔"

"نہیں۔ صرف اس لیے نہیں بلکہ اسے یہ شک تھا اور شاید اب بھی ہو کہ تم اسرائیلی ہو۔"

"مجھے بھی کبھی کبھی یہی گمان گزرتا ہے۔"

"یہ تمہارا گمان نہیں، حقیقت ہے۔ تم نہ صرف اسرائیلی ہو بلکہ میرے بچے، میں تمہاری حقیقی ماں ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور یوکابد کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یہ بات بھولے سے بھی اپنی زبان پر نہ لائیے گا ورنہ میری اور آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ بس اتنا بتا دیجیے کہ آپ نے مجھے صندوق میں بند کر کے پانی میں کیوں بہا دیا تھا؟“

”بیٹا! مجھے خدا کی طرف سے الہام ہوا تھا کہ میں ایسا کروں۔ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیرے بیٹے کو تجھ سے پھر ملا دیں گے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ تو نے کسی بھی عورت کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ پھر قدرت نے تجھے میرے پاس پہنچا دیا۔ تو نے میرا دودھ پی لیا۔ ملکہ یہی سمجھتی رہی کہ میں تیری ماں نہیں، محض دودھ پلایا ہے۔ دودھ چھڑانے کے بعد تو مجھ سے پھر چھین لیا گیا۔ میرے خدا نے مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ تجھے اپنا رسول بنائے گا۔ اگر یہ وعدہ بھی پورا ہوا تو اسرائیلیوں کو تو اس مظالم سے نجات دلانا جو فرعون کی طرف سے ان پر توڑے جا رہے ہیں۔ بس میں تجھے یہی بتانے آئی تھی کہ تو فرعون کے خاندان سے نہیں، اسرائیلیوں کے حق میں آواز ضرور اٹھانا۔ اس نے ہم پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ہمارے بیٹوں کو مار ڈالتا ہے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا ہے۔“

”اماں جان! ہمارے گھر میں اور کون کون ہے؟“

”تیری بہن مریم ہے۔ تیرا بھائی ہارون ہے۔ تیرے والد ہیں۔“

”اماں! کچھ دن صبر کر لیں۔ میں ان سب سے آ کر ملوں گا۔“

”ایسا ہرگز مت کرنا۔ اگر فرعون کو معلوم ہو گیا......“

”میں ایسا ضرور کروں گا۔ جس مہم پر جا رہا ہوں اس سے لوٹ آؤں پھر میں ایسا ضرور کروں گا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اس مہم پر نہ جائے؟“

”کیوں اماں......؟“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔ تیری جان کو ضرر نہ پہنچے۔“

”آپ اللہ کے وعدے پر یقین رکھتی ہیں پھر ایسا کہتی ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

یوکابد ڈر کے مارے اپنے بیٹے کو گلے بھی نہ لگا سکیں کہ کسی روزن، کسی کھڑکی سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی دل مضبوط کیے بیٹھے تھے۔

”بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ جائیے ورنہ مجھ سے ضرور پوچھا جائے گا کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔“

یوکابد اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پیار سے دیکھا اور باہر نکل گئیں۔ ایک پہرے دار آگے بڑھا اور انہیں محل سے باہر تک چھوڑ کر آ گیا۔

ان کے جاتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جس راز کو جاننے کے لیے وہ بے چین تھے، اچانک کھل گیا تھا۔ انہیں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ان کے ماں باپ ابھی زندہ ہیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن بھی ہے۔ زندگی رہی تو ان سے ملاقات ضرور ہو گی۔

یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں، بنی اسرائیل پر ہونے والے مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ”اے خدا! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ان مظالم کو روک سکوں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس دن سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتۂ قرابت نہیں اور یہ کہ ان کے والدین اسی شہر میں ہیں لیکن وہ ان سے مل نہیں سکتے...... اس دن سے وہ پریشان رہنے لگے تھے۔ حضرت آسیہ کو تو خیر وہ اپنی ماں ہی سمجھتے تھے لیکن فرعون کی طرف سے ان کے دل میں بال آ گیا تھا۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلائیں گے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کریں بلکہ بنی اسرائیل سے مل کر خود ان کی زبانی ان کی داستانِ حیات سنیں اور شہر میں گھوم پھر کر ان مظالم کا بذاتِ خود مشاہدہ کریں۔

انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کی پیدائش سے بہت پہلے فرعون نے دو شہروں کی تعمیر کرائی تھی اور بنی اسرائیل کے افراد بیگار رہی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ فرعون نے بڑے پیمانے پر بنی اسرائیل کی نسل کشی کی ہے۔ اس سے وہ خود براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ اگر ان کی والدہ کو ان کے قتل کا کھٹکا نہ ہوتا تو وہ انہیں صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں کیوں بہاتیں۔

جیسے جیسے یہ حالات ان کے علم میں آتے جا رہے تھے، وہ فرعون کی طرف سے بدظن ہوتے جا رہے تھے۔

ابھی تک انہیں محل سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ باہر نکلیں اور بنی اسرائیل کے بزرگوں سے ان کے حالات معلوم کریں۔ وہ شام ہوتے ہی گھوڑے پر سوار ہوتے اور محل سے نکل جاتے۔ حضرت آسیہ نے انہیں کئی مرتبہ ٹوکا کہ شہزادوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سڑکوں پر یوں گھومتے رہیں اور پھر یہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا کہ نوجوانی کے دن ہیں، سیر و تفریح کو جی چاہتا ہوگا۔

فرعون کے درباریوں میں سے بہت سوں نے فرعون کی توجہ اس طرف مبذول کرائی پھر ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ کسی نے انہیں بنی اسرائیل کی بستیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی خبر فرعون کو ہو گئی۔

”موسیٰ جس طرح عبرانیوں کی حمایت میں آگے بڑھ رہے ہیں، اس سے مصریوں کا دبدبہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اسرائیلیوں سے تعلقات استوار کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسرائیلیوں کو آپ کے خلاف ورغلا بھی رہے ہوں۔ اگر انہیں روکا نہیں گیا تو مصر میں خانہ جنگی ہو جائے گی۔“

ہامان نے بھی اس موقع پر فرعون کے خوب کان بھرے۔

”آپ نشانیاں دیکھنا چاہتے تھے نا۔ ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ آپ کے احسانات فراموش کر کے آپ کے دشمنوں سے سازباز کر رہا ہے، اس لیے کہ میرے کہنے کے مطابق وہ اسرائیلی ہے۔ وہ نجومیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق ہمارے لیے خطرے کا باعث بن رہا ہے۔“

فرعون یہ باتیں سن رہا تھا لیکن اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کمزور بچے نہیں تھے۔ طاقت اور بہادری میں اپنی مثال آپ تھے۔ اب ان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں رہا تھا۔

فرعون کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ انہیں مصری افواج کا کمانڈر بنا کر جلد سے جلد مصر سے روانہ کر دیا جائے اور دورانِ جنگ کسی سازش کے تحت انہیں قتل کرا دیا جائے۔ اس طرح ملکہ بھی مطمئن ہو جاتی کہ جنگوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

”اسیوبیہ“ قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے، ان کے اور فراعنہ کے خاندان کے درمیان جنگ کے میدان گرم ہوتے رہتے تھے۔ یہ مہم غالباً اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔

ابھی مصری افواج کی روانگی میں کچھ تاخیر تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حالات سے بے خبر اسی طرح سیر و گشت میں مشغول تھے۔ ایک دن شہری آبادی سے نکل کر سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے کہ دو آدمیوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا۔ قریب جا کر دیکھا تو ان میں ایک مصری تھا، ایک اسرائیلی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رجحان یقیناً اسرائیلی کی طرف تھا۔ انہوں نے مصری سے ڈانٹ کر پوچھا۔

”اس غریب کو کیوں مار رہا ہے؟“

”یہ غریب نہیں ہے، اسرائیلی ہے۔“

”کوئی بھی ہے۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اسے کیوں گھسیٹ رہا ہے؟“

”بنی اسرائیل ہمارے غلام ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو بھی سلوک کریں، تم بولنے والے کون ہوتے ہو؟“

”خدا کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ کوئی کسی کا غلام نہیں ہوتا۔“

”مجھے تو تم بھی اسرائیلی معلوم ہوتے ہو جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی سے پوچھا جسے گھسیٹا جا رہا تھا۔

”تو بتا، یہ شخص تجھے کیوں گھسیٹ رہا ہے؟“

”اس شخص کے مکان کی دیوار گر گئی ہے۔ یہ مجھ سے کہہ رہا ہے میں وہاں چل کر مزدوری کروں۔ یہ مصری لوگ اسی طرح ہم سے بیگار لیتے ہیں۔ مزدوری بھی کرائیں گے اور پیسے بھی نہیں دیں گے۔ پھر میں کیوں اس کے ساتھ جاؤں؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصری کو پھر ڈانٹا کہ اگر اس شخص سے کام لینا ہے تو مزدوری طے کر و ورنہ اپنا راستہ لو۔ مصری کو اپنے مصری ہونے کا گھمنڈ تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی جھڑک دیا اور اسرائیلی کو گھسیٹنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر سمجھایا لیکن مصری نہ مانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں آ کر مصری کے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیونکہ ان کا ارادہ ہرگز اس کے قتل کا نہ تھا۔ ندامت اور شرمندگی

کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ کارِ شیطان ہے۔ وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا۔ میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں۔ خدا نے بھی ان کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔

"وہ (موسیٰ) شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ اہلِ شہر غفلت میں تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، یہ شیطان کی کارفرمائی ہے۔ وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے پھر وہ کہنے لگا، اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا۔ میری مغفرت فرما دے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عہد کیا۔ "اے میرے رب! یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے، اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔" (سورۃ القصص)

دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں خبر مشہور ہو گئی کہ کسی اسرائیلی نے ایک مصری کو قتل کر دیا لیکن وہ اسرائیلی کون ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام اسرائیلی کا ہے لہٰذا آپ دادرسی فرمائیں۔ فرعون نے کہا اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جا سکتا، تم قاتل کا پتا لگاؤ۔ میں اسے ضرور سزا دوں گا۔

مقتول مصری نے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہچان بھی لیا تھا تو یہ بتانے کو زندہ نہیں تھا۔ لوگ اپنے طور پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ قاتل اسرائیلی تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام دوسرے دن یہ دیکھنے کے لیے شہر میں نکلے کہ دیکھیں کل کے واقعے کے متعلق شہر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ انہیں پھر وہی اسرائیلی نظر آیا جس کی ایک دن پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدد کی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک مصری سے جھگڑ رہا تھا۔ مصری اس پر غالب آ رہا تھا۔ اس شخص کی نظر جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پڑی، اس نے مدد کو پکارا۔

"اے بنی اسرائیل کے بہادر شخص...... میری مدد کر جیسے کہ تُو نے کل میری مدد کی تھی۔"

اس واقعے کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوہری ناگواری محسوس کی۔ ایک جانب مصری کا ظلم تھا، دوسری جانب اسرائیلی کا شور و غوغا اور گزشتہ دن کے واقعے کی یاد تھی۔ آج وہ کسی ایسے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مصری کو باز رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو جھڑکتے ہوئے فرمایا۔

"تو بھی بلاشبہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔ خوامخواہ جھگڑا مول لے کر فریاد کرتا رہتا ہے۔"

وہ اسرائیلی یہ سمجھا کہ کل انہوں نے مصری کو مارا تھا، آج مجھے مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ وہ پیچھے ہٹتا ہوا زور سے پکارا۔

"جس طرح کل تُو نے ایک مصری کو ہلاک کر دیا تھا اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر مصری کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہچان بھی گیا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کل جس مصری کو قتل کیا گیا تھا، اس کے قاتل یہی ہیں۔ وہ شہر کی طرف بھاگا اور مصریوں کو جمع کر کے پوری روداد سنائی۔ یہ سب جمع ہو کر فرعون کے پاس پہنچے۔

"آپ نے کل کہا تھا کہ اگر ہم قاتل کا نام بتا دیں تو آپ اس کو ضرور سزا دیں گے۔"

"ہاں، میں نے کہا تو تھا۔ کیا تمہیں قاتل کا نام معلوم ہو گیا؟"

"وہ کوئی اور نہیں، آپ کے لے پالک بیٹے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور چونکہ وہ خود اسرائیلی ہیں اس لیے اسرائیلیوں کی حمایت کرتے پھرتے ہیں۔"

"اے فرعون! تو نے اسرائیلیوں کو اپنا دشمن قرار دیا ہے اور اپنے دشمن کو اپنا بیٹا بنا کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کھلا دوغلا پن ہے۔ اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایک مصری کے قتل کے جرم میں موسیٰ کو سزا سنا۔"

فرعون بہت دن سے سن رہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کی بستی میں جاتے ہیں۔ وہ یقیناً بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ساری نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ اب جو اپنی قوم کو سخت غصے میں دیکھا اور تقریباً ثابت ہو گیا کہ مصری کا قتل حضرت

موسیٰ علیہ السلام ہی نے کیا ہے تو اس نے فوراً حکم جاری کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔

مصریوں کے اس وفد میں ایک مصری وہ بھی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھتا تھا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا۔ اس نے جو فرعون کا یہ حکم سنا تو اسے سخت تشویش ہوئی۔ وہ اسی وقت شہر کی طرف بھاگا تاکہ گرفتاری سے قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باخبر کر دے۔ وہ دیوانوں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا بالآخر ایک جگہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام مل گئے۔ اس شخص نے انہیں دربار میں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

فرمانِ باری ہے۔ "ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا، حضرت موسیٰ علیہ السلام! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکل جا۔ میں تیرا خیرخواہ ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ڈر ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر بھی یہاں ٹھہرے تو فرعون کے کارندے اسی طرح انہیں ڈھونڈ لیں گے جیسے اس شخص نے ڈھونڈ لیا۔ وہ شخص بھی برابر اصرار کر رہا تھا کہ وہ فوراً شہر سے نکل جائیں۔

"میرا کام صرف اتنا تھا کہ آپ کو بروقت مطلع کر دوں۔ اگر اس کے باوجود بھی آپ یہاں ٹھہرے تو آپ کو نقصان اور مجھے افسوس ہوگا۔"

آپ کے پاس اس وقت نہ تو کوئی سواری تھی اور نہ کوئی سامان سفر ساتھ تھا۔ ان چیزوں کے بندوبست کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ آپ اسی حالت میں شہر سے نکل پڑے۔ آپ کبھی مصر سے باہر نہ نکلے تھے۔ نہ کسی راستے کا علم تھا، نہ کوئی منزل سامنے تھی کہ کہاں جائیں گے۔ جو راستہ سامنے آیا، اس پر چل پڑے اور زبان پر خدا سے فریاد جاری رکھی۔

"اے میرے رب! مجھے ظالموں سے بچا۔ امید ہے میرا پروردگار مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور ان کے قدم "مدین" کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ شہر مدین مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھا۔ اللہ نے ان کے لیے اس علاقے کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ مدائن قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت اسحٰق بن ابراہیم کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ حضرت اسحٰق کے بھائی مدین بن ابراہیم کی نسل کے لوگوں پر مشتمل تھا۔

مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسمٰعیل کے پہلو میں آباد کی۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانۂ خلیج سے بحر احمر و ارضِ ثمود و حجاز تک، جہاں ثمود و جرہم و عرب اسمٰعیل آباد تھے، واقع تھا۔

تاریخ ارض القرآن کے مولف علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ہم مدین کا آغاز عہد ۲۰۰۰ ق۔م فرض کرتے ہیں کیونکہ پدر مدین حضرت ابراہیم کا زمانہ ۲۱۰۰ ق م یا ۲۲۰۰ ق م ہے۔ ایک خاندان کو قوم کی حیثیت سے پیدا کرنے کے لیے کم از کم دو سو برس کی ضرورت ہوگی، اس لیے مدین سب سے پہلے عہد یعقوبؑ میں سوداگران کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔"

حضرت یوسفؑ کو جو کاروانِ تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ یہی اہل مدین اور اسمٰعیلی عرب تھے۔

اس واقعے کے بعد چار سو برس تک مدین کی تاریخ پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ مدین کے سوانح نگار بنی اسرائیل ہیں اور یہ زمانہ بنی اسرائیل کے قیام مصر کا ہے۔ چار سو برس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا اور دعوتِ حق اور جب قوم کے جرم میں ان کو مصر سے ہجرت کرنی پڑی تو ان کا ملجا اسی قافلے کی سرزمین تھی جو ان کی قوم کو چار سو برس پہلے مصر پہنچا گئی تھی یعنی مدین۔

مدین کی قوم اس وقت جس کاروبار میں نظر آتی ہے، وہ وہی ہے جو تمام سامی قوموں کا ہمیشہ پیشہ رہا ہے یعنی گلہ بانی۔ یہی وہ شغل ہے جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا پیشہ تھا اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی شہری زندگی میں میسر نہ آتا۔ بنو سام کے عظیم الشان پیغمبر کے لیے ضروری تھا کہ وہ جہاں بانی سے پہلے گلہ بانی کا سبق لے۔ اس لیے قضائے الٰہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کے تمدن زار سے عرب کے بے تکلف اور سادہ ملک میں بھیج دیا جہاں شرفائے سام نے اب تک اپنی آبائی عادات کو ترک نہیں کیا تھا۔

مدین کے قبائل ایک منظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین کے لیے "کاہن" ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جو کاہن تھا، توریت میں اس کا نام کہیں راعویل کہیں جو باب مذکور ہے (توریت کے مطابق اس کاہن کے دس نام تھے)۔

اکثر مسلمان مفسرین کے نزدیک ان کا نام حضرت شعیب تھا جو لفظاً جو باپ سے بہت قریب ہے۔

تاریخ ''الرسول والملوک'' کے مطابق حضرت موسیٰ سات دن سات راتیں مسلسل پیدل سفر کرنے کے بعد مدین اس حال میں پہنچے کہ ان سات دنوں میں درختوں کے پتوں کے سوا کچھ تناول نہیں کیا تھا۔ دشوار گزار راستے کی وجہ سے آپ کے جوتے بھی کہیں گر گئے تھے اور آپ برہنہ پا تھے۔

مدین میں قدم رکھتے ہی آپ کا گزر ایک کنوئیں کے سامنے سے ہوا۔ کنوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی تھی اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔

اس بھیڑ سے الگ تھلگ دو لڑکیاں اپنی بکریوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ بکریاں بار بار پانی کی طرف بڑھ رہی تھیں اور یہ لڑکیاں انہیں پانی کی طرف جانے سے روک رہی تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں بھی وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم قوتوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہاں بھی سارا انتظام ظلم کی بنیادوں پر قائم ہے۔ شاید یہ لڑکیاں کمزور ہونے کے سبب اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو پانی پلا چکیں تو بچا کھچا پانی ان کے جانوروں کا حصہ بنے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لڑکیوں کے قریب پہنچے۔

''تم اپنے جانوروں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟ دور کیوں کھڑی ہو؟''

''ہم اتنی ہمت نہیں رکھتے۔ جب ہم اپنے جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو طاقت والے ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ ہمارا یہی روز کا دستور ہے۔ ہمارے والد بوڑھے اور کمزور ہیں۔ وہ اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ان کی مزاحمت کو دور کرسکیں۔ تم فکر نہ کرو۔ جب یہ لوگ پانی پلا کر واپس چلے جائیں گے تو ہمارے جانوروں کو پانی مل جائے گا۔ ہم روز یہی کرتے ہیں بلکہ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔''

''اس طرح تو تمہیں واپس لوٹتے لوٹتے بہت دیر ہو جاتی ہوگی۔''

''دیر تو ہو جاتی ہے مگر کیا کریں۔ ہمارا تو کوئی بھائی بھی نہیں ہے جو ان سے زبردستی کر سکے۔''

''آج تمہیں انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ ان لوگوں کے جانوروں سے پہلے تمہارے جانور پانی پئیں گے۔ اپنے جانوروں کو آگے لاؤ۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور کنوئیں پر پہنچ گئے۔ کنوئیں کا بڑا ڈول اٹھایا۔ یہ ڈول اتنا بڑا تھا کہ کئی لوگ مل کر اسے کھینچتے تھے لیکن انہوں نے تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا۔

کنوئیں پر جمع لوگوں کو ان کی یہ حرکت ناگوار تو بہت گزری لیکن ان کی پُرجلال صورت اور جسمانی طاقت نے سب کو مرعوب کر دیا۔

لڑکیوں نے اپنے گلّے کو پانی پلایا اور خوش خوش گھر کی طرف چل دیں۔

''یہ آدمی کون ہو سکتا ہے؟'' ایک نے دوسری سے پوچھا۔

''مدین کا تو نہیں لگتا۔ اس سے پہلے بستی میں کبھی نظر بھی نہیں آیا۔''

''اس کی حالت بتا رہی تھی کہ طویل مسافت طے کر کے آیا ہے۔''

''تو نے پوچھا تو ہوتا، وہ آیا کہاں سے ہے۔''

''تو نے پوچھ لیا ہوتا۔ مجھے تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔''

''تو نے اس کی طاقت دیکھی؟ جس ڈول کو کئی آدمی مل کر کھینچتے ہیں اس نے اکیلے کھینچ لیا۔''

''بہادر بھی لگتا ہے۔ تو نے دیکھا کس طرح بھیڑ کو چیرتا ہوا کنوئیں تک پہنچ گیا۔ بڑے بڑے سورما اس کے سامنے بکری بن گئے۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے دونوں لڑکیاں گھر تک پہنچ گئیں۔ گھر کے ساتھ بانس لگا کر بکریوں کا باڑا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکیوں نے بکریوں کو اس باڑے میں دھکیلا اور خود باپ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ انہیں وقت سے پہلے دیکھ کر والد نے ان سے جلد آنے کی وجہ دریافت کی۔

''کیا تم آج بکریوں کو پانی پلائے بغیر ہی واپس آ گئیں؟''

''نہیں بلکہ آج تو ان بکریوں نے ہمیشہ سے زیادہ سیر ہو کر پانی پیا ہے۔''

''کیوں، کیا آج کنوئیں پر کوئی موجود نہیں تھا؟''

''سب تھے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بھیڑ تھی۔''

''پھر تمہیں پانی اتنی جلدی کیسے میسر آ گیا؟''

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں ایک کہہ رہی تھی تُو بتا۔ دوسری کہہ رہی تھی تُو بتا پھر ایک نے جس کا نام صفورہ تھا بتانا شروع کیا۔

''ہم اپنی باری کے انتظار میں تھے کہ ایک اجنبی وہاں آ گیا۔ اسے ہم پر رحم آیا اور اس نے کنوئیں سے پانی کھینچ کر ہمارے جانوروں کو پلا دیا۔''

''اللہ اس کا بھلا کرے۔'' بزرگ نے کہا۔ ''کہاں ہے وہ؟ وہ ہمارا مہمان ہے اور اس نے احسان کیا ہے ہم پر۔ اب ایسی بھی کیا بے مروتی کہ ہم اسے روٹی بھی نہ کھلا سکیں۔ تم میں سے کوئی جائے اور اگر وہ وہاں ہے تو اسے بلا کر لے آئے۔''

(ان بزرگ کے نام میں اختلاف رائے ہے لیکن مفسرین کی اکثریت نے کہا ہے یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے)۔

یہ حضرت صفورہ ہی تھیں جو جانے کے لیے تیار ہوئیں اور کنوئیں کی طرف چل دیں۔

ان لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد تھکے ماندے، بھوک سے نڈھال حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہ درخت کیکر کا تھا۔ آپ اس وقت اللہ کی مخلوق میں اللہ کے سب سے قریبی دوست تھے لیکن حال یہ تھا کہ شکم مبارک بھوک کی وجہ سے پشت سے مل گیا تھا۔ کھجور کے ایک ٹکڑے تک کے لیے آپ محتاج ہو رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر دعا فرمائی۔

''پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے، میں اس کا محتاج ہوں۔''

دعا کے الفاظ ابھی اچھی طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ صفورہ وہاں پہنچ گئیں۔ دیکھا کہ وہ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کیا۔

''آپ ہمارے گھر چلیے والد بلاتے ہیں۔ وہ آپ کو اس احسان کا بدلہ دیں گے جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ احسان کا بدلہ قبول کریں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس دعوت کو ہرگز قبول نہ کرتے لیکن اس وقت تو وہ خود ہی یہ دعا کر چکے تھے کہ میرے لیے سامان مہیا کر۔ انہوں نے لڑکی کا آنا دعا کی مقبولیت کا پیش خیمہ سمجھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''میں آگے چلتے ہوئے آپ کی راہنمائی کرتی ہوں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے چلتے رہیے۔''

''نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ آپ میرے لیے غیر ہیں۔ میں آگے چلتا ہوں آپ میرے پیچھے آئیے اور کنکری یا اشارے سے میری راہنمائی کرتی رہیے۔''

وہ حضرت شعیب کے گھر پہنچے۔ ایک نورانی صورت بزرگ کو اپنے سامنے پایا۔ بزرگ نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ مہمان کے لیے غسل کے پانی کا بندوبست کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل سے فارغ ہوئے۔ سفر کی مٹی بدن سے اتاری اور بزرگ کی طرف سے دیے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ کھانا تیار تھا۔ بزرگ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

کھانے سے فراغت کے بعد بزرگ نے ان کے حالات جاننے کی درخواست کی۔ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ کیا افتاد پڑی تھی کہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔ پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حالات سنائے۔ فرعون کے مظالم سے آگاہ کیا اور اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کی لرزہ خیز داستان گوش گزار کی۔

''خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہیں ان ظالموں سے نجات مل گئی۔ اب کوئی خوف کا مقام نہیں۔ میں تمہیں مہمان اور اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر میں رکھوں گا۔''

''آپ مجھ سے کوئی کام لیں۔ مجھے یوں مفت میں رہنا گوارا نہیں ہوگا۔''

''تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ کچھ دیر آرام کرلو۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

حضرت صفورہ باپ کے پاس آئیں اور باپ کو مشورہ دینے لگیں۔

''ابا جان! میرا تو مشورہ یہ ہے کہ آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کو چرانے اور پانی مہیا کرنے کے لیے اجیر رکھ لیجیے۔ اجیر وہی ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔ یہ شخص قوی بھی ہے اور امانت دار بھی۔''

''تو یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ وہ قوی بھی ہے اور امانت دار بھی؟''

''اس کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ اس نے کنوئیں کا بڑا ڈول تنہا کھینچ لیا۔ امانت کی آزمائش اس طرح ہوئی، میں جب اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں اور گفتگو کے دوران ایک مرتبہ بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کا کہا اور خود آگے چلا اور صرف اشاروں ہی میں اس کی راہنمائی کرتی رہی۔''

یہ سن کر حضرت شعیب نہایت مسرور ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مہمان کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے میری بیٹی کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ایک چمک سی آ گئی تھی۔

''تو یہی چاہتی ہے تاکہ میں اس مہمان کو اجیر (اجرت پر کام کرنے والا) رکھ لوں۔''

''ہاں ابا جان! اس میں حرج بھی کیا ہے۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑا سہارا ہوگا۔''

''اس کی اجرت کیا مقرر کی جائے؟''

''یہ تو آپ پر منحصر ہے۔''

''تو اجرت مجھ پر چھوڑتی ہے۔''

''ہمارا سب کچھ تو آپ ہی ہیں۔''

''اگر میں اجرت کے بدلے میں تیری شادی اس سے کر دوں؟''

حضرت صفورہ نے شرما کر گردن جھکائی اور باپ کے پاس سے ہٹ گئیں۔ رضامندی مل گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام شام تک سوتے رہے۔ جب وہ سو کر اٹھے اور رات کے کھانے سے فارغ بھی ہو چکے تو حضرت شعیب نے بات کا آغاز کرنا مناسب سمجھا۔ اس وقت تک دونوں لڑکیاں سونے کے لیے بستر پر جا چکی تھیں۔

''اگر میں بطور اجیر تمہیں اپنے پاس رکھ لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''میں تو خود یہی چاہتا ہوں۔''

''اگر میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں تو کیا یہ اجرت نہیں ہوگی؟''

''یہ تو اجرت کثیر ہوگی۔''

''میری وہ لڑکی جو تمہیں کنوئیں پر بلانے گئی تھی، اس کا نام صفورہ ہے۔ میں اس کی شادی تم سے کرنے کو تیار ہوں۔ اگر آٹھ سال تک تم میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ اور اگر اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا۔''

''مجھے یہ شرط منظور ہے البتہ یہ میری خوشی پر چھوڑ دیجیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کروں۔ آپ کی جانب سے مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا۔''

طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر ''عقد'' عمل میں آیا اور عقد کے فوراً بعد ہی حضرت موسیٰ اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہو گئے۔

توریت اس قول کی تائید کرتی ہے کہ مدت ختم ہونے پر وہ فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہوئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب وادی مقدس میں پہنچ کر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جا کر فرعون کے ظلم سے ان کو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ جو مدت میں پوری کروں مجھ پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔ قول و قرار پر خدا شاہد ہے اور ہم دونوں پر وکیل ہے۔

امام بخاری صحیح بخاری میں روایت فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ مجھ سے .... کسی یہودی نے پوچھا حضرت موسیٰ نے دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری فرمائی تھی۔ میں نے کہا میں تو نہیں جانتا، ہاں عرب کے

بڑے عالم کے پاس جا کر پوچھ سکتا ہوں۔ حضرت سعید فرماتے ہیں پھر میں نے ابن عباسؓ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا آپ نے دونوں مدتوں میں سے زیادہ اور عمدہ کو پورا فرمایا۔

یہی بات مفسرین ابن جریرؒ نے بھی روایت کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے جبرائیل سے پوچھا دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت موسیٰ علیہ السلام نے پوری فرمائی تو کہا دونوں میں سے اکمل اور اتمام (یعنی دس سال والی مدت)۔

حضرت مجاہد سے مرسلاً حدیث مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت جبرائیل سے اس کے متعلق استفسار فرمایا تو حضرت جبرائیلؑ نے آگے حضرت اسرافیل سے استفسار کیا۔ حضرت اسرافیل نے پروردگار عزوجل سے استفسار کیا تو پروردگار نے فرمایا دونوں مدتوں میں سے زیادہ وفا والی مدت پوری کی۔

اسی طرح ابن جریر نے محمد بن کعب سے اس کو روایت کیا کہ رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ دونوں عرصوں میں سے کون سا عرصہ حضرت موسیٰ نے پورا فرمایا۔ آپ نے جواب مرحمت فرمایا، دونوں میں سے زیادہ وفا والا اور مکمل۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت مکمل فرمائی؟ آپؐ نے فرمایا ان دونوں میں سے زیادہ وفا اور حسن سلوک والی اور فرمایا اگر تو یہ پوچھے کہ دونوں عورتوں میں سے کون سی سے شادی فرمائی تو چھوٹی سے شادی فرمائی۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ دس سال تک بکریاں چراتے رہے۔ گلہ بانی کے لیے آپ ایک لاٹھی ہاتھ میں رکھتے تھے جو انہیں حضرت شعیب نے دی تھی۔

توریت میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرت موسیٰ کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیرسون رکھا۔ عبرانی میں اس کے معنی ''غربت و مسافرت'' کے ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ نے بیٹے کے نام میں اپنی مسافرت کو بہ طور یادگار قائم رکھا تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچے کی ولادت غربت و مسافرت میں ہوئی تھی۔

توریت کی عبارت یہ ہے۔

''اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ (علیہ السلام) کو دی۔ وہ بیٹا جنی اور اس کا نام جیرسون رکھا کیونکہ اس نے کہا میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں۔''

ایک روز حضرت موسیٰ اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے۔ کسی غلام کو نبوت کیسے مل سکتی تھی لیکن اب دس سال کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ اب وہ آزاد تھے۔ قدرت ان پر اپنا آخری انعام نچھاور کرنے کے لیے تیار تھی۔

اس سفر میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ مصر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ گلہ بانی کے لیے نکلے تھے کہ راستہ بھٹک گئے یا اتنی دور چلے گئے کہ واپسی میں رات ہو گئی۔

سفر کہیں کا بھی ہو لیکن ہوا یہ کہ رات ٹھنڈی تھی۔ باد شمال چلنے کی وجہ سے ناقابل برداشت سردی تھی۔ سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلے پر بحر قلزم کے دوشاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا۔

حضرت موسیٰ نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی، اس نے کام نہ دیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو سامنے کی وادی (وادی ایمن) میں ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر آیا۔

''مجھے وہاں آگ کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ تم یہاں ٹھہرو میں آگ لے آؤں۔ تاپنے کا بھی انتظام ہو جائے گا اور کوئی راہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔''

''پھر موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے لا سکوں یا الاؤ پر کسی راہبر کو پا سکوں۔'' (طٰہٰ ع ۱)

حضرت موسیٰ سوچ رہے تھے کہ یہ عجب آگ ہے۔ ایک درخت ہے اس پر جل رہی ہے لیکن کمال کی آگ ہے کہ درخت کو نہیں جلا رہی ہے۔ بہت تیز ہوا ہے لیکن نہ آگ بجھتی ہے نہ پھیلتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک احساس ہوا کہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے ہیں، آگ دور ہوتی جا رہی ہے۔ چلنے کے باوجود ان کے اور آگ کے

درمیان فاصلہ کم نہیں ہو رہا ہے۔

رات کا وقت، سنسان وادی، آوازیں نکالتی ہوئی تیز ہوا۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی۔ ایک لاٹھی کے سوا اپنے تحفظ کے لیے کوئی ہتھیار بھی نہیں اور اس پر ایسی پراسرار آگ۔ ان کے دل میں خوف پیدا ہونے لگا۔ بیوی بچے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے، ان کا خیال بھی تھا۔ انہوں نے آگ کا خیال چھوڑ دیا اور واپسی کے لیے مڑے۔ اب حال یہ تھا کہ وہ آگے تھے اور آگ پیچھے تھی۔ پھر انہیں محسوس ہوا کہ آگ ان کے قریب آ گئی ہے یا یہ سمجھو کہ وہ آگ کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ وہ آگ کے قریب پہنچے۔ یہ ایک درخت تھا۔ دور سے آگ نظر آتی تھی لیکن دراصل آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی تھی جو اس درخت سے پھوٹ رہی تھی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس درخت کے قریب گئے تو ایک آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ آواز اسی درخت سے پھوٹ رہی تھی۔

''اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں سارے جہاں والوں کا مالک۔'' (قصص)۔

''پس جب موسیٰ اس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ، میں ہوں تیرا پروردگار پس تو اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن۔'' (طٰہٰ ع ۱)

توریت اس کو یوں بیان کرتی ہے۔

''تب اس نے کہا ادھر پاس مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اتار کیونکہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہ مقدس زمین ہے۔''

پھر اس نے کہا میں تیرے باپ کا خدا یعنی ابرہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر کرنے سے ڈرتا تھا۔

اور خداوند نے کہا میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف جو مصر میں ہیں خوب دیکھی اور ان کی فریاد جو بیگار لینے والوں کے سبب سے ہے، سنی اور میں ان کے دکھوں کو جانتا ہوں اور میں اترا ہوں کہ ان کو مصریوں کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس ملک سے نکال کر ان کو ایک اچھے اور وسیع ملک میں جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے...... پہنچاؤں۔

ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے جو آواز درخت سے آ رہی تھی وہ براہ راست ندائے الٰہی تھی۔

جوتا اتارنے کو اس لیے کہا جا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ اس وقت گدھے کی کھال سے تیار کیا ہوا جوتا پہنے ہوئے تھے اس لیے طاہر نہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ خوف، کچھ حیرت، کچھ خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مبہوت کھڑے تھے۔ بولنے کی سکت نہیں تھی۔ کتنے بڑے انقلاب سے دوچار ہوئے تھے۔ آگ لینے آئے تھے، پیغمبری مل گئی تھی۔ گلہ بانی کرتے کرتے جہاں بانی کی دولت مل رہی تھی۔ خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ وحی کے الفاظ سننے کے لیے کانوں کو کھلا رکھو۔

درخت کی جانب سے آواز پھر آئی۔

''موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''یہ میری لاٹھی ہے۔ اس پر بکریاں چراتے وقت سہارا لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور میرے لیے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔''

''موسیٰ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔'' حکم ہوا۔

حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل میں لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا۔ وہ سمجھے تھے جس طرح جوتے اتارنے کو کہا گیا تھا، اسی طرح لاٹھی پھینکنے کا حکم بھی دیا جا رہا ہے لیکن یہ دیکھتے ہی بھاگنے کے لیے مڑے کہ لاٹھی نے ایک بڑے اژدہے کا روپ دھار لیا ہے اور زمین پر دوڑ رہا ہے۔ تقاضائے بشریت یہی تھا جو انہوں نے کیا یعنی بھاگنے کے لیے مڑے۔ فوراً آواز آئی۔

''موسیٰ اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ۔ ہم اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیں گے۔''

حضرت موسیٰ کی یہ لکڑی دوشاخہ تھی۔ اب وہی دوشاخہ اژدہے کا منہ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا لیکن حکم الٰہی کی پاسداری بھی ضروری تھی۔ انہوں نے بے خوف ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ اژدہا دوبارہ لاٹھی کی شکل اختیار کر گیا۔

حضرت موسیٰ کو دوبارہ پکارا گیا۔

''اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر بغل سے مس کیجیے۔ نکل آئے گا وہ مرض کے بغیر نہایت روشن۔'' انہوں نے یہ عمل کیا تو ہاتھ ستارے کی طرح چمکنے لگا۔

''موسیٰ! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت و رسالت کے دو بڑے نشان ہیں۔ یہ تمہارے پیغام صداقت اور دلائل و براہین حق کی زبردست تائید کریں گے۔ پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت و رسالت سے نوازا اسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان معجزے بھی عطا کیے۔ اب جاؤ اور فرعون اور اس کی قوم کو راہ ہدایت دکھاؤ۔ انہوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر اور ظلم کے ساتھ انہوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، سو ان کو غلامی سے چھٹکارا دلاؤ۔''

انہیں واضح طور پر مصر جانے کا حکم دیا جا رہا تھا اور وہ مصر جانے سے کترا رہے تھے۔ جس وجہ سے وہ مصر سے نکلے تھے وہ وجہ ابھی تک برقرار تھی۔

حضرت موسیٰ نے جناب باری میں عرض کیا۔

''پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کر دیں۔ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے اور مجھ کو جھٹلائیں گے۔ یہ منصب عالی جب تو نے عطا فرمایا ہے تو میرے سینے کو فراخ اور نور سے معمور کر دے اور اس اہم خدمت کو میرے لیے آسان بنا دے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو اور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اس لیے اس کو بھی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنا دے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر جاؤ اور ان کو حق کی راہ دکھاؤ۔ وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے۔ ہم تمہاری درخواست منظور کرتے ہیں۔ تمہارے بھائی کو بھی تمہارا شریک کار بناتے ہیں۔ دیکھو تم دونوں فرعون اور اس کی قوم کو ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤ تو اس پیغام حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا۔ کیا عجب کہ وہ نصیحت قبول کر لیں اور خوف خدا کرتے ہوئے ظلم سے باز آ جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات عطا ہو گئے تھے۔ نبوت بھی عطا ہو گئی تھی۔ بڑے بھائی کو شریک کار بھی بنا دیا گیا تھا۔ یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ مصر جاؤ۔ فرعون اور اس کی قوم کو پیغام حق پہنچاؤ اور اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے آؤ۔

اتنی نعمتیں ملی تھیں کہ سنبھالے نہیں جاتی تھیں۔ دل مضبوط کر دیا تھا لیکن پھر بھی تقاضائے بشریت خوفزدہ کر رہا تھا کہ دیکھیے دربارِ فرعون میں کیا پیش آتا ہے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہوئے۔ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھ لیتے تھے کہ شاید پھر کوئی بلا رہا ہو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پلک جھپکتے ہی دنیا بدل گئی۔ ماتھے تک ہاتھ گیا تو اس سردی میں بھی پسینے کے کچھ قطرے ابھر آئے تھے۔ ذمے داری کے احساس نے پاؤں بھاری کر دیے تھے۔ روشنی بجھ گئی تھی اور اب وادی میں مکمل اندھیرا تھا۔ پاؤں رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ اب ایک خوف بھی دل میں جاگزیں ہونے لگا تھا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ واپسی کا راستہ ہی بھول جائیں اور بیوی تک نہ پہنچ سکیں۔ دور اندھیرے میں ایک متحرک سایہ دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ صفورہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں۔

''آگ مل گئی؟''

''آگ تو نہیں ملی پیغمبری مل گئی۔ جلدی کرو۔ کچھ دیر میں صبح کا اجالا پھیل جائے گا۔ ہم اپنا راستہ تلاش کر لیں گے۔ ہمیں فوراً مدین پہنچنا ہوگا۔''

''یہ آپ نے کیا کہا کہ پیغمبری مل گئی۔ مجھے کچھ بتائیے تو سہی۔''

حضرت موسیٰ نے تمام باتیں تفصیل سے بتائیں۔

''میں تمہارے مہر کی دس سالہ مدت پوری کر چکا ہوں۔ اب میں آزاد ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ مصر چلنا ہوگا۔''

''میں تو آپ کی باندی ہوں۔ آپ مجھے جہاں لے جائیں گے، وہاں جاؤں گی۔''

وادی میں ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ حضرت موسیٰ نے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ریوڑ کو ایک جگہ جمع کیا اور اللہ کا نام لے کر ایک طرف کو چل دیے۔ اس امید پر چلے تھے کہ اب دن نکل آیا ہے، کوئی نہ کوئی مسافر راستے میں مل جائے گا۔ وہ اس سے مدین کا راستہ پوچھ لیں گے لیکن خدا نے انہیں سیدھے راستے پر ڈال دیا۔ وہ رات بھر بھٹکتے رہے تھے لیکن اب جو دیکھا تو مدین ان کے سامنے تھا۔

وہ اس اعتماد سے مدین میں داخل ہوئے جیسے کبھی راستہ بھٹکے ہی نہ تھے۔
گھر پہنچتے ہی اپنے خسر کی خدمت میں پہنچ گئے۔
''کیا میں نے دس سال کی مدت پوری نہیں کرلی؟''
''بے شک تو اپنے قول کا سچا تھا۔''
''اب میں آزاد ہوں جہاں بھی جاؤں۔''
''اب میں تجھے روکنے والا کون ہوتا ہوں۔''
''میں چاہتا ہوں اب میں مصر کو جاؤں اور اپنے گھر والوں سے ملوں۔''
''اب تو میری طرف سے آزاد ہے۔ مصر میں تجھ پر ظلم کرنے والے ہلاک ہو چکے ہیں۔ تیرے زمانے کا فرعون مر کھپ گیا۔ اب اس کی جگہ اس کا بیٹا ''منفتاح'' تخت پر بیٹھا ہے۔ اب وہ فرعون ہے۔ تو بے خوف ہو کر مصر کو جا۔''

حضرت موسیٰ نے بیوی کو گدھے پر بٹھایا۔ دوسرے گدھے پر خود بیٹھے اور مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔

تعمیل حکم الٰہی کے لیے مصر میں داخل ہو کر اپنے مکان پر پہنچے اور اپنی والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت میں ظاہر ہوئے۔ ان کی والدہ انہیں قطعی نہ پہچان سکیں لیکن ان کا گھرانا چونکہ مہمان نوازی میں پورے بنی اسرائیل میں مشہور تھا اس لیے ان کی والدہ نے ایک مسافر کی حیثیت سے انہیں گھر میں جگہ دی اور خوب خاطر مدارات کی۔ حضرت موسیٰ نے بھی خود کو ان پر ظاہر نہیں کیا۔ دل ہی دل میں مسکراتے رہے کہ جب انہیں اچانک معلوم ہوگا تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔

حضرت ہارون اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے۔ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی حضرت ہارون کو خدا کی طرف سے منصب رسالت عطا ہو چکا تھا۔ انہیں بذریعہ وحی حضرت موسیٰ کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا۔ وہ بھائی سے آکر لپٹ گئے۔ والدہ حیران تھیں کہ ہارون اس دور دراز کے مسافر کو کیسے جانتے ہیں۔

''آپ نے اس مسافر کو پہچانا؟'' حضرت ہارون نے والدہ سے کہا۔
''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''
''یہ میرا چھوٹا بھائی موسیٰ ہے۔ دیکھیے تو کتنا بڑا ہو گیا ہے۔''

والدہ نے اس اطلاع کے بعد غور سے دیکھا تو حضرت موسیٰ کا ناک نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔

ان کی آنکھوں سے دیر تک خوشی کے آنسو بہتے رہے۔ توریت میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''اور خداوند نے ہارون سے کہا کہ بیابان میں جا کر موسیٰ سے ملاقات کر۔ وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر اس سے ملا اور اسے بوسہ دیا اور موسیٰ نے ہارون کو بتایا کہ خدا نے کیا کیا باتیں کیں اور کون کون سے معجزے دکھانے کا اسے حکم دیا۔''

رات کو جب حضرت موسیٰ عبادت کے لیے کھڑے ہوئے تو انہیں پھر وہی آواز سنائی دی جو وہ وادی سینا میں سن چکے تھے۔

''میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔ یاد کر کہ جب تیری بہن چل رہی تھی پھر جا کر کہتی ہے میں تمہیں اس کا پتا دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو اور یہ بھی (یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ ہم نے تجھے اس کے پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے گزارا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا۔ پھر اب ٹھیک وقت پر تو آ گیا ہے۔ اے موسیٰ (علیہ السلام) میں نے تجھ کو اپنے کام کا بنا لیا ہے۔ جا تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ..... اور دیکھو تم میری یاد میں تقصیر مت کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی سے بات کرنا۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کر جائے یا ڈر جائے۔''

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء۔ ابن کثیر۔ توریت۔.....ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

خطرناک

انجم فاروق ساحلی

ہاتھ میں خنجر ہو تو خطرے کے بجائے طاقت کا احساس ہوتا ہے... بالکل اسی طرح دشمن اگر دوست کے روپ میں ملے تو اس کی محبت اس کے مہلک ہونے کا ادراک نہیں ہونے دیتی۔ یہی حال اس کا بھی تھا جو اس کے دل کی دنیا اجاڑ کر خود اسی دل کا مکین ہونا چاہتا تھا مگر... وہ یہ بھول گیا تھا کہ قریب سے حملہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک وفا شعار بیوی کی محبت کا... عبرتناک انجام

پٹرول پمپ کے ملازم نے سیلی سے پانچ ڈالر کا نوٹ لیا اور اسے بھنانے کی غرض سے اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ ''ممی! گرمی بہت ہو رہی ہے۔'' کار کی پچھلی نشست پر کھڑی ہوئی چار سالہ پاپی نے شکایت کی۔

''ذرا صبر کرو۔'' سیلی نے تسلی دی۔ ''ہم شاپنگ کر چکے ہیں۔ یہاں سے سیدھے گھر ہی جائیں گے۔''

پٹرول پمپ کے اسٹیشن سے ایک دوسرا مرد برآمد ہوا۔ اس کے بال گھرے سیاہ تھے۔ اس نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ کار تک آیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی دوسری جانب والی کھلی کھڑکی پر جھک گیا۔

''خاتون! آپ نے ملازم کو کتنے پیسے دیے تھے؟''

''پانچ ڈالر کا ایک نوٹ دیا تھا۔'' سیلی نے جواب دیا۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ میں موجود نوٹوں کی ایک گڈی میں سے پانچ ڈالر کا نوٹ نکال کر سیلی کو دے دیا۔

''آج پٹرول مفت سپلائی کیا جا رہا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' سیلی اپنے ہاتھ میں موجود اس



نوٹ کو گھورتے ہوئے بولی۔
"یہ اس ملازم کی نوازش ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "کیا اس نے آپ کی ٹنکی بھر دی ہے؟"
"ہاں لیکن یہ سب کیا ہے۔" سیلی کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ "کیا یہ کسی قسم کا انعام ہے؟"
وہ شخص دروازہ کھول کر اس کی بغلی نشست پر بیٹھ گیا۔
"یہ ایک سرپرائز ہے خاتون۔" اس نے کہا۔ "آپ نے ابھی ابھی سرحدی علاقے تو کیلو تک سفر کرنے کا انعام جیت لیا ہے۔"
"ایک منٹ......" سیلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک سیاہ ریوالور چمک رہا تھا۔
"خاموشی سے تسکن کی جانب سفر شروع کر دو۔" اس نے بے حد سرد لہجے میں حکم دیا۔ سیلی کے جسم پر خوف سے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور گلا خشک ہو گیا۔ اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں ریوالور کی نال پر مرکوز ہو گئیں جو اس کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔
اس نے کانپتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر لے آئی۔ قصبے کی جیل اس پٹرول پمپ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ سیلی نے پُرامید ہو کر سوچا کہ ممکن ہے نل یا اس کا نائب ہینک انہیں وہاں سے گزرتے دیکھ لیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن جب کار جیل کے قریب سے گزری تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ جیل کی ایک منزلہ عمارت پیچھے رہ گئی۔ سامنے ہی سڑک کے کنارے ایک سائن بورڈ نظر آ رہا تھا جس پر لکھا تھا۔ "الوداع ٹاپاسٹی۔ ایریزونا کا گنجان ترین علاقہ۔ آبادی 1965۔ بلندی 3480 فٹ۔"
"آبادی سے زیادہ تو اس کی بلندی ہے۔" ریوالور بدست اجنبی نے تبصرہ کیا۔
"میرا نام پامی ہے۔ آپ کا کیا نام ہے؟" یکایک پچھلی نشست سے پامی نے معصومیت سے پوچھا۔ اجنبی نے ایک جھٹکے سے گردن پیچھے موڑی۔ ساتھ ہی اپنا ریوالور بھی بلند کر لیا۔ پامی اطمینان سے اپنی ٹھوڑی اگلی نشست کی پشت گاہ سے لگائے ہوئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص پُرسکون ہو گیا۔
"میرے دوست مجھے رے کہہ کر پکارتے ہیں۔" اس نے کہا اور پامی کے سر کے اوپر سے کار کے عقبی شیشے میں سے پیچھے کی جانب دیکھنے لگا۔
"رفتار بڑھا کر ستر تک لے جاؤ۔" اس نے سیلی کو حکم دیا اور گردن موڑ کر رفتار والی سوئی کو گھورنے لگا۔
"کیا یہ تمہاری ہی بچی ہے؟" چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔ سیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر پامی کی جانب دیکھا۔ "یہ بہت برا ہوا۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس بچی کی موجودگی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔" اس نے خدشے کا اظہار کیا۔ "یہ اتنی بڑی ہے کہ سب کچھ یاد رکھ سکتی ہے اور بتا بھی سکتی ہے۔"
"یہ صرف چار سال کی ہے۔"
"بے بی! کیا تم جانتی ہو کہ نوگیلو کہاں ہے؟" اس شخص نے گردن موڑ کر تیز لہجے میں پوچھا۔ بچی اپنی نشست پر جا بیٹھی اور انگوٹھا منہ میں لے کر نفی میں سر ہلا دیا۔
"نہیں جانتیں تو بہتر ہے۔" اس شخص نے کہا اور اس کے چہرے پر قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ کار اس وقت ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اس کے پہیے تارکول کی تپتی ہوئی سڑک پر تیزی سے پھسل رہے تھے اور دور بہت دور، تسکن کے عقب میں واقع چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کڑی دھوپ میں ہولے ہولے کانپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
اس کی نگاہیں اس کے حسین اور پُرکشش چہرے پر سے آہستہ آہستہ سفر کرتی ہوئی اس کے نرم و نازک پیروں تک پہنچ گئیں۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔
"سیلی۔" وہ ہر ممکن حد تک پُرسکون لہجے میں بولی۔
"عمر بتانے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کافی بڑی ہو۔"
"تم نے اسے لوٹ لیا ہے نا؟" سیلی نے عام سے لہجے میں کہا۔
"کسے؟" وہ شخص قدرے چونک اٹھا۔
"پٹرول پمپ کے ملازم کو۔"
"میں مجبور تھا بے بی۔" اس نے جواب دیا اور دوسرے خالی ہاتھ کی مدد سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سیلی کی جانب بڑھا دیا۔ سیلی کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ وہیل پر سخت ہو گئی۔
"کک...... کیا تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟"
"نہیں۔ صرف بے ہوش کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔ "کیوں، وہ تمہارا کچھ لگتا ہے؟"
"نہیں۔" سیلی نے جواب دیا۔ "میں اسی قصبے میں رہتی ہوں اور اس جیسے چھوٹے قصبوں میں لوگ ایک دوسرے کے کچھ لگتے ہوں یا نہ ہوں پھر بھی ان کے درمیان ایک تعلق ضرور ہوتا ہے۔"
رے نے خالی ہاتھ سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر پہلے اپنا اور پھر سیلی کا سگریٹ سلگایا۔ "مجھے نوگیلو میں رقم کی ضرورت پڑے گی۔" اس نے کہا۔ "اس احمق پولیس آفیسر نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ یہ ریوالور اسی کا ہے جو میرے ہاتھ آ گیا ہے۔" سیلی پھر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ وہ ٹاپاسٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی جہاں اس کا سب کچھ تھا اور جس سے اسے بے حد محبت تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پچھلی نشست کی جانب دیکھا۔ پامی سو گئی تھی۔ اس کا انگوٹھا اب بھی منہ میں تھا اور کھلونا اس کے ننھے بازو میں دبا ہوا تھا۔ سیلی کو یاد آ گیا کہ وہ آج دوپہر حسب معمول سوئی نہیں تھی۔
"تم کس پولیس آفیسر کی بات کر رہے ہو؟" اس نے سڑک پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔
"میں جانتا ہوں کہ اس قصبے میں صرف دو پولیس آفیسر ہیں۔" اس شخص نے کہا۔ "ایک چیف اور دوسرا اس کا نائب ہینک ہے۔ کوئی ریڈ انڈین معلوم ہوتا ہے۔ وہ چیف ہی تھا جس سے میں نے یہ ریوالور چھینا تھا۔ اس نے اپنے نائب کو کسی کام سے کہیں بھیج دیا تھا۔ لہٰذا صرف ہم دونوں ہی رہ گئے تھے۔"
"اس کا نام نل ہے۔" سیلی نے آگاہ کیا۔ رے ہنس پڑا۔
"ہاں، وہ کتنا احمق ہے۔ اس سے پستول چھیننا اتنا آسان ثابت ہوا جیسے کوئی اندھے بھکاری کی ہتھیلی سے سکہ اٹھا لے۔"
سیلی نے ایک گہری سانس لی۔ "پھر کیا ہوا؟ میرا مطلب ہے تم نے اسے ہلاک کر دیا؟"
"کرنا پڑا بے بی۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "ورنہ یہ پستول میرے پاس کیسے موجود ہوتا؟" سیلی خاموش رہی۔ "میں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے سیلی کو آگاہ کیا۔ "لیکن اس کے پاس میرے بارے میں ایک اشتہار تھا جو پولیس نے شائع کر دیا تھا۔ تمہیں پتا ہے میں انہیں مطلوب ہوں۔ اس اشتہار میں میری دو تصویریں ہیں اور تفصیل بھی ہے۔ انہیں میں اس لیے مطلوب ہوں کہ بینک کا چوکیدار میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ وہ ناکام واردات ثابت ہوئی تھی۔ مجھے وہاں سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکی تھی۔ اس احمق نے ہیرو بننے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا اسے اڑانا پڑ گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کر آج ٹاپاسٹی پہنچا۔ یہ خاصا پُرسکون قصبہ ہے۔ میں یہاں چند روز گزارنا چاہتا تھا لیکن پولیس چیف نل خدا اسے غارت کرے۔ اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔" اس نے خاموش ہو کر سگریٹ باہر اچھال دیا۔ "بینک کے اس چوکیدار کو ہلاک کرنے کی بنیاد پر وہ لوگ مجھے سزائے موت دے سکتے تھے لہٰذا مجھے وہاں سے فرار ہو کر ٹاپاسٹی آنا پڑا لیکن یہاں نل میرے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ قتل ایک ہو یا دو، سزا تو ایک ہی ہوتی ہے نا...... سزائے موت۔" سیلی نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ رے نے پوچھا۔ "کیا بات ہے...... کیا وہ پولیس چیف نل تمہارا کچھ لگتا تھا؟"
"ایک چھوٹے سے قصبے میں ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔"
"یہاں وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔" تسکن کے قریب پہنچنے پر اس نے کہا۔ "سرحد پر ہمارے منتظر ہوں گے، چنانچہ ہمیں یہاں اس وقت تک پناہ لینی پڑے گی جب تک کہ وہ یہ نہ فرض کر لیں کہ ہم کسی اور طرف فرار ہو گئے ہیں۔ کار کو اگلی کچی سڑک پر موڑ لینا۔"
تسکن کے مضافات میں وہ ایک سنسان چوراہے پر واقع ایک چھوٹے سے اسٹور کے سامنے رکے تھے۔ رے نے اسے گاڑی ایسی جگہ روکنے پر مجبور کیا جہاں اسٹور کے اندر سے وہ اس پر اچھی طرح نظر رکھ سکے۔ "عقل سے کام لینا اور کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے اسٹور میں جاتے ہوئے کہا اور کار کی چابی بھی ساتھ لیتا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سبزیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی تھی اور دو کمبل بھی۔ "بچی کے لیے دودھ بھی لے لیا ہے۔" اس نے کہا۔
وہ گرد آلود کچی سڑک ایک متروک کان تک جا کر ختم ہو گئی۔ رے نے سبزی کی تھیلی میں سے کچھ چیزیں نکال کر سیلی کو دیں اور پامی کو دودھ پلایا۔ اس دوران اس نے اپنا ریوالور تان رکھا تھا۔
"تم مجھے بالکل اچھے نہیں لگے۔" پامی نے دودھ پیتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے اچھی طرح بات نہیں کرتے، تم مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔"
"یہ کل تک سب کچھ بھول جائے گی۔" سیلی دھڑکتے دل کے ساتھ بولی۔
"اسے سلا دو۔" رے نے ریوالور انگلی پر نچاتے ہوئے کہا۔
"کوشش کرتی ہوں کہ یہ پچھلی نشست پر سو جائے۔"

''میں سونا نہیں چاہتی۔'' پاپی نے کہا۔
''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا ہی کرو اور چپ رہو۔'' سیلی نے تنبیہ کی۔ پاپی نے انگوٹھا منہ میں لے لیا۔
''اچھا ممی۔'' وہ سعادت مندی سے بولی۔ رے اور سیلی کار سے اتر کر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ اب شام کی دھند چھانے لگی تھی۔
''کیا یہ شے تمہارے ہاتھ میں اُگی تھی؟'' سیلی نے ریوالور کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور پیار کا تاثر تھا۔
رے نے ریوالور کو نرمی سے اچھالا۔ ''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ محض تمہیں یہ احساس دلانے کے لیے ہے کہ کوئی غلط حرکت مت کر بیٹھنا۔''
''لیکن مجھے اس کی موجودگی کچھ اچھی نہیں لگ رہی ہے۔'' سیلی نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ ''اسے ہمارے درمیان حائل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی رومان پرور شے تو نہیں ہے۔''
رے نے ریوالور اپنے سے قریب اور اس کی پہنچ سے دور زمین پر رکھ دیا۔ ''میں تمہیں ایک بار پھر خبردار کرتا ہوں کہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں تمہاری بچی کو قتل کردوں گا اور پھر تم سے بھی نمٹ لوں گا۔''
سیلی ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ ''میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنی اور اپنی بچی کی زندگی خطرے میں ڈالوں۔'' وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ رے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا لیکن اس کے چہرے پر متانت اور سچائی کے سوا کچھ نہ تھا۔
''میرے خیال میں، اس پولیس چیف سے تمہارا کوئی رومانس وغیرہ چل رہا تھا۔'' چند لمحے بعد وہ اچانک بول پڑا۔ ''کیونکہ جب میں نے یہ کہا کہ وہ میری گولی سے ہلاک ہوگیا ہے تو تمہارے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا۔ خیر اب اسے بھول جاؤ کیونکہ اب تمہیں ایک نیا ساتھی مل گیا ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور زمین سے اٹھالیا۔ ''تمہیں میرے رویے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تھی؟''
''نہیں۔'' سیلی نے جواب دیا۔ ''برخلاف اس کے کہ تم نے مجھ سے اور میری بچی سے بے حد اچھا سلوک کیا ہے۔ تم ایک اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو اور ہاں تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ اس پولیس آفیسر سے میرا کوئی ایسا ویسا رشتہ تھا۔ میں ایک بیوہ ہوں اور پولیس چیف ایک شریف اور ہمدرد انسان تھا اور بس..... تم مجھے اچھے لگے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شرما گئی۔
''شکریہ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں بھی سوچ رہا تھا، تم مجھے بے حد پسند آئی ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔'' سیلی اپنی زلف ایک ادا سے جھٹک کر مسکرادی۔
رے نے ایک کمبل اٹھالیا۔
''کہاں چلے؟'' سیلی پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
''معدنی کان کے اندر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور ہاں، یاد رہے تم کبھی وثوق سے نہیں کہہ سکتیں کہ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔ تم بھی اب اطمینان سے سو جاؤ۔'' سیلی وہیں گھاس پر دوسرا کمبل بچھا کر سو گئی۔ کار کی چابی رے کے پاس تھی۔

☆☆☆

اگلے روز سورج ایک بار پھر آگ برسا رہا تھا اور سڑکیں تپنے لگی تھیں۔ ان کی کار لہراتی چلی جارہی تھی۔
''یہاں سے رفتار کی حد میں رہ کر سفر کریں گے۔'' رے نے کہا۔ ''اور جہاں تک ممکن ہوسکا ہائی وے سے گریز کریں گے۔'' اس نے ریوالور کی نال سے سامنے پھیلے ہوئے نقشے پر لگی ہوئی ایک سیاہ لکیر کی جانب اشارہ کیا۔ یہ نقشہ اسے کار کے اندر سے ملا تھا۔ پھر مزید کہا۔
''بہتر ہے کہ یہ سڑک استعمال کرو۔'' اس نے ہدایت کی۔ ''یہ پختہ معلوم ہوتی ہے اور اپاچی ویلز کے قریب سے ہوکر گزرتی ہے۔ وہاں ایک ہوٹل بھی ہے جہاں ہم کم از کم دو روز قیام کریں گے اور صورتِ حال کا جائزہ بھی لیں گے۔'' اس نے نقشہ لپیٹ کر رکھ دیا۔
''ہم اسٹیٹ روٹ 16 پر گامزن ہیں جو ڈرائی ریور نامی قصبے سے ہوکر گزرتی ہے۔'' سیلی نے کہا۔ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی پاپی کچھ گانے لگی تھی۔
''بچے گاتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ سیلی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
''اچھا ہاں، اس اپاچی ویلز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا وہاں ٹھہرنا مناسب رہے گا؟''
''یہ ایک اچھا خیال ہے۔'' سیلی نے تائید کی۔ ''مجھے ہوٹل میں ٹھہرنا اچھا لگتا ہے اور پھر تمہاری رفاقت میں تو یہ قیام اور بھی پُرلطف ہوجائے گا۔''
''میں تمہاری زبان سے یہی سننا چاہتا تھا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔
''میں سچ کہہ رہی ہوں، بالکل سچ۔'' سیلی نے اثبات

میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم واقعی مجھے پسند کرنے لگی ہو۔''
''عورت کی آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔'' سیلی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔
وہ قصبہ ڈرائی ریور کے مضافات میں ایک بلندی طے کرنے ہی لگے تھے کہ اچانک انہیں ناکا بندی نظر آگئی۔ روٹ 16 اور ہائی وے کے سنگم پر سڑک کے دونوں جانب پولیس کاریں کھڑی تھیں۔ ''کار موڑو۔'' رے نے چیخ کر حکم دیا اور تیزی سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ''خدایا۔'' دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے نکل گیا۔ ان کے پیچھے ایک اور کار چلی آرہی تھی۔ ''ہائی وے پٹرول۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔ ''یہ لوگ ضرور کسی بغلی سڑک سے نکل کر ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔'' اس نے ریوالور اپنی جیکٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑس لیا۔ ''کوئی بات نہیں، میں ان سے نمٹ لوں گا۔'' سیلی نے کار کی رفتار دھیمی کردی۔
''احمق نہ بنو، وہ لوگ یہی چاہتے ہیں کہ تم کوئی غلط قدم اٹھاؤ۔ تمہیں ہر صورت فرار ہونا پڑے گا۔ میں انہیں مصروف کرلوں گی۔''
''ہاں ٹھیک ہے۔'' رے نے اتفاق کیا۔ ''کار روکو، میں فرار ہورہا ہوں۔'' اس نے دروازہ کھول لیا۔ ''تم سے اپاچی ویلز میں ملاقات ہوگی۔''
''ہاں ڈارلنگ۔'' وہ بولی۔ عقب نما آئینے میں اسے پیچھے آنے والی کار رکتی ہوئی نظر آئی۔ پولیس کار کے دروازے پوری طرح کھل گئے اور دو باوردی پولیس والے اچھل کر باہر آگئے۔ انہوں نے ہوائی فائر کیے۔ رے سڑک کے اس پار درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔
سیلی اسے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ نشیب میں اتر کر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس نے کار دوبارہ اسٹارٹ کردی۔ ''اب تم آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھی رہو۔'' اس نے پاپی سے کہا اور ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی بن گئی۔ ناکا بندی کے قریب کھڑے ہوئے پولیس والے برق رفتاری سے کار کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر بوکھلا گئے۔ اس نے قریب پہنچ کر بے حد مہارت اور چابکدستی سے کار کو لہرا کر ان دونوں کاروں کے درمیان سے نکال لیا لیکن پھر اس پر قابو نہ پاسکی اور اس کی کار سڑک کے کنارے لگے جنگلے سے جا ٹکرائی۔
''اسے فرار ہونے دو۔'' اس نے بہ آواز بلند خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''خدا کے لیے اسے فرار ہونے دو۔''

سوال جواب

ایک آدمی بہت جلدی میں اپنے آفس کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں گر پڑا۔ ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کے باس کی کال آگئی۔ اس آدمی نے جیسے ہی موبائل اپنے کان سے لگایا، اس کے باس نے چلا کر کہا۔
''کہاں ہو اور کیا کررہے ہو؟''
وہ آدمی تلخی سے بولا۔ ''میں گرا ہوا ہوں اور ایک گرا ہوا آدمی کیا کرسکتا ہے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا!!!''

باپ بیٹے سے: ''بتاؤ بیٹا کوہ ہمالیہ کہاں ہے؟''
بیٹا: ''معلوم نہیں۔''
دادی اماں جو قریب ہی بیٹھی تھیں فوراً بولیں۔ ''بیٹا اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اپنی چیزیں سنبھال کے رکھا کرو۔''

مرسلہ: عیسیٰ جیسانی طائف سعودی عرب

اس کے ساتھ ہی اس نے مڑ کر پاپی کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھیک تھی۔ گویا اس نے پولیس کی توجہ اپنی جانب کرلی تھی۔
پاپی عقبی شیشے سے پیچھے کی جانب دیکھ رہی تھی۔
''واہ.....واہ ٹکر ہوگئی۔'' وہ ہنس ہنس کر تالیاں بجانے لگی۔
''واہ..... واہ..... واہ۔'' پولیس والے اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ ان سے بولی۔ ''اور بس۔''
''آپ کو کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟'' ایک پولیس والے نے پوچھا۔
''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔''
''اس نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا تھا؟''
''نہیں۔'' سیلی نے جواب دیا۔
''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ آفیسر بولا۔ ''آپ جانتی تھیں کہ وہ کار سے کود کر فرار ہوگیا ہے؟''
''ہاں۔'' سیلی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔
''پھر آپ نے ناکا بندی توڑنے کی کوشش کیوں کی؟ آپ نے ہمارے لیے مشکلات پیدا کردی ہیں۔ آپ نے اس سے تعاون نہ کیا ہوتا تو وہ فرار نہیں ہوسکتا تھا۔''
''مجھے بے حد افسوس ہے۔'' سیلی نے معذرت آمیز

لہجے میں کہا۔ ''میں شاید نروس ہوگئی تھی، میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا کررہی ہوں۔''

''آپ خوش قسمت ہیں کہ زندہ بچ گئیں اور یہ بچی بھی محفوظ ہے۔'' آفیسر نے ہمدردی سے کہا۔ ''آپ کی کار کو تھوڑا سا نقصان پہنچا ہے۔ میں اپنے ایک ساتھی کو بھیج کر اسے ٹھیک کرادوں گا۔''

''شکریہ۔ کیا میں اب گھر جاسکتی ہوں؟''

''میڈم! تھوڑی دیر رک کر تازہ دم ہولیں۔''

''نہیں شکریہ، میرے خیال میں میرا اس وقت گھر چلے جانا بہتر ہے۔''

''اس مفرور مجرم کی گرفتاری کے بعد آپ کو اپنا بیان دینا پڑے گا۔ کیا ہم تاپاسٹی میں آپ سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں؟''

''ہاں جس وقت بھی آپ لوگ چاہیں، میں حاضر ہوں۔''

☆☆☆

اس نے تھیلی میں سے کھانے کی چیزیں نکال کر پامی کودیں۔ ''میں دودھ پیوں گی۔'' پامی نے مچلتے ہوئے کہا۔

''میری جان، میں دودھ لینا بھول ہی گئی اور اب کافی رات ہوگئی ہے۔ سارے اسٹورز بند ہوچکے ہیں۔'' وہ بولی۔

''آپ بھول گئیں مما مگر وہ شخص دودھ لینا نہیں بھولا تھا۔'' پامی نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''کون؟''

''میں ہوں...... دروازہ کھولو۔'' باہر سے آواز آئی۔ یہ رے تھا۔ سیلی نے دروازہ بہ آہستگی کھول دیا۔ وہ چپکے سے اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس نے مڑکر اپنے عقب میں دروازہ بند کردیا۔

''تم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔'' سیلی خوش ہوکر بولی۔ ''مجھے بے حد خوشی ہوئی۔''

''یہ بے حد آسان ثابت ہوا۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا۔ ''میں نے ان کی ناک کے عین نیچے سے ایک کار چرالی تھی اور ان کے درمیان سے نکل کر ہوشیاری سے یہاں آگیا۔ وہ اب بھی مجھے مضافات میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سیلی کو دیکھنے لگا۔ ''تم نے مجھے فرار ہونے کا موقع تو دیا ہی تھا لیکن یہاں ملنے کا وعدہ پورا کرکے واقعی اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ تمہاری یہ بات میرے دل کو چھوگئی ہے۔''

سیلی نے شرما کر پلکیں جھکالیں۔

''اچھا مجھے کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔'' اس نے ریوالور انگلی پر نچاتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔'' سیلی کچن کی جانب مڑی۔ ''لیکن پہلے اس ریوالور کو کہیں رکھ دو۔ کھاتے وقت بھی تم اسے ہم پر تانے رہو گے؟'' اس نے ایک لمحے تک غور کیا پھر ہنس کر ریوالور بستر کے پاس پڑی ہوئی تپائی پر رکھ دیا۔

''تم نے جس خلوص اور محبت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیش نظر مجھے اس شے کو اپنے قریب رکھتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' وہ بولا اور تھکن سے کراہتا ہوا بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

''یہ لو۔'' سیلی خورد ونوش کی کچھ اشیا تپائی پر رکھتے ہوئے بولی اور پھر دوسرے ہی لمحے برق سرعت کے ساتھ اس نے تپائی پر پڑا ہوا ریوالور اٹھالیا۔

''لیکن میرے خیال میں اب تمہیں دنیا کی کسی شے کی حاجت نہیں رہے گی۔'' اس نے ریوالور رے پر تانتے ہوئے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں مارے دہشت کے اپنے حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔

''یہی کہ تم نے جس پولیس چیف کو قتل کیا تھا، وہ میرا شوہر تھا۔'' سیلی ماہرانہ انداز میں دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں بولی۔ ''میں نے تمہیں فرار ہونے کا موقع اس لیے دیا تھا تاکہ اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کا انتقام لے سکوں اور شکر ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہورہی ہوں۔ اگر تم قانون کی گرفت میں آجاتے تو تمہیں زیادہ سے زیادہ عمر قید ہوتی یا سزائے موت بھی ہوتی تو نجانے اس میں کتنا عرصہ لگ جاتا جبکہ میں تمہیں فوراً اس جرم کی سزا دینا چاہتی تھی۔''

ریوالور نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے اور دونوں گولیاں رے کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ وہ کسی شرابی کے مانند لڑکھڑایا اور پھر بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں حیرت اور دہشت منجمد ہوکر رہ گئی تھی۔

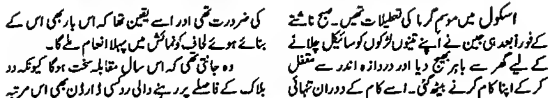
''ممی۔'' پامی خوف سے چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ اس نے ریوالور ایک جانب پھینک دیا اور اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

رازداں

ثمر عباس

دوسروں کی کمزوریوں سے کھیلنے والا بعض اوقات خود بھی کسی نہ کسی کمزوری کا شکار ہوتا ہے اور شاید اسی کی پردہ داری کے لیے وہ اتنی ہوشیاری سے کھیلتا ہے کہ عقل کی ساری حدیں اس پر آکر ختم ہوجاتی ہیں اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں سے نہ صرف اس کی عقل کا خاتمہ بلکہ چالبازیوں کا بھی زوال شروع ہوجاتا ہے۔

اوروں کی ٹوہ میں رہنے والوں کے رازوں کا دلچسپ تماشا



اسکول میں موسم گرما کی تعطیلات تھیں۔ صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی جین نے اپنے تینوں لڑکوں کو سائیکل چلانے کے لیے گھر سے باہر بھیج دیا اور دروازہ اندر سے مقفل کرکے اپنا کام کرنے بیٹھ گئی۔ اسے کام کے دوران تنہائی کی ضرورت تھی اور اسے یقین تھا کہ اس بار بھی اس کے بنائے ہوئے لحاف کو نمائش میں پہلا انعام ملے گا۔

وہ جانتی تھی کہ اس سال مقابلہ سخت ہوگا کیونکہ دو بلاک کے فاصلے پر رہنے والی روسی ڈارڈن بھی اس مرتبہ

نمائش میں حصہ لینے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اگر جین مقابلہ جیت جاتی تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا اور وہ ہوسٹن میں ہونے والی بین الاقوامی لحاف نمائش کے لیے بہتر طور پر تیاری کر سکتی تھی۔ اس کے بعد تجارتی پیمانے پر بھی اپنے تیار کردہ ڈیزائن فروخت کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

وہ ہر دو سال بعد اس مقابلے میں حصہ لیتی تھی کیونکہ چھ مہینے تو ڈیزائن کی تیاری میں ہی لگ جاتے تھے پھر ایک مہینا کلر اسکیم اور کپڑے کی خریداری کے لیے درکار ہوتا تھا پھر اس کا ایک نقلی نمونہ تیار کرنے کے بعد اس کے مطابق پیٹرن پر بلاک کی شکل دیتی اور سلائی مشین پر انہیں جوڑتی۔ یہ ایک طویل اور مشکل عمل تھا لیکن جب لحاف کا اوپری حصہ مکمل ہو جاتا تو اس کی خوشی اور اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

وہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھی۔ اس کی پرورش نانی نے کی جو ایک چھوٹے سے قصبے لورلینا میں رہتی تھی، گوکہ نانی اس سے بہت محبت کرتی تھی لیکن بچپن سے ہی اسے نظم و ضبط کا پابند اور سخت زندگی کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دکانوں پر لے جاتی اور وہاں سے اسکولوں کے لیے نئے یونیفارم تیار کرنے کے لیے مختلف نمونے اور کپڑا خریدتی۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے انہیں سستے مال کے لیے کپڑا بنانے کے کارخانوں میں جانا پڑتا جہاں رنگوں کی تیز بو سے اس کے نتھنے جلنے لگتے اور آنکھوں میں پانی آ جاتا۔ تاہم نانی نے اسے بہت چھوٹی عمر میں سلائی کا کام سکھا دیا اور اسے اپنی ہوم اکنامکس کلاس میں ہونے والے فیشن شوز میں انعامات ملنے لگے۔

ہائی اسکول میں بھی اسے کسی لڑکے نے اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت نہیں دی۔ نہ ہی وہ کسی سینئر کلاس کے لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پر گئی۔ وہ اتنی خوب صورت بھی نہیں تھی کہ اسے ماڈلنگ کی پیشکش کی جاتی اور نہ ہی اس نے نوجوانی میں شادی کے سپنے دیکھے۔ وہ اپنے کام میں مگن تھی اور اس کے پاس اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنی کلاس میں ٹاپ کیا تو اسے نارتھ کیرولینا اسٹیٹ کی جانب سے وظیفہ مل گیا پھر اس کی ملاقات ٹام برنز سے ہوئی اور انہوں نے شادی کر لی۔ اس وقت تک وہ کنواری تھی جبکہ اس کی سہیلیاں مانع حمل ادویات خریدنے کے لیے فارمیسی کے چکر لگاتی رہتی تھیں۔

ٹام ایک تعمیراتی فرم میں اچھے عہدے پر فائز تھا لہٰذا اسے خرچ کرنے کی آزادی تھی۔ وہ اپنے ہنر کی تکمیل کے لیے بہترین چیزیں خرید کر لاتی تھی۔ اس نے اوپر کی منزل پر ایک کمرا سلائی کے کام کے لیے مخصوص کر دیا تھا کیونکہ کھڑکیوں سے آنے والی روشنی اس کام کے لیے بالکل مناسب تھی جو بہت تیز یا آنکھوں کو خیرہ کرنے والی نہیں لیکن اتنی روشن ضرور تھی کہ آنکھوں پر زور نہ پڑے۔ اس نے ایک بڑھئی کو بلا کر دیوار میں شیلف اور درازیں بنوائیں۔ ان میں سفید رنگ کرا دیا اور وہاں کپڑے اور سلائی کا سامان رکھنے لگی۔

اس کے کچھ دوست طنزاً کہتے کہ اسے لحاف بنانے کا جنون ہو گیا ہے اور وہ خود بھی یہ مانتی تھی کہ وہ اس عمل کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے پانچ کمروں کے ہر بستر کو اپنے فن پاروں سے سجا دیا پھر جب اس نے اپنی ایک دوست کو بچی کی پیدائش پر لحاف کا تحفہ دیا تو وہ اس کے فن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی رضائیاں اور پلنگ پوش نمائش میں رکھے۔

دوپہر کے وقت الارم کی آواز سن کر وہ اٹھی اور سیڑھیاں اترتی ہوئی کچن میں چلی گئی تاکہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر سکے۔ کچھ ہی دیر میں لڑکے واپس آ کر کھانا مانگتے اس لیے وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔ ابھی اس نے میز پر سینڈوچ، چپس اور لیمن جوس کا جگ رکھا ہی تھا کہ اس کے تینوں لڑکے ٹیلر، ٹیڈ اور ٹیری گھر میں داخل ہوئے۔ مسلسل سائیکل چلانے سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور وہ پسینے میں شرابور تھے۔

”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے مام؟“ ٹیلر نے سینڈوچ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بہت اچھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور پانی کے پائپ سے پالتو کتے ”سنو“ کے لیے پانی کا پیالہ بھرنے لگی۔ ”میں نے تم لوگوں سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اس کے پانی کا خیال رکھا کرو۔ ٹیلر! تم سب سے بڑے ہو۔ اس لیے میں تمہیں اس کا ذمے دار سمجھتی ہوں۔“

”سوری مام! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”رائے کی مما نے بتایا ہے کہ کل ٹائلر کے گھر چوری ہو گئی تھی جب وہ شاپنگ کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔“ ٹیڈ نے اطلاع دی۔ ”ڈاکو تمام زیورات اور قیمتی سامان لے گئے۔“

”بہت برا ہوا۔“ جین بولی۔ یہ خبر سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ٹائلر ان کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہتا

تھا۔ ”کیا ان کا سیکیورٹی الارم کام نہیں کر رہا تھا؟“

”رائے کی مما نے بتایا ہے کہ وہ چور اس سے باخبر تھے۔ انہوں نے پہلے اسے ناکارہ بنایا۔“

جین کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ یہ عادت بھی اسے نانی سے ورثے میں ملی تھی۔

”ڈیڈی بھی یہ خبر سن کر پریشان ہو جائیں گے۔“ ٹیلر نے کہا۔

”ضروری نہیں کہ انہیں ہر بات بتائی جائے۔“ اس نے بے زاری سے کہا اور اپنے ذہن سے بُرے خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ اپنے کمرے میں جاؤ۔ اب تم لوگوں سے شام کو ملاقات ہوگی۔“

یہ کہہ کر اس نے بیرونی دروازہ بند کیا اور اوپر جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ ان کا علاقہ غیر محفوظ ہے۔ چوری تو کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب اہلِ خانہ گھر میں موجود نہ ہوں۔ جین بڑے آرام سے اس گھر میں رہ رہی تھی۔ ان کے پاس فرنیچر اور ٹی وی سیٹ کے علاوہ ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں تھی جو چوری ہو سکے۔ اس کے علاوہ پولیس کی گاڑی بھی اس علاقے میں وقفے وقفے سے گشت کرتی رہتی تھی اس لیے چوری کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس نے کام کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور پانچ بجے کا الارم لگا... کر کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ذہن کے پردے پر مختلف مناظر چل رہے تھے۔ کبھی وہ دیکھتی کہ اس کے بنائے ہوئے پلنگ پوش کو نمائش میں پہلا انعام ملا ہے اور کبھی نانی کی شبیہ ابھرتی جس نے مرنے سے پہلے اسے لحاف بنانا سکھایا تھا۔

پھر منظر بدلا اور اس کے ذہن پر رچ مائیکل کا چہرہ نمودار ہو گیا۔ اس سے اس کی ملاقات ایک سال قبل ایک شو میں ہوئی تھی۔ وہ ایک میز پر کھڑی کپڑوں کے نمونے دیکھ رہی تھی کہ اس نے اپنا تعارف ایک سیلز مین کے طور پر کروایا۔ اگر کوئی اس کے سر پر گن رکھ دیتا تب بھی وہ یہ وضاحت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی باتوں میں کیسے آ گئی۔ وہ کبھی بھی اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن نہیں تھی۔ ٹام ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ تھا اور ان کی زندگی بڑے ہموار طریقے سے آگے بڑھ رہی تھی پھر رچ نے کیسے اس میں نقب لگائی۔ یہ شاید اس کی پُرکشش شخصیت اور گہری نیلی آنکھوں کا کرشمہ تھا جس نے اس کے دل میں چنگاری سی سلگا دی جو بڑی تیزی سے شعلے میں تبدیل ہو گئی اور اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔

ان کی خفیہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دو مرتبہ جب ٹام کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور بچے اسکول میں تھے، اس نے رچ کو عقبی دروازے سے گھر میں بلا لیا۔ گوکہ یہ ایک خطرناک بات تھی لیکن رچ نے جو آسودگی دی، وہ اسے پہلے کبھی نہیں ملی تھی پھر انہوں نے باہمی رضامندی سے طے کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔ نہ فون پر بات ہوگی اور نہ ہی کسی جگہ خفیہ ملاقات کی جائے گی۔ اب بھی وہ اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے میں مشکل محسوس کر رہی تھی۔

شام کو ٹام گھر آیا تو اس نے جین سے کہا۔ ”کیا تم نے آج کے اخبار میں چوریوں کے بارے میں پڑھا؟“

”نہیں۔ البتہ لڑکے بتا رہے تھے کہ ٹائلر کے گھر میں چوری کی واردات ہوئی ہے۔“

”صرف ٹائلر ہی نہیں بلکہ اب تک بارہ گھروں میں نقب زنی ہو چکی ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں دن کے وقت لڑکوں کا گھر سے باہر رہنا مناسب ہے۔“

”اگر وہ گھر میں رہے تو سارا دن ویڈیو گیم کھیلیں گے یا اُدھم بازی کرتے رہیں گے جس کی وجہ سے میرے کام میں حرج ہوگا۔“ اس نے اعتراض کیا پھر مدافعانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”وہ دوپہر میں گھر آ جاتے ہیں اور ’سنو‘ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔“

”سنو بے زبان جانور ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم نے بھونکنے والا کتا خریدنے کی مخالفت کی تھی۔“

”ہمیں چاہیے تھا کہ اس علاقے میں منتقل ہو جاتے جسے گیٹ لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے لیکن تمہیں وہاں کے اسکول پسند نہیں آئے۔“ جین نے اسے ٹالنے کی کوشش کی پھر بولی۔ ”تمہیں کس نے بتایا کہ میں ان لڑکوں کو گھر سے باہر بھیج دیتی ہوں؟“

”سیلی نے آج مجھے فون کیا تھا۔“ ٹام نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”اوہ! وہ جاسوس عورت۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“ جین نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اس نے اسے اپنا معاملہ بنا لیا ہے۔“

”جب سے وہ ایسوسی ایشن کی صدر بنی ہے، وہ سمجھتی

ہے کہ ہماری زندگیوں پر حکومت کرنے کا حق مل گیا ہے۔"
"میں جانتا ہوں کہ تمہاری نظر میں اپنے کام کی بہت اہمیت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لڑکے گھر میں رہ کر تمہیں تنگ کرتے رہیں گے، اس لیے کیوں نہ انہیں چند ہفتوں کے لیے سمر کیمپ بھیج دیا جائے۔ یہ تمہارے اور ان کے حق میں بہتر ہوگا۔"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "لیکن پہلے مجھے سوچنے دو۔"
"میں نہیں جانتا کہ تم ایک میڈ کیوں نہیں رکھ لیتیں۔ ہم بہ آسانی اسے تنخواہ دے سکتے ہیں۔"
"کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہم یہ کوشش پہلے بھی کر چکے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کام کی نہیں تھی۔ وہ نہ تو ڈھنگ سے صفائی کرتی ہیں اور نہ ہی احتیاط سے کام کرتی ہیں۔ میرے کئی قیمتی برتن انہوں نے توڑ دیے۔ اس کے علاوہ انہیں باتیں کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ہر وقت اپنے گھریلو مسائل کا رونا روتی رہتی ہیں جبکہ مجھے کام کے دوران مکمل پرائیویسی چاہیے ہوتی ہے۔"
"جیسا تم مناسب سمجھو۔" ٹام نے کہا۔
جمعے کی صبح وہ اینشول گئے۔ لڑکوں کو کیمپ میں چھوڑا اور واپسی میں کینڈل لائٹ ڈنر کے لیے گرووپارک ان چلے گئے۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے ٹام نے اسے ایک تحفہ دے کر حیران کر دیا۔ جینن نے پیکٹ کھول کر دیکھا۔ سونے کی زنجیر کے ساتھ ایک سنہری قینچی منسلک تھی۔
"اب وقت آ گیا ہے کہ تم کام کے دوران کوئی قیمتی چیز استعمال کرو۔" ٹام نے مسکراتے ہوئے کہا جب اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تو جینن نے سوچا کہ اب اسے جج کے ساتھ اپنا افیئر ختم کرنا ہوگا جو اسے شروع ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

وہ معمول کے مطابق فریم پر جھکی اپنا کام کر رہی تھی کہ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ ایک نوجوان شخص گلے میں شناختی کارڈ لٹکائے اور ہاتھ میں بریف کیس لیے ہوئے کھڑا تھا۔ جینن نے ہچکچاتے ہوئے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور بولی۔
"اس علاقے میں سیلز مینوں کا آنا منع ہے۔"
"مجھے معلوم ہے میم لیکن میں تمہارا صرف ایک منٹ لوں گا۔ میرا تعلق پیک الارم کمپنی سے ہے اور ہم نے ایک خصوصی اسکیم متعارف کروائی ہے۔ اگر تم اپنے گھر پر یہ الارم لگوا لو تو ہم ایک ماہ تک بلا معاوضہ سروس دیں گے۔"
"معاف کرنا۔ ہمارے گھر میں پہلے سے الارم نصب ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔"
یہ کہہ کر اس نے سیلز مین کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے اس پر چسپاں ایک خط نکال لیا۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یہ خط ہوم اونرز ایسوسی ایشن کی طرف سے تھا اور اس میں لکھا تھا کہ اگر انہوں نے دس روز کے اندر لان کی بڑھی ہوئی گھاس اور جھاڑیاں نہ کاٹیں تو ان پر جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر باہر کی طرف دیکھا۔ واقعی لان کی حالت بہت خراب تھی اور بڑھی ہوئی بیلوں نے مکان کے ایک حصے کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس جانب توجہ نہ دے سکی اور بھول گئی کہ موسم گرما میں لڑکے اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔
"او سیلی...... تجھے خدا سمجھے۔ ابھی بتاتی ہوں۔"
غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے دراز سے فون بک نکالی اور لان سروس والوں کا نمبر تلاش کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے جج کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔
"ہمارے درمیان جو کچھ تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔"
اس کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ گو کہ جج سے اس کی گفتگو کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی لیکن اسے امید تھی کہ وہ یہ بات سمجھ گیا ہوگا۔ بہرحال اس تعلق کو ختم ہونا ہی تھا۔
"بہت خوب۔" ٹام نے اس کے کندھوں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "ایک اور شاہکار۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "تم کیا سمجھتی ہو۔ اس مرتبہ بھی پہلا انعام تمہیں ہی ملے گا؟"
"امید تو یہی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں سرنگ کے دہانے پر روشنی دیکھ رہی ہوں۔"
بعد میں مشروب پینے کے دوران اس نے سیلز مین کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "داخلی دروازے کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر صاف لکھا ہوا ہے کہ سیلز مینوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"
"ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ تمہیں جواب دینے کے لیے دروازے پر جانا ضروری ہے۔" ٹام نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے انٹرکام پر بات کیوں نہیں کی۔ وہ شخص

تمہیں قابو کر کے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔"
"میں نہیں جانتی۔ شاید اس وقت میں نے یہ بات نہیں سوچی۔" اس نے جواب دیا۔
ٹام نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں ایک گن خرید لینی چاہیے۔"
"نہیں۔ ہمارے گھر میں بچے ہیں۔" اس نے احتجاج کیا۔ "اس کے علاوہ میں نے زندگی میں کبھی گن استعمال نہیں کی۔"
"دراصل آج میں نے اشتہار میں اسمتھ اینڈ ویسن ریوالور دیکھا ہے۔ اس میں لیزر بیم بھی ہے۔ تمہیں صرف نشانہ لے کر فائر کرنا ہوگا۔ بالکل فول پروف ہے۔ تم اسے رات میں بھی استعمال کر سکتی ہو۔"
"نہیں۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے یہ آئیڈیا پسند نہیں آیا۔"
"کیا تمہاری لان سروس والوں سے بات ہوئی؟" ٹام نے پوچھا۔
"ہاں۔ وہ کل صبح آئیں گے۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "لیکن سیلی نے یہ اچھا نہیں کیا۔"
"وہ اپنا فرض نبھا رہی ہے۔" ٹام نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔
"وہ خط بھیجنے کے بجائے مجھے فون کر کے بھی بتا سکتی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ لڑکے سمر کیمپ میں گئے ہوئے ہیں اور لان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے پریشان کرنے کے لیے خط بھیجا ہے۔"
"شاید اسے دیر سے ان باتوں کا ادراک ہوتا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو؟"
جینن نے سر ہلایا اور کچن میں چلی گئی۔
دوسرے دن وہ صبح سے ہی کام کرنے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی اسے "سنو" کے کراہنے کی آواز آئی جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ جینن اس کا مطلب سمجھ گئی۔ دراصل وہ لڑکوں کے ساتھ باہر جانے کا عادی تھا اور ان کی غیر موجودگی میں جینن یہ بات بھول گئی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔
"اوہ! مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ آؤ چلتے ہیں۔"
جیسے ہی جینن نے سنو کو باہر نکالنے کے لیے دروازہ کھولا، اس کی نظر روکسی پر گئی جو ان کے مکان کے پیچھے والی پگڈنڈی پر جاگنگ کر رہی تھی۔ اس کے سرخ بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور فیروزی رنگ کے جاگنگ سوٹ میں اس کے جسم کا ہر حصہ نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر رکی اور اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
"تمہارے لحاف کی تیاری کہاں تک پہنچی؟"
"امید ہے کہ چند ہفتوں میں مکمل ہو جائے گا۔" جینن نے جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس بار تم بھی مقابلے میں حصہ لے رہی ہو؟" وہ توقع کر رہی تھی کہ شاید روکسی اس بارے میں کچھ بتائے۔
"میرا ڈیزائن خاصا مشکل ہے۔ اس میں کٹائی کا کام زیادہ ہے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بڑی باریک بینی سے جوڑنا پڑ رہا ہے۔ یقیناً یہ میرے لیے ایک چیلنج ہے۔ میں اسے پورا کر لوں گی۔"
"گڈ لک۔" جینن نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ لان سروس والے آ چکے تھے۔ اس نے انہیں لان کے وہ حصے دکھائے جہاں کام ہونا تھا پھر وہ اپنے لیے کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ وہ روکسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق اس کا کام تخلیقی کے بجائے روایتی لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بارے میں پُرامید تھی کہ اس بار بھی پہلا انعام اسے ہی ملے گا۔
وہ ساری دوپہر کام کرتی رہی پھر اسے مزدوروں کو اجرت کی ادائیگی کے لیے اٹھنا پڑا۔ اس نے اپنے کھانے کے لیے فریج سے ایک سیب اور پنیر کا ٹکڑا نکالا اور واپس اپنے کام پر آ گئی۔ وہ تعریفی انداز میں اپنے بنائے ہوئے لحاف کی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اب اسے سلائی کے لیے رنگوں کا انتخاب کرنا تھا۔
اس نے سوچا کہ کیوں نہ دکان کا ایک چکر لگا لے تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ ایک بار پھر مرکزی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھی کہ شاید لان سروس والے کچھ بھول گئے لیکن وہ دروازے کے پیچھے کھڑے ہوئے جج کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔
"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے شیشے میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے ایک منٹ کے لیے اندر آنے دو۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"
"سب باتیں ہو چکی ہیں۔ اب یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ بات سمجھ گئے ہوگے۔"
وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی جج کو دروازے پر کھڑا نہ

دیکھ لے۔ روکسی جوگنگ کرتے ہوئے کسی بھی وقت واپس آسکتی ہے یا پڑوسیوں میں سے کوئی اپنی گاڑی میں وہاں سے گزر سکتا ہے۔

"تم نے اپنی گاڑی کہاں کھڑی کی؟" اس نے بلا سوچے سمجھے کہا۔ "امید ہے کہ ہمارے ڈرائیو وے میں نہیں کی ہوگی۔"

"نہیں۔ میں نے اپنی کار کافی فاصلے پر کھڑی کی ہے اور پیدل چلتا ہوا یہاں تک آیا ہوں اور تم سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

جین نے سوچا کہ اس سے جان چھڑانے کا یہی ایک راستہ ہے کہ اس کی بات مان لی جائے، چنانچہ اس نے اسے اندر آنے دیا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی رچ نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور اس کی گردن پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں موسم گرما کے ختم ہونے کا انتظار کررہا ہوں کہ کب خزاں شروع ہو اور ہم دوبارہ ایک ہوجائیں۔"

"پلیز رچ۔" وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "میں نے ایک دفعہ بھی یہ نہیں کہا کہ ہمارا ساتھ مستقل ہوسکتا ہے۔"

"جین! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اس طرح کسی عورت کو نہیں چاہا جیسے تمہیں چاہتا ہوں۔"

جین کو کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے اچک کر دیکھا۔ سیلی اس کے کتے سنو کی زنجیر پکڑے عقبی دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

"کوئی ہے؟" اس نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے آواز لگائی۔

جین نے غصے کے عالم میں دروازہ کھولا تو سیلی اندر داخل ہوگئی۔

"مجھے امید ہے کہ میں نے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ یہاں کتوں کو پٹا ڈالنے کے بارے میں بھی قانون موجود ہے۔ شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔"

"معاف کرنا۔ لگتا ہے کہ اب میں پہلے کی طرح بیک وقت کئی کام کرنے کی عادی نہیں رہی۔" جین نے کہا۔

"میرا مقصد دخل اندازی کرنا نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنا خوب صورت کتا کہیں چلا جائے۔ یہ سڑک پر کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہا تھا۔"

"اسے واپس لانے کا شکریہ۔" جین اسے عقبی حصے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہارے کہنے کے مطابق لان ٹھیک کروادیا ہے۔"

"اوہ! بہت اچھا لگ رہا ہے۔ جین! میرے پاس خط بھیجنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمہاری گھاس اتنی گھنی ہوگئی تھی کہ اس میں سے کوئی کیڑا بھی نہیں گزر سکتا تھا۔"

"تم یہ بات ٹیلی فون پر بھی کہہ سکتی تھیں۔"

سیلی نے اس کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے فریج ڈور کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اندر کسے چھپا رکھا ہے؟"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے پھر بھی اگر جاننا چاہتی ہو تو سنو۔ وہ الارم کمپنی سے آیا ہے، ہمارا الارم سسٹم چیک کرنے۔ اس میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔" جین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کی کار کہاں ہے؟ ڈرائیو وے میں تو نظر نہیں آئی۔" سیلی نے کاٹ کھانے والے انداز میں پوچھا جس پر جین مشتعل ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتی، سیلی بولی۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔ شام ہونے سے پہلے کافی کام نمٹانے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں پہلے جین اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔

"پریشان مت ہونا۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "تمہارا راز میرے پاس محفوظ رہے گا۔"

اس کے جانے کے بعد جین آندھی اور طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی اور رچ سے بولی۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"یہ کون تھی؟"

"سیلی ٹیلر...... اس علاقے کی جاسوس۔ وہ ہر وقت لوگوں کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے اور اس کا شوہر کاؤنٹی کمشنر ہے۔ ان دونوں کا اس علاقے میں بہت اثر رسوخ ہے۔ اب وہ ساری عمر مجھے چٹکیاں لیتی رہے گی۔ میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ... یا میں پولیس کو بلاؤں۔"

"نہیں۔" رچ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جب تک تم یہ نہیں کہو گی کہ ہم دوبارہ ایک ہورہے ہیں، میں نہیں جاؤں گا۔"

جین اپنی میز کی طرف بڑھی اور کارڈلیس فون اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رچ اسے روکنے کے لیے صوفے سے اٹھا۔ وہ خوفزدہ ہوکر بھاگی۔ رچ نے بھی اس کا پیچھا کیا۔

سنو بھی ان کے تعاقب میں تھا۔ جیسے ہی وہ لیونگ روم میں پہنچی، رچ نے اسے پکڑ لیا اور وہ دونوں فرش پر گر گئے۔ ان کے درمیان کشمکش جاری تھی کہ اچانک ہی جین نے اپنے دفاع میں قینچی پکڑی اور اس کی گردن میں گھونپ دی۔ رچ کے جسم سے خون بہنے لگا جس کے چھینٹے سنو کی سفید کھال پر پڑے۔

"اب تمہیں میری بات کا یقین آگیا..... کتیا کی اولاد۔" وہ چلاتے ہوئے بولی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ جب اس نے رچ کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تو اسے اپنے فعل کا احساس ہوا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے لیے کچن کی طرف بھاگی اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اوہ میرے خدا..... یہ میں نے کیا کردیا۔"

پولیس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ ضرور کوئی چور تھا جو سیلز مین کا روپ دھار کر اندر آگیا۔ جب طبی عملہ رچ کے بے جان جسم کو لے جانے لگا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے مر چکا ہوگا۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک کے بعد دوسرا جھوٹ بولنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ازدواجی زندگی بچانے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

چوریوں کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے پیش نظر ٹام اس سے دن میں ایک دو مرتبہ اس کے سیل فون پر ضرور بات کرتا تھا۔ اس دن بھی سہ پہر میں اس نے اپنی نئی عمارت کے نقشے کے بارے میں بتانے کے لیے فون کیا تو جین نے روتے ہوئے اسے یہ منحوس خبر سنائی۔

سب سے زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ گھر کے چاروں طرف زرد فیتہ باندھ کر اسے جائے وقوعہ قرار دے دیا گیا اور لیونگ روم کی ناکا بندی کردی گئی۔ پولیس کے سراغ رساں گھر کے اندر اور باہر ثبوت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

"تم صرف اپنا دفاع کررہی تھیں۔" ٹام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم سے پولیس اسٹیشن میں کچھ سوالات پوچھے جائیں گے لیکن یہ ایک رسمی کارروائی ہوگی۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں پھر بھی میں احتیاطاً بہترین وکیل کی خدمات حاصل کرلوں گا۔"

آنے والے دنوں میں ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا اور دروازے کی گھنٹی بار بار بجنے لگی۔

دوست اور ملنے والے اس کی بہادری اور حوصلے کی داد دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ مقامی اخبار نے

آزمائش

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اللہ سے رزق مانگا جائے یا نہ مانگا جائے، جو نصیب میں ہے وہ رزق انسان کے پاس دوڑا آتا ہے۔

ایک نیک و پارسا اور عبادت گزار شخص نے سوچا کیوں نہ اسے آزما کر دیکھا جائے۔ اس نے گھر بار چھوڑ کر ایک جنگل میں رہائش اختیار کرلی۔ وہ یہاں لیٹا رہتا اور سوچتا دیکھتا ہوں میرا رزق یہاں کیسے پہنچتا ہے؟

اسے وہاں لیٹے لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک قافلہ راستہ بھول کر وہاں آنکلا۔ قافلے والوں نے دیکھا کہ ایک تنہا شخص پہاڑی کے دامن میں بے سدھ لیٹا ہوا ہے، نہ اسے جنگلی درندوں کا ڈر ہے، نہ کوئی اور خوف ہے۔ انہیں خیال گزرا معلوم نہیں یہ شخص زندہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس کے قریب گئے اور اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

"اے بندۂ خدا! تو کون ہے اور یہاں اس ویرانی میں کیا کررہا ہے؟"

وہ خاموش رہا تو قافلے کے لوگوں نے سوچا اس کا یہ حال یقیناً بھوک پیاس سے ہوا ہوگا۔ انہوں نے اس کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ ایک شخص نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلانے کی کوشش کی تو اس نے منہ بند کرلیا۔ وہ تو دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ رزق کس طرح دوڑ کر انسان کے پاس آتا ہے۔

قافلے والے اسے کھانا کھلانے میں ناکام ہوئے تو ان میں سے ایک شخص نے مشورہ دیا کہ چھری سے اس شخص کا منہ کھولا جائے تاکہ اسے کھانا کھلایا جاسکے۔ وہ عابد زاہد شخص چھری کا نام سنتے ہی ڈر گیا۔ اس نے خوفزدہ ہوکر منہ کھول دیا۔ اسے کھانا کھلایا گیا یہاں تک کہ کھانا حلق تک آگیا۔ اس شخص کے دل نے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

"میں نے تجھ سے یہ آزمائش صرف اس لیے کرائی تاکہ تیرا توکل مضبوط ہوجائے۔ یاد رکھنا لالچ اور ہوس گدھا پن ہے۔" وہ شخص اب مان گیا تھا کہ ہر کسی کو اس کے نصیب کا رزق ہر صورت ملتا ہے۔

(حکایت رومی وسعدی سے انتخاب)

کورنگی سے مونا رضوان کا قلمی تعاون

بھی اس واقعے کی خبر کچھ یوں لگائی۔ ”خاتونِ خانہ نے مداخلت کار کو قینچی سے شکست دے دی۔“ لیکن جینن کے دماغ میں ایک ہی بات بیٹھ گئی تھی کہ اس سے قتل جیسا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

ٹام کا خیال تھا کہ پولیس اسٹیشن میں رسمی سوالات ہوں گے لیکن جلد ہی انہوں نے تفتیش کی شکل اختیار کر لی۔ جب ایک نئے جوشیلے سرکاری وکیل نے یہ کیس گرینڈ جیوری میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ عدالت میں بھی ٹام اسے تسلی دیتا رہا جس طرح کوئی باپ اپنے زخمی بچے کے آرام کا خیال رکھتا ہے۔ وہ بچ کے کسی رشتے دار کو نہیں جانتی تھی لیکن تحقیقات شروع ہونے پر ان میں سے کوئی بھی سامنے آ سکتا تھا۔

وہ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ سیلی کے کہے ہوئے الفاظ ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتے رہتے۔ ”تمہارا راز میرے پاس محفوظ رہے گا۔“ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے بے وفائی اور پاگل پن کا نوبل انعام ملنا چاہیے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سیلی اس بارے میں اور کیا جانتی ہوگی۔ اس نے ٹام جیسے شریف اور خیال رکھنے والے شخص کو دھوکا دیا جواب بھی قدم قدم پر اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران وہ معذوری کی سی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکوں کو کچھ نہ بتایا جائے۔ ان کی چھٹیاں برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ انہیں خود ہی اس معاملے سے نمٹنا تھا۔ چھ ماہ قبل انہوں نے لیک کیسٹن پر ایک جگہ خریدی تھی اور ٹام نے اپنے بیٹوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک ویک اینڈ ہاؤس کا نقشہ تیار کر لیا تھا جس میں مچھلیاں پکڑنے کی جگہ، بوٹ ہاؤس اور جیٹ اسکائی بھی ہوتی۔ ٹام اس کی حوصلہ افزائی کے لیے لیک ہاؤس کے بارے میں باتیں کرتا لیکن مشروب کا ایک گلاس ہی جینن کو سکون دے سکتا تھا جو وہ ٹام کی نظر بچا کر حلق میں انڈیل لیتی۔

اس کی نیند غائب ہو چکی تھی اور جب آنکھ لگتی تو وہ اپنے آپ کو خلا میں تیرتا ہوا محسوس کرتی اور بلندی سے زمین اسے ایک کھلونے کے مانند نظر آتی۔ اسے ڈراؤنے خواب نظر آتے اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ پوری رات یونہی سوتے جاگتے گزرتی۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس کیفیت سے آزاد نہیں کر پا رہی تھی۔

ٹام اس کے گرد یوں منڈلاتا جیسے مرغی اپنے چوزوں کا خیال رکھتی ہے اور جب وہ بستر سے باہر آتی تو فوراً اس کے سامنے انڈے کا آملیٹ بنا کر رکھ دیتا اور خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا۔ ٹام کا یہ رویہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پشیمان ہوتی پھر ایک دن اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہہ دیا۔ ”تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ میں تمہاری محبت کا قرض کبھی نہیں اتار سکتی۔“

ٹام اپنی مصروفیات کے ساتھ گھر کا بھی پورا خیال رکھ رہا تھا۔ اس نے گرومنگ سروس کو فون کر کے سنو کی دیکھ بھال کے لیے بلایا اور جب زرد فیتہ ہٹ گیا تو اس نے کلیننگ سروس کو بلا کر لیونگ روم کو اس کی اصلی حالت میں واپس لانے کے لیے کہا۔ جب وہ خون آلود قالین کو لپیٹ کر لے جانے لگے تو جینن نے کہا۔

”اسے واپس لانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ کبھی اتنی آزردہ نہیں ہوئی تھی۔

وہ اپنے بچوں کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہی تھی لیکن جب وہ سمر کیمپ سے واپس آئے تو ان کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اس کی ایک ہیرو کی طرح عزت کر رہے تھے۔ ایک ایسی بہادر عورت جس نے محض ایک چھوٹی سی قینچی کی مدد سے بڑے آدمی کو شکست دی۔ وہ اسے کیمپ میں قیام کے دوران کشتی رانی، ورزش اور کیمپ فائر کے قصے سنا رہے تھے۔

لڑکوں کے آنے کے بعد وہ کافی حد تک نارمل ہو گئی اور اس نے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ اس کا لحاف تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اب بارڈر لگانا باقی رہ گیا تھا۔ اس کے لیے اس نے گہرے سرخ رنگ کا انتخاب کیا۔ پھر اکتوبر کی وہ خوشگوار صبح بھی آ گئی جب وہ اپنی نئی وین میں اس گراؤنڈ کی طرف جا رہی تھی جہاں نمائش کا انعقاد ہو رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس نے دو سال اس لحاف کی منصوبہ بندی، ڈیزائن اور تیاری میں لگائے تھے اور اب اس امتحان کا نتیجہ سامنے آنے والا تھا۔

وہ پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی کھڑی کر کے باہر آئی تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ خوانچہ فروشوں کی قطار کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی جو کھانے پینے کی مختلف اشیا فروخت کر رہے تھے۔ بھنی ہوئی مکئی کے دانوں اور مونگ پھلی کی خوشبو سے کئی ہفتوں بعد پہلی بار اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ وہ درمیانی چال چلتی ہوئی اس عمارت میں داخل ہو گئی جہاں لحافوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

قطار در قطار رنگ برنگے خوش نما لحاف لٹکے ہوئے تھے اور نتیجے کے مطابق ان پر مختلف رنگوں کے ربن لگا دیے گئے تھے۔ ہال کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اس کے بنائے ہوئے لحاف پر نیلا ربن لگا ہوا تھا..... گویا اسے بیسٹ آف شو قرار دیا گیا تھا۔

اس نے فوراً ہی یہ خوش خبری ٹام کو سنائی تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ جشن منانے کا موقع ہے۔ ہم آج رات کہیں باہر کھانا کھائیں گے۔ جہاں تم کہو گی۔“

اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرتی، ٹام بولا۔ ”تھوڑی دیر پہلے میری وکیل سے بات ہوئی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کیس میں گرینڈ جیوری کو کیوں گھسیٹا جا رہا ہے لیکن اسے پورا یقین ہے کہ تمہارے کیس میں بالکل بھی جان نہیں ہے۔ بچ کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے جس میں ریپ کے کیس سب سے زیادہ ہیں۔“

اس ایک فون کال نے جینن کو زمین پر گرا دیا۔ اس کے ذہن میں سیلی کا خیال آیا اور وہ اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی کہ سیلی کا شوہر حال ہی میں گرینڈ جیوری کا رکن مقرر ہوا ہے۔ جینن متضاد کیفیتوں کا شکار تھی۔ ایک طرف اسے جیتنے کی خوشی تھی تو دوسری جانب اس پر یہ نیا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ سیلی نے کہا تھا کہ اس کا راز اس کے سینے میں محفوظ رہے گا۔ کیا وہ اپنے وعدے پر قائم رہ سکے گی؟

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ روکسی کے بنائے ہوئے لحاف کو بھی بیسٹ آف شو کا نیلا ربن ملا تھا۔ ان دونوں کے نام ایک بڑے کارڈ پر ساتھ ساتھ نمایاں طور پر لکھے ہوئے تھے۔

واپس آتے ہوئے اس نے ایک آئس کریم لی اور وہیں پارک کی بنچ پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ تبھی اسے محسوس ہوا کہ جھاڑیوں کے پیچھے سے کچھ مانوس آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ کان لگا کر سننے لگی۔

”ہینکس آج رات میٹنگ میں جا رہا ہے۔ اس لیے ہم کہیں مل سکتے ہیں۔“ یہ سیلی کی آواز تھی۔ ”بشرطیکہ تمہارے لیے مطلع صاف ہو۔“

جینن نے باقی ماندہ کون قریبی ڈسٹ بن میں پھینکی اور جھاڑیوں کے قریب ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”میں واقعی تمہیں بہت یاد کر رہی ہوں۔“ روکسی نے خوابناک آواز میں جواب دیا۔

جینن نے اپنی ہمت مجتمع کی اور رینگتی ہوئی باڑ کے سرے تک پہنچ گئی جہاں سے وہ ان دونوں کو دیکھ سکتی تھی۔ سیلی نے روکسی کی کمر کے گرد بازو ڈالا ہوا تھا اور وہ اس کا دیوانہ وار بوسہ لے رہی تھی۔

جینن نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کیا اور ان کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے مقابلے کا نتیجہ دیکھنے ابھی ابھی آئی ہے۔

”ہائے۔“ اس نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس تیزی سے ان کی جانب بڑھی کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں جیسے زمین ان کے قدموں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہو۔

جینن اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”امید ہے کہ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی ہوگی۔“

سیلی جھینپتے ہوئے بولی۔ ”مبارک ہو۔ تم نے بیسٹ آف شو کا انعام جیتا ہے۔“ اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور وہ اضطراب کے عالم میں اپنے بلاؤز کا کالر پکڑے ہوئے تھی۔

”تمہیں بھی مبارک ہو روکسی۔“ جینن نے کہا۔ اس کے اندر حسد کا ناگ پھن مار رہا تھا۔

”تمہارا لحاف بہت پیارا ہے۔ تمہیں اس پر فخر کرنا چاہیے۔“

روکسی خاموش کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر شرمساری کے آثار تھے۔

”میرا خیال ہے، اب چلنا چاہیے۔ ابھی مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔“ جینن نے کہا۔ ”اور تم لوگ بالکل پریشان مت ہونا۔ تمہارا راز میرے پاس ہمیشہ محفوظ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دی۔

پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اب واقعی اس کا کیس مضبوط ہو گیا ہے۔ سیلی کبھی نہیں چاہے گی کہ اس کی بدنامی ہو اور گرینڈ جیوری کے رکن کو اپنی بیوی کے حوالے سے کسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ سیلی کو اگر اپنی اور شوہر کی عزت عزیز ہے تو وہ ضرور اس کی سفارش کرے گی اور گرینڈ جیوری کے معزز رکن کو اپنی پیاری بیوی کی بات ماننے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس رازداری کی کوئی نہ کوئی قیمت تو سیلی کو ادا کرنی ہی ہوگی۔

وارث

اسما قادری

وقت کا ہر لمحہ گواہ ہے کہ جب جب خالق اور مخلوق کے درمیان ابلیس نے حائل ہونے کی کوشش کی تب اس قادرِ مطلق نے اسے خوب ڈھیل دی کہ اس کے ترکش میں جتنے تیر ہیں پہلے وہ اپنی خوش گمانیوں میں مبتلا ہوکر انہیں ہر انداز سے آزمالے مگر جب آخری نشانہ لگانے کا وقت آتا ہے تو قدرت کے کاروبار میں ہلچل ہوتی ہے اور پھر انصاف کے تقاضے کچھ اس انداز میں پورے کیے جاتے ہیں کہ مخلوق اپنے خالق کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ بس یہی وہ نکتہ ہے جسے نہ صرف شیطان بلکہ شاطرانہ چالیں چلنے والے انسان بھی نظرانداز کردیتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی چاہت کے جنون میں مبتلا ہوکر بھٹکتے رہے جو اس کا نپ تقدیر نے ان کے مقدر میں لکھی ہی نہیں تھی... ایسے میں انسان کو صبر کی تلقین ہے مگر وہ ناشکرے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں جس ظالمانہ روش کو اختیار کر بیٹھے تھے اس کا انجام تو بالآخر یہی ہونا تھا، جو ہوا... اندھی خواہشوں کے پیچھے بھاگنے والے جب زندہ دل انسانوں کو کچلتے کچلتے گرگئے تو دولت کی بے ساکھی بھی انہیں اپنے پیروں پر دوبارہ نہ کھڑا کرسکی۔

محبت کے خوش رنگ خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے والے عاشقوں کی نامرادیوں کی دلگداز داستان



وہ ایک بہت بڑی، پُرتعیش اور خوب صورت خواب گاہ تھی جو اس وقت حجلۂ عروسی کے جملہ لوازمات کے ساتھ بجی اور بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ گلدستوں، لڑیوں اور قالین کی طرح بچھی پتیوں کی صورت میں وہاں اتنے زیادہ پھول موجود تھے کہ کسی ائر فریشنر کے استعمال کے بغیر ہی فضا مہک اٹھی تھی۔ کمرے کے بالکل وسط میں گول شکل کی وسیع و عریض مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے گرد بیلے اور گلاب کی کلیوں کی اتنی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں کہ آرام وہ دبیز بستر پر بیٹھی دُلہن نظر بھی نہیں آ رہی تھی لیکن بہرحال حجلۂ عروسی کے سب سے لازمی جزو کے طور پر وہ موجود تھی اور جیسے اپنی یہاں موجودگی پر دم بخود تھی۔ رشتہ طے پانے سے لے کر شادی کے فرض کی ادائیگی تک اسے سسرال کی طرف سے جتنی پذیرائی ملی تھی، وہ اس کے لیے خوش کن تھی۔

اس کا مشاہدہ تھا کہ عموماً اونچی حیثیت کے لوگ خود سے نسبتاً نیچے کے گھرانے سے بہو لانے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور یہاں تو معاملہ بیٹے کی پسند کا بھی تھا لیکن اس کے سسرالیوں کی طرف سے کبھی ایسا کوئی ردعمل نہیں ظاہر کیا گیا تھا جس سے یہ گمان ہوتا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض تھا۔ اپنی اکلوتی اولاد کی خواہش پر انہوں نے اس کے گھر والوں کے سامنے دستِ طلب دراز کرنے سے لے کر شادی کی انجام دہی تک بڑی خوش اسلوبی سے سارے معاملات نمٹائے تھے اور کہیں بھی اس کے اور اپنے خاندان کی حیثیت کے فرق کو نہیں جتایا تھا۔ جہیز لینے سے انکار کرتے وقت بھی ان کا رویہ اس کے والد کے سامنے اتنا عاجزانہ تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی زیادہ اصرار نہیں کر سکے تھے اور یہ سوچ کر قائل ہو گئے تھے کہ ایک ایسا محل نما گھر جو پہلے ہی دنیا جہاں کی چیزوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا اور جہاں کا انٹیریئر ہر سال تبدیل کر دیا جاتا تھا، وہاں جہیز کے نام پر چند لاکھ کی چیزیں بھجوانا پیسے کے زیاں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ رقم بیٹی کا حق جانتے ہوئے اس کے نام سے اکاؤنٹ کھلوا کر بینک میں جمع کروا دی تھی۔ اس نے اپنے طور پر اپنے والد کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا کیونکہ اس کا اندازہ تھا کہ اپنے امیر و کبیر سسرال میں رہتے ہوئے اسے اس رقم کی ضرورت پیش نہیں آئے گی لیکن اس کے والد نے اس کے انکار کے باوجود رقم اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ رقم تمہارے لیے مخصوص کی گئی تھی اور اسے تمہاری ہی کسٹڈی میں ہونا چاہیے۔

بہرحال وہ میکے اور سسرال دونوں طرف سے برتے جانے والے خصوصی محبت بھرے رویوں پر نازاں، دل میں ڈھیروں ارمان لیے بابل کا دیس چھوڑ کر پیا نگر چلی آئی تھی۔ اس کا عروسی لباس اتنا خوب صورت اور قیمتی تھا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ زیورات اس سے بھی بڑھ کر تھے اور دیکھنے سننے والے اس کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔ وہ پیاری تھی اور اتنے لوازمات کے ساتھ شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے بیوٹی ایکسپرٹ کے ہاتھوں سے تیار ہونے کے بعد حسین ترین لگ رہی تھی۔ ان کی شادی پر میڈیا کوریج کا بھی انتظام موجود تھا اور وہ جانتی تھی کہ کئی چینلز پر اس شادی کی خبر چلنے کے علاوہ کل صبح کے اخبارات میں بھی مع تصاویر خبر ضرور آئے گی۔ عام سے گھر کی لڑکی کی اتنی پذیرائی پر لوگ دنگ رہ گئے تھے اور وہ خود بھی بے تحاشا خوش تھی۔ سسرال کی دہلیز پر اترنے پر بھی اس کا والہانہ استقبال ہوا تھا۔ خوب صورت آتش بازی، صدقے کے بکرے، نوٹوں کی برسات، دلہن کے دودھ سے پاؤں دھلوانا اور دیگر کئی رسومات نہ جانے کون کون سے مراحل تھے جن سے گزر کر وہ اس حجلۂ عروسی تک پہنچی تھی اور اس کا دل اس شخص سے ملن کے خیال سے بے طرح دھڑک رہا تھا جس کی اہمیت باقی ہر شے سے بڑھ کر تھی اور جو یہ ساری دولت و جائداد نہ ہونے کی صورت میں بھی اس کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

اونچا، لمبا، وجیہہ دُلہا اس کے نصیب پر رشک کرنے والوں کے لیے ایک علیحدہ موضوع تھا۔ بقول اس کی ایک کزن کے کہ تیرے نصیب پر رشک کرنے کے لیے تو یہ اکیلا دُلہا ہی کافی ہے، باقی تام جھام کو تو بس دلہا بھائی کے پلس پوائنٹس ہی شمار کرنے چاہئیں اور اس نے ایسا ہی سمجھا تھا۔ ایسا شاندار شخص جو اس کی محبت بھی تھا اسے مل گیا تھا تو اس سے بڑھ کر بھلا اس کی کیا خوش نصیبی ہو سکتی تھی لیکن سسرال کی دہلیز پر اترنے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی اس کا سارا خمار بھی اتر گیا تھا اور حجلۂ عروسی میں اس نے جس شخص کو جانا تھا اس سے تو وہ متعارف ہی نہیں تھی۔ وہ جو سمجھی تھی کہ پسند کی شادی کر کے ان خوش نصیب عورتوں میں شامل ہونے جا رہی ہے جنہیں کسی نئے آدمی سے انڈر اسٹینڈنگ قائم کرنے کے مشکل مراحل سے گزرنے کی زحمت سے نہیں گزرنا پڑتا اب ایسی دم بخود تھی کہ لگتا تھا سانس بھی نہیں لے پا رہی ہو۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ اپنے ہمسفر کو بہت اچھی طرح جانتی ہے اب اپنے یکسر انجان ہونے پر عالمِ حیرت میں تھی بلکہ یہ حیرت سے بھی زیادہ صدمے کی کیفیت تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا

کہ وہ سانس بھی ڈھنگ سے نہ لے پا رہی ہو۔

اس کشادہ کمرے میں جہاں اے سی کی خنکی پھیلی ہوئی تھی اسے سانس لینے کے لیے ڈھنگ سے آکسیجن نہیں مل رہی تھی اور قابلِ رشک عروسی لباس دہکتے انگاروں کی طرح اس کے جسم سے لپٹا اس کے جسم ہی نہیں روح کو بھی جھلسا رہا تھا اور وہ...... وہ جو اس کا نصف بہتر کہلایا تھا اس کی ہر کیفیت سے انجان بنا ملحقہ غسل خانے میں گنگناتا ہوا غسل کر رہا تھا۔ وہ یہاں بیٹھی بھی اس کے گنگنانے اور پانی گرنے کی آواز سن سکتی تھی اور خود اس کے اندر نوحۂ مرگ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پانی اس کے اندر بھی گر رہا تھا لیکن وہ ایسا نمکین پانی تھا جو آنکھوں سے ٹپکنے کے بجائے براہِ راست دل پر گرتا ہے۔ سچ یہ تھا کہ وہ شادی کا جوا ہار گئی تھی۔

☆☆☆

سویرا بستر پر بالکل چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کی نظریں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انداز سے ظاہر تھا کہ ذہنی طور پر وہ اپنی جگہ پر حاضر نہیں ہے اور سوچوں ہی سوچوں میں کہیں دور نکلی ہوئی ہے۔ اس کے بائیں پہلو میں اس کا شوہر واصف گہری نیند سویا ہوا تھا۔ وہ ایک خوب صورت اور وجیہہ و شکیل مرد تھا جس سے سویرا کی پسند کی شادی ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں خوش تھے۔ سسرال کا بھی کوئی خاص جھنجٹ نہیں تھا۔ تین کمروں کے اس گھر میں ان کے ساتھ صرف واصف کی والدہ ہوتی تھیں جو خاصی معقول خاتون تھیں اور بیٹے اور بہو کی زندگی میں بے جا مداخلت کرنے کے بجائے اپنا زیادہ وقت عبادت میں گزارتی تھیں۔ گھریلو امور کی انجام دہی میں بھی وہ سویرا کی خاصی مدد کر دیتی تھیں۔ یوں دیکھا جائے تو سویرا کو شادی شدہ زندگی میں کسی قابلِ ذکر مسئلے کا سامنا نہیں تھا۔ واصف کی عام سی ملازمت میں بھی ان کا اچھی طرح گزارہ ہو جاتا تھا۔ حقیقتاً اپنے میکے کے غربت زدہ ماحول سے نکل کر یہاں آنے پر سویرا کو کشادگی کا ہی احساس ہوتا تھا۔ سب سے بڑھ کر اسے یہاں واصف کی بے تحاشا محبت میسر تھی جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر وہ اندر سے خوش نہیں تھی یا یوں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مکمل طور پر خوش نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ کمی تھی اولاد کی۔ وہ اولاد کے لیے دن رات بری طرح تڑپتی رہتی تھی حالانکہ اس کی شادی کو ابھی مشکل سے سال بھر ہی ہوا تھا اور ایک سال کا عرصہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ عورت اتنی بری طرح مضطرب ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں واصف اتنا زیادہ بے چین نہیں تھا اور دل میں اولاد کی خواہش رکھنے کے باوجود بہت صبر سے اللہ کے کرم کا منتظر تھا۔ ساس کی طرف سے بھی اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں تھا پھر بھی سویرا کی بے چینی کسی طور کم نہیں ہوتی تھی اور یہ بے چینی ہی اسے راتوں کو جگاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ بہت دیر تک چھت کو گھورتے رہنے کے بعد اپنی جگہ سے حرکت میں آئی اور جیسے طو عاً و کرہاً بستر سے نیچے اتر کر الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کا پٹ کھولنے کے بعد اس نے ایک بار پھر واصف کی طرف دیکھ کر اس بات کا اطمینان کر لیا کہ واصف گہری نیند سو رہا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے کپڑوں کے نیچے دبی ہوئی چابی نکال کر لاکر کا تالا کھولا اور زیورات کے ڈبے کے نیچے رکھا ایک خاکی لفافہ باہر نکالا۔ اس لفافے میں گولیوں کے چند پتے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک پتے سے گولی نکال کر اپنی مٹھی میں دبائی اور لفافہ واپس جگہ پر رکھ کر لاکر بند کر کے چابی کو ایک دوسری جگہ چھپا دیا۔ واصف زیادہ مداخلت کرنے والا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی سویرا کی چیزوں میں گھسنے کی کوشش کی تھی، اس کے باوجود وہ احتیاط کے تقاضے نبھانے کے لیے ہر دوسرے دن لاکر کی چابی کی جگہ تبدیل کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے چابی چھپا کر رکھنے کے بعد الماری بند کی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل کر باورچی خانے کا رخ کیا۔ فریج سے پانی نکال کر گولی حلق میں رکھتے ہی اس کی نظر اپنی ساس پر پڑی۔ وہ جو گولی نگلنے کے لیے پانی کا گلاس منہ سے لگا چکی تھی، بری طرح چونکی۔ ممکن تھا کہ ٹھسکا لگنے سے گولی منہ سے باہر آ گرتی لیکن اس نے پوری جدوجہد کے ساتھ گولی کو منہ میں روک لیا اور کسی نہ کسی طرح حلق سے نیچے بھی اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ اور بات کہ اس جدوجہد میں اس کی حالت غیر ہو گئی تھی اور آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔

"آرام سے بیٹا! کیا ہوا گولی کیوں کھا رہی تھیں؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟" اس کی ساس قریب آ کر اس کی پیٹھ سہلانے لگیں اور ساتھ ہی اس سے وہ سوال بھی کر ڈالا جس کا اسے ڈر تھا۔

"جی امی! سر میں درد ہو رہا تھا۔ اسی کی گولی کھا رہی تھی۔" اس نے جلدی سے بہانہ بنایا اور موضوع بدلنے کے لیے ان سے پوچھنے لگی۔

"آپ کو کچھ چاہیے تھا کیا؟"

"بس پانی پینا تھا۔ آج آنکھ جلدی کھل گئی تو میں نے

دوبارہ سونا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر دوبارہ تہجد کے لیے اٹھ ہی نہ پاؤں۔ پیاس بھی لگ رہی تھی تو میں نے سوچا پہلے پانی پی لوں پھر وضو کروں گی۔"

وہ اسے جواب دیتے دیتے فریج کی طرف بڑھ چکی تھیں اور اب بوتل سے پانی نکال کر گلاس ہاتھ میں لیے لاؤنج کی طرف جارہی تھیں۔ سویرا کو معلوم تھا کہ وہ اس کی طرح یہاں کھڑے کھڑے پانی پینے کے بجائے وہاں اطمینان سے بیٹھ کر پانی پئیں گی۔ واصف بھی ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا لیکن کئی بار ٹوکے جانے کے باوجود سویرا اس معاملے میں اب بھی کوتاہی کرجاتی تھی۔ شاید ایسا تربیت کے فرق کی وجہ سے تھا۔ اس کی ماں اس کی ساس صوفیہ خاتون جیسی عورت نہیں تھی۔ صوفیہ خاتون ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں جنہوں نے پرائیویٹ اسکولز کی ملازمت اور ٹیوشنز کی مدد سے بڑی جدوجہد کے ساتھ واصف کی پرورش کی تھی اور اب کچھ عرصے سے واصف کے اصرار پر یہ سب چھوڑ کر گھر میں وقت گزار رہی تھیں۔ ان کے مقابلے میں سویرا کی اپنی ماں ایک اَن پڑھ عورت تھی جس نے ساری زندگی گھریلو ملازمہ کے طور پر گزاری تھی اور اسے کبھی فرصت نہیں ملی تھی کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دے سکے۔ توجہ دینے کی صورت میں بھی اس کے پاس صوفیہ خاتون جیسے اوصاف نہیں تھے جو وہ اپنی اولاد میں منتقل کرسکتی۔ بہرحال سویرا ذہین لڑکی تھی اور اس نے اپنے طور پر ہی خود کو کافی حد تک سنوارنے کی کوشش کی تھی، اس لیے اس میں بالکل ہی اجڈپن بہرحال نہیں تھا۔ اب بھی وہ شرمندہ شرمندہ سی اپنی ساس کے پاس لاؤنج میں پہنچی اور ان کا خالی کیا گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ گلاس لے کر وہ وہاں سے ہٹی نہیں بلکہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

"امی! آپ اتنی عبادت کرتی ہیں۔ اللہ سے ہمارے لیے دعا کیا کریں۔"

"کرتی ہوں بیٹا! تم دونوں کے سوا میرا ہے ہی کون! تمہارے لیے بھی دعا نہیں کروں گی تو اور کس کے لیے دعا کروں گی۔" انہوں نے قدرے تعجب سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"اس کا تو مجھے یقین ہے امی لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمارے لیے خصوصی دعا کریں اور اللہ سے اپنے پوتے پوتی طلب کریں۔" اس نے قدرے جھجک کے ساتھ اپنی خواہش بیان کی تو وہ مسکرادیں پھر بولیں۔

"میں ان خوشیوں کے لیے بھی اپنے رب کے سامنے دامن پھیلاتی ہوں بیٹا۔ انشاء اللہ وہ جلد دعاؤں کو سنے گا۔ تم اتنی پریشان نہ ہو۔ ابھی تم دونوں ہی کم عمر ہو اور شادی کو بھی صرف ایک سال کا عرصہ گزرا ہے اس لیے ایسی کوئی خاص تشویش کی بات نہیں ہے، میں خود شادی کے پورے دو سال بعد واصف کی ماں بنی تھی۔" انہوں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی جس پر سویرا دانتوں سے اپنا ہونٹ چبانے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس اطمینان کی کیفیت میں صوفیہ خاتون بس ایک معمول کی طرح بیٹے کی اولاد کی دعا کرتی ہوں گی جبکہ وہ جن حالات سے دوچار تھی، اسے بہت خصوصی اور تڑپ کر مانگی جانے والی دعا کی ضرورت تھی۔

"کیا بات ہے، تم کس سوچ میں گم ہوگئیں؟" انہوں نے اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کشمکش کا اندازہ لگالیا۔

"کچھ نہیں امی! بس میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ خصوصیت سے واصف کی اولاد کے لیے دعا مانگیں تاکہ اگر کہیں کوئی رکاوٹ ہو تو دور ہوجائے۔" اس کا انداز مبہم تھا لیکن اس بار صوفیہ خاتون چونک گئیں اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ بیٹا! آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے بھی تو علاج سے حل ہوسکتا ہے۔"

"جی ایسی کوئی بات ہے تو نہیں لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ احتیاطاً ایک بار چیک اپ کروالیا جائے۔ بس واصف کو راضی کرنا ہے۔" اس نے آہستہ سے انہیں جواب دیا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں خود واصف سے کہوں گی کہ تمہیں کسی اچھے ہاسپٹل لے جائے۔ اب تم جاکر آرام سے سوجاؤ۔ صبح ہونے میں دو ڈھائی گھنٹے ہی رہ گئے ہیں۔" وہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں تو سویرا نے بھی ان کی تقلید کی۔ اب وہ قدرے پُرسکون تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ ایک اہم مسئلہ حل ہونے کو ہے۔

☆☆☆

جولیا ماتھر نے ویکیوم کلینر بند کرکے ایک طرف رکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنا سانس درست کرنے لگی۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن چھ ماہ پہلے بریسٹ کینسر کی تشخیص کے بعد علاج کے مراحل سے گزرتی ہوئی وہ اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ معمولی سے کام بھی اس کے لیے بڑے بوجھ کے مانند ثابت ہوتے تھے۔ وہ مالی طور پر اتنی آسودہ

تھی کہ اسے گھریلو کام انجام دینے کی ضرورت نہیں تھی اور ان کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی لیکن پچھلے دو دن سے ملازمہ اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں چھٹی لے کر گئی ہوئی تھی اور آج جولیا اپنی نفاست پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہوکر خود صفائی کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ بے اولاد تھی اور تین سال قبل اس کے شوہر ماتھر کا ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال ہوچکا تھا۔ ماتھر کے ادارے سے ملنے والی پنشن اور فکسڈ ڈپازٹ سے ملنے والی رقم کے باعث اس کا گزارہ بہ آسانی ہورہا تھا۔ وہ تین کمروں کے جس اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی وہ اس کی ذاتی ملکیت تھا اور کسی مہربان کی عنایت کی وجہ سے اسے ملا تھا۔ جس وقت اسے یہ اپارٹمنٹ ملا وہ اسے لینے کی خواہش مند نہیں تھی لیکن دینے والے نے زبردستی اور بہ اصرار اسے یہ اپارٹمنٹ عطا کیا تھا جو اب اس کے لیے ایک نعمت ہی ثابت ہورہا تھا۔

وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی جس نے ماضی میں کئی برس اپنی تنہائی سے گھبرا کر اور اپنی ممتا کی تسکین کے لیے گورنس کی ملازمت کی تھی۔ اس کی وہ ملازمت اتنی اچھی تھی کہ وہ ماتھر سے زیادہ کماتی تھی۔ اسی اچھی ملازمت کے طفیل وہ اتنی بچت کرپائی تھی کہ آج بھی اس کا سکون سے گزارہ ہورہا تھا لیکن کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے بعد وہ پریشانی میں گھر گئی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ اگر اسے اپنے علاج کو جاری رکھنا ہے تو مزید رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ رقم کے انتظام کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ اپنے اس اپارٹمنٹ کو فروخت کردیتی لیکن یہ آسان نہیں تھا۔ یہاں اس کے ماتھر کے ساتھ گزارے ہوئے خوب صورت وقت کی یادیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اس جگہ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ایک بار اگر وہ اپنی جذباتی وابستگی کو فراموش بھی کردیتی تب بھی یہ آسان نہیں تھا۔ اس صورت میں اسے اپنے لیے کرائے پر رہائش کا انتظام کرنا پڑتا اور یہ کرایہ اس کے لیے ایک اضافی بوجھ ہوتا جسے اٹھانے کی وہ متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ فکسڈ ڈپازٹ کی رقم کو تو چھیڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ ماہانہ منافع سے محروم ہوجاتی اور اسے صرف ماتھر کی پنشن پر گزارہ کرنا پڑتا جو ممکن نہیں تھا۔

ایسی صورت حال میں اسے ایک ہی حل سوجھا اور اس نے اسی مہربان سے رابطہ کرکے جس نے اسے یہ اپارٹمنٹ عنایت کیا تھا، اپنے حالات سے آگاہ کرکے اپنے لیے مدد طلب کی۔ حسبِ امید اسے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور بھرپور مالی معاونت کا یقین دلایا گیا۔ اس حسن سلوک پر متشکر وہ اپنی تندرستی سے متعلق بے حد پُریقین ہوچکی تھی اور اس یقین نے ہی اس کے اندر اتنی امنگ پیدا کردی تھی کہ کمزوری کے باوجود وہ خود صفائی کرنے کھڑی ہوگئی تھی حالانکہ آج اس کا ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ بھی تھا اور وہ ایک بار پھر کیمو کے تکلیف دہ مرحلے سے گزرنے والی تھی۔ اس کی ملازمہ کو اس بارے میں علم تھا اور اس نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس کے ہاسپٹل سے واپس آنے تک لازماً اپارٹمنٹ پر پہنچ جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ کیمو کے بعد جولیا کی حالت بہت غیر ہوجاتی ہے اور اسے ایک اٹینڈنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جولیا کو اس کی ذمے دارانہ طبیعت کا علم تھا پھر بھی اس نے فون پر ایک بار پھر اسے یاددہانی کرواکر اس بات کا یقین کرلیا تھا کہ وہ حسبِ وعدہ آج شام تک واپس آجائے گی۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد ہوجانے والی تھکن کے باعث وہ اپنی حماقت پر دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ جب ملازمہ کو آج واپس آجانا تھا تو اسے اس مشقت میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کچھ دیر کرسی پر بیٹھی خود کو سنبھالتی رہی پھر تازہ دم ہونے کے لیے شاور لینے چلی گئی۔ شاور لے کر اس نے ہاسپٹل جانے کی تیاری شروع کردی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر بلڈنگ کے چوکیدار سے ٹیکسی لانے کو کہا اور جب چوکیدار نے ٹیکسی آجانے کی اطلاع دی تو اپنا پرس اور چھڑی تھام کر نکل پڑی۔ چھڑی کا استعمال وہ کچھ عرصے سے احتیاطاً کرنے لگی تھی کہ کمزوری کے باعث کہیں قدم لڑکھڑانے سے گر نہ جائے۔

ہاسپٹل پہنچنے پر حسبِ معمول اس کا خوش اخلاقی سے خیرمقدم کیا گیا اور پھر معمول کے مراحل طے کیے جانے لگے۔ جولیا باہمت عورت تھی جو تنہا ہونے کے باوجود اس مشکل بیماری اور علاج سے پورے حوصلے کے ساتھ گزر رہی تھی۔ آج بھی اس نے سب کچھ بہت ہمت کے ساتھ سہا لیکن اسے محسوس ہورہا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تکلیف سے گزری ہے۔ فارغ ہونے کے بعد اسے نقاہت بھی بہت زیادہ محسوس ہورہی تھی اس لیے اس نے واپسی کے لیے ٹیکسی کے بجائے اسپتال کی ایمبولینس سروس استعمال کرنے فیصلہ کیا۔ ایمبولینس میں اسٹریچر پر لیٹ کر سفر کرتے ہوئے وہ اپنی رہائشی عمارت تک پہنچی تو اس کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ اتر کر خود سے اپنے اپارٹمنٹ تک جاسکے۔ وہ بہت مشکل سے ایمبولینس سے اتر کر عمارت کے

دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے تک پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ممکن تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر ہی جاتی لیکن عمارت کے نوجوان چوکیدار کی بروقت اس پر نظر پڑ گئی اور اس نے لپک کر جولیا کو سنبھال لیا پھر چوکیدار ہی اسے اس کے اپارٹمنٹ تک چھوڑ کر گیا۔ غنیمت تھا کہ ملازمہ حسبِ وعدہ پہنچ چکی تھی۔ اس نے سہارا دے کر جولیا کو اس کے بستر پر لٹایا اور اس سے اس کی ضروریات کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد اپنے کام نمٹانے میں معروف ہوگئی۔

جولیا نے کچھ دیر آرام کرنے کا عندیہ دیا تھا اس لیے ملازمہ بہت آہستگی سے بغیر آواز پیدا کیے اپنا کام نمٹا رہی تھی۔ جولیا نے ویکیوم کلینر سے کارپیٹ وغیرہ صاف کر دیے تھے لیکن ڈسٹنگ کا کام ادھورا تھا۔ ملازمہ ڈرائنگ روم کے فرنیچر کی صفائی کر رہی تھی کہ اسے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن پھر اندازہ ہوگیا کہ یہ خرخراہٹ جیسی آوازیں ہیں جو جولیا کی خواب گاہ سے آرہی ہیں۔ وہ لپک کر اس کی خواب گاہ کی طرف دوڑی۔ اندر کا منظر ہولناک تھا۔ تکلیف سے تڑپتی جولیا کا آدھا جسم بستر سے نیچے لٹک رہا تھا اور منہ سے جھاگ سا نکل رہا تھا۔ ملازمہ گھبرا گئی اور جلدی سے جولیا کے لٹکتے جسم کو گھسیٹ کر واپس بستر پر ڈالا۔ اس عمل کے دوران اس نے محسوس کرلیا تھا کہ جولیا کہ جسم میں شدید اکڑاؤ ہے۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے پہلے انٹرکام پر چوکیدار کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے اسپتال تک سواری کا بندوبست کرنے کا کہا پھر جولیا کے پڑوس میں اس کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دی۔ انسانی ہمدردی کے پیشِ نظر وہ لوگ فوراً چلے آئے۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر جولیا کو نیچے لے جانے اور ایمبولینس میں منتقل کرنے کے علاوہ پڑوسی خاتون نے اس کے ساتھ اسپتال تک ساتھ جانے کے لیے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ سائرن بجاتی ایمبولینس تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ روانگی کے چوتھے منٹ پر جولیا کی پڑوسن نے دیکھا کہ جولیا کی گردن ڈھلک چکی ہے اور آنکھوں کی پتلیاں اپنی جگہ ساکت ہوگئی ہیں۔ اسے جولیا کی موت کا اندازہ ہوگیا۔ اسپتال پہنچ کر اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق ہونے والا شدید ہارٹ اٹیک اس کی موت کا سبب بنا تھا۔ پڑوسیوں نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر لاوارث جولیا کی اس کے مذہب کے مطابق آخری رسومات کی ادائیگی اور تدفین کا انتظام کر ڈالا۔ ان میں سے کسی کو معمولی سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ ایک تنہا اور بیمار عورت کو باقاعدہ سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے اور قاتل وہ مسیحا ہے جو اپنے پیشے کے تقدس اور فرض کو بھول کر امارت اور اختیار کے سامنے جھک گیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر رفعت نصیح نے اپنے کزن خالد کو اللہ حافظ کہا اور اپنی نشست سے کھڑی ہوگئیں۔ انہیں کھڑا ہوتا دیکھ کر خالد نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"پلیز خالد! تم بیٹھو۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ تمہارے کلائنٹس تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔ تم انہیں ہینڈل کرو۔" ڈاکٹر رفعت نے اپنے کزن کو تکلفات میں پڑنے سے روکنے کی کوشش کی۔ ان کا کزن خالد پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا اور جوانی میں ہی اس پیشے میں اپنی اچھی ساکھ بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر رفعت اپنی والدہ کی خواہش پر اپنے آبائی گھر اور زمین سے متعلق وراثت کی تقسیم کے سلسلے میں مشورہ کرنے خالد کے پاس آئی تھیں اور اسے ان کا پیغام بھی پہنچا دیا تھا کہ وہ جلد ان کے حسبِ خواہش وصیت نامہ تیار کر کے ان کے پاس لے آئے تا کہ وہ اس پر اپنے دستخط کر دیں۔ ڈاکٹر رفعت کی والدہ گردوں کے عارضے میں مبتلا تھیں اور مرض کی اس انتہا پر تھیں کہ انہیں اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی، اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں ہی وراثت کی تقسیم کا مسئلہ حل کر دیں تا کہ ماضی کی طرح رفعت کے بھائی اس کے ساتھ زیادتی نہ کر سکیں۔ ڈاکٹر رفعت آج جس مقام پر تھیں، انہیں خاندانی جائداد سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی لیکن ان کی والدہ کا موقف تھا کہ زیادتی کرنے والوں کو مسلسل زیادتی کرتے رہنے کی اجازت دیتے رہنا خود ان کے ساتھ ظلم ہے اور وہ نہیں چاہتیں کہ ان کے بیٹوں کے نامۂ اعمال میں ہمیشہ بہن سے حق تلفی کا جرم درج ہوتا رہے۔ انہیں بیٹوں کی دنیاوی ترقی سے زیادہ ان کی آخرت کی فکر تھی اس لیے انہوں نے رفعت سے کہا تھا کہ اگر تمہیں جائداد میں اپنے حصے کی ضرورت نہیں ہے تو بھی اسے لے لو اور کسی فلاحی کام میں لگا کر ضرورت مندوں کے کام لے آؤ۔ ان کی یہ تجویز ڈاکٹر رفعت کے دل کو لگی تھی اور وہ اپنے کزن خالد سے ملنے اس کے دفتر پہنچ گئی تھیں۔ برسوں بعد ملاقات ہونے کے باوجود خالد ان سے بہت عزت اور احترام کے ساتھ پیش آیا تھا اور انہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ جلد اپنی چچی یعنی ڈاکٹر رفعت کی والدہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوگا۔ اس ملاقات

کے اختتام پر ہی وہ انہیں احتراماً نیچے ان کی گاڑی تک چھوڑنے جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے روک دیا تھا۔

”پانچ منٹ کی تو بات ہے بجیا! میں آپ کو نیچے تک چھوڑ کر فوراً واپس آ جاؤں گا۔ آپ میری بڑی بہن اور ابتدائی استاد ہیں اور اتنا کرنا تو میرا فرض بنتا ہے۔ ویسے تو اصولاً آپ کو ملاقات کے لیے گھر پر ہی آنا چاہیے تھا تاکہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتیں اور ذرا زیادہ وقت گزار پاتیں۔“ خالد نے ملاقات کی ابتدا میں کیا جانے والا شکوہ دہرایا۔

”گھر پر میں پھر کسی روز آ جاؤں گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں برسوں بعد امی سے ملی ہوں اور زیادہ سے زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ اگر ان کا اصرار نہ ہوتا تو میں جس مقصد کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں، اسے بھی اہمیت نہیں دیتی۔“ انہوں نے ایک بار پھر اس کے شکوے کا جواب دیا۔ اس جواب میں خالد کے گھر نہ جانے کی صرف ایک وجہ شامل تھی، دوسری وجہ انہوں نے جان بوجھ کر بیان نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس ملاقات کا احوال خالد کی بیوی زرین کے ذریعے خاندان کے دوسرے گھروں اور پھر اس کے بھائیوں تک پہنچ جاتا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے حوالے سے دبے الفاظ میں خالد کو جتا بھی دیا تھا کہ فی الحال یہ باتیں راز میں ہی رہنی چاہئیں اور کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی وصیت نامہ تیار کروایا گیا ہے۔ خالد نے رازداری کی یقین دہانی کروائی تھی کیونکہ یہ اس کے پیشے کا ایک لازمی جزو تھا۔

”بجی کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے، بہرحال آپ آیئے میں آپ کو کم از کم لفٹ تک تو چھوڑ کر آ جاتا ہوں تاکہ میری طرف سے آدابِ میزبانی بھی ادا ہو جائے اور آپ کی بات بھی رہ جائے۔“

خالد نے خود آگے بڑھ کر ان کے لیے دفتر کا دروازہ کھولا تو ڈاکٹر رفعت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہیں بے ساختہ ہی خالد کا بچپن یاد آ گیا تھا۔ بچپن میں بھی وہ بہت بذلہ سنج اور حاضر جواب ہوتا تھا اور وہ اسے پڑھاتے ہوئے لطف محسوس کرتی تھیں۔ بعد میں وہ میڈیکل کی سخت پڑھائی میں مصروف ہو گئیں اور انہیں ہاسٹل شفٹ ہونا پڑا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ بعد کے سالوں میں مزید کئی تبدیلیاں آئیں تو ملاقاتیں اور رابطے نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور آج برسوں بعد خالد اور ان کی اتنی طویل ملاقات ہوئی تھی جس میں انہوں نے خالد کو بچپن ہی کی طرح مؤدب اور تمیزدار پایا تھا۔ اپنی مؤدبانہ طبیعت کے بموجب ہی وہ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ لفٹ تک آیا تھا اور لفٹ کا دروازہ بند ہونے تک وہیں کھڑا رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد ڈاکٹر رفعت کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی اور انہوں نے اپنے ساتھ لفٹ میں موجود لڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ ایک کثیر المنزلہ دفتری عمارت تھی اور لڑکی اوپر کی کسی منزل سے ہی لفٹ میں چلی آ رہی تھی۔ اس نے جینز کی بلیو پینسل کے اوپر گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی سرخ اوپن شرٹ پہن رکھی تھی اور دوپٹا اسٹول کی شکل میں قدرے بے پروائی سے اس کے بائیں شانے پر لٹکا ہوا تھا۔

وہ خوش شکل لڑکی تھی اور شکل سے خاصی پُراعتماد نظر آ رہی تھی۔ لڑکی کے اس مختصر جائزے کے دوران ہی لفٹ نے گراؤنڈ فلور تک کا راستہ سرعت سے طے کر لیا اور وہ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چلتی ہوئی وسیع ہال نما حصے کو طے کر کے مرکزی دروازے تک پہنچیں۔ اس دروازے کے دائیں اور بائیں جانب اوپن پارکنگ ایریا تھا جبکہ فٹ پاتھ کے پار ایک مصروف سڑک پر روانی سے چلتا ٹریفک دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر رفعت نصیح نے اپنی گاڑی بائیں جانب پارک کی تھی اس لیے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے فطری طور پر ان کی توجہ اسی طرف مبذول تھی۔ لڑکی کو پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنی تھی اور وہ یہیں سے کسی خالی رکشے کو تلاشنے کے چکر میں سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی چنانچہ اس کی نظروں نے فوراً ہی اس سیاہ کار کو دیکھ لیا جس کی پچھلی طرف کی کھڑکی کے ذرا سا نیچے ہوئے شیشے سے ایک ہولناک گن کی نال جھانک رہی تھی۔ یہ شاید اس کا اضطراری عمل تھا کہ گن کے شعلے اگلتے ہی اس نے اپنے بائیں جانب موجود ڈاکٹر رفعت کا شانہ پکڑ کر انہیں اپنے ساتھ ہی واپس عمارت کے اندر کھینچنے کی کوشش کی۔ گھبراہٹ اور جلد بازی میں کی گئی اپنی اس کوشش کے نتیجے میں وہ خود بھی گری اور ڈاکٹر رفعت کو بھی گرایا لیکن یہ گرنا ہی ان کی زندگی کے بچنے کا بہانہ بن گیا اور گولیاں ان کے اوپر سے سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر گئیں۔ گولیوں کے دھماکے سن کر لڑکی اور ڈاکٹر رفعت دونوں ہی نے بے ساختہ فرش پر لڑھک کے دروازے کے دائیں بائیں دیوار کی آڑ میں پناہ لے لی تھی چنانچہ دوسری بار فرش کی طرف رخ کر کے چلائی جانے والی گولیاں بھی کام نہ دکھا سکیں۔ ان دو ناکام کوششوں کے بعد سیاہ کار والوں نے مزید کوئی کوشش نہیں کی اور کار ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ ٹریفک کے بہاؤ میں جگہ بناتی ہوئی وہاں سے فرار ہو گئی۔

خطرہ ٹلتے ہی ادھر ادھر پناہ لے لینے والے لوگ ہجوم کی شکل میں ان دونوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ فوراً ہی پولیس بھی بلوالی گئی لیکن پولیس کی آمد سے قبل ہی خالد، ڈاکٹر رفعت کی کال پر پہنچ آ چکا تھا۔ اس نے پولیس والوں کو مشاقی سے ہینڈل کر لیا اور انہیں یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ حال ہی میں برطانیہ سے پاکستان واپس آنے والی ڈاکٹر رفعت کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی جو انہیں ٹارگٹ کیا جاتا۔ ان کی جان بچانے کا بہانہ بننے والی لڑکی بھی ایک عام سے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جس نے حال ہی میں یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور یہاں ایک دفتر میں کام کرنے والی اپنی کسی کیملی سے ملاقات کے لیے آئی تھی۔ پولیس پر یوں بھی کام کا بہت بوجھ رہتا تھا اور وہ کام کرنے میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں رکھتے تھے اس لیے انہوں نے یہ تسلیم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی کہ یہ ایک عام سا دہشت گردی کا واقعہ تھا جس میں راہ چلتے عوام کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ کام چوری کی عادت نے انہیں یہ سوال اٹھانے کی زحمت ہی نہیں کرنے دی تھی کہ دہشت گردوں نے کسی پُرہجوم جگہ کے بجائے ایک دفتری عمارت سے نکلنے والی دو خواتین کو ہی کیوں اپنے مقصد کے حصول کے لیے چنا تھا۔ وہ تھوڑی سی محنت اور کرتے تو انہیں دیواروں اور دروازے پر بننے والی گولیوں کے نشانات سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا کہ سارے فائرز بائیں جانب کیے گئے تھے یعنی دہشت گردوں کا اصل نشانہ ڈاکٹر رفعت نصیح تھیں۔ کیوں؟ اس سوال کی کھوج میں پڑنے کی وہاں فرصت کسے تھی۔ ہاں ڈاکٹر رفعت اور خالد اپنے اپنے طور پر ایک رخ سے ضرور سوچ رہے تھے لیکن دونوں ہی نے اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اصل میں دونوں ہی کو یقین نہیں تھا کہ دولت کی خاطر خون اتنا سفید بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

”تھینک یو سو مچ عروسہ! تمہاری پھرتی اور حاضر دماغی آج ہم دونوں کی زندگی بچنے کا سبب بن گئی۔“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ڈاکٹر رفعت نے اپنے برابر والی سیٹ پر براجمان لڑکی کو مخاطب کر کے اس سے کہا۔ پولیس کی کارروائی کے دوران وہ ایک دوسرے کے ناموں اور چند بنیادی معلومات سے آگاہ ہو گئی تھیں اس لیے ڈاکٹر رفعت نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

”شکریے کی کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں نے جو کچھ کیا بے اختیار کیا اور اس میں میری ذہانت یا ارادے کا کوئی کمال نہیں تھا۔“ عروسہ نے نہایت صاف گوئی سے ان کے روبرو اعتراف کیا۔ پولیس کی کارروائی نمٹنے کے بعد ڈاکٹر رفعت نے اس سے اس کی منزل دریافت کر کے خود ہی لفٹ کی آفر کی تھی اور وہ معمولی سے انکار کے بعد ان کی پیشکش قبول کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ اسے ڈاکٹر رفعت اچھی لگی تھیں اور جس طرح انہوں نے اس واقعے کے بعد فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کی پُراعتماد خاتون ہیں۔ کچھ ایسی ہی رائے ڈاکٹر رفعت نے بھی اس کے متعلق قائم کی تھی۔

”بے اختیاری میں بھی ایسے اعمال ان ہی لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں جو اندرونی طور پر مضبوط اور پُراعتماد ہوں۔ تم مجھے ایک ذہین اور پُراعتماد لڑکی محسوس ہوئی ہو۔ میرے خیال میں تم ملازمت کے حصول کے لیے اپنی فرینڈ سے ملنے یہاں آئی ہو گی۔“ ایک بار پھر اس کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اس کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور ذرا شریر لہجے میں بولی۔

”فی الحال تو میرے کسی دفتر میں ملازمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ بہت جلد میں ہاؤس جاب پر جانے والی ہوں۔“

”ہاؤس جاب۔“ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اس اصطلاح کے استعمال پر چونکیں کیونکہ لڑکی نے پولیس والوں کو اپنی تعلیمی قابلیت ایم اے بتائی تھی اور اپنے ڈاکٹر ہونے کا ذکر نہیں کیا تھا پھر اس کے چہرے پر بکھرے رنگوں نے انہیں اصل بات سمجھا دی اور وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”نیکسٹ منتھ کے اسٹارٹ میں۔ میری فرینڈ کے بھائی کا پرنٹنگ پریس... ہے اور میں شادی کارڈز پرنٹ کروانے کے سلسلے میں ہی اس سے ملاقات کرنے یہاں آئی تھی۔ اصل میں، میں اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی ہوں۔ میرے بعد دو بہنیں اور ہیں اور سب سے آخر میں اکلوتا بھائی ہے جو ابھی نائنتھ کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے اس لیے اپنے والد کا بوجھ کم کرنے کے لیے اپنی شادی کے چھوٹے موٹے کام میں خود نمٹا رہی ہوں۔“ اس نے قدرے تفصیل سے انہیں جواب دیا۔

”گڈ۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اب وقت بدل رہا ہے اور اس بدلتے ہوئے وقت کا تقاضا ہے کہ لڑکیاں اس طرح کے معاملات میں چھوئی موئی بن کر بیٹھنے کے بجائے

عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرتی رہیں۔ میں پچھلے وقتوں کی اس فرسودہ سوچ کی قائل نہیں ہوں کہ لڑکیاں اپنی شادی کا ذکر ہوتے ہی دوپٹے کا پلو دانتوں میں دبا کر کسی کونے میں چھپ جائیں۔ لڑکی بھی ایک مکمل شخصیت ہے اس لیے اسے بھی سوسائٹی میں اپنا پاورفل رول پلے کرنا چاہیے۔'' انہوں نے حوصلہ افزائی کرنے والے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''آپ نے ایک لمبا عرصہ ملک سے باہر گزارا ہے اس لیے اس انداز میں سوچتی ہیں ورنہ یہاں میری امی سمیت کئی خواتین میرے رویے کے خلاف ہیں۔ بہرحال تبدیلی یہاں بھی آرہی ہے اور لوگ ماضی کے مقابلے میں مختلف انداز میں سوچنے لگے ہیں۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''اگر میں آپ کو اپنی شادی پر انوائٹ کروں تو آپ آئیں گی کیا؟''

''وعدہ نہیں کرسکتی لیکن کوشش ضرور کروں گی۔'' اس نے کچھ ایسے اشتیاق سے ان سے سوال کیا تھا کہ وہ صاف انکار نہیں کرسکیں۔

''آپ مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے دیں۔ میں آپ کو کارڈ پوسٹ کرنے کے ساتھ ساتھ ایس ایم ایس کرکے بھی ریمائنڈ کروادوں گی۔'' اس نے اصرار کیا تو انہوں نے اسے دونوں چیزیں نوٹ کروادیں جو اس نے اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیں۔

''بس یہاں روک لیں، یہاں سے میرا گھر نزدیک ہے میں آرام سے پیدل چلی جاؤں گی۔'' ایک بس اسٹاپ کے قریب اس نے اشارہ کیا تو انہوں نے گاڑی روک لی۔

''اگر آپ نے اپنی بیمار والدہ کے پاس جلد پہنچنے کی مجبوری بیان نہ کی ہوتی تو میں آپ کو اپنے گھر تک چلنے پر اصرار کرتی۔ بہرحال آپ کے یہاں تک لفٹ دینے کا شکریہ۔ میں امید رکھوں گی کہ آپ میری دعوت پر میری شادی میں شرکت ضرور کریں گی۔'' نیچے اترنے کے بعد اس نے کھڑکی میں منہ ڈال کر ان سے کہا۔

''میں کوشش کروں گی پیاری لڑکی اور نہ بھی آسکی تو میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔'' انہوں نے ایک بار پھر مروت کا مظاہرہ کیا۔ حقیقتاً اپنے آبائی گاؤں سے یہاں شہر آکر کسی شادی میں شرکت کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔

''اتنی امید دلانے کا بھی شکریہ میم۔'' عروسہ نے خوش دلی سے کہا، اور کھڑکی سے ہٹ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ڈاکٹر رفعت نے بھی جواب میں ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا اور گاڑی آگے بڑھا کر لے گئیں۔

☆☆☆

شادی کے بعد دوسرے دن میکے والوں کا دلہن کو لینے آنا ایک رواج ہے لیکن جب بیٹی اپنے سے بہت اونچے خاندان میں بیاہی جائے تو اس کی سسرال والوں کو رسموں رواجوں کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جو ایک اذیت ناک شب عروسی سے گزر کر شدت سے میکے جانے کی منتظر تھی، اس اطلاع کو سن کر گم صم ہوگئی کہ اس کے میکے والے حسبِ رواج اسے لینے کے لیے نہیں آرہے ہیں۔ وجہ بھی اسے معلوم ہوگئی۔ اس کی ساس نے اس کے میکے والوں سے نہایت عاجزی سے درخواست کی تھی کہ چونکہ دُلہا اور دُلہن کو ولیمے کے دوسرے دن ہی ہنی مون کے لیے روانہ ہوجانا ہے اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ دلہن یہ مختصر عرصہ سسرال میں ہی گزارے۔ انہوں نے جتنے ارمانوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی تھی اور جتنے چاؤ سے بہو کی ناز برداریاں کرتی رہی تھیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان کی عاجزانہ درخواست کو رد کردیا جاتا۔ چنانچہ وہ حسبِ رواج میکے میں نہیں جاسکی تھی اور اسے ان لوگوں سے صرف فون پر ہی بات کرنے کا موقع مل سکا تھا۔ وہ بھی اپنی ساس اور شوہر کی کڑی نگرانی میں۔ اس واحد فون کال کے بعد اس کا موبائل اس سے لے لیا گیا تھا اور وہ پورا دن ہی کڑی نگرانی میں رہی تھی۔ اس کی ساس کی ملازمۂ خاص پورا دن اس کے سر پر مسلط رہی تھی۔ یہاں تک کہ ولیمے کے فنکشن کے لیے اسے تیار کرنے کے لیے آنے والی بیوٹیشن کے ساتھ بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا گیا تھا۔ یہ سب صرف احتیاطی تدابیر تھیں ورنہ اسے جو دھمکیاں دی گئی تھیں، وہ اتنی خطرناک تھیں کہ وہ کسی کے سامنے زبان کھولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنے بااختیار اور طاقتور لوگوں کی گرفت میں ہے جن کی دھمکی محض دھمکی نہیں ہے اور انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر پوری طرح عمل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

وہ ایک پڑھی لکھی اور پُراعتماد لڑکی تھی اور ایک دن پہلے تک تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ کوئی اسے اس طرح بے بس کرسکتا ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی میں عورتوں کو ظلم سہتے اور قدم قدم پر سمجھوتے کرتے دیکھتی تھی تو بہت چڑتی تھی کہ عورتیں خود کو اتنا ارزاں اور بے بس کیوں محسوس کرتی ہیں۔ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی کوشش کیوں نہیں

کرتیں اور یہاں اس کی آواز کا ہی گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ ولیمے کے فنکشن میں تمام لوازمات کے ساتھ تیار وہ شادی والے دن سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی بہنیں، کزنز اور سہیلیاں اس کی شان و شوکت دیکھ کر اس کے نصیب پر رشک کررہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں دعائیں دے رہی تھیں کہ ہر لڑکی کو اس جیسا ہی نصیب ہو اور وہ دل ہی دل میں ''اللہ نہ کرے'' کہتی جارہی تھی۔ دلی کیفیت کے برعکس اس کے ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ سجی ہوئی تھی کیونکہ اسے اسی بات کا حکم دیا گیا تھا۔ حکم سے سرتابی کی اسے جرأت نہیں تھی کہ تقریب کے دوران بھی اس کی نگرانی کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا۔ زیادہ تر وقت اس کا شوہر نامدار اس کے ساتھ ہی موجود رہا تھا۔ ملازمۂ خاص بھی آس پاس منڈلا رہی تھی۔ دوسرے آج برات والے دن سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ بے شمار نامور شخصیات تھیں جو ولیمے کی اس تقریب میں شرکت کررہی تھیں اور ان اہم شخصیات کے ساتھ دُلہا، دُلہن اور اس کی ساس کا فوٹو سیشن مسلسل جاری تھا۔ ایسے میں بے حد مرعوب اس کے میکے والوں کی خود بھی بار بار اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ یہ تو اس کی ساس ہی تھیں جو اپنی مکاری و سفاکی کو خوش اخلاقی کے لبادے میں چھپائے اس کے والدین اور بھائی بہنوں کو اسٹیج پر لائی تھیں اور ان کے ساتھ اس کا فوٹو سیشن کروایا تھا۔ ان ہی کی ایما پر اس کے چند قریبی اعزا اور سہیلیوں کو بھی اسٹیج پر آکر دلہا دلہن کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کی سعادت عطا کی گئی تھی۔ ولیمے کی بے حد شاندار اور پُرتکلف تقریب سے واپس لوٹتے ہوئے اس کے میکے والے اس کی ساس کے گن گارہے تھے اور وہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی ہوئی یہ سب سہنے پر مجبور تھی۔ کوئی نہیں تھا جسے وہ اپنے دل پر گرتے آنسو دکھا سکتی۔

☆☆☆

ڈرائیونگ کرتے ہوئے ڈاکٹر رفعت کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ اتنے برسوں بعد وطن واپس آئی تھیں اور یہ جان کر دکھی تھیں کہ اتنے برسوں بعد بھی یہاں لوگوں کے ذہنوں کو وسعت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ان کے سگے بھائی جو برسوں پہلے بھی انہیں جائداد کا حصے دار ماننے کے لیے راضی نہیں تھے، آج بھی انہیں ان کے حق سے محروم ہی رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے کزن ایڈووکیٹ خالد کی آمد اور تنہائی میں والدہ سے ملاقات پر خاصا ہنگامہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ جانتے ہیں کہ رفعت کی پاکستان واپسی ایک سازش ہے۔ وہ لالچ میں اتنے اندھے ہورہے تھے کہ انہوں نے اپنی بیمار ماں کا بھی خیال نہیں کیا تھا اور انہیں سخت باتیں سنائی تھیں کہ وہ بیٹی کی محبت میں اندھی ہوکر خاندانی روایات کے برخلاف بیٹوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہی ہیں۔ جواب میں ان کی والدہ کا موقف تھا کہ وہ شرعی اور قانونی تقاضے پورے کررہی ہیں لیکن اس موقف کو ان کے بھائی تسلیم نہیں کررہے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رفعت نے ایک بار پھر اپنی والدہ سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائیوں کی بات مان لیں لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی تھیں۔ خالد نے بھی ان کے موقف کی حمایت کی تھی اور انہیں سمجھایا تھا کہ جب ایک بار وہ فیصلہ کرچکی ہیں کہ اپنے حصے کی جائداد کو فلاحی کاموں میں خرچ کریں گی تو پھر پیچھے ہٹنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اس نکتے پر آکر ڈاکٹر رفعت ایک بار پھر خاموش ہوگئی تھیں ورنہ ذاتی طور پر انہیں دولت و جائداد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے طب کے پیشے سے بہت عزت اور مناسب دولت کمائی تھی جو ان کی ذات کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی جو انہیں اپنے بچوں کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح تھی کہ وہ کیوں اپنے بھائیوں کے سامنے جھک کر ظلم کے اس سلسلے کو جاری رکھنے میں مدد دیتیں۔ آج اگر انہیں جائداد میں سے حصہ ملنے کی ایک مثال قائم ہوجاتی تو خاندان کی دوسری لڑکیوں کو بھی ان کا حق ملنے کی راہ کھل سکتی تھی۔

وہ بھائیوں کے بگڑے ہوئے تیوروں کے باوجود اپنا حق وصول کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھیں لیکن گھر کی کشیدہ فضا ان کے لیے اعصابی تناؤ کا باعث بن رہی تھی۔ اس ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہی انہوں نے عروسہ کا پوسٹ کیا ہوا شادی کارڈ بھی کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ شادی سے ایک دن پہلے عروسہ نے انہیں یاد دہانی کروانے کے لیے ایس ایم ایس کیا تو انہیں شادی کارڈ کھول کر دیکھنے کا خیال آیا۔ شادی میں شرکت کے بارے میں انہوں نے اب بھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اور صرف کارڈ دیکھنا چاہتی تھیں۔ کارڈ دیکھتے ہوئے وہ دُلہا کے نام پر چونک گئیں۔ وہ صرف ایک نام ہوتا تو ان کو چونکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ایک نام کے کئی افراد ہوتے ہیں لیکن اس کارڈ پر دُلہا کے نام کے ساتھ دُلہا کے باپ کا نام بھی مکمل القابات کے ساتھ لکھا ہوا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ یہ اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا جس سے وہ واقف تھیں۔ حقیقت کا ادراک ہوتے ہی انہیں اس پیاری سی لڑکی عروسہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ

جانتی تھیں کہ یہ شادی عروسہ کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا ثابت ہوگی۔ عروسہ کا ان پر بہت بڑا احسان تھا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر ان کی جان بچائی تھی اور اب ان کا فرض بنتا تھا کہ وہ اس کی جان بچانے کی کوشش کرتیں اور اسے ان ظالموں کے پنجے میں نہیں جانے دیتیں جو اپنی انا اور وقار کے بت کو سلامت رکھنے کے لیے انسانی زندگی کی بھینٹ چڑھانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

پہلے انہوں نے سوچا کہ عروسہ کے نمبر پر کال کر کے اس کے والدین سے بات کریں لیکن پھر انہیں احساس ہوا کہ اتنے اہم معاملے پر ٹیلیفونک گفتگو مناسب نہیں ہوگی اور انہیں خود جا کر ان لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کرنا ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد انہوں نے فوری طور پر شہر جانے کا ارادہ باندھ لیا۔ خالد سے ملاقات کے لیے جانے کے بعد آج وہ پہلی بار گھر سے باہر نکل رہی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت والدہ کی قربت میں گزارنے کی خواہش میں عزیز و اقارب کی دعوت کے باوجود گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور آج بھی صرف ایک انسانی زندگی بچانے کے لیے باہر جا رہی تھیں۔ باہر نکلنے سے قبل انہوں نے اپنی والدہ کے کمرے میں جا کر انہیں اپنے شہر جانے کے پروگرام سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ شام تک واپس آجائیں گی۔ اس وقت والدہ کے کمرے میں ان کا چھوٹا بھائی بھی موجود تھا جو ان کی وہاں موجودگی کے دوران مسلسل تیوریاں چڑھائے بیٹھا رہا۔ دل میں دکھ محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کے رویّے کو نظر انداز کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں اور اب ان کی گاڑی شہر جانے والے راستے کی طرف رواں دواں تھی۔

کسی زمانے میں یہ گاڑی ان کی والدہ کے زیرِ استعمال رہتی تھی اور اسے ڈرائیور چلاتا تھا لیکن انگلستان سے واپس آنے کے بعد وہ اسے استعمال کر رہی تھیں۔ گاڑی چلاتے ہوئے ان کا ذہن ایک طرف تو اپنے بھی مسائل کی وجہ سے الجھا ہوا تھا اور دوسری طرف وہ عروسہ کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ عروسہ کی زندگی بچانے کے لیے وہ جو قدم اٹھانے جا رہی تھیں ایک طرح سے وہ خطرناک بھی تھا۔ اس شادی کے رکنے کی صورت میں اگر ان کا نام سامنے آجاتا تو انہیں بہت بھیانک نتائج بھگتنے پڑتے۔ یہ بہت بڑے لوگوں سے مخالفت مول لینے والی بات تھی۔ اس خطرے کے علاوہ برسوں پہلے کیا جانے والا اپنا وعدہ بھی ان کے قدموں کی زنجیر بن رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ کہیں وہ وعدہ خلافی کر کے غلط تو نہیں کر رہی ہیں لیکن پھر انہیں اپنا فیصلہ ٹھیک بھی لگ رہا تھا۔ یہ ایک لڑکی کی زندگی کا سوال تھا اور لڑکی بھی وہ جو ان کی محسن تھی۔

سوچوں کے جال میں ابھی وہ اپنے عقب میں آتی اس ٹریکٹر ٹرالی سے انجان تھیں جو لمحہ بہ لمحہ درمیانی فاصلہ کم کرتی ہوئی ان کی گاڑی پر چڑھی چلی آ رہی تھی۔ ٹریکٹر ٹرالی نے ان کی گاڑی کو دائیں جانب سے ٹکر ماری تو انہیں بہت زوردار جھٹکا لگا۔ اگر سیٹ بیلٹ نہ بندھی ہوتی تو انہیں شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اب بھی انہوں نے بہت مشکل سے گاڑی کو سنبھالا اور بیک ویو مرر میں اس نااہل ڈرائیور کو دیکھنے کی کوشش کی جو دوسروں کی زندگی کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے سے قبل ہی گاڑی کو ایک اور ٹکر ماری گئی۔ یہ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ وہ کسی صورت گاڑی کو نہ سنبھال سکیں اور گاڑی ریلنگ توڑتی ہوئی نیچے بہتی نہر میں گرتی چلی گئی۔ اضطراری طور پر انہوں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ جس لمحے گاڑی چھپاکے کے ساتھ پانی میں گری، وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکی تھیں لیکن ابھی سیٹ بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ اپنے بوجھ کی وجہ سے بہت تیزی سے پانی میں ڈوبتی ہوئی گاڑی نے ان کے اوسان خطا کر دیے تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ گاڑی کے ساتھ وہ بھی اس نہر میں ڈوب کر ختم ہو جائیں گی لیکن پھر فوراً ہی زندہ رہنے کی جبلی خواہش نے سر ابھارا اور انہیں خیال آیا کہ وہ کیسے ڈوب کر مر سکتی ہیں۔ انگلستان میں قیام کے عرصے میں انہوں نے سوئمنگ سیکھی تھی اور برسوں کی مشق کے نتیجے میں ماہر تیراک بن چکی تھیں۔ آج اپنی اس مہارت کو کام میں لانے کا وقت تھا۔ انہوں نے سانس روک کر تیزی سے اپنے حواس کو بحال کیا اور تھوڑی ہی کوشش کے نتیجے میں اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے میں کامیاب ہو گئیں۔

گاڑی کے کھلے دروازے سے ان کا ہینڈ بیگ، ڈیش بورڈ پر رکھا موبائل اور دوسرا سامان پانی کے ریلے کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ فی الحال جان بچانے سے زیادہ اہم کوئی بات تھی بھی نہیں چنانچہ وہ چیزوں کا خیال دل میں لائے بغیر اس تگ و دو میں مصروف ہو گئیں۔ سمت کا تعین ممکن نہیں تھا بس اندازے سے ہی انہوں نے زیرِ آب مخالف سمت میں تیرنا شروع کر دیا۔ اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ان پر دوسرا قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے چنانچہ وہ اس جگہ سے مخالف سمت میں جانے کی کوشش کر رہی تھیں جہاں وہ حملہ آور موجود ہو سکتا تھا۔ حملہ آور کی نظروں سے محفوظ رہنے کے

لیے ہی وہ اس وقت تک زیرِ آب تیرتی رہیں جب تک ان کے پھیپھڑوں میں ذرا بھی طاقت باقی رہی۔ پھیپھڑوں کے جواب دے جانے پر انہوں نے احتیاط سے سر سطحِ آب پر نکالا اور جلدی جلدی سانس لے کر پھیپھڑوں میں آکسیجن جمع کرنے کے بعد دوبارہ ڈبکی لگا دی۔ وقفے وقفے سے یہ عمل دہراتے ہوئے وہ آگے کی جانب تیرتی چلی گئیں اور جب اپنے بہت دور نکل آنے کا یقین ہو گیا تو آرام سے سطح پر آ کر تیرنے لگیں۔ اپنی زندگی میں اتنی اعصابی کشیدگی کے ساتھ اتنی طویل پیراکی کرنے کا یہ ان کا پہلا موقع تھا اور اعصاب کے ساتھ ساتھ بازو بھی شل ہو گئے تھے۔ وہ ہمت ہار دیتیں اس سے قبل ہی انہیں کنارہ نظر آنے لگا جہاں ایک عورت کھڑی آنکھوں پر بائیں ہاتھ کا چھجا بنائے، حیرت سے منہ کھولے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اجنبی، حیران و پریشان عورت ان کے لیے زندگی کی نوید تھی۔

☆☆☆

اس مہنگے پرائیویٹ کلینک سے باہر نکلتے ہوئے واصف کا ذہن اچھا خاصا الجھا ہوا تھا۔ وہ آج دوسری بار سویرا کے اصرار پر وہاں آیا تھا۔ سویرا نے اسے بتایا تھا کہ اس کلینک میں اس نے اپنا چیک اپ کروایا تھا اور اس کی تمام رپورٹس بالکل ٹھیک تھیں جس کے بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے شوہر کا طبی معائنہ کروانے کی تجویز دی تھی۔ دیگر مردوں کی طرح واصف بھی اس طرح کا معائنہ کروانے کے خیال سے جزبز ہو رہا تھا لیکن سویرا کی ضد اور خواہش پر اسے راضی ہونا پڑا۔ اس کا دوسرا اعتراض اتنے مہنگے کلینک کے انتخاب پر تھا لیکن سویرا نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا تھا کہ اس کلینک میں اس کی ایک سہیلی نرس ہے اور اس نے فیس میں خاطر خواہ کمی کروا دی ہے اس لیے بہترین علاج اور نتائج کے لیے اس مہنگے کلینک کے انتخاب میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واصف پہلی بار وہاں گیا تھا تو اس کے چند ٹیسٹ لیے گئے تھے اور رپورٹس کے لیے چند دن بعد کی تاریخ دے دی گئی تھی۔ آج وہ رپورٹس لینے ہی وہاں گیا تھا۔ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی سویرا کی سہیلی نے ہی اس کا استقبال کیا تھا اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ ڈاکٹر نے یہ انکشاف کر کے اسے ہولا دیا تھا کہ اس کے ساتھ تھوڑا سا مسئلہ ہے اس لیے وہ لوگ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں لیکن ساتھ ہی ڈاکٹر نے اسے یہ بھی تسلی دی تھی کہ علاج سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے، بس واصف کو تھوڑا سا تعاون کرنا ہوگا۔

واصف ہامی بھر لینے کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس کی طرف سے تعاون کی یقین دہانی کے بعد ڈاکٹر نے اس کے کچھ مزید ٹیسٹ لیے تھے اور یہ عمل خاصا طویل تھا۔ واصف کو محسوس ہوا تھا کہ ان ٹیسٹوں کے دوران وہ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں بھی چلا گیا تھا لیکن ڈاکٹر کا رویّہ اس کے ساتھ اتنا دوستانہ اور مشفقانہ تھا کہ وہ کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں اٹھا سکا تھا۔ بے چینی اور بے قراری اسے کلینک سے نکلنے کے بعد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس نے بی کام کیا تھا اور میڈیکل سائنس کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتا تھا لیکن پھر بھی اسے لگ رہا تھا کہ ایک عام سے مسئلے کے حل کے لیے اسے بہت زیادہ خصوصی مراحل سے گزارا گیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کلینک بہت جدید ہے اور یہاں علاج کے جدید طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اس لیے وہ اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اندر ایک گلٹ سا بھی تھا کہ اس کی کمی کی وجہ سے سویرا اپنی انتہائی خواہش کے باوجود ماں بننے سے محروم ہے۔ الجھن میں مبتلا بے دھیانی سے بائیک چلاتا وہ اپنی طرف بڑھنے والی موت سے بے خبر تھا۔ ایک تیز رفتار ٹرک نے اسے ٹکر ماری اور وہ بائیک سمیت اچھلا تو اس کے پاس خود کو بچانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس موقع پر قدرت کی طرف سے کوئی معجزہ بھی رونما نہیں ہوا اور وہ اچھل کر سڑک پر واپس گرا تو ایک مزدا اسے روندتی ہوئی آگے چلی گئی۔ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔ اس کا کیس ان بے شمار کیسوں میں شامل کر دیا گیا تھا جہاں حادثے کی ذمے داری موٹر سائیکل چلانے والے کی بے احتیاطی پر ڈال دی جاتی ہے۔

☆☆☆

”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ اپنے مجازی خدا کی بات سن کر بے ساختہ ہی اس کی زبان سے نکلا اور گردن مسلسل نفی میں ہلتی چلی گئی۔

”تم فکر نہیں کرو ڈارلنگ! سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ اس نے جواباً گویا اسے تسلی دی۔

”اس سائنسی ترقی نے تم جیسوں کی اخلاقی تنزلی میں جو اضافہ کیا ہے، وہ قابلِ نفرت ہے۔“ اس نے نفرت انگیز نظروں سے اپنے شوہر کو گھورا۔ یہ وہ شخص تھا جسے وہ سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی لیکن آج روئے زمین پر اس سے

زیادہ قابلِ نفرت کوئی نہیں لگ رہا تھا۔

''میں اخلاقیات پر کوئی لیکچر سننے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میں تمہیں وہ بتا رہا ہوں جو میں اور امی جان تم سے چاہتے ہیں۔'' وہ اس کی بات کو ذرا خاطر میں نہیں لایا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو عادل! یہ گناہ ہے۔ کوئی عالمِ دین، کوئی مفتی اس کے حق میں فتویٰ نہیں دے سکتا۔'' وہ اسے سمجھانے لگی۔

''ہمیں کسی فتوے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمارے لیے بس اتنا کافی ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ صاف ستھرے طریقے سے ہو جائے۔ تمہارے تعاون کے بدلے میں تمہیں دنیا کی ہر نعمت مل سکتی ہے۔ تم میری زندگی سے نکلنا چاہو تو تمہیں اس کی بھی اجازت ہوگی لیکن یہ بات بہر صورت تمہیں ماننی ہوگی۔'' اس کے لہجے میں حکم تھا۔

''پلیز عادل! میرے ساتھ یہ سب مت کرو۔ میں بھلے سے تمہارے جتنے امیر و کبیر اور مشہور و معروف خاندان کی بیٹی نہیں ہوں لیکن ایک باعزت اور غیرت مند شخص کی بیٹی ضرور ہوں۔ تم مجھے اس گناہ پر مجبور نہ کرو۔'' وہ جو یونیورسٹی کی بہترین مقررہ تھی اور اپنے دلائل سے منٹوں میں دوسروں کو قائل کر دیتی تھی، اس وقت بڑی بے بسی کے عالم میں اس فرعون صفت شخص کے آگے گڑگڑا رہی تھی۔

''کیا گناہ گناہ کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے۔ میں کونسا تمہیں کسی نامحرم شخص کے بستر پر سونے کا کہہ رہا ہوں جو تم اتنا واویلا مچا رہی ہو۔ ایک چھوٹی سی بات ہی تو ہے جس کو ماننے میں تم ہزاروں نخرے دکھا رہی ہو۔'' وہ بگڑا۔

''چھوٹی سی بات...... یہ چھوٹی سی بات ہے۔ تم میری ہستی کا غرور خاک میں ملانے جا رہے ہو اور اسے چھوٹی سی بات کہہ رہے ہو۔'' اسے غصہ آگیا۔

''اس کے بدلے میں، میں تمہیں منہ مانگی قیمت بھی تو دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم قارون کا خزانہ بھی دے دو تو مجھے یہ بات منظور نہیں ہے۔'' اس نے ترنت انکار کیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ایک ایک کر کے اپنے سب گھر والوں کی لاشیں دیکھنے کے لیے تیار ہو جانا۔ سب سے پہلا نشانہ تمہارا اکلوتا بھائی ہوگا۔ تمہارے باپ کی نسل مٹ جائے گی اس کے مرنے سے۔ بولو کیا یہ تمہیں منظور ہے؟'' وہ نہایت سفاکی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''پلیز...... پلیز عادل! میرے گھر والوں کو کچھ نہیں کرنا۔ تم یہ سب کیسے کر سکتے ہو؟ تم تو مجھ سے محبت کے دعوے دار تھے۔ پلیز اس محبت کے صدقے ہی مجھے بخش دو۔'' وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔

''محبت......'' وہ زور سے ہنسا اور بولا۔ ''محبت نہیں تم میرا انتخاب ہو۔ ہمیں تمہارے طبقے سے جن صفات کی حامل لڑکی چاہیے تھی، وہ سب صفات تم میں موجود تھیں اس لیے تمہارا انتخاب کیا گیا۔ ذہانت، خوب صورتی، خود اعتمادی، رکھ رکھاؤ یہ سب خصوصیات ایک ساتھ تمہارے طبقے کی لڑکیوں میں خصوصاً کم ہی پائی جاتی ہیں لیکن تم میں یہ خوبیاں تھیں اس لیے تمہیں ہمارے خاندان میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہو سکا۔'' عادل نے اس کی واحد خوش فہمی بھی دور کر دی۔ احساسِ بے بسی اور ذلت سے آنسو بہاتی وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کہے جو اس شخص کے دل کو موم کر دے اور وہ اس مصیبت سے نکل سکے۔ اس کے پیاروں کے نزدیک تو وہ اس وقت ہنی مون منانے ورلڈ ٹور پر نکلی ہوئی تھی۔ انہیں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی قید میں ہے جہاں سے کسی کو اپنی مدد کے لیے بھی نہیں پکار سکتی۔

''تم خوامخواہ کی بحث میں کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔ یہ طے ہے کہ اب ہمارے لیے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں ہے۔ اس منصوبے پر ہم نے بے تحاشا پیسا خرچ کیا ہے اور ان سارے لوگوں کو دوسری دنیا بھجوا دیا ہے جو کسی بھی طرح ہمارے لیے نقصان کا باعث بن سکتے تھے۔ اس لیے تم بھولے سے بھی یہ مت سوچو کہ اس بات سے پیچھے بھی ہٹا جا سکتا ہے۔''

''تم نے لوگوں کو قتل بھی کروایا ہے؟'' وہ جیسے اس کے الفاظ کا مفہوم درست ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''ہاں، تم قتل بھی کہہ سکتی ہو۔'' اس نے آرام سے تسلیم کر لیا اور ان سارے لوگوں کے بارے میں بتانے لگا جو اس چکر میں اپنی جان سے گئے تھے۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اس کے اتنے مزے سے کیے جانے والے اعترافات و انکشافات کی وجہ نہ سمجھ پاتی۔ وہ اسے ذہنی دباؤ میں مبتلا کر رہا تھا تا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جن لوگوں کے اشارے پر اتنی آسانی سے انسانوں کی زندگیاں چھین لی جاتی ہیں، ان کے لیے اس کے گھر والوں کو موت کی نیند سلا دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ گھر والوں کی محبت نے اسے ہرا دیا اور وہ اس شخص کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی جس کے لیے اب اس کے دل میں سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔

☆☆☆

کسی کی کرب ناک چیخوں نے انہیں گہری نیند سے جگا دیا۔ وہ اسی عورت کے گھر میں مقیم تھیں جو انہیں نہر کے کنارے ملی تھی۔ بہت دیر تک نہر میں رہنے کی وجہ سے ان کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی اور وہ عورت کے سوالوں کے جواب بھی ڈھنگ سے نہیں دے سکی تھیں۔ عورت ہی کسی کو بلا کر لائی تھی اور انہیں بیل گاڑی اپنے گھر لے گئی تھی۔ انہوں نے عورت کی مدد سے اپنا بھیگا ہوا لباس بدل کر اسی کا فراہم کردہ پرانا گھسا ہوا لباس پہن لیا تھا اور پھر گرم گرم دودھ پی کر جو گہری نیند سوئی تھیں تو اب نسوانی چیخوں سے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ ان چیخوں کو سن کر وہ گھبرا کر اٹھیں اور اس چھوٹے سے کچے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ کمرے کے باہر کچا صحن تھا اور اس صحن میں مزید دو کمروں کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے آوازوں سے اندازہ لگا لیا کہ عورت کی آواز کس کمرے سے آرہی ہے۔ وہ بے ساختہ ہی اس کمرے کی طرف بڑھیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور انہوں نے اسی عورت کو پریشان صورت کے ساتھ باہر آتا دیکھا۔ ''کیا ہوا؟'' انہوں نے عورت سے پوچھا لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر درمیانی فاصلہ طے کر کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں صورت حال سمجھ آگئی۔

''یہ میری نُوہے جی! دائی نے جو دیہاڑ بتایا تھا اس میں ابھی دیر تھی لیکن اس کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی۔ دائی آج پنڈ میں نہیں ہے، وہ اپنے بھتیجے کے ویاہ میں شریک ہونے اپنے بھائی کے پنڈ گئی ہوئی ہے۔ تین دن بعد واپس آئے گی۔'' عورت اس کے پیچھے کمرے میں واپس آئی اور اسے بتانے لگی۔ اس عورت کے علاوہ وہاں مزید دو عورتیں اور موجود تھیں جو تکلیف سے چیختی اس جوان العمر عورت کو تسلیاں دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''اسے اسپتال لے کر کیوں نہیں جاتے تم لوگ؟'' وہ عورت کی حالت دیکھ کر چیخ پڑیں۔

''ادھر کوئی اسپتال نہیں ہے جی۔ دائی ہی سب کو نمٹاتی ہے۔ اسپتال آگے بہت دور نور پور کے قصبے میں ہے۔ بیل گاڑی میں وہاں تک جانے میں بہت دیلا لگتا ہے اور ابھی تو رات بھی بہت گہری ہو گئی ہے۔'' بڑی عمر کی اس عورت نے انہیں اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

''او مائی گاڈ! اس طرح تو یہ مر جائے گی۔'' وہ بڑبڑائیں اور آگے بڑھ کر اسے دیکھنے لگیں۔ ایک ماہر گائناکولوجسٹ کی حیثیت سے وہ ایک عورت کو اس حال

گوشت شناسی

یہ گزشتہ عید الاضحیٰ کا ذکر ہے۔ قریشی صاحب پر ہماری نظر پڑ گئی۔ وہ بے چارے اس دھوکے میں دفتر کی تیسری منزل پر آ نکلے تھے کہ شاید ہم دفتر کی کسی اور منزل پر قربانی کا گوشت ہضم کر رہے ہیں۔ جونہی انہوں نے ہمیں دیکھا الٹے پاؤں بھاگنے کی سوچنے لگے لیکن اب ہمارے ہاتھ سے بچ نکلنا مشکل تھا اور یہ بات وہ بھی جان گئے تھے چنانچہ جب انہوں نے ہر طرح سے اندازہ کر لیا کہ اب فرار کا راستہ مسدود ہے تو قدرے گڑگڑا کر بولے۔

''دیکھو بھئی۔ شرافت سے عید ملو گے؟''

ہم نے جواب دیا۔

''کمال کرتے ہو۔ بھلا آپ سے کیا بدمعاشی کروں گا؟''

قریشی صاحب نے اپنی مدافعت میں دونوں ہاتھ کچھ اس طرح گھمائے جیسے کوئی کرتب دکھا رہے ہوں پھر انہوں نے منہ سے بیڑی نکال کر ایک طرف پھینک دی اور چند قدم پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے کہنے لگے۔

''تم نے پچھلی عید پر اس قدر دبایا تھا کہ پسلیاں دکھنے لگی تھیں۔ اب دباؤ گے نہیں!'' ہم نے انہیں یقین دلایا۔

''اچھا نہیں۔ نہیں دباؤں گا۔''

ہمارے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے کہنے لگے۔

''نہیں۔ تم دباؤ گے۔ خدا کی قسم پسلیاں دکھنے لگتی ہیں؟''

جواب میں ہم نے ایک بار پھر انہیں یقین دلایا۔ ''یار کمال کرتے ہیں آپ۔ میں خلوص سے عید مل رہا ہوں۔''

ہمارا یہ جملہ سن کر قریشی صاحب قدرے مطمئن ہو گئے اور پھر قدرے ڈرے ڈرے، سہمے سہمے اس طرح گلے ملے جیسے مشیت ایزدی یہی ہو اور بندہ اس کے آگے مجبور و لاچار ہو۔ ظاہر ہے رسم کے مطابق ہمیں تین بار ان سے گلے ملنا تھا۔ ہم پہلی بار ان سے بڑی آہستگی سے ملے تو انہیں ہماری شرافت کا کچھ کچھ یقین سا ہو گیا۔ دوبارہ دوسری طرف سے گلے لگایا تو پھر نہایت آہستگی اور صبر و ضبط کا ثبوت دیا اب تو واقعی مطمئن ہو گئے تھے کہ اب ہم پنجابیوں کی طرح عید نہیں مل رہے لہٰذا تیسری بار وہ بے کھٹکے ہمارے گلے لگ گئے اور یہی موقع ہمارے لیے غنیمت تھا۔ چنانچہ اس دفعہ ہم نے انہیں پوری قوت سے دبا کر جو دو تین جھٹکے دیے تو اس کے ساتھ ہی پیٹ دبنے سے قریشی صاحب کی ڈھیلی ڈھالی پتلون سرک کر پاؤں میں جا گری اور قریشی صاحب بڑبڑا کر چلائے۔

''ابے یار! تم پھر پنجابی بن گئے۔ تمہاری یہی بات بری لگتی ہے۔''

شفیع عقیل کی کتاب ''سرخ سفید سیاہ''
سے آذین رضوان، کراچی کا انتخاب

میں تکلیف سے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں اور پھر انہوں نے اس چھوٹے سے کچے کمرے میں نہ ہونے کے برابر سہولیات کے ساتھ ناکافی روشنی میں ایک ننھی روح کو دنیا میں بخیریت لانے کا فریضہ انجام دیا۔ وہ جو انگلستان کے ایک جدید اسپتال میں دنیا کی بہترین سہولتوں کے ساتھ یہ کام انجام دیتی تھیں، تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں کہ کبھی انہیں اس طرح کی صورتِ حال کے ساتھ بھی نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ انہیں اندازہ تھا کہ بچے کو دنیا میں لاتے ہوئے وہ کم عمر سی عورت بدترین تکلیف سے گزری ہے اور اسے یہ تکلیف اس لیے سہنی پڑی ہے کہ وہ ایک نہایت پسماندہ علاقے میں موجود تھی۔ کسی اچھے اسپتال میں یہ تکلیف کئی گنا کم ہوتی اور عورت کا اتنا خون بھی ضائع نہیں ہوتا۔ قابلِ اطمینان بات بس یہ تھی کہ عورت اور اس کی مولود بچی کی زندگی بچ گئی تھی یہ اور بات کہ اس مشکل کیس کو نمٹانے میں ان کا تھکا ہوا جسم اور ذہن دونوں مزید تھک گئے تھے۔

''تسی دایہ گیری کرتے ہو جی؟'' نومولود بچی کی دادی نے جب نہایت سادگی سے ان سے یہ سوال کیا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ وہ جو کبھی جائداد میں اپنے حصے سے دستبردار ہونے کا سوچتی تھیں، اب حتمی فیصلہ کرچکی تھیں کہ اس پنڈ میں ایک اچھا اسپتال قائم کریں گی۔ ان کے بھائیوں کے پاس پہلے ہی اللہ کا دیا بہت کچھ تھا اس لیے اگر وہ اپنے حصے کی جائداد ان مستحق لوگوں کے لیے وقف کر دیتیں تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اپنے ذہن میں آنے والے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے انہوں نے فوراً ہی لائحہ عمل سوچنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ فی الحال اسی پنڈ میں روپوش رہیں گی۔ دوبارہ کے قاتلانہ حملے کے بعد یہ روپوشی ان کی ضرورت تھی۔ ان کے حق میں اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ سرداراں نامی جس عورت کے گھر انہیں پناہ ملی تھی، اس کا گھر باقی پنڈ سے ہٹ کر نہر کے قریب ہی واقع تھا اور سرداراں کو باقی پنڈ والوں کو یہ بات بتانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ کوئی عورت نہر میں بہتی ہوئی وہاں پہنچی ہے۔ بہو کی طبیعت خراب ہونے پر جو دو عورتیں اس نے پنڈ سے بلوائی تھیں، انہیں بھی پریشانی میں کچھ نہیں بتاسکی تھی۔ انہوں نے سرداراں کو الگ کمرے میں بلوا کر اسے فی الحال اپنے سلسلے میں زبان بند رکھنے کی ہدایت کی اور اگلے دن سرداراں کے بیٹے خوشی محمد کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دیا۔ اپنا کل سامان وہ نہر میں گنوا بیٹھی تھیں اور صرف یادداشت کے سہارے انہوں نے خالد کے دفتر کے پتے پر اسے ایک خط بھجوایا تھا۔ خط بھیجنے کے ایک ہفتے بعد جب وہ مایوس ہونے لگی تھیں، ایک گاڑی پنڈ میں داخل ہوئی اور اس سے خالد برآمد ہوا۔ ڈاکٹر رفعت سے سامنا ہوتے ہی وہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گیا۔

''آپ کو زندہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے میں بتا نہیں سکتا بجیا! آپ کا خط ملا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ہم سب تو آپ کی زندگی کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے۔ آپ کی کار کے حادثے کی خبر مل گئی تھی اور نہر میں سے کار بھی دریافت کر لی گئی تھی لیکن باوجود بہت کوشش کے آپ کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا تھا اس لیے فرض کرلیا گیا تھا کہ آپ نہر میں ڈوب کر ختم ہوگئی ہیں اور لاش بہہ کر کہیں دور نکل گئی ہے۔ آفتاب بھائی اور شہزاد اس حادثے کے بعد بہت اپ سیٹ ہیں۔ انہیں رہ رہ کر آپ کے ساتھ اپنے رویے پر افسوس ہوتا ہے۔''

''میری گاڑی کو حادثہ پیش نہیں آیا تھا خالد! یہ مجھ پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں، میں معجزانہ طور پر ہی بچ گئی ہوں۔'' انہوں نے اچانک انکشاف کرکے خالد کی بولتی بند کردی۔

''او مائی گاڈ......! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خون ایسے سفید ہوسکتا ہے۔'' وہ ڈاکٹر رفعت کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ انہیں شبہ تھا کہ جائداد کے چکر میں ان کے اپنے بھائی انہیں قتل کروانا چاہتے ہیں۔ ماضی کے سلوک کی روشنی میں وہ اس طرح کا شک کرنے میں حق بجانب تھیں۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس وقت ڈاکٹر بنی تھیں جب ان کے گاؤں میں ان جیسے خوشحال گھروں کی لڑکیاں بھی زیادہ سے زیادہ میٹرک تک تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ وہ اپنے والد کی لاڈلی بیٹی تھیں اور انہوں نے ان کے شوق کے پیشِ نظر انہیں میڈیکل کی تعلیم دلوائی تھی۔ وہ آگے بھی ان کے سارے خواب پورے کرنے کا عزم رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر رفعت کی کم نصیبی تھی کہ ہاؤس جاب کے دوران ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور جائداد کا سارا انتظام بھائیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ آفتاب بھائی بڑے تھے اور انہوں نے ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کی خواہش کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ وہ بہن پر اتنی بڑی رقم خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت والدہ بھی ڈاکٹر رفعت کی مخالف تھیں اور چاہتی تھیں کہ بیٹی مزید پڑھائیوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے اپنا گھر بسالے۔ ڈاکٹر رفعت نے

اس خواہش کو ٹھکرا دیا اور جیسے ہی انہیں ملک سے باہر جانے کا ایک موقع ملا، اس سے فائدہ اٹھا کر انگلستان چلی گئیں۔ وہ اس خواہش کو مکمل کرنے والی شخصیت سے وعدہ کر کے گئی تھیں کہ دوبارہ پاکستان نہیں آئیں گی۔ اس وقت وہ اپنے گھر والوں سے اتنی بدگمان تھیں کہ انہیں یہ وعدہ کرنا مشکل نہیں لگا تھا اور پورے چوبیس سال انہوں نے اپنے اس وعدے کو نبھایا لیکن جب والدہ کی طرف سے التجا آمیز فون کالز آنے لگیں کہ وہ آخری وقت میں آکر ماں سے مل جائیں تو وہ خود کو روک نہ سکیں۔ گزرے برسوں میں غصہ بھی ختم ہوگیا تھا اور وعدے کی پاسداری کا بھی اتنا خیال نہیں رہا تھا چنانچہ وہ واپس آگئی تھیں لیکن یہاں حالات بہت تکلیف دہ تھے۔ بھائیوں نے اتنے برسوں بعد بھی ان کا خندہ پیشانی سے استقبال نہیں کیا تھا اور الٹا ان کی جان کے درپے ہوگئے تھے۔

''میرے خیال میں بجیا! آپ انگلینڈ واپس چلی جائیں۔ میں آپ کے حصے کی جائداد فروخت کر کے رقم وہاں ٹرانسفر کروا دوں گا۔ ویسے بھی اب یہاں ایسا کچھ نہیں رہا ہے جس کے لیے آپ یہاں رکنا چاہیں۔'' کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد خالد نے انہیں مشورہ دیا تو وہ اس کے آخری جملے پر چونک گئیں۔

''کچھ نہیں رہا ہے سے تمہارا کیا مطلب ہے خالد؟'' انہوں نے سراسیمگی سے دریافت کیا۔

''آپ کے ڈوبنے کی خبر ملنے کے دوسرے دن ہی بچی جان کا انتقال ہوگیا تھا۔'' خالد نے جھکے سر کے ساتھ انہیں وہ افسوسناک اطلاع دی تو وہ ساکت ہوگئیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ موت سے نبرد آزما ان کی ماں پر ان کی موت کی خبر قیامت بن کر ٹوٹی ہوگی اور ایک جھٹکے میں زندگی کی ڈور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہوگی۔ وہ جو ماضی میں بھی ماں سے بھی ناراض ہوگئی تھیں، اب ان کے مرنے کی خبر سن کر حیران تھیں کہ وہ کیسے اپنی ماں سے ناراض تھیں اور کیسے ان کے بغیر اتنے سال گزار لیے تھے۔

''میں جانتا ہوں بجیا یہ غم بہت بڑا ہے لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' خالد نے ان کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے ان سے کہا تو انہوں نے بہت ہمت سے اپنے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد خالد کو بتانے لگیں کہ وہ اس سے کیا چاہتی ہیں۔ اس کام میں بھی رکاوٹ کا اندیشہ تو تھا لیکن خالد کو یقین تھا کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے ہر مسئلے کو حل کر دے گا۔ ڈاکٹر رفعت کو صرف اس کے مشوروں پر عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

سویرا انگشت بدنداں تھی۔ سال بھر سے بھی زیادہ عرصہ وہ دن رات جس خوشی کے لیے دعا مانگتی رہی تھی، اس نے اس وقت اس کے وجود میں جنم لیا تھا جب واصف ہی نہیں رہا تھا۔ واصف کی موت اس کے لیے ایک ایسا حادثہ تھی جس نے ہفتوں اسے اس کے حواسوں میں واپس نہیں لوٹنے دیا تھا اور وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کو فوری طور پر محسوس نہیں کرسکی تھی۔ اب بھی صوفیہ خاتون کو شک ہونے پر اس نے تصدیق کے لیے ٹیسٹ کروایا تو حیران رہ گئی کہ ایسا کیونکر ہوگیا پھر اسے یاد آیا کہ واصف کی حادثے میں موت سے چند دن قبل ہی اسے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ چند دن بعد اس پر سے ماں بننے کی پابندی ہٹالی جائے گی اور وہ ان گولیوں کو کھانے کی پابندی سے آزاد ہوگی جو اب تک اس کے ماں بننے میں مانع رہی تھیں۔ وہ اس اطلاع پر اتنی خوش ہوئی تھی کہ اسی دن سے گولیاں کھانا ترک کردی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ جب چند دن بعد پابندی ختم ہی ہونی ہے تو ابھی سے ختم کر دینے میں کیا حرج ہے۔ چند دن کا فرق کوئی کیسے نوٹ کرسکے گا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ پابندی لگانے والے بہت سوچ سمجھ کر اور پورے حساب کتاب سے اپنی چال چل رہے ہیں۔ خبر دوسروں کے کانوں تک پہنچتے ہی اس کے پاس ایک فون کال آگئی۔

''یہ ہم کیا سن رہے ہیں سویرا! جب ہماری طرف سے تم پر پابندی عائد کی گئی تھی تو تم نے ایسی جرأت کیسے کی۔''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ چند دنوں میں یہ پابندی ختم کر دی جائے گی اس لیے میں نے......'' پُرجلال آواز کے جواب میں اس نے کپکپاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''ہم نے پابندی ختم کرنے کا اشارہ دیا تھا ابھی ختم تو نہیں کی تھی۔ بہرحال اب بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنی اس غلطی کو ختم کر دو، ہماری ناراضی دور ہوجائے گی۔'' اب لہجہ قدرے نرم تھا لیکن الفاظ نے سویرا کے اعصاب پر بم گرا دیا تھا۔

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم تمہاری ماں سے کہیں گے کہ تمہیں کسی اچھی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ وہ آسانی سے یہ مسئلہ ختم کر دے گی۔'' انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ یہ بچہ میرے پاس واصف کی نشانی اور امانت ہے۔" اس بار اس نے ہمت کر کے صاف انکار کر دیا۔

"ہمارے احسانوں کا یہ بدلہ دوگی تم؟" لہجہ دوبارہ پُرجلال ہوگیا۔

"ماں دنیا کے کسی بھی احسان کے بدلے اپنی اولاد کی قربانی نہیں دے سکتی۔" وہ جو کبھی اس ہستی کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھی، اپنے وجود میں سانس لیتے وجود کی خاطر اپنی بات پر ڈٹ گئی۔

"ہم سے وعدہ خلافی اور یہ گستاخی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی سویرا! اب بھی وقت ہے، ہماری بات مان لو اور بچے کا طوق اپنے گلے میں مت ڈالو۔ ابھی تم کم عمر اور جوان ہو۔ ہم تمہاری کسی دوسرے اچھے لڑکے سے شادی کروا دیں گے۔ بچے کے ساتھ دوسرا رشتہ ملنا مشکل ہوگا۔" وہ جیسے اب اسے زور، دھمکی اور لالچ سے راضی کرنا چاہتی تھیں۔

"واصف سے بھی میں نے آپ کے کہنے پر ہی شادی کی تھی۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اس شادی سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ ہم نے حاصل کر لیا۔ اب بھی تم وہ کرو جو ہم تم سے کہہ رہے ہیں۔" ان کا لہجہ سرد ہوگیا۔

"نہیں۔ میں کسی صورت واصف کے بچے کو قتل نہیں کروں گی۔ مجھے آپ کے کسی مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں بس اپنے بچے کی زندگی چاہتی ہوں اور اسے واصف کی نشانی کے طور پر اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہوں۔"

"اپنا یہ فیصلہ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔" اس بار لہجہ سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھا۔ سلسلہ منقطع ہوگیا تو سویرا سہمی ہوئی گم صم سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔

"سویرا۔" صوفیہ خاتون نے اسے آواز دی تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ "کیا بات ہے؟ تم کس سے بات کر رہی تھیں؟" وہ اسے بہت کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"کسی سے نہیں بس وہ....." اسے فوری طور پر کوئی بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

"جو بھی بات ہے مجھے بتاؤ۔ میں نے تمہاری فون پر کی جانے والی باتیں سن لی ہیں۔ اگر تم مجھے سچ بتا دو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" وہ اس کے قریب آ بیٹھیں اور نرمی سے اسے سمجھانے لگیں۔ سویرا نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ واصف کی ماں تھیں اور وہ ہستی تھیں جنہیں واصف کی موت نے اس سے بھی زیادہ متاثر کیا تھا۔ چند ہفتوں میں وہ بالکل گھل کر رہ گئی تھیں لیکن جب سے انہیں یہ خبر ملی تھی کہ سویرا واصف کے بچے کی ماں بننے والی ہے، ان کی حالت سنبھلنے لگی تھی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس سے کچھ قصور سرزد ہوگئے ہیں لیکن موجودہ حالات میں واصف کی ماں سے زیادہ کوئی اس کا ہمدرد نہیں ہوسکتا۔ وہ انہیں شروع سے پورا سچ بتانے لگی۔

"آپ جانتی ہیں کہ میری امی ایک گھر میں گھریلو ملازمہ کا کام کرتی ہیں۔ میرے ابو کے مرنے کے بعد سے ہی وہ یہ کام کر رہی ہیں۔ جب میں چھوٹی تھی تو وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ وہاں مالکوں کے بچوں کو پڑھتے لکھتے دیکھ کر مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا لیکن امی کے پاس مکان کا کرایہ، بجلی گیس کے بل اور راشن کے اخراجات نکالنے کے بعد اتنی گنجائش نہیں نکلتی تھی کہ وہ مجھے تعلیم دلوا سکیں۔ وہ باقی اخراجات بھی بہت مشکل سے پورے کر پاتی تھیں اور مہینے کے آخری دنوں میں جب ہمارے گھر فاقوں کی نوبت آنے لگتی تھی تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مالکوں کا بچا ہوا کھانا گھر لانے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں میرا تعلیم حاصل کرنے کا شوق وہ پورا کرتیں بھی تو کیسے..... لیکن شوق تو شوق ہوتا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا شوق بڑھتا گیا۔ مالکوں کے بچوں کو پڑھانے ان کا ٹیوٹر گھر آتا تو میں کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اور کان لگا کر اس کا پڑھایا ہوا سبق یاد کرنے کی کوشش کرتی۔ میری یہ حرکت ایک بار مالکن کی ایک مہمان کی نظر میں آگئی۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو میری ماں نے انہیں میرے شوق کے بارے میں بتا دیا۔ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئیں اور پھر فیصلہ سنایا کہ میری تعلیم کے سارے اخراجات وہ پورے کریں گی۔ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور میرا بہت اچھے اسکول میں داخلہ کروا دیا گیا۔ میں نے بہت دل لگا کر محنت سے پڑھا اور میٹرک میں اے ون گریڈ لیا۔ میں آگے ایف ایس سی پری میڈیکل میں داخلہ لینا چاہتی تھی لیکن ان صاحبہ نے مجھے حکم دیا کہ میں کامرس کالج میں داخلہ لوں۔ میں ان کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس وقت بھی میری تعلیم کے اخراجات وہی اٹھا رہی تھیں۔ اپنی دلچسپی کے برخلاف میں نے کامرس کالج میں داخلہ لے لیا تو انہوں نے مجھے دوسرا حکم واصف کے سلسلے میں دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے ہر حال میں واصف سے قریب ہونے کی کوشش کرنی ہے اور اسے اس حد تک اپنا بنانا ہے کہ

وہ مجھ سے شادی پر راضی ہو جائے۔ میں اس حکم پر حیران ہوئی لیکن انکار نہیں کر سکی۔ واصف سے واقفیت پیدا ہونے کے بعد مجھے یہ کام اس لیے مشکل نہیں لگا کہ مجھے سچ مچ واصف اچھے لگنے لگے تھے۔ انہیں بھی میں پسند آئی اور انہوں نے تعلیم کے بعد ملازمت ملتے ہی آپ کی رضامندی سے مجھ سے شادی کر لی۔ میری والدہ نے آپ کو بتا دیا تھا کہ شادی کے سارے اخراجات ان کے مالکوں نے پورے کیے ہیں۔ حقیقت میں یہ بات سچ نہیں تھی۔ ان کے مالک کبھی بھی اتنے سخی نہیں رہے تھے۔ شادی کے اخراجات ان خاتون نے ہی اٹھائے تھے جنہوں نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔ پہلے احسان کے بعد ان کا یہ دوسرا احسان بہت بھاری تھا بلکہ میرے حساب سے تو یہ ان کا تیسرا احسان تھا۔ دوسرا احسان تو انہوں نے مجھے واصف سے نزدیک ہونے کا حکم دے کر کیا تھا لیکن اپنے ان احسانات کی انہوں نے مجھ سے بہت عجیب وغریب قیمت وصول کی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس وقت تک ماں نہیں بنوں گی جب تک ان کی طرف سے اجازت نہیں مل جاتی۔ حکم دیتے ہوئے انہوں نے مجھے یہ بھی تسلی دی تھی کہ پابندی کا یہ عرصہ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ ہوگا۔ مجھے ہامی بھرنی پڑی لیکن دو تین مہینے بعد ہی مجھے ایسا لگنے لگا کہ میں کوئی جرم کر رہی ہوں۔ میں نے ان سے پابندی ختم کرنے کے سلسلے میں بات کی جواباً انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کچھ کیا تو مجھے اس کے خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ وہ بہت بااثر خاتون تھیں اس لیے میں ڈر گئی اور ان کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے لگی۔ ان کی فراہم کردہ گولیاں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ میں واصف کے سامنے اس بات کا وقتاً فوقتاً اظہار کرتی رہتی تھی کہ مجھے جلد از جلد ماں بننے کی شدید خواہش ہے۔ واصف میری دیوانگی پر کبھی ہنس دیتے اور کبھی تسلی دیتے کہ ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا ہے کہ اس معاملے میں پریشان ہوا جائے لیکن ایک سال بعد میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ ہمیں کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا چاہیے۔ کلینک اور ڈاکٹر کا انتخاب ان ہی بیگم صاحبہ نے کیا اور میرے بعد واصف کو بھی ایک چیک اپ اور ٹیسٹوں کے لیے بلوایا گیا۔ اس سب کے پیچھے وجہ کیا تھی، مجھے نہیں معلوم۔ میں بس اس بات پر خوش تھی کہ اس کے بعد مجھ پر سے پابندی ہٹ جائے گی۔ پابندی ہٹ جانے کی امید پر میں نے اجازت ملنے سے قبل ہی گولیوں کا استعمال ترک کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ چند دن کے فرق کا کسی کو اندازہ نہیں ہوسکے گا پھر یہ امید بھی نہیں تھی کہ فوراً ہی میری دلی خواہش پوری ہو جائے گی لیکن دونوں ہی باتیں ہوگئیں۔ اللہ نے واصف کے دنیا سے جانے سے پہلے میرے وجود میں ان کی نشانی رکھ دی لیکن ساتھ ہی بیگم صاحبہ کو بھی پتا چل گیا کہ میں نے ان کی حکم عدولی کی ہے۔ ابھی انہوں نے مجھے اسی سلسلے میں فون کیا تھا کہ مجھے اس بچے سے جان چھڑانی ہوگی۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے لالچ اور دھمکیاں دونوں دی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی بااختیار ہیں کہ اپنی ہر دھمکی پر عمل کر سکتی ہیں۔" انہیں ساری داستان سناتے ہوئے آخر میں اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ دوسری طرف صوفیہ خاتون کا چہرہ بھی خوف سے زرد پڑ چکا تھا۔

"کہیں ان بیگم صاحبہ کا نام......" تقریباً سرگوشی میں ایک نام ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے کی زردی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

"بالکل۔ یہی..... یہی نام ہے ان کا۔ آپ نے کیسے جانی یہ بات؟" سویرا نے تصدیق کرتے ہوئے حیرت سے ان سے پوچھا لیکن اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ جیسے کرنٹ کھا کر یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئیں اور اس سے بولیں۔

"سویرا! فٹافٹ اپنا سارا ضروری سامان، رقم اور زیور ایک بیگ میں رکھ لو۔ میں بھی اپنا سامان پیک کر رہی ہوں۔ ہم آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو تمہاری اور واصف کے بچے کی زندگی بچانا بہت مشکل ہو جائے گی۔" وہ بے حد خوفزدہ اور عجلت کا شکار تھیں۔ سویرا کو ان کی ہدایت پر عمل کرنا ہی درست لگا کیونکہ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی ساس ان بیگم صاحبہ کو اس سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہیں۔

☆☆☆

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ دور تک پھیلا ہوا سبزہ اور پگھلی ہوئی چاندی کی طرح بہتی شفاف نہر نے اس کی آنکھوں کو عجیب سی تراوٹ عطا کی۔ قیدی وہ اب بھی تھی لیکن اسپتال کے اس بند کمرے سے باہر نکل کر اس کھلی فضا میں سانس لینا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے مناظر کو دیکھنا بوجھل اعصاب کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا تھا۔ ایک آدھ دن نہیں وہ پورے پانچ مہینے تک ایک کمرے میں محدود رہی تھی اور اسے سخت نگرانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ عرصہ اس نے کیسے گزارا تھا، یہ وہی جانتی

تھی۔ جبر ایسا شدید تھا کہ اسے اپنے گھر والوں کی آواز سن کر بھی ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور وہ وہی کچھ بولتی تھی جو اسے رٹوایا جاتا تھا۔ شروع کے چند دن تو وہ گھر والوں کو یہی بتاتی رہی تھی کہ وہ نگر نگر کی سیاحت کرتی پھر رہی ہے۔ ہر بار فون کرنے پر وہ اپنے گھر والوں کو عادل کے بتائے ہوئے کسی شہر میں اپنی موجودگی کی اطلاع دے دیتی تھی۔ عادل نے اسے بتا دیا تھا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے کی جانے والی یہ کالز کچھ ایسی ٹرک سے کی جاتی ہیں کہ اس کے ابو کے موبائل پر اسی ملک اور شہر کا نمبر ظاہر ہوتا ہوگا جہاں پر وہ اپنی موجودگی کی اطلاع دیتی ہے۔ شروع کا ایک ڈیڑھ مہینا یہ کھیل کھیلنے کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ دلہن امید سے ہے اور بچے کی پیدائش تک دونوں میاں بیوی لندن میں ہی قیام کریں گے تاکہ بچے کو وہاں کی نیشنلٹی مل جائے۔

اس اطلاع کو مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کے ساتھ اس کی ساس نے خود اس کے میکے پہنچایا تھا اور اس کی امی نے اسے بتایا تھا کہ انہیں یہ خوشخبری سناتے ہوئے اس کی ساس بہت خوش تھیں۔ حقیقتاً اس کی ساس کے رویے نے اس کے گھر والوں کو اس کی طرف سے خاصا بے فکر کر دیا تھا۔ اکثر عادل بھی ان لوگوں سے فون پر بات کر لیتا تھا اور ایک نیک داماد کی حیثیت سے انہیں اس کی طرف سے مطمئن کرتا رہتا تھا۔ وہ اتنی پابندی سے اس کے میکے والوں سے بات کرواتا تھا کہ خود انہیں کال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایک آدھ بار کسی نے کوشش بھی کی تو ناکام رہا اور شکایت کرنے پر عادل نے بڑی محبت سے ان لوگوں کو پابند کر دیا کہ وہ بے کار میں اتنی مہنگی کال کرنے کے بجائے ان کی طرف سے کال کا انتظار کیا کریں۔ روزانہ بات ہو جاتی تھی اس لیے کسی کو عادل کی بات ماننے میں تامل بھی نہیں تھا۔ بس یہ وہی جانتی تھی کہ وہ کس طرح عادل کی موجودگی میں خود پر جبر کر کے گھر والوں سے ہلکی پھلکی گپ شپ کرتی تھی اور ہر طرح سے انہیں اپنے بہ خیریت ہونے کی یقین دہانی کرواتی رہتی تھی۔ ویڈیو کالز کے لیے بھی عادل نے بہانے سے بڑی خوب صورتی سے ان لوگوں کو ٹال دیا تھا اور کہا تھا کہ اب ماں اور بچے کو ساتھ ہی دیکھنا تاکہ زبردست سرپرائز ملنے کا احساس ہو۔

وہ اس سے بھی زیادہ اس کے گھر والوں سے دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز میں لمبی لمبی ٹیلیفونک گفتگو کیا کرتا تھا، اب اتنے خوش اخلاق اور نفس کھ داماد پر کوئی شک کرتا بھی تو کیسے؟ سب کچھ عادل اور اس کی ماں کے حسبِ خواہش چل رہا تھا لیکن وہ ان کی بے پناہ ہدایات کے باوجود اپنی صحت کو بہترین حالت میں رکھنے سے قاصر تھی۔ اسے طے شدہ شیڈول کے مطابق پابندی سے غذا اور دوا دی جاتی تھی اور ہلکی پھلکی ورزشیں بھی کروائی جاتی تھیں لیکن یہ ذہنی دباؤ تھا جو اس کی صحت پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ آخرکار پانچویں مہینے کے وسط میں اس کی ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ اگر اسے مستقل اسی ماحول میں رکھا گیا تو بہتری کی امید رکھنا فضول ہوگا۔ اس اعلان کے بعد ماں بیٹے کے درمیان مشاورت ہوئی اور اسے اس جگہ منتقل کر دیا گیا جس کی حیثیت تو ایک قید خانے ہی کی تھی لیکن یہ قید خانہ ذرا وسیع اور قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔

بند کمرے کی قید سے نجات ملنے پر اس کی صحت پر مثبت نتائج مرتب ہوئے اور ڈاکٹر نے اس کی طرف سے اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر، عادل اور چند وفادار ملازم اس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے اور یہاں بھی وہ کڑے پہرے میں تھی۔ اس کے کمرے سمیت پوری عمارت میں خفیہ کیمرے نصب تھے تاکہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کر سکے۔ اسے اپنی جان تک لینے کی اجازت حاصل نہیں تھی اور وہ ایک جبرِ مسلسل کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور تھی لیکن اس نے خود محسوس کیا تھا کہ یہاں آنے کے بعد سے مایوسی کا احساس کچھ کم ہو گیا ہے اور آزاد فضاؤں کو دیکھ کر اس کے اندر بھی آزادی کی خواہش ابھرتی ہے۔ دن بھر فارغ رہ کر وہ آزادی اور فرار کے کئی منصوبے بناتی بھی لیکن کسی بھی منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت اس لیے نہیں تھی کہ ہر روز اسے جتایا جاتا تھا کہ اس کی کوئی بھی غلطی اس کے گھر والوں کے لیے خطرناک ثابت ہوگی۔ اب وہ فرار کے منصوبے سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ طریقہ بھی سوچنے کی کوشش کرتی تھی جس پر عمل کر کے اپنے گھر والوں کے تحفظ کا انتظام کر سکے لیکن کڑے پہروں میں ان تک پیغام رسانی کا بھی تو کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اس گھر میں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے تھے، ملازم اپنے مالکوں کے سخت وفادار تھے اور سب سے بڑھ کر عادل بیشتر اوقات اس کے سر پر مسلط رہتا تھا۔ وہ پیغام رسانی کے لیے کوئی راہ نکالتی تو کیسے نکالتی لیکن پھر اسے راہ سوجھ ہی گئی۔ اس روز وہ فون پر اپنے ابو سے بات کر رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ ہر تھوڑی دیر بعد اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ جیسے سب اچھا ہے کی رپورٹ کے باوجود انہیں اس کی طرف سے کچھ پریشانی

لاحق ہو۔ اس نے بظاہر ان کی توجہ ہٹانے کے لیے بچپن کے قصے چھیڑ دیے۔

”آپ کو یاد ہے نا ابو جب ہم چھوٹے تھے تو آپ سے میٹھے اور پہیلیاں بجھوایا کرتے تھے۔“ وہ انہیں ایک پرانی یاد میں لے گئی۔

”بہت اچھی طرح یاد ہے بیٹا اور یہ بھی یاد ہے کہ سب سے زیادہ میٹھے تم ہی پوچھا کرتی تھیں۔“ وہ ماضی یاد آنے پر ہنس دیے۔

”کیا آپ اب بھی میٹھے بوجھ سکتے ہیں؟“ اس نے ان سے سوال کیا۔

”بالکل۔ کیا تم مجھ سے کوئی معما حل کروانا چاہتی ہو؟“ انہوں نے بچپن جیسی ہی توجہ اور اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔

”جی۔ میرے ذہن میں ایک معما ہے لیکن وہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ بالکل اچانک ہی کسی دن آپ کے سامنے رکھ دوں گی پھر آپ کی ذہانت کا امتحان ہوگا کہ آپ اسے حل کر پاتے ہیں یا نہیں۔“ اس نے انہیں جواب دیا۔

”تم نے تو بھئی مجھے تجسس میں ڈال دیا۔ اب مجھے روز انتظار رہے گا۔“ ان کے لہجے میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ سامنے بیٹھ کر گفتگو سنتا عادل عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بات کر کے فارغ ہوئی تو اس سے پوچھنے لگا۔

”تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں نا؟“

”آف کورس کرتے ہیں۔ دنیا کے سارے باپ اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں۔ کیا تمہارے باپ کو تم سے محبت نہیں تھی؟“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”معلوم نہیں۔ میں نے اپنے باپ کو دیکھا ہی کہاں ہے۔ وہ تو میری پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے جا چکے تھے۔“ اس کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ پل بھر کے لیے اس کے دل میں عادل کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے لیکن پھر وہ نفرت غالب آ گئی جو بہت ٹھوس بنیادوں پر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ شخص کسی طرح ہمدردی کے لائق نہیں تھا۔

☆☆☆

چند ماہ کے مختصر عرصے میں ڈاکٹر رفعت کے چھوٹے سے اسپتال کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ ضروری ساز و سامان کی تنصیب کے بعد اس اسپتال میں کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر رفعت کی طرف سے دی گئی پاور آف اٹارنی اور لائیو ویڈیو کال کے ذریعے خالد نے ان کے بھائیوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ زندہ ہیں اور جائداد میں سے اپنا حصہ چاہتی ہیں لیکن اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملوں کے بعد منظر پر آنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ویڈیو میں انہوں نے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ قاتلانہ حملوں کے لیے اپنے بھائیوں کو ذمے دار سمجھتی ہیں۔ بھائیوں نے اس الزام کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مانتے ہیں کہ وہ جائداد میں سے انہیں حصہ دینے کے حق میں نہیں تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہیں اپنی بہن سے محبت ہی نہیں اور وہ اسے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ والدہ کی وصیت کی موجودگی میں بھائیوں کے پاس انہیں حصہ دینے سے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی پھر ماں اور بہن کی پے در پے جدائی نے بھی اثر ڈالا تھا کہ انہوں نے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی اور مارکیٹ ویلیو کے مطابق گھر اور زمینوں میں ان کے حصے کی جو رقم بنتی تھی، وہ نقد ادا کر دی۔ رقم ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی وہ اپنی ذاتی جمع پونجی سے سرداراں بی بی کے پنڈ میں اسپتال کی تعمیر کا کام شروع کروا چکی تھیں اور اسپتال تعمیر ہونے تک بھی فارغ بیٹھنے کے بجائے سرداراں بی بی کے گھر کے ہی ایک کمرے میں کام شروع کر دیا تھا۔ سرداراں اور اس کے گھر والوں سمیت پورا پنڈ خوش تھا کہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر میسر آ گئی ہے۔ اپنی یہاں آمد اور موجودگی کے سلسلے میں انہوں نے ایک کہانی سنا کر لوگوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ کسی کو شک بھی تھا تو خاموشی مناسب سمجھی گئی تھی کہ شک و شبہے کا اظہار کر کے امدادِ غیبی سے محروم ہو جانا کہیں کی عقلمندی نہیں تھی۔

انہوں نے ایک نرس اور وارڈ بوائے کے ساتھ اپنے چھوٹے سے اسپتال کا آغاز کیا تو پنڈ کے لوگوں کا بھرپور تعاون ان کے ساتھ تھا۔ لوگ ایک طرف ان کے اخلاق کے گرویدہ تھے تو دوسری طرف اس بات کے بھی قائل ہو چکے تھے کہ ان کے ہاتھ میں بہت شفا ہے۔ وہ عورتوں کے مخصوص کیسز دیکھنے کے علاوہ عمومی بیماریوں کا علاج بھی کر رہی تھیں اور طبی سہولتوں سے محروم پنڈ والوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ اسپتال کی صفائی، چوکیداری اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے موٹے کئی کام پنڈ کے چند لوگوں نے رضاکارانہ طور پر سنبھال لیے تھے۔ انہوں نے اس تعاون کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا کیونکہ اسپتال بن گیا تھا لیکن ان کے پاس اسے چلاتے رہنے کے لیے محدود وسائل ہی میسر تھے۔ ان کی بچ جانے والی محدود رقم سے خالد نے ایک منافع بخش کمپنی کے شیئرز خرید کر آمدنی کا ایک ذریعہ تو بنایا تھا لیکن بہرحال وہ ایک محدود رقم تھی۔ کچھ رقم

تا لدنے ماہانہ دیتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوشش کرے گا کہ کچھ مخیر افراد کو اسپتال کے لیے فنڈز دینے پر راضی کرلے۔

وہ پُرامید تھیں کہ انہوں نے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے نعوذ اللہ کی طرف سے انہیں مدد میسر آتی رہے گی۔ فی الحال وہ جو کچھ میسر تھا اسی پر اکتفا کر کے اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھیں اور اپنی رہائش کے لیے بھی اسپتال ہی کا ایک حصہ استعمال کر رہی تھیں۔ اسپتال سے ملحق یہ دو کمروں کا ایک پورشن سا تھا جہاں وہ رہتی تھیں اور اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ گاؤں والوں نے ذاتی کاموں کے سلسلے میں بھی اپنی خدمات کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ بیرون ملک رہ کر انہیں اپنا ہر کام خود انجام دینے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں یہ پسند بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے احسان کا بدلہ اس طرح لیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس کے بدلے میں وہ خوشی اور اطمینانِ قلب کافی تھا جو انہیں یہ سب کر کے حاصل ہوا تھا اور وہ بجا طور پر کہہ سکتی تھیں کہ لندن کے جدید ترین اسپتالوں میں کام کر کے اور سہولیات سے مزین رہائش گاہوں میں رہ کر بھی انہوں نے کبھی وہ خوشی نہیں پائی تھی جس سے ان کا دل اب واقف ہوا تھا۔ گمنامی کی یہ زندگی انہیں راس آ گئی تھی اور وہ اپنی دہری شہریت کو بھول کر اس مٹی کی ہو کر رہ گئی تھیں جس سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔

☆☆☆

''میں جس اسکول میں ملازمت کرتی تھی، اس کے ایک فنکشن میں وامف کے والد بطور چیف گیسٹ آئے تھے اور میری خوب صورتی اور برجستگی سے گھائل ہو کر گئے تھے۔ اس فنکشن میں کمپیئرنگ کے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھے اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میں کسی کو اتنا متاثر کر چکی ہوں۔ ان کی طرف سے رابطہ کیا گیا تو میں حیران رہ گئی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے اس لیے مجھے ان کی محبت کو قبول کرنے میں تھوڑا سا تامل تھا لیکن پھر ان کی شدتوں کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ والدہ بچپن میں فوت ہو چکی تھیں اور صرف والد تھے جنہوں نے ہمیشہ میری خواہشات کی تکمیل کی کوشش کی تھی۔ وامف کے والد سے خفیہ شادی کی راہ میں بھی وہ رکاوٹ نہ بنے اور میرے سر پر سایہ بنے میرے ساتھ اس گھر میں رہتے رہے جو مجھے اپنے شوہر کی طرف سے مہر میں دیا گیا تھا۔ اس شادی سے مجھے سب کچھ حاصل تھا اور میں کسی شہزادی کی طرح رہتی تھی لیکن سرِعام خود کو ان کی بیوی کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ وہ دنیا کے ڈر سے نہیں بس اپنی پہلی بیوی کے ڈر سے مجھے چھپائے ہوئے ہیں اور اس شادی کا اعلان اس وقت کریں گے جب میں ماں بن جاؤں گی۔ ان کی بیوی ان کی تایازاد اور عمر میں ان سے آٹھ سال بڑی تھی۔ عمر کا فرق بھولا جا سکتا تھا، اگر ان کی بیوی کا رویہ اتنا زیادہ حاکمانہ نہ ہوتا۔ اس حاکمانہ رویے کے پیچھے میرے شوہر کے والد اور تایا کی بھرپور سپورٹ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاہجہاں، آصف سے زیادہ ذہین اور قابل ہیں اسی لیے خاندانی معاملات سے لے کر سیاست کے میدان تک ان کو آصف سے آگے رکھا جاتا تھا۔ آصف کو اندازہ تھا کہ ان کی بااختیار بیوی کتنی خود پسند، خودسر اور خود غرض ہے۔ آصف کی شادی کی خبر ہو جانے پر وہ انتقام میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اپنے غلاموں کی فوج کے ہوتے ہوئے اس کے لیے انسانی زندگیوں کے فیصلے صادر کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان جاں نثار غلاموں اور اپنے عیاری سے بنائے تعلقات کے بل پر وہ اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ باپ اور سسر کی حمایت کے بغیر اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اس کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ شادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی ماں نہیں بن سکی تھی اور آصف چاہتے تھے کہ وہ اپنے وارث کے ساتھ مجھے منظر پر لائیں تاکہ خاندان کی طرف سے مجھے حمایت حاصل ہو سکے۔ مجھے وامف کی خوشخبری ملنے میں کچھ وقت لگا اور جب یہ خوشخبری ملی تو ایک دوسری خبر نے اسے ذرا ماند کر دیا۔

''شادی کے اتنے برسوں بعد شاہجہاں بھی معجزانہ طور پر ماں بننے جا رہی تھی۔ آصف فطری طور پر خوش تو تھے لیکن ساتھ ہی انہیں یہ پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی کہ اگر شاہجہاں کے بطن سے بیٹا پیدا ہو گیا تو ان کے لیے میری اور میرے بچے کی جگہ بنانا مشکل ہو جائے گی۔ اس پریشانی کا کوئی حل نکلتا اس سے پہلے ہی وہ حادثہ پیش آ گیا جس نے آصف کو ہر مسئلے سے بے نیاز کر دیا۔ وہ ایک جلسے میں شرکت کے لیے پہنچے ہی تھے کہ انہیں گولیوں سے چھلنی کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ بہت شور مچا۔ مخالف پارٹی پر الزام عائد کیا گیا، انکوائری کے مطالبات کیے گئے لیکن ہماری ملکی تاریخ کے مطابق قاتل گرفتار نہ ہو سکے۔ آصف کے قتل سے میری تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ میرے والد نے مجھے اپنے سسرال جانے کا مشورہ دیا لیکن میں ہمت نہیں کر سکی۔ جس عورت سے آصف خوفزدہ تھے میں اس کے سامنے جانے کی جرأت کیسے کر سکتی

تھی پھر میرے پاس نکاح نامے کی نقل کے علاوہ کوئی خاص ثبوت بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اس نقل کو جعل سازی اور فراڈ قرار دے کر ٹھکرا دیتے تو میں کیا کر پاتی۔ میں نے خاموشی سے ایک طرف ہو کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ واصف کی پیدائش تک میں گھر تک ہی محدود رہی اور اس جمع پونجی سے گزارہ کرتی رہی جو آصف مجھے اخراجات کے لیے دیا کرتے تھے۔ واصف کی پیدائش کے ایک ماہ بعد ہی مجھے اخبارات سے شاہجہاں کے ماں بننے کی بھی خبر مل گئی۔ وہ بھی بیٹے کی ماں بنی تھی اور بالکل گنجائش نہیں تھی کہ میں واصف کو اس اونچے خاندان کے وارث کے طور پر ان لوگوں کے سامنے لے جاتی۔

”میں نے مہر میں ملا ہوا مکان فروخت کر کے رقم اکاؤنٹ میں محفوظ کر دی اور خود کرائے کے چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گئی۔ میری شادی کے بعد سے میرے والد جو پہلے مستری کا کام کیا کرتے تھے، آصف کی خواہش پر کام ترک کر چکے تھے۔ پُرتعیش زندگی کے مزے لوٹنے کے بعد ان کے لیے بڑھاپے میں دوبارہ محنت مزدوری کرنا مشکل تھا۔ میں نے واصف کو ان کے حوالے کیا اور خود دوبارہ اسکول کی ملازمت اختیار کر لی۔ جمع جتھے اور اپنی محنت سے میں واصف کی مناسب پرورش کرنے میں کامیاب رہی لیکن بہرحال اسے وہ زندگی نہیں دے سکی جو آصف کے زندہ ہونے کی صورت میں اسے مل سکتی تھی۔ واصف کو کبھی میں نے اس کے ددھیال کے بارے میں بتایا بھی نہیں کہ کہیں خوامخواہ وہ کسی چکر میں پڑ جائے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ چکر تو میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور محدود زندگی گزارنے کے باوجود میں کسی کی نظروں میں ہوں۔ تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ شاہجہاں کو ایک عرصے سے آصف کی دوسری شادی اور واصف کے وجود کا علم تھا اور وہ کسی لمبی منصوبہ بندی میں مصروف تھی۔ کیوں؟ میں نہیں جانتی لیکن اندازہ کر سکتی ہوں کہ اس جیسی گھاگ اور شاطر عورت نے کچھ بھی بلاوجہ نہیں کیا ہوگا۔ اب تو مجھے یہ بھی شبہ ہونے لگا ہے کہ میرا بچہ حادثاتی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور قتل کی ذمے دار شاہجہاں ہے۔ اس نے جائداد میں اپنے بیٹے کے ساتھ حصے دار واصف کو راہ سے ہٹایا ہے اور واصف کے وارث کو بھی دنیا میں نہیں آنے دینا چاہتی۔ اس لیے میں تمہیں اتنی عجلت میں وہاں سے نکال کر یہاں لے آئی ہوں۔ ہم جہاں رہ رہے ہیں یہ میرے ماموں کا گھر ہے اور شہر میں، میرے کسی واقف کار کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ والد کی زندگی میں بھی اور ان کے انتقال کے بعد بھی ہم لوگ کرائے کے گھر میں رہنے کی وجہ سے مسلسل رہائش گاہ تبدیل کرتے رہتے تھے۔ دوسرے میں مصروف بھی بہت رہتی تھی اس لیے آس پڑوس سے بھی اتنے زیادہ گہرے تعلقات قائم نہیں ہو سکے کہ انہیں میرے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوں، اس لیے مجھے امید ہے کہ ہم یہاں لمبے عرصے تک محفوظ رہ سکیں گے۔“

انہیں گاؤں آئے کئی ماہ ہو چکے تھے جب صوفیہ خاتون نے اپنی خاموشی توڑی اور سویرا کو اپنے مکمل حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کیوں شاہجہاں بیگم سے اتنی خوفزدہ ہیں اور کیوں اسے بالکل خاموشی سے یہاں رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اصل میں جوں جوں وقت گزر رہا تھا اور بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا تھا، سویرا کو اپنی ماں کی یاد شدت سے آنے لگی تھی لیکن صوفیہ خاتون اس بات کے حق میں نہیں تھیں کہ سویرا اپنی ماں سے رابطہ کرے۔ اس نے حد سے زیادہ ضد کی تو انہوں نے اسے سارے حالات سے آگاہ کر کے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا اور بولیں۔

”اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اپنی ہڑک مٹانے کے لیے اپنی ماں سے رابطہ کر لو یا اپنے بچے کی حفاظت کی خاطر اپنے دل پر صبر کی بھاری سل رکھ لو۔“ اور عورت تو ہمیشہ اپنی ممتا کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتی آئی ہے، سویرا نے بھی ماں کے لیے ہمکتے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ لی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت غور سے مالی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بانسوں کو ایک دوسرے کے اوپر ایسی ترتیب سے رکھ کر ان کے اتصال پر گانٹھ لگا رہا تھا کہ چوکور خانوں کا ایک جال سا تیار ہوتا جا رہا تھا۔ مالی پتا نہیں کس مقصد کے تحت بانسوں کا یہ جال سا بنا رہا تھا لیکن خود اس کے اپنے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا اور امید کی ایک کرن جاگی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یہ معمولی سی کرن بھی اس کے دل کو خوشی سے سرشار کر گئی تھی کیونکہ اس معمولی سی کرن کو جگمگانے میں بھی مہینوں لگ گئے تھے اور وہ حمل کے آٹھویں مہینے سے گزر رہی تھی۔ اس کی ڈاکٹر اس کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھی اور مستقل اس کی اور بچے کی صحت پر توجہ رکھے ہوئے تھی۔ غذا اور علاج کے ساتھ ساتھ کروائی جانے والی ورزشوں نے اسے عام حاملہ خواتین کی طرح سست اور کاہل نہیں بننے دیا تھا۔ وزن میں اضافے سے قدرتی طور پر کچھ فرق ضرور پڑا تھا لیکن بہرحال وہ چاق

وچوبند تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت پر ورزش کے علاوہ چہل قدمی بھی کرنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ جتنا خود کو ایکٹو رکھے گی اور چہل قدمی کا دورانیہ بڑھائے گی، اتنی ہی بچے کی پیدائش میں آسانی رہے گی۔ چہل قدمی کے لیے اسے گھر کے وسیع باغیچے میں تنہا گھومنے کی اجازت تھی، اس لیے وہ یہ کام بہت دل جمعی سے کرتی تھی۔ کیمروں کی زد سے باہر عادل کی نظروں سے دور کچھ وقت گزارنا اسے اچھا لگتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہاں سے فرار کی ترکیبیں بھی سوچتی رہتی تھی لیکن اجازت دینے والوں نے بھی اس لیے اجازت دی تھی کہ انہیں اپنے انتظامات پر بھروسا تھا۔ چار دیواری بہت اونچی تھی اور گیٹ پر چوبیس گھنٹے مسلح پہرے دار موجود رہتا تھا۔ نگرانی کے دو کتے بھی موجود تھے لیکن ان کتوں کو اس نے سب سے پہلے خود سے مانوس کر لیا تھا۔ وہ انہیں گوشت کے پارچے اور مخصوص بسکٹ کھانے کے لیے دیتی تھی، اس لیے وہ اس کے بہت اچھے دوست بن گئے تھے اور اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگتے تھے۔ فرار ناممکن دکھائی دینے کے باوجود وہ ممکنہ حد تک فرار کی تیاری کرتی رہی تھی۔ اب بھی اس نے مالی کو بانسوں کا جال بناتے ہوئے دیکھا اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اندر عادل ہنس ہنس کر اس کی امی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھا تو کسی بہت چاہنے والے شوہر کی طرح بے تکلفی سے بولا۔

”لو بھئی تم خود اپنی امی سے بات کر کے ان کی تسلی کروا دو کہ تم خیریت سے ہو اور میں جو ساری دنیا کے کام چھوڑ کر یہاں بیٹھا ہوا ہوں، تمہارا بہت خیال رکھ رہا ہوں۔“ یقیناً وہ جانتا تھا کہ یہ ڈائیلاگ فون کی دوسری طرف موجود اس کی امی بھی سن رہی ہیں۔ اس نے جواب میں بس ذرا تیز نظروں سے عادل کو گھورا اور پھر اس کے ہاتھ سے فون لے کر امی سے بات کرنے لگی۔ ان سے کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے ابو سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً لائن پر آ گئے۔

”ارے بھئی کہاں ہے وہ تمہارا معما! میں کب سے اسے حل کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔“ سلام دعا کے بعد انہوں نے خود ہی وہ ذکر چھیڑ دیا جسے چھیڑنے کے متعلق وہ سوچ رہی تھی چنانچہ فوراً ہی بولی۔

”اس بار معما ایک خواب کی شکل میں ہے ابو! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک سنہری پنجرے میں قید ہوں اور اس پنجرے کے تالے کی چابی آپ کے پاس ہے۔ آپ پنجرے کا تالا کھولتے ہیں تو میں کسی چڑیا کی طرح پُھر سے پنجرے سے اڑ جاتی ہوں اور کھلی فضاؤں میں چہچہاتی پھرتی ہوں۔“ بولتے ہوئے اس کی توجہ عادل پر بھی تھی جو اسے سخت نظروں سے گھور رہا تھا اور اشارے سے اس طرح کی گفتگو کرنے سے روک رہا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کر چکی تھی اس لیے خاموش ہو گئی۔ دوسری طرف ابو اس خواب پر الجھ گئے تھے۔

”چھوڑیں ابو! آپ بعد میں اس معمے کو حل کیجیے گا، ابھی تو مجھے یہ بتائیں کہ آپ لوگ نجیب چچا کی برسی میں شرکت کے لیے ابھی تک روانہ کیوں نہیں ہوئے ہیں۔ پرسوں ان کی برسی ہے اور ہر سال تو ہم لوگ دو دن پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اس سال بھی آپ سب کو اب تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا ورنہ چچی ناراض ہوں گی اور اپنے دل میں گمان کریں گی کہ بیٹی کو اونچے خاندان میں بیاہ کر آپ مغرور ہو گئے ہیں۔ کسی کو اس طرح کا گمان کرنے کا موقع دینا مناسب نہیں ہے ابو۔ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ آج ہی وہاں کے لیے روانہ ہو جائیں۔“ وہ بغیر رکے بولتی جا رہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ کہیں ابو درمیان میں اسے ٹوک نہ بیٹھیں اور اس کا پیغام ادھورا رہ جائے۔ پیغام ادھورا نہیں رہا تھا۔ کم از کم ابو نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ انہیں اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے چنانچہ انہوں نے سوال نہیں کیا تھا اور نہایت متانت سے بولے تھے۔

”تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہاری امی سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔“

”بات کیا کرنی ہے ابو! بس انہیں تیاری کا کہہ دیں۔ امی کب آپ کی بات ماننے سے انکار کرتی ہیں اور یہ تو ایک طے شدہ بات ہے کہ ہماری فیملی ہر سال چچا کی برسی میں شرکت کرنے ان کے گھر جاتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ نجیب نام کے اس کے کوئی چچا تھے ہی نہیں تو ہر سال ان کی برسی میں جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا لیکن ابو نے نہایت سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایک بھی سوال نہیں اٹھایا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ معما اس نے اب ان کے سامنے رکھا تھا۔ وہ فون بند کرنے کے بعد اس معمے پر غور کرتے تو اس بات کو سمجھ جاتے کہ ان کا اہلِ خانہ سمیت آج کی تاریخ میں گھر چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام پر چلے جانا ازحد ضروری ہے اور اسی عمل میں اس کی بقا پوشیدہ ہے۔ وہ بہت پُرامید تھی کہ ابو اس کے لیے لاکھ پریشان ہونے کے باوجود اس کے اس پیغام پر ضرور عمل

کریں گے چنانچہ اس گفتگو کے بعد ان سے چند ایک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

”یہ نجیب چچا کون ہیں؟ تم نے کبھی مجھ سے اپنے ان چچا کا ذکر تو نہیں کیا؟“ حسبِ توقع فون بند ہوتے ہی عادل نے اس سے تفتیش شروع کر دی۔

”نجیب چچا میرے چچا ہیں۔ رہی ان کا ذکر نہ کرنے کی بات تو ان کے علاوہ میرے ایک ماموں اور دو پھپھیاں بھی مرحومین میں شامل ہیں اور میں نے ان کا بھی کبھی تم سے ذکر نہیں کیا۔ اگر تم کہو تو میں دادا دادی اور نانا نانی سے لے کر اب تک کے تمام مرحومین کی لسٹ تمہیں تھما دوں۔“

اس نے تلخی سے عادل کو جواب دیا تو وہ خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر نے حال ہی میں اسے نصیحت کی تھی کہ وہ اسے اعصابی دباؤ سے دور رکھنے کی کوشش کرے تاکہ وہ منفی اثرات سے محفوظ رہے۔ ڈاکٹر کی عادل کو کی جانے والی اس نصیحت کے پیچھے بھی وہ خود ہی تھی۔ اسی نے ڈاکٹر کو یہ باور کروایا تھا کہ عادل کی ہمہ وقت اپنے ارد گرد موجودگی اسے ناگوار گزرتی ہے اور وہ پے تک ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر نے اس پر بہت محنت کی تھی اور بہترین نتائج پر بہترین انعام کی امیدوار تھی، اس لیے اس نے دبے الفاظ میں ہی سہی عادل کو اس سے دور رہنے کی ہدایت دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اب بھی عادل اسے میکے میں معمول کی ٹیلیفونک گفتگو کروانے کے بعد اس کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور اس نے سچ مچ اپنے اعصاب پر سے دباؤ کم ہوتا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آئی اور کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ روشنی بہت کم تھی لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ مالی کا تیار کردہ وہ بانسوں کا جال عقبی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ وہ جال اور عقبی دیوار سے ذرا پرے بہتی نہر اس کی امیدوں کا مرکز تھی۔ نیم تاریکی میں ان دونوں چیزوں کو باری باری دیکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں پوری شدت سے دعا مانگ رہی تھی کہ ابو نے اس کے پیغام کو سمجھ کر فوری طور پر گھر چھوڑ دیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ ابو بہت معاملہ فہم آدمی ہیں انہوں نے اس کے خواب اور نجیب چچا والے قصے سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ ان سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے پنجرے میں قید ہونے کا ذکر کرتے ہوئے تالے کی چابی ان کے ہاتھ میں ہونے کا ذکر کیا تھا اور انہیں سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ جن پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے، اس کی اصل وجہ اس کے گھر والے ہیں۔ اگر وہ لوگ اس کی ہدایت کے مطابق منظر سے غائب ہو جاتے تو اس کے پیروں میں پڑی بیڑیاں ٹوٹ جاتیں اور اس کے پنجرے کا تالا کھل جاتا۔

”مجھے آپ کا چیک اپ کرنا ہے مسز عادل!“ وہ جانے کب تک اسی طرح کھڑکی میں کھڑی رہتی۔ دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہونے والی ڈاکٹر اس سے مخاطب ہوئی تو مجبوراً اسے کھڑکی سے ہٹنا پڑا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ کوئی معمولی ڈاکٹر نہیں تھی، بہت قابل اور فارن کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھی اور بہت خطیر رقم کے عوض اسے اس کام کے لیے ہائر کیا گیا تھا۔ اس نے ایک بار گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ رقم کے علاوہ اس کی دلچسپی اس تجربے میں بھی تھی جو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ وہ بیرونِ ملک قیام کے دنوں میں ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ اس طرح کے دو تین تجربات میں حصہ لے چکی تھی لیکن انفرادی طور پر صرف اپنی ذاتی قابلیت کی بنیاد پر اس کا پہلا تجربہ تھا اور اسے اس کی کامیابی کی بہت فکر تھی۔

”آپ کا بلڈ پریشر معمولی سا بڑھا ہوا ہے مسز عادل!“ معائنہ مکمل کرنے کے بعد اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ہاں شاید میں ڈپریشن کا شکار ہوں۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا ہے مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے بہانہ بنایا ورنہ وہ سمجھ سکتی تھی کہ بلڈ پریشر میں یہ معمولی سا اضافہ اس جوش کی وجہ سے ہے جو یہاں سے فرار کی امید پا کر اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔

”پہلی بار میں ہر عورت تھوڑا سا خوف محسوس کرتی ہے لیکن آپ کو بالکل خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسز عادل! آپ کا کیس بہت ماہر ہاتھوں میں ہے اور میں ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کی تیاری کر چکی ہوں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ آپ کے ہاں نارمل ڈلیوری ہی ہوگی لیکن اس کے باوجود یہاں سیزر کا بھی مکمل انتظام کر لیا گیا ہے۔ میری درخواست پر معاون اسٹاف کو بھی دو دن بعد یہاں بھیجا جا رہا ہے۔ کہیں کوئی پیچیدگی، کوئی مسئلہ نہ ہونے کے باوجود ہر طرح کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کی تیاری کر لی گئی ہے اور اتنے مکمل انتظامات کے بعد آپ کو بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا کوئی بھی منفی جذبہ بچے کی صحت پر برا اثر ڈال سکتا ہے۔“ ڈاکٹر اسے سمجھانے لگی تو اس نے یوں مسکرا کر سر ہلایا جیسے اسے کافی تسلی ہوئی ہو۔

”فی الحال میں بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے

ایک لائٹ سی میڈیسن دے دیتی ہوں۔ امید ہے صبح میں ... چیک اپ کروں گی تو آپ کا بی پی نارمل ہوگا۔“ ڈاکٹر نے اس سے کہا اور اپنی نگرانی میں اسے دوا کھلائی۔

”رات کو سوتے میں کبھی کبھی میرا دم گھٹنے لگتا ہے ڈاکٹر اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی کھلی جگہ پر چلی جاؤں۔ ایسے میں نیند بھی اڑ جاتی ہے۔“ اس نے ان سے شکایت کی۔

”کبھی کبھی دورانِ حمل اس طرح کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کھلی فضا میں جانے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ آپ بھی ایسی کیفیت محسوس کریں تو باہر چلی جایا کریں۔ اس سلسلے میں آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔“

ڈاکٹر کے الفاظ نے اسے پُرسکون کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنے انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے سبب اسے اس چار دیواری میں گھومنے پھرنے کی آزادی دی گئی تھی لیکن اس کے کمرے میں موجود کیمرے چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ ایسے میں اگر وہ خلافِ معمول رات کو کمرے سے نکل کر باہر جاتی تو یہ ایک چونکا دینے والی بات ہوتی۔ اب ڈاکٹر کے سامنے اس سلسلے میں بات ہو گئی تھی تو کسی کے تشویش میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ کمرے میں ہی تھوڑی دیر چہل قدمی کرتی رہی پھر سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔ سونے کا کوئی سوال نہیں تھا لیکن پورے دو گھنٹے تک وہ یہ ظاہر کرتی رہی کہ گہری نیند سو رہی ہے۔ دو گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر بستر پر بیٹھ کر یوں ظاہر کرتی رہی جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ کچھ دیر کی اس اداکاری کے بعد وہ بستر سے اتری اور پیروں میں سلیپر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی اور اس کے جسم پر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ ایسے میں اگر کوئی اسے دیکھ بھی رہا تھا تو یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔

باہر نکلنے کے بعد وہ ٹہلنے کے انداز میں عقبی حصے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ نگرانی کے کتے کھلے ہوئے تھے جو اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں بھونکے اور آگے نکل گئے۔ وہ چلتی ہوئی عقبی دیوار کے ساتھ لگے بانسوں کے جال تک پہنچی۔ وہ کافی بڑا تھا اور دیوار کی اونچائی سے بس ذرا ہی چھوٹا تھا۔ مالی شاید اسے مزید بڑا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے اب بھی کئی بانس وہاں پڑے ہوئے تھے۔ اسے اطمینان تھا کہ کھلے حصے میں نگرانی کے کیمرے موجود نہیں ہیں اور پہریدار بھی سامنے گیٹ تک ہی محدود رہتا ہے اس لیے ایک نظر اطراف میں ڈال کر اپنا اطمینان کر لینے کے بعد بانسوں کے ڈھیر میں سے ایک بانس اٹھایا اور بانسوں سے بنے جال کے ایک خانے پر پیر رکھ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے وزن سے کوئی بانس ٹوٹ بھی سکتا ہے اس لیے ہاتھ میں پکڑے بانس کو زمین پر لگا کر اپنے وزن کا کافی حصہ اس پر منتقل کیے ہوئے تھی۔

حمل کے آٹھویں مہینے میں اس طرح کا پُرمشقت تجربہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن آزادی کی شدید خواہش نے اس کے اندر بے انتہا جوش اور جنون پیدا کر دیا تھا اور جن کے اندر جذبہ جنون ہو ان کی ہمت بھی انتہا پر ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی زندگی کی قیمت پر یہ بازی کھیل رہی ہے پھر بھی اس بازی کو کھیلنے سے باز نہ رہ پائی تھی۔ اتنے عرصے میں اسے یہ پہلا موقع ملا تھا اور وہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس کے بعد اسے کوئی دوسرا موقع بھی مل سکے گا اس لیے پوری استقامت سے جدوجہد میں جت گئی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اس کوشش میں بھلے سے اس کی جان چلی جائے لیکن وہ عادل اور اس کی ماں کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اس کی موت یا گمشدگی دونوں ہی ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بن سکتی تھیں اور وہ ایسے سفاک لوگوں کی زندگی میں مسئلہ پیدا کر کے سکون محسوس کرتی۔ جال کے ایک ایک خانے پر پاؤں جما کر اوپر چڑھتی وہ مسلسل اسی طرح کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اس کا جنون اس کی مشکل کو آسان بنا رہا تھا جس وقت اس کی انگلیوں نے دیوار کے کناروں کو چھوا اس نے اپنے پورے جسم میں سنسنی پھیلتی ہوئی محسوس کی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھی تو یہ سنسنی اپنے عروج پر تھی۔ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اس نے بانسوں کے اس جال کو اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ جال زیادہ بھاری نہیں تھا لیکن اسے اپنی حالت کی وجہ سے اسے اوپر کھینچنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ دانت پر دانت جمائے اس عمل کو انجام دیتی وہ کھلی ہوا میں ہونے کے باوجود پسینے سے تربتر ہو گئی لیکن ہمت نہیں ہاری اور اسے اوپر کھینچنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ سہارے کے لیے لیا ہوا بانس وہ دیوار پر چڑھتے وقت دیوار کے ساتھ لگا کر چھوڑ چکی تھی۔ جال کو اوپر کھینچنے کے بعد اسے دیوار کی دوسری طرف ترچھے زاویے سے کھڑا کیا اور جس ترکیب سے اوپر چڑھی تھی، اسی ترکیب سے نیچے اترنے لگی۔

چڑھنے کے مقابلے میں اترنے کا عمل نسبتاً آسان

ثابت ہوا تھا۔ اس کے پیروں نے زمین کو چھوا تو اس نے اپنے دل میں ایسی خوشی محسوس کی جیسے اس کے پَر نکل آئے ہوں اور وہ آسمان پر اڑ رہی ہو۔ دو تین منٹ وہیں بیٹھ کر اپنی سانس ہموار کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور بانسوں کے جال کو گھسیٹتی ہوئی نہر کی طرف بڑھنے لگی۔ زمین نرم تھی اس لیے گھسیٹنے سے زیادہ آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ نہر کی طرف سے چلتی ٹھنڈی ہوا نے اس کا پسینا بھی سکھانا شروع کر دیا تھا لیکن اس کا دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جو مرحلہ طے کر آئی تھی، اب اس سے بھی زیادہ خطرناک مرحلہ درپیش تھا۔ چاند کی معمولی سی روشنی میں اس نے نہر تک کا مختصر فاصلہ طے کیا اور بانسوں کا جال پانی میں ڈالا۔ ہلکے وزن کے اس جال کو سطح آب پر تیرتا دیکھ کر اسے خوشی ہوئی اور وہ خود اس جال پر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ ایک پُرخطر مرحلہ تھا لیکن اسے اس مرحلے سے ہر حال میں گزرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا غیاب بہت دیر تک چھپا نہیں رہے گا اور خشکی کے راستے یہاں سے نکلنے کی کوشش میں وہ جلد ہی پکڑی جائے گی کیونکہ اس وقت اسے کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اور اس حالت میں وہ زیادہ دیر تک بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اسے بس یہی امید تھی کہ اگر وہ ہمت کر کے نہر میں اتر جائے تو پانی اسے یہاں سے دور لے جا سکتا ہے۔ بانسوں کے جال پر اس طرح پانی میں سفر کرنے کی تکنیک اس نے وائلڈ لائف کے کسی پروگرام میں دیکھی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کتنی کامیاب رہے گی، بس جان کی بازی لگانے کا حوصلہ تھا جو اس سے سب کچھ کروا رہا تھا۔

کنارے پر ذرا کم گہرے پانی میں اتر کر اس نے جال پر سوار ہونے کی کوشش کی تو اس کے وزن سے جال بری طرح ڈول گیا اور ساتھ ہی اس کا دل بھی اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جان کی بازی لگانے کا حوصلہ رکھنا الگ بات تھی اور جان جاتی نظر آنے پر فطری ردعمل پر قابو پانا الگ بات۔ اس کا دل بھی خوف سے بے تحاشا لرز رہا تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور دوبارہ کوشش کی۔ چوتھی کوشش میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔ بانسوں کے جال پر توازن سے بیٹھنے میں کامیاب ہو کر وہ ایسے خوش تھی جیسے کسی بڑی سلطنت کے تخت پر براجمان ہونے کا موقع مل گیا ہو۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ جال اس سمیت حرکت میں آیا تو اس کا دل چاہا وہ کسی بچے کی طرح تالیاں بجا کر قہقہے لگائے لیکن وہ جانتی تھی کہ اب بھی وہ خطرے میں ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ جال الٹ جاتا تو وہ پانی میں گر جاتی اور اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ وہ سراپا دعا بنی سیاہ آسمان پر چمکتے چاند ستاروں کو تکتی دل کی گہرائی سے ان کے اور اپنے خالق سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ چاند ستارے بھی اسے حیرت سے تک رہے تھے کہ یہ کون ہے جو ایک عام سی عورت ہو کر بھی اتنی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کی دعاؤں کے ساتھ اس کے حوصلے کے گواہ چاند ستاروں کی سفارش بھی شامل ہو کر ربِ کائنات کے حضور پہنچ گئی تھی۔ کائنات کے عوامل ظلم و جبر کے خلاف برسرِپیکار اس معمولی لڑکی کے حامی بن گئے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ خالق کی رحمت اپنی مخلوق کے لیے جوش میں نہ آتی۔ اس رحمت نے ایک خوش گوار اتفاق بن کر اسے دھکیل کر سرداراں کے پنڈ تک پہنچا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے، بس یہ اندازہ تھا کہ وہ اس جگہ سے بہت دور نکل چکی ہے جہاں عادل نے اسے ایک پُرتعیش قید خانے میں رکھا ہوا تھا۔

دوبارہ خشکی پر قدم رکھنے پر وہ وہیں اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئی اور اس کی آنکھوں سے ڈھیروں آنسو بہہ نکلے۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ جس رب نے اسے اتنی کامیابی عطا کی ہے، وہ آگے بھی اس کا ساتھ دے گا۔ اللہ کے ساتھ کا یقین دل میں لیے وہ ایک بار پھر ہمت کر کے کھڑی ہوئی اور اپنے شل ہوتے ہوئے جسم کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا لباس مکمل طور پر بھیگ کر اس کے جسم سے چپک چکا تھا اور سردی نہ ہونے کے باوجود رات کی خوش گوار ہوا جسم سے ٹکرانے پر وہ کپکپاہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ سرداراں کا گھر اس کے لیے گھور اندھیرے میں مشعل کی طرح ثابت ہوا۔ اس نے پوری ہمت سے اس گھر تک کا درمیانی فاصلہ طے کیا اور لکڑی کے دروازے پر زوردار دستک دینے کے بعد زمین پر ڈھے گئی۔ اب تک کی جدوجہد میں وہ اپنے جسم کی ساری طاقت استعمال کر چکی تھی اور اب اسے سہارے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

سرداراں نے آنکھیں میچ کر اپنی دلیز پر پڑی اس بھیگی ہوئی مخلوق کو دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ عجیب ہی اتفاق تھا کہ پانی نے زندہ عورتیں اگل کر اس کے سامنے پھینکنا شروع کر دی تھیں۔ کئی ماہ پہلے ڈاکٹر رفعت اسی طرح اس کے سامنے پہنچی تھیں اور گاؤں کے لیے ایک رحمت ثابت ہوئی تھیں۔ کیا پتا اب بھی رب نے اپنی رحمت ہی بھیجی ہو۔ اس

کے دل میں خیال آیا اور اپنی بہو کو آواز دیتے ہوئے وہ دلیز پر ڈھیر کی صورت میں پڑی اس جوان العمر عورت کو سنبھالنے لگی جس کی جسمانی حالت اس کے حاملہ ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ بہو آئی تو دونوں عورتوں نے مل کر اسے اندر چارپائی تک پہنچایا۔ گھر کا واحد مرد، سرداراں کا بیٹا بھی جاگ چکا تھا۔ سرداراں نے اسے ڈاکٹر رفعت کی طرف دوڑایا اور خود اپنے تجربے کی بنیاد پر اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر رفعت کی آمد تک دونوں ساس بہو اس کا لباس تبدیل کر چکی تھیں اور ہاتھ پاؤں سہلا کر اس کے جسم کی گرمی واپس لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر رفعت آئیں تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک گئیں۔

”عروسہ......“ بے ساختہ ہی ان کے لبوں نے اس کا نام پکارا اور وہ اس پر جھک گئیں۔ وہ پیاری سی لڑکی انہیں بھولی نہیں تھی جس نے ایک بار ان کی جان بچائی تھی اور بہت محبت سے انہیں اپنی شادی میں مدعو کیا تھا۔ اس کی شادی کا کارڈ دیکھ کر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وہ پیاری لڑکی غلط جگہ پھنسنے والی تھی اور اسے بچانے کے لیے ہی وہ اس روز گھر سے نکلی تھیں تو خود ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد کے حالات ایسے ہو گئے کہ وہ عروسہ کے لیے کچھ نہیں کر سکیں۔ اخبارات کے ذریعے انہیں اس کی شادی اور بیرونِ ملک روانگی کی خبریں مل گئی تھیں اور وہ کفِ افسوس ملتی رہ گئی تھیں کہ عروسہ کے لیے کچھ نہیں کر سکیں۔ انہیں امید بھی نہیں تھی کہ وہ عروسہ کو اس حالت میں اور اس جگہ دیکھیں گی۔ وہ بہت جانفشانی سے اسے طبی امداد دینے لگیں، کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ وہ صرف ذہنی دباؤ کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی۔ ان کی تھوڑی سی کوشش سے ہوش میں آ گئی۔ ہوش میں آنے پر اس کی نظر ڈاکٹر رفعت کے چہرے پر پڑی تو بری طرح چونک گئی اور حیرت سے لبریز لہجے میں بولی۔

”آپ ...... ڈاکٹر رفعت آپ ...... آپ زندہ ہیں؟“ اس کے الفاظ کسی چابک کی طرح ڈاکٹر رفعت کو لگے۔ وہ کیوں ان کے زندہ ہونے پر حیران تھی؟ اس سوال نے انہیں الجھا دیا اور انہیں لگا کہ ان پر کوئی انکشاف ہونے والا ہے۔ انہوں نے فوری طور پر عروسہ کو کوئی جواب نہیں دیا اور سرداراں کی طرف رخ کر کے اس سے مخاطب ہوئیں۔

”یہ لڑکی میری جاننے والی ہے سرداراں۔ اپنے بیٹے سے کہو وہ ہم دونوں کو میرے گھر پر چھوڑ آئے اور خیال رکھنا کہ تم میں سے کسی کی زبان پر اس لڑکی کی یہاں موجودگی کا ذکر نہ آئے۔ میری اگلی ہدایت تک تم بھول جانا کہ کوئی لڑکی اس طرح تم لوگوں تک پہنچی تھی۔“ سرداراں کا بیٹا راستے میں بتا چکا تھا کہ عروسہ کس حال میں ان کے گھر تک پہنچی تھی اس لیے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عروسہ غیر معمولی حالات کا شکار ہے اور ان حالات میں رازداری سب سے مناسب بات تھی اس لیے قدرے رعب سے سرداراں کو اس سلسلے میں حکم دیا تھا۔

”تسی فکر ہی نہ کرو ڈاکٹرنی صاحبہ! تسی جاندے ہو سرداراں نے پہلے بھی کبھی زبان نہیں کھولی۔“ وہ انہیں ان کی آمد کا واقعہ یاد دلا رہی تھی۔ واقعی اس نے ان کی ہدایت پر کسی کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی تھیں۔ اس کی بات سن کر انہوں نے سر کو معمولی سی جنبش دی اور عروسہ سمیت وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ان کے ساتھ بیل گاڑی پر سوار ان کی رہائش گاہ کی طرف جاتی عروسہ حیران تھی کہ یہ لندن پلٹ ڈاکٹر... ایسے گاؤں میں کیا کر رہی ہے جہاں اسے بیل گاڑی پر سفر کرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

عروسہ کا غیاب چند گھنٹوں سے زیادہ چھپا نہیں رہ سکا تھا اور صبح جب ڈاکٹر حسبِ معمول اس کا معائنہ کرنے اس کے کمرے میں گئی تھی تو اسے غیر موجود پا کر حیران رہ گئی تھی۔ تشویش بہرحال اسے نہیں تھی اور اس نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ باہر تازہ ہوا میں ہو گی۔ ملازمہ کو اسے دیکھنے کے لیے بھیجا گیا تو وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد ہر طرف اس کی ڈھنڈیا مچ گئی اور انکشاف ہوا کہ وہ پورے گھر میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے کمرے میں جو کیمرے لگے تھے رات کے وقت ان کی باقاعدگی سے مانیٹرنگ کا سلسلہ کافی دنوں سے موقوف تھا۔ اتنے دنوں میں تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ہار مان چکی ہے۔ کچھ اس کی حالت کے پیشِ نظر بھی اس سے فرار کا خطرہ نہیں رہا تھا اس لیے نگرانی کے عمل میں کچھ نرمی آ گئی تھی، البتہ اسے یہی تاثر دیا جاتا رہا تھا کہ اس کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے۔ کیمروں کی ریکارڈنگ سے انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ رات کو کس وقت اپنے کمرے سے نکل کر باہر گئی تھی اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے انداز سے بالکل ظاہر نہیں تھا کہ وہ یہاں سے فرار کے لیے باہر نکل رہی ہے۔ اس کے فرار کی راہ کا بھی تعین نہیں کیا جا سکا تھا۔ گیٹ پر موجود پہریدار قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ رات بھر بنا پلک جھپکائے اپنی ڈیوٹی کرتا رہا ہے۔ گیٹ پر لگے کیمرے نے بھی اس کے بیان کی گواہی دی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی اونچی دیواریں پھلانگ کر باہر گئی ہو گی تو کیسے! گنتی کے جو چند ملازم وہاں موجود تھے ان کی شامت آ گئی

تھی اور دھمکیاں دی جارہی تھیں کہ اگر کسی نے اسے فرار میں مدد دی تھی تو اس کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ ایسے میں دینو مالی جو اپنا بنایا بانسوں کا جال غائب دیکھ کر کافی حد تک کہانی سمجھ گیا تھا، چپ سادھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سانپ کے نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے والے ذرا سا شک ہونے پر ملبہ اسی پر گرادیں گے۔ اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بہانے اس نے دیوار کے پاس سے ان نشانات کو بھی برابر کردیا جو عروسہ کے فرار کا ایک ثبوت تھے۔ تلاش کا کام کرنے والوں نے بھی اندر سے زیادہ باہر توجہ دینی مناسب سمجھی تاکہ عروسہ کو زیادہ دور نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔ قدرتی طور پر ان کی توجہ نقل و حمل کے عام راستوں کی طرف تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ نہر کے ذریعے فرار ہوئی ہے۔

عادل کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ گاؤں سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئی ہے تو آس پاس کے کسی گاؤں دیہات میں بھی موجود ہوسکتی ہے۔ اس کے شہر پہنچ جانے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا گیا تھا۔ عادل نے بہانے سے عروسہ کے والد سے بھی فون پر بات کی تھی اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی برسی میں شرکت کے لیے اس کے گھر جاچکے ہیں۔ وہ عروسہ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن عادل نے اس کے سوئے ہوئے ہونے کا بہانہ بنادیا تھا۔ واقعے کی اطلاع اس نے اپنی ماں شاہجہاں بیگم کو بھی دے دی تھی اور وہ کسی زخمی ناگن کی طرح بل کھارہی تھیں۔ انہوں نے عادل کو بھی سخت باتیں سنائی تھیں جو ایک عورت کو نہیں سنبھال سکا تھا۔ اصل میں تو عادل ان کے احکامات ہی پر عمل کرتا تھا اور خود اتنا ذہین نہیں تھا کہ کسی معاملے میں لمبی چوڑی پلاننگ کرسکے یا معمولی باتوں سے نتائج اخذ کرسکے۔ شاہجہاں بیگم البتہ خطرناک حد تک ذہین تھیں اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر خراب سے خراب صورت حال کو بھی اپنے حق میں کرنا جانتی تھیں۔ یہ ان کی ذہانت ہی تھی کہ وہ ہر دفعہ حکومت میں کوئی نہ کوئی وزارت حاصل کرنے میں کامیاب رہتی تھیں اور اب وزیر داخلہ کی اہم پوسٹ کے لیے ان کا انتخاب ہونے کے امکانات بے حد روشن تھے۔ ایسے حالات میں پیدا ہونے والے اس مسئلے نے انہیں شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ اگر عروسہ کسی میڈیا پرسن تک پہنچ گئی تو ان کے سیاسی کیریئر کے لیے یہ بہت ہی خطرناک ہوگا۔ وہ اونچے خاندان کی فرد تھیں اور ہمیشہ تکبر سے گردن اکڑا کر رہتی تھیں۔ وہ برداشت نہیں کرسکتی تھیں کہ یہ معاملہ کھلے اور ان کا نام عوام کے سامنے اچھلے اس لیے انہوں نے عادل کو ہر ممکن طریقے سے عروسہ کو تلاش کروانے کا حکم دیا۔ اس حکم میں سرفہرست ملازمین سے سختی سے باز پرس کرنے کا حکم تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں تمام ملازمین پر بے تحاشا تشدد کیا گیا۔ تشدد سہنے والوں میں مالی بھی شامل تھا لیکن اس نے اب زبان کھولنے کو اپنے لیے اور بھی خطرناک جانا۔ وہ اپنے مالکوں کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اگر اب اس نے سچ بولا تو سزا صرف اسے ہی نہیں اس کے پورے خاندان کو دی جائے گی۔ وہ عروسہ کو فرار کروانے میں شریک نہیں تھا لیکن اس کے فرار کی راہ ہموار کرنے میں انجانے میں ہی سہی، بڑا اہم کردار ادا کرچکا تھا۔

پورا دن گزر جانے کے بعد جب کہیں سے عروسہ کی کوئی خبر نہیں ملی تو شاہجہاں بیگم خود گاؤں پہنچ گئیں۔ انہوں نے عادل اور لیڈی ڈاکٹر سے پچھلے دو چار دن کی ہر بات کرید کرید کر پوچھی اور اندازہ لگالیا کہ عروسہ فرار کے متعلق سوچ رہی تھی اسی لیے اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے والد کو ایک پیغام دے دیا تھا۔ اپنے گھر والوں کو منظر سے غائب کروا کر اس نے اپنی سب سے بڑی کمزوری دور کردی تھی۔ ان کے اس اندازے کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب عادل کی ان کو آخری بار کی جانے والی کال کے بعد عروسہ کے گھر والوں کے زیر استعمال رہنے والے سارے نمبرز بند ملے۔ گاؤں میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے عروسہ کے چند رشتے داروں سے معلومات کروائیں تو یہ بات بھی سامنے آگئی کہ اس کے نجیب نامی کوئی چچا نہیں ہیں۔ وہ لڑکی جس کا انہوں نے اپنے تئیں بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا ایسے وقت میں انہیں چکمادے گئی تھی جب اس سے ایسی امید ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف انہیں سویرا نے بھی چوٹ دی تھی۔ وہ اور صوفیہ مسلسل غائب تھیں۔ انہوں نے سویرا کی ماں سے اس کا پتا معلوم کرنے کے لیے اس غریب کی چمڑی ادھڑوادی تھی اور وہ جان سے چلی گئی تھی لیکن انہیں سویرا کا پتا نہیں دے سکی تھی۔ اب تک ان دونوں کی تلاش میں کی جانے والی ان کی ہر کوشش ناکام رہی تھی اور اب یہ دوسرا اس سے بھی بڑا مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ دو ماہ بعد ہونے والے قومی انتخابات کے سلسلے میں بھی بے حد مصروف تھیں اور انہیں احتیاط کرنی تھی کہ ان کے کسی ذاتی مسئلے کی ان کے مخالفین کو ہوا نہ لگ سکے۔ سویرا والے معاملے سے زیادہ عروسہ کا معاملہ نازک تھا چنانچہ اس کی تلاش میں ان کی طرف سے تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ

احتیاط سے بھی کام لیا جارہا تھا۔ ان کے آدمی عروسہ کی تصویریں لیے جگہ جگہ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جلد عروسہ کو کسی ڈاکٹر کی ضرورت پیش آنے والی ہے اس لیے اسپتالوں اور کلینکوں کے ساتھ ساتھ نجی طور پر یہ کام کرنے والوں سے بھی خاص طور پر رابطے کیے جارہے تھے۔ ایک آدمی ڈاکٹر رفعت کے اسپتال میں بھی پہنچا تھا اور انہیں اس کی تصویر دکھا کر ان سے کہا تھا کہ اگر اس تصویر میں موجود عورت ان کے پاس آئی ہو یا آئندہ کبھی آئے تو ضرور اطلاع دی جائے۔ اطلاع دینے کے لیے وہ ایک فون نمبر چھوڑ کر گیا تھا اور اطلاع دینے کی صورت میں بہت بڑے انعام کا لالچ بھی تھا۔ اس آدمی کی آمد پر ڈاکٹر رفعت نے شکر ادا کیا تھا کہ انہوں نے عروسہ کی موجودگی کو چھپانے کا پہلے ہی انتظام کرلیا تھا اور سرداراں کے گھر والوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ ان کے گھر میں رہ رہی ہے۔ شاہجہاں بیگم نے عروسہ کی فیملی کو ٹریس کرنے کی بھی کافی کوشش کی تھی۔ اس کے بھائی کی تصویر مخبوط الحواس گمشدہ بچے کے طور پر اخبارات میں چھپوانے اور ٹی وی پر چلانے کا انتظام کردیا تھا پھر بھی کامیابی کی رپورٹ نہیں ملی تھی۔ وہ سارے لوگ جنہیں وہ اپنی نظروں اور نگرانی میں رکھنا چاہتی تھیں، ایک ایک کرکے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوگئے تھے اور دوسری طرف انتخابی سرگرمیاں بھی ان کی توجہ کی متقاضی تھیں۔ ناچار انہیں ان سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا لیکن وہ ان لوگوں کی تلاش سے بھی مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوئی تھیں۔

☆☆☆

عروسہ کو ڈاکٹر رفعت کے ساتھ رہتے ہوئے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ وہاں اپنی آمد کے بعد اس نے سب سے پہلا کام اپنے والد سے رابطہ کرنے کا کیا تھا اور یہ جان کر مطمئن ہوگئی تھی کہ انہوں نے کافی حد تک اس کا پیغام سمجھتے ہوئے اپنا گھر اور شہر چھوڑ دیا تھا۔ عروسہ کے لیے ساری تفصیلات اپنے والد کے گوش گزار کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اس نے انہیں اتنی بات سمجھادی تھی کہ اس کی شادی بہت بڑا دھوکا تھی اور اس شادی نے اسے ایک عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ شاہجہاں بیگم اور عادل نے اس کے خاندان کو اس کی کمزوری بنایا ہوا تھا اور وہ ملک میں رہتے ہوئے بھی ان لوگوں سے دور رہنے اور جھوٹ بولنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے والد کو سارے زیر استعمال نمبرز فوری طور پر بند کردینے کی تلقین کی تھی اور احتیاطاً انہیں بھی

نہیں بتایا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس دن کے بعد سے اس کا دوسرے نمبرز پر اپنے گھر والوں سے رابطہ رہنے لگا تھا اور وہ انہیں تسلیاں دیتی رہتی تھی کہ جلد وہ ان مشکل حالات سے نکل آئے گی اور اس سلسلے میں اس کی ساری امیدیں ڈاکٹر رفعت کے تعاون سے جڑی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں جب ایک دوسرے سے ملی تھیں اور اپنی اپنی کہانیاں سنائی تھیں تو بہت سے بھید کھل گئے تھے اور بہت سی چالیں سامنے آ گئی تھیں۔ ڈاکٹر رفعت کو اب بھی اپنے کیریئر کا وہ ابتدائی زمانہ یاد تھا جب ان کے بھائیوں نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ایک بہت مشہور اور قابل لیڈی ڈاکٹر کو اسسٹ کر رہی تھیں۔ اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس شاہجہاں بیگم کا کیس بھی تھا اور ان کے عدت میں ہونے کی وجہ سے وہ رفعت کے ساتھ شاہجہاں بیگم کی حویلی جا کر ہی ان کا معائنہ کیا کرتی تھی۔ اب یہ اتفاق تھا کہ آخری دنوں میں اچانک لیڈی ڈاکٹر کی والدہ فوت ہو گئیں اور اسے فوری طور پر ان کے جنازے میں شرکت کے لیے اپنے آبائی شہر روانہ ہونا پڑا۔ خلافِ امید عین اسی رات شاہجہاں بیگم کی طبیعت بھی خراب ہو گئی اور ڈاکٹر رفعت کو ہی کیس نمٹانے حویلی جانا پڑا۔ وہ جونیئر تھیں لیکن اس اعتبار سے کسی دوسرے سینئر ڈاکٹر سے بہتر تھیں کہ وہ شروع سے شاہجہاں بیگم کا کیس دیکھ رہی تھیں۔ کسی سینئر ڈاکٹر سے رابطہ کرنے کی مہلت بھی نہیں تھی اس لیے رفعت نے ہی شاہجہاں بیگم کی تمام تر ناگواری کے باوجود ان کا کیس نمٹایا لیکن نومولود دنیا میں آتے ہی خود دم بخود رہ گئیں۔ کچھ ماہ پہلے اپنے شوہر کی موت کا صدمہ سہنے والی شاہجہاں بیگم کو یہ خبر سنانا بہت مشکل تھا کہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ ایک نامکمل ہستی ہے اور ان لوگوں میں شمار ہوتا ہے جسے تیسری صنف کہا جاتا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دورانِ حمل بچے کی پوزیشن ایسی رہی تھی کہ الٹراساؤنڈ کے باوجود اس کی صنف کا تعین نہیں کیا جا سکا تھا۔ انہوں نے بہت خاموشی سے بچے کو کمبل میں لپیٹ کر شاہجہاں بیگم کی ملازمۂ خاص کے حوالے کر دیا تھا اور خود اپنے فرائض انجام دینے لگی تھیں۔ بعد میں ملازمۂ خاص نے ہی شاہجہاں بیگم کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا جنہوں نے اتنے نازک لمحات میں بھی اپنے آہنی اعصاب کی مالک ہونے کا ثبوت دیا تھا اور ڈاکٹر رفعت کو اس سچ کو راز میں رکھنے کی قیمت کے طور پر بیرونِ ملک تعلیم دلوانے کی پیشکش کر دی تھی۔ شاہجہاں کا راز کھولنے میں رفعت کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے ان کی پیشکش فوراً شرائط سمیت قبول کر لیں۔ گھر والوں کے رویے سے مایوسی کی وجہ سے اس وقت انہیں شاہجہاں بیگم کی کوئی شرط کڑی نہیں لگی تھی۔

عروسہ عادل کی زبانی کسی حد تک اس بات سے واقف تھی، بس اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ عادل کو دنیا میں لانے میں مدد دینے والے ہاتھ ڈاکٹر رفعت کے تھے۔ اس نے ہی انہیں عادل کی زبانی سنے باقی واقعات سے آگاہ کیا تھا۔ شاہجہاں بیگم نے قدرت کے فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا اور پیسے کے بل بوتے پر عادل کی ادھوری شخصیت کو رازداری سے مکمل بنانے کی کوششوں میں لگی رہی تھیں۔ انہیں اپنی ان کوششوں میں بس اس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ عادل میں تیسری صنف کی خصوصیات نمایاں نہیں ہوئی تھیں اور بظاہر دیکھنے میں وہ ایک لڑکا ہی لگتا تھا۔ راز کو راز رکھنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے گئے تھے۔ ملازمۂ خاص کے علاوہ کسی کو عادل کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ ایک ان پڑھ عورت تھی اور تربیت کے لیے کوالیفائڈ گورنس کا ہونا ضروری تھا جس کے لیے جولیا ماتھر کا انتخاب کیا گیا۔ احتیاط کے باوجود دن رات بچے کے ساتھ رہنے والی جولیا پر بچے کی حقیقت آشکار ہو گئی اور پیسوں سے اس کا بھی منہ بند کرنے کا انتظام کر لیا گیا۔ عادل کے نوجوانی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد جولیا ماتھر کی ضرورت نہیں رہی اور اسے بھلا دیا گیا لیکن جب جوانی میں اس کے مستقبل کے لیے نئی منصوبہ بندی کی جانے لگی تو جولیا ماتھر جیسے غیر ضروری کردار کو کوئی مصیبت بننے سے قبل ہی ختم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ قتل اس کے مسیحا ہی کے ہاتھوں طبی طریقے سے انجام پایا۔

عادل کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہوئے شاہجہاں بیگم نے ان دو کرداروں کو فراموش نہیں کیا تھا جن سے وہ اپنے شوہر کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہی آگاہ ہوئی تھیں۔ انہیں اپنے شوہر خان آصف جاہ کی تجوری سے ان کا اور صوفیہ کا نکاح نامہ مل گیا تھا لیکن صوفیہ کی طرف سے مسلسل خاموشی کی وجہ سے انہوں نے صوفیہ اور اس کے بیٹے واصف کو کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ زیرک سیاستدان تھیں اور جانتی تھیں کہ کس مہرے سے کب کام لینا ہے۔ اپنے منصوبے کے اگلے مرحلے کے لیے انہوں نے سویرا کو استعمال کیا اور عادل کی شادی کے فوراً بعد واصف کو اسپتال تک لانے میں کامیاب رہیں۔ انہوں نے جو کچھ سوچا تھا اس کے لیے واصف ہی سب سے درست انتخاب تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ

خان آصف جاہ کے پوتے کے نام سے دنیا میں آنے والا بچہ ان ہی کا خون ہو۔ واصف سے انجانے میں قیمتی جوہر حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسے بھی قتل کروا دیا تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے ڈاکٹر رفعت کو بھی قتل کروانے کی کوشش کی تھی۔ ایسے موقع پر جبکہ وہ اپنی زندگی کی سب سے اہم بازی کھیلنے جا رہی تھیں، خلافِ وعدہ ڈاکٹر رفعت کی وطن واپسی انہیں بہت ناگوار گزری تھی۔ پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد دوسرا وار کیا گیا تھا۔ اس دوسرے وار سے بھی ڈاکٹر رفعت خوش نصیبی کے باعث محفوظ رہی تھیں لیکن کیونکہ لاش یا کوئی خبر نہ ملنے کے باعث فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ مر چکی ہیں اور لاش پانی میں کہیں بہہ گئی ہے، شاہجہاں بیگم کو کامیابی کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔

عادل نے اپنی بچتی میں عروسہ کو ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے زیرِ اثر تھا۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن ان جتنا شاطر اور ہوشیار نہیں تھا کہ اپنے پتے چھپا کر رکھتا۔ شاید اس نے اس لیے بھی عروسہ کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ اس کے نزدیک وہ جال میں پھنسی ہوئی چڑیا تھی جو اس کا اور اس کی ماں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ عروسہ کے ان خیالات کے اظہار پر ڈاکٹر رفعت نے ایک اور اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد شاید عروسہ کی بھی کسی بہانے جان لے لی جاتی اسی لیے اس سے کوئی راز بیان کرنے میں احتیاط نہیں برتی گئی تھی۔ عروسہ کو ان کا یہ اندیشہ درست محسوس ہوا تھا اور شاہجہاں اور عادل کے لیے دل میں مزید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ عادل نے بہت چالاکی سے محبت کے نام پر اسے اپنے مقصد کے لیے پھانسا تھا اور اب وہ ایک ایسے بچے کو جنم دینے جا رہی تھی جو اس کے نام کا بچہ نہیں تھا۔ وہ واصف کا بچہ تھا جو سائنسی کرشمے سے اس کے بطن میں رکھ دیا گیا تھا اور وہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہ گار محسوس کرتی تھی۔ اپنی اس نفرت کے باعث وہ فوری طور پر دنیا کے سامنے کھڑے ہو کر شاہجہاں اور عادل کا بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے بے چین تھی لیکن ڈاکٹر رفعت نے اسے روک دیا اور مشورہ دیا تھا کہ بچے کی پیدائش تک انتظار کر لیا جائے تاکہ ڈی این اے سے بھی ثابت ہو جائے۔ وہ اس لیڈی ڈاکٹر سے بھی واقف تھیں جس نے اس بھیانک منصوبے میں شاہجہاں بیگم کا ساتھ دیا تھا۔ خالد کے تعلقات کا استعمال کر کے وہ اس لیڈی ڈاکٹر کے گرد دائرہ تنگ کروا رہی تھیں کیونکہ اس ڈاکٹر کا اعتراف ہی اس کیس میں سب سے اہم شہادت تھی۔

☆☆☆

سویرا کی حالت شام سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ رہ رہ کر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ شدت سے اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ صوفیہ خاتون کی تمام تر توجہ کے باوجود وہ ایسے نازک وقت میں اپنی ماں کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ رات گئے اس کی طبیعت زیادہ خراب محسوس ہونے لگی تو اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ یہ ڈاکٹر رفعت کا اسپتال تھا اور سویرا کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی وہ عروسہ کے کیس سے فارغ ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بہت خوب صورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا اور ابھی تک لیبر روم میں نڈھال پڑی ہوئی تھی۔ سویرا کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے عروسہ کو لیبر روم سے ہٹانے سے پہلے ہی اسے وہاں منتقل کرنا پڑا۔ تکلیف میں ہونے کے باوجود اس نے عروسہ کو شناخت کر لیا۔

”عروسہ..... آپ عروسہ ہیں نا..... خان عادل جاہ کی بیوی؟“ اس نے کہا تو عروسہ کو کرنٹ سا لگ گیا۔

”تم کون ہو؟“ سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے سوال کیا۔

”میں..... میں سویرا ہوں۔“ سویرا کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اپنا مکمل تعارف کروائے چنانچہ صرف نام بتانے پر ہی اکتفا کیا اور عروسہ کے لیے نام ہی کافی تھا۔

”تم..... تم سویرا ہو..... خان واصف جاہ کی بیوی؟“

اس نے سوال کیا تو درد کی انتہا پر موجود سویرا صرف اثبات میں سر ہی ہلا سکی۔ دم بخود سی ڈاکٹر رفعت کو فوراً اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ برسوں پہلے خان آصف جاہ کا وارث ادھوری شخصیت کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں اس دنیا میں آیا تھا اور آج ان ہی کے ہاتھوں خان آصف جاہ کی نسل کو آگے چلانے کے لیے دو ننھی جانوں نے دنیا میں قدم رکھا تھا۔ یہ اور بات کہ ان کی نسل کو آگے بڑھانے کے لیے دنیا میں آنے والے یہ دونوں ننھے وجود ان کی خاندانی بیوی شاہجہاں بیگم کی اولاد کے ذریعے دنیا میں نہیں آئے تھے بلکہ ایک معمولی اسکول ٹیچر صوفیہ خاتون کے بیٹے واصف کا نطفہ تھے جو خان آصف جاہ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی کبھی خود کو خان واصف جاہ نہیں کہلوا سکا تھا اور بھری جوانی میں دنیا چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ زندگی ہار کر بھی جیت گیا تھا کہ خان آصف جاہ کی نسل کو اس کے بیٹوں نے ہی آگے بڑھانا تھا۔

☆☆☆

شاہجہاں بیگم ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ عروسہ کی تلاش میں ناکام ہونے کے باوجود وہ اس کے چھوٹے بھائی کی تصویریں تلاشِ گمشدہ کے عنوان سے مسلسل مشتہر کرواتی رہی تھیں اور آخرکار ان کی یہ ترکیب کام کر گئی تھی۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ وادو میں اس شکل صورت کا ایک لڑکا اپنے گھر والوں سمیت ایک خاندان کے ساتھ مقیم ہے اور اس لڑکے سمیت اس خاندان کے لوگ بہت ہی کم گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ اس بار شاہجہاں بیگم نے اپنا طریقہ کار تبدیل کیا اور دھونس دھمکی اور لالچ کے ہتھکنڈے استعمال کیے بغیر بہت خاموشی سے ان لوگوں کی نگرانی کرواتی رہیں۔ ان کے پاس ایک ایک دن کا حساب تھا اور وہ ان متوقع تاریخوں کے بارے میں جانتی تھیں جب عروسہ کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اس موقع پر عروسہ کی ماں اس کے پاس جانے کی کوشش ضرور کرے گی اور ان کا یہ یقین غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ عروسہ کے ہاں بیٹے کی ولادت کا سن کر اس کی ای بضد ہوگئی تھیں کہ انہیں اس کے پاس آنا ہے۔ ناچار عروسہ کو انہیں اپنا پتا بتانا پڑا تھا۔ ویسے بھی اب وہ منظرِ عام پر آنے کی تیاری کر رہی تھی اس لیے پہلے جیسی رازداری کی ضرورت نہیں تھی۔ عروسہ کے والدین بیٹی سے ملنے سرداراں والے پنڈ پہنچے تو شاہجہاں بیگم کے ہرکاروں نے انہیں بھی اطلاع دے دی۔ وہ عادل سمیت رنگے ہاتھوں اپنے مجرموں کو پکڑنے وہاں جا پہنچیں اور ان کا سب سے پہلے ڈاکٹر رفعت سے سامنا ہوا۔ شاہجہاں بیگم انہیں زندہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''اتنی حیران نہ ہوں بیگم صاحبہ! بااختیار لوگ کتنی ہی کوشش کریں کہ لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے اور تقدیریں ان کے ہاتھوں میں آجائیں پھر بھی یہ فیصلے اس رب کے اختیار میں ہی رہتے ہیں جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ میری زندگی سمیت آپ یہاں رب کے اختیارات کے کئی نمونے دیکھیں گی اس لیے اپنی تھوڑی حیرت سنبھال کر بھی رکھیں۔'' وہ شاہجہاں بیگم کو دیکھ کر نہ تو گھبرائی تھیں اور نہ ہی خوفزدہ ہوئی تھیں بلکہ بڑے محظوظ ہونے والے انداز میں ان سے مخاطب تھیں۔

''ہم تم جیسی دو کوڑی کی ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔ ہم یہاں سے صرف اپنے پوتے کو لے جانے کے لیے آئے ہیں۔'' ان کی کسی بھی بات کو خاطر میں لائے بغیر شاہجہاں بیگم نے رعونت سے اعلان کیا۔ ان کے گونگے بہرے، ایک اشارے کے منتظر فرمانبردار مسلح غلام ان کے ساتھ تھے اس لیے وہ اپنی جگہ، بہت پُراعتماد تھیں۔

''بات تو آپ کو کرنی پڑے گی بیگم صاحبہ کیونکہ آج یہ دو کوڑی کی ڈاکٹر آپ کی عزت اور وقار کو دو کوڑی کا کرنے کی پوزیشن میں ہے..... اور ہاں اپنی کریکشن کر لیجیے۔ یہاں خان آصف جاہ کے ایک نہیں دو پوتے موجود ہیں۔ یاد رہے خان آصف جاہ کے پوتے..... شاہجہاں بیگم کے پوتے نہیں ہیں کیونکہ رب کائنات نے پہلے دن ہی طے کر لیا تھا کہ شاہجہاں بیگم کو ایسی کوئی نعمت نہیں ملنے والی ہے۔'' بہت کاٹ دار لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے ایک نظر ان کے ساتھ کھڑے عادل کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا خوبرو چہرہ احساسِ توہین سے سرخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رفعت کو پل بھر کے لیے اپنے الفاظ پر افسوس ہوا۔ وہ شخص تو خود قابلِ رحم تھا لیکن نہیں، وہ بھی تو اپنی ماں کی گھناؤنی منصوبہ بندی میں اس کے ساتھ مکمل طور پر شریک رہا تھا اور جانتا تھا کہ جھوٹی آن اور شان و شوکت کو قائم رکھنے کے لیے کتنے انسانوں کی جان لی گئی ہے اور کتنے انسانوں کی زندگی کو تماشا بنا گیا ہے۔

''تو وہ دھوکے باز سویرا اور خان آصف کی رکھیل صوفیہ بھی یہیں ہے؟'' ذہین شاہجہاں بیگم کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''دھوکے باز سویرا نہیں آپ ہیں جس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک معمولی احسان کے عوض ایک معصوم لڑکی کے جذبات سے کھلواڑ کیا اور رہی صوفیہ خاتون کے خان آصف جاہ کی رکھیل ہونے کی بات تو یقیناً یہ بات آپ مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ صوفیہ خاتون خان صاحب کی نکاحی بیوی ہیں۔ خان صاحب کی دولت و جائداد میں آپ کی برابر کی شریک اور خاندانی عزت و احترام کی حق دار۔'' وہ بہت سکون سے شاہجہاں بیگم سے نمٹ رہی تھیں۔

''ہم یہ ساری بکواس سننے یہاں نہیں آئے ہیں۔ ہم اپنے پوتے کو یہاں سے لے جانے آئے ہیں اور لے جاکر رہیں گے، چاہے اس کے لیے ہمیں یہاں لاشیں ہی کیوں نہ بچھانی پڑیں۔'' ان کے ایک اشارے کی دیر تھی، ان کے غلاموں کے ہتھیار فوراً سیدھے ہو گئے۔

''بہت شوق سے یہ سب کیجیے۔ کیمرے ان مناظر کو بہت اچھی طرح شوٹ کریں گے اور میڈیا اس ساری اسٹوری کو بہت چٹخارے لے کر سنائے گا۔ عروسہ، سویرا اور صوفیہ خاتون کے بیانات ریکارڈ کیے جاچکے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر مشال مارشل جس کی خدمات آپ نے اس گھناؤنے

منصوبے کے لیے حاصل کی تھیں، اب تک خفیہ ادارے کے اہلکاروں کے سامنے اپنا اعترافی بیان دے چکی ہو گی۔'' ڈاکٹر رفعت کے الفاظ نے شاہجہاں بیگم کی رنگت اڑا دی۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ہمارے ساتھ بلف کر رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم تھا کہ ہم یہاں آنے والے ہیں۔'' گرتے گرتے بھی انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

''عقل اور ذہانت صرف آپ کے پاس ہی نہیں ہے بیگم صاحبہ اللہ نے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے نوازا ہے۔'' ڈاکٹر رفعت نے بے نیازی سے انہیں جواب دیا۔

''تم یہ سب نہیں کرسکتیں ڈاکٹر! ہمیں بتاؤ کہ تم اس کھیل سے کیا چاہتی ہو؟ ہم تمہیں تمہاری منہ مانگی قیمت دیں گے۔'' وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھیں اور ایک بار پھر اپنا برسوں کا آزمودہ نسخہ آزما رہی تھیں۔ ان کی بات سن کر ڈاکٹر رفعت نے شدت سے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔

''معاف کیجیے گا بیگم صاحبہ! برسوں پہلے جب میں نے اپنی خواہش اور ضرورت کی تکمیل کے لیے آپ کی پیشکش قبول کی تھی تو میرے دل میں کسی کو نقصان پہنچانے کا کوئی خیال نہیں تھا اور میں نے اپنے دل میں آپ کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری یہ ہمدردی غلط شخصیت کے لیے ہے اور میں معصوم انسانوں کے ساتھ ظلم کا انتظام کر رہی ہوں۔''

''تو تم اس تماشے کو ختم نہیں کرو گی؟'' شاہجہاں بیگم غرائیں۔

''تماشا میں نے شروع نہیں کیا تھا جو اسے ختم کرنے کا اختیار میرے پاس ہو۔'' ڈاکٹر رفعت نے انہیں صاف جواب پکڑا دیا۔

''لیکن میں یہ تماشا ختم کرسکتا ہوں۔'' عادل جو اب تک خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا اور جس کا چہرہ پل پل اپنی رنگت بدل رہا تھا، یکدم ہی بولا اور کسی کے کچھ سمجھنے سے قبل اپنے بائیں جانب کھڑے گارڈ سے اس کی گن جھپٹ لی۔ وہ مالک تھا اس لیے ردعمل ظاہر کرنے میں گارڈ جھجک گیا اور پل بھر میں دو زندگیوں کا فیصلہ ہو گیا۔ عادل نے کئی گولیاں اپنی ماں شاہجہاں بیگم پر برسانے کے بعد ایک گولی اپنی کنپٹی پر رکھ کر چلا دی تھی۔ وہ ایک انا پرست عورت کی انا پرست اولاد تھا۔ وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ برسوں سے سنبھال کر رکھا گیا اس کا پندار ٹوٹ جائے۔ اس لیے اس نے اپنی جان دینے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ ساتھ ہی ماں کو بھی اس کے کیے کی سزا دے گیا تھا۔ اس غیر متوقع صورت حال پر بھونچکی ڈاکٹر رفعت نے ایک سرد آہ بھری۔ جو کچھ انہوں نے شاہجہاں بیگم سے کہا تھا، اس میں تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ بہت سارا جھوٹ شامل تھا۔ منصوبہ بندی تو انہوں نے تقریباً ایسی ہی کی تھی لیکن منصوبہ بندی پر پوری طرح عمل ہونے سے پہلے شاہجہاں بیگم ان کے سر پر پہنچ گئی تھیں اور انہیں اپنے سمیت کئی انسانوں کے تحفظ کے لیے جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ اس جھوٹ نے ان دو کرداروں کو جو بہت سفاک تھے، اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

شاہجہاں بیگم کوئی معمولی عورت نہیں تھیں جو ان کی اور ان کے بیٹے کی موت کا معاملہ خاموشی سے نمٹ جاتا۔ پوسٹ مارٹم، تفتیش اور تحقیق سب لوازمات پورے ہوئے تھے جن کے نتیجے میں انکشافات بھی ہوئے تھے۔ ڈاکٹر رفعت سمیت کہانی کے ہر کردار نے سچ بولا تھا لیکن صوفیہ خاتون کی طرف سے اس سچ کو چھپا لینے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ اپنے مرحوم شوہر خان آصف جاہ کے خاندان کی بے عزتی نہیں چاہتی تھیں۔ سچ کو لوگوں کے سامنے لانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ذمے داروں کو ان کے کیے کی سزا نہیں دی جاسکتی تھی اور سب سے زیادہ عروسہ اور اس کے خاندان کے متاثر ہونے کا احتمال تھا۔ عروسہ پہلے ہی بہت بڑی ذہنی و روحانی اذیت سے گزری تھی، اب اس کے نام کے ساتھ ایسی انوکھی کہانی سامنے آجاتی تو اس کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس معصوم بچے کے اوپر بھی اثر پڑتا جو اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا لیکن اس کے دنیا میں آنے کے غیر فطری طریقے کے باعث اس کی ذات کو متنازعہ بنا دیا جاتا..... خصوصاً ہمارے معاشرے میں جہاں اپنے گریبانوں میں جھانکنے سے زیادہ دوسرے کے دامن پر چھینٹے اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صوفیہ خاتون کی درخواست کے علاوہ شاہجہاں بیگم کے ابھی تک بقیدِ حیات والد کے اثر رسوخ کے سبب بھی اصل معاملے کو سامنے آنے سے روک دیا گیا تھا۔ عوام کو جو خبریں دی گئی تھیں، ان کے مطابق شاہجہاں بیگم کا بیٹا عادل ذہنی مریض تھا لیکن اس کا مرض چھپایا گیا تھا۔ شادی کے بعد اس نے اپنے مرض کی وجہ سے اپنی بیوی عروسہ کا جینا حرام کر دیا۔ ان ہی دنوں اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس کے والد آصف جاہ نے اس کی ماں کے علاوہ بھی کسی عورت سے شادی کر رکھی تھی۔ اس انکشاف نے اس کے ذہنی مرض میں مزید اضافہ کر دیا اور اس نے عروسہ کو زچ کر دیا۔ ناچار عروسہ اس سے بچنے کے لیے عادل کی سوتیلی ماں کے پاس جا چھپی۔ عادل اسے تلاش کرتا

رہا اور آخر کار اس تلاش میں کامیاب ہو کر سخت اشتعال میں عروسہ کو قتل کرنے کے ارادے سے اس اسپتال میں جا پہنچا جہاں اس کے بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ شاہجہاں بیگم کو اس کے ارادے کی خبر ہو گئی اور اس کے پیچھے پہنچ کر انہوں نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ماں کی یہ مداخلت عادل سے برداشت نہ ہوئی اور اس نے انہیں گولیاں مار کر خود بھی خودکشی کر لی۔

کہانی یہ بھی سنسنی خیز اور چٹ پٹی تھی لیکن اس سے ان زندہ کرداروں پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جو اس کہانی سے منسلک تھے۔ بڑھاپے کی انتہا پر پہنچے ہوئے شاہجہاں بیگم کے والد کی سپورٹ نے کہانی کو سچ ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں کہانی کے متاثرین سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن اپنی بیٹی کے کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا تھا۔ بے انتہا ضعیفی کے باعث اب ان میں اتنا دم خم بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کوئی دوسری کہانی تخلیق کرتے اور اصل کہانی کے کرداروں کی زبان بندی کا بھی انتظام کرتے پھرتے۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ انہیں اپنے خاندان کا نام قائم رکھنے اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے کے لیے واصف کے بیٹوں کی ضرورت تھی۔ شاہجہاں ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور خان آصف جاہ ان کے بھائی کی اکلوتی نرینہ اولاد۔ اب آصف جاہ کے پوتوں سے ہی ان کے خاندان کی نسل قائم رہنی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان بچوں کی ماؤں کی حیثیت کو قبول کر لیتے۔ قانونی طور پر اس دولت کے اصل وارث اب وہ دونوں بچے ہی تھے اور ان کے بالغ ہونے تک صوفیہ خاتون کو ان کا سرپرست مقرر کر دیا گیا تھا۔ صوفیہ خاتون نے بہت خوش اسلوبی سے معاملات سنبھالنا شروع کر دیے تھے۔ دو دو پوتوں کو پا کر انہوں نے جوان بیٹے کی موت پر صبر کر لیا تھا۔ صبر کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ قاتل خود اپنے انجام تک پہنچ گئے تھے اور اب وہ اتنا ہی کر سکتی تھیں کہ اللہ سے بیٹے کی مغفرت اور جنت میں بلند مقام کی دعا مانگتی رہتیں۔ سویرا بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ اسے بھی ان ہی کی طرح اپنی ماں اور واصف کے قتل پر صبر کرنا پڑا تھا اور اس نے واصف کے دونوں بیٹوں کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لیا تھا۔

صوفیہ خاتون نے سویرا اور عروسہ دونوں کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے لیے زندگی کے نئے ساتھی منتخب کر سکتی ہیں۔ سویرا نے فوری طور پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ جیسے انہوں نے خان آصف جاہ کی موت کے بعد صرف واصف کے سہارے اپنی ساری زندگی گزار دی تھی، ویسے ہی وہ بھی واصف کی نشانیوں کو سینے سے لگا کر ساری زندگی گزار سکتی ہے۔

عروسہ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ابھی اس کا دل فگار اور روح زخم زخم تھی، ابھی اس نے محبت میں دھوکا کھایا تھا، ابھی اسے انسانوں پر دوبارہ اعتبار قائم ہونے میں کچھ وقت لگنا تھا اور اس وقت کے انتظار میں وہ ایک این جی او سے وابستہ ہو گئی تھی۔ امید کی جا سکتی تھی کہ دوسروں کے غم کا مداوا کرتے کرتے کبھی اسے بھی کوئی چارہ گر مل جاتا جو اس کی روح کے زخموں کی رفوگری کر کے مہکتے جذبوں کو محسوس کرنے کے لائق بنا دیتا لیکن ابھی وقت لگنا تھا...... ابھی کچھ وقت لگنا تھا۔ وقت ہی سارے فیصلے کرتا ہے جیسا کہ اس نے ڈاکٹر رفعت کی اپنے بھائیوں سے بدگمانی کو دور کر دیا تھا اور انہوں نے جان لیا تھا کہ ان کے بھائی غاصب ضرور تھے قاتل نہیں۔ وہ ماں کی موت کے مہینوں بعد ان کی قبر پر جانے میں کامیاب ہوئی تھیں اور نم آنکھوں سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی تھی۔ بھائیوں کے روکنے کے باوجود سرداراں والے پنڈ میں واپس آ کر انہوں نے اپنا اسپتال سنبھال لیا اور ہاں...... اب انہیں اس اسپتال کا انتظام چلانے کے لیے فنڈز کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ صوفیہ خاتون نے اس چھوٹے سے اسپتال کے لیے جہاں ان کے دونوں پوتوں نے آنکھیں کھولی تھیں ایک بڑی رقم مقرر کر دی تھی۔

قدرت اپنے کارخانے کو ایسے ہی چلاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا نقصان بہت سوں کے فائدے کا سبب بن جاتا ہے۔ سرداراں کے پنڈ میں قائم ڈاکٹر رفعت کے اسپتال سے صرف اسی پنڈ کے لوگ ہی نہیں، آس پاس کے کئی گاؤں دیہاتوں کے لوگ بھی مستفید ہو رہے تھے۔ یہ اسپتال اس نہر کی طرح تھا جو ان سارے گاؤں دیہاتوں کی بیچ سے گزرتی ہر ایک کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی اور بدلے میں کسی سے کچھ نہیں مانگتی تھی۔ جو بدلے میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا اس کے لیے اللہ کے پاس بہت سے انعامات ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رفعت بھی ان ہی گنے چنے انسانوں کی فہرست میں شامل ہو چکی تھیں، اس لیے ان کا دل بہت مطمئن، شاد اور پُرسکون تھا اور ایسا دل ہی اللہ کی طرف سے پہلا اور سب سے بڑا انعام ہوتا ہے۔ ایسے دلوں پر اللہ کی طرف سے رحمتیں اترتی ہیں اور اترتی چلی جاتی ہیں۔